راہِ عمل

۴۔ عصرِ حاضر کے سماجی مسائل
۵۔ دینی وعصری تعلیم اور درسگاہیں۔ مسائل اور حل

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جلدِ دوم
حصہ چہارم، پنجم



زمزم پبلشرز

راہِ عمل ④

عصرِ حاضر کے سماجی مسائل

مغربی ثقافت کے غلبہ اور اسلامی تعلیمات سے
دُوری کی وجہ سے موجودہ حالات میں جو سماجی مسائل پیدا
ہو رہے ہیں اُن پر بصیرت مندانہ تبصرہ اور رہنمائی۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مُقدس مسجد اُردو بازار کراچی

راہِ عمل

کتاب کا نام ——— عصرِ حاضر کے سماجی مسائل

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دارالھدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون: 2726509
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
Bl1 3NE U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، وہ کتنی ہی قرابت مندیوں اور رشتہ داریوں کی ڈوری سے بندھا ہوا ہے، ان ہی رشتوں سے خاندان وجود میں آتا ہے، اور کئی خاندان مل کر جب ایک جگہ قیام کرتے ہیں تو اس سے سماج کی تشکیل عمل میں آتی ہے، سماج میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے لوگ بھی، وہ لوگ بھی ہوتے ہیں، جو راہ راست پر مستقیم ہیں، اور وہ لوگ بھی جو صحیح راستہ سے منحرف ہو گئے، اس لئے سماج میں اچھے اور برے دونوں طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔

ان واقعات کا انسان کی زندگی سے گہرا تعلق ہے، اور انسان چاہے نہ چاہے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس سے الگ نہیں رکھ سکتا، اس لئے آج اصلاح معاشرہ اور سماج سدھار کی آواز ہر طرف سے اٹھ رہی ہے، اور کتنی ہی مقامی، ملکی اور بین ملکی سماجی تنظیمیں ہیں، جو میدان عمل میں اتری ہوئی ہیں، لیکن ایک حقیقت ہے کہ خدا کے یقین، خدا کی بھیجی ہوئی شریعت کی پیروی اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کے بغیر سماج کی حقیقی اصلاح نہیں ہوسکتی، اس کے بغیر جو کاوشیں کی جاتی ہیں، ان کی مثال درخت کی جڑ کے بجائے اس کے تنوں اور ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسی پس منظر میں راقم الحروف روزنامہ ''منصف'' کے کالم شمعِ فروزاں میں سماجی مسائل کو خصوصی اہمیت دیتا رہا ہے، بحمد اللہ لوگوں نے نہ صرف اسے پسند کیا، بلکہ بہت سے رسائل وجرائد اسے نقل بھی کرتے رہتے ہیں، اب یہ مستقل مجموعہ کی شکل میں قارئین کی نذر ہے، خدا کرے یہ کم سواد تحریریں سوئے ہوئے دلوں کو جگانے اور غافل اذہان میں فکر کی چنگاری سلگانے میں کچھ کامیابی حاصل کرسکیں۔ وباللہ التوفیق۔

۱۲ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۹ ستمبر ۲۰۰۴ء

خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

عرضِ مرتب

انسان طبعی طور پر معاشرت پسند واقع ہوا ہے، چنانچہ تمدن کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ لوگ کسی کالونی یا شہر کو مکمل طور پر آباد نہیں کرتے تھے، بلکہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے، اس زمانہ میں بھی لوگ اپنے خاندان اور متعلقین کے ساتھ رہتے تھے، پھر جب رفتہ رفتہ انجمنوں کا قیام عمل میں آیا، دنیا نے تمدن کو اپنایا تو سماج اور سوسائٹی وجود میں آئی، ظاہر ہے یہ سماج حضرت انسان کے وجود سے ہی آج تک قائم ہے، جس کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے خیر وشر دونوں طرح کی خصوصیات رکھی ہیں، کبھی تو وہ رشک فرشتہ بنتا ہے، اور کبھی وہ شیطان سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

انسان کی نیکی و بدی کی یہ صلاحیت انفرادی زندگی کے مقابلہ اجتماعی زندگی میں بہت جلد ترقی کر جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نیک کام یا برا عمل کوئی شخص تنہا کرے، تو سوسائٹی میں اس کا اثر جلد نہیں ہوتا ہے، لیکن جب کسی معاشرہ میں بہت سے لوگ ایک ساتھ مل کر کسی خیر یا شر کا کام کریں تو سوسائٹی اس سے بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے انسانی سماج میں آج کے زمانہ میں خیر اور بھلائی کے مقابلہ شر اور برائی روز افزوں ترقی پر ہے، مغرب کی ایجاد کردہ بدتہذیبی اب مشرقی ممالک کے لئے تہذیب بنتی جارہی ہے، اور مغرب کی جانب سے چلنے والی ہر ہوا

کے جھونکے کو مشرق اب بادِ نسیم تصور کرنے لگا ہے، پھر یہ مسائل ایسے نہیں کہ اس سے صرف مسلمان ہی متاثر ہو رہے ہیں، بلکہ ہر انسان جس کے سینہ میں دل اور دل میں ضمیر ہو، اب یہ پوری انسانیت کا مسئلہ ہو گیا ہے، اور اس سے کڑھن محسوس کر رہا ہے، خود بخود جو سماج میں برائیاں کیا کم تھیں، مگر مغربی تہذیب نے تو اس کا گراف اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کی شخصیت علمی و دعوتی حلقوں میں محتاج بیان نہیں، اللہ تعالیٰ نے علمی گہرائی و گیرائی، فکری اعتدال اور زمانہ آگہی، کے ساتھ ساتھ انہیں زبان و قلم اور تعبیر و تشریح کا بے پناہ ملکہ دیا ہے، مشکل سے مشکل تعبیر کو آسان سے آسان تر انداز میں بیان کرنا آپ کا امتیاز ہے، ادھر تقریباً چھ سالوں سے روزنامہ ''منصف'' حیدر آباد کے جمعہ ایڈیشن میں ''شمع فروزاں'' کے کالم میں ہر ہفتہ آپ قومی اور بین الاقوامی مسائل پر خصوصی کالم تحریر فرماتے ہیں جو بصد شوق زبان و بیان کی چاشنی اور معنویت کی وجہ سے پڑھے جاتے ہیں، اور عوام و خواص دونوں میں یکساں رہنمائی کی جاتی ہے، اس کالم میں سماجی مسائل سے متعلق بھی بہت سی تحریریں آپ کے قلم سے نکلی ہیں، جو عصر حاضر میں پیدا شدہ سماجی مسائل کے اسلامی حل کی رہنمائی کرتی ہیں، احقر نے ان مسائل کو ''منصف'' کی قدیم فائلوں سے جمع کیا ہے، اور اب یہ مجموعہ ''عصر حاضر کے سماجی مسائل'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس مجموعہ میں اکثر اہم سماجی امراض کی طرف نشاندھی کی گئی ہے اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا علاج

بھی بتایا گیا ہے، یقیناً یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر گھر میں پڑھی جائے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو امتِ مسلمہ بلکہ انسانیت کے لئے نفع بخش بنائے اور قبولیت سے نوزے، اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ مدظلہ کا سایہ تادیر بصحت و عافیت قائم رکھے، اور مؤلف کے ساتھ ساتھ راقم الحروف کو بھی اس کے اجر میں شریک کرے۔

۱۷ شعبان ۱۴۲۵ھ

محمد نعمت اللہ

۲ر ستمبر ۲۰۰۴ء

(ریسرچ اسکالر: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

قانونِ شریعت ——— رحمت نہ کہ زحمت

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اور ان کی ضروریات سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور شیر خوار بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انہیں مشکل نہیں ہوتی ، یہ تو خیر انسان ہیں، جانور اور حیوانات جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کو اشارہ کی بھی زبان نہیں آتی ، ان کے مالکان اور پرورش کرنے والے بھی ان کی عادات وضروریات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اس بستی میں بسنے والی تمام مخلوقات اور کائنات کا حاصل ''حضرت انسان'' کی ضروریات ، جذبات ، مصالح ومفاسد اور عادات واطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا، اس لئے خود خالق کائنات انسان کے لئے جتنے بہتر اُصولِ زندگی اور جتنا مناسب قانونِ حیات وضع کرسکتا ہے، یقیناً کوئی اور طاقت نہیں کرسکتی ، نظامِ زندگی کو مرتب کرنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں اور اس کے لئے قوتِ فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے۔ ''اَلا لَهُ الْحُكْمُ'' (انعام:۶۲)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے ، لباس و پوشاک اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظامِ زندگی کے بارے میں بھی اندھیرے میں نہیں رکھا، کیوں کہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کے جذبات ،ضروریات اور فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا اور اس سے اس بات کی بھی اُمید نہیں کی جاسکتی کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے بحیثیتِ انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور

انصاف سے کام لے سکے گا، اسی لئے خدا کے رب اور رحمٰن و رحیم ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گذارنے اور جینے اور مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے، حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہوگیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے جو قانون بھیجا جارہا، اسی کو ''شریعت'' کہتے ہیں، انسان کا ابتدائی دور چوں کہ علمی اور تمدنی ناپختگی کا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس عہد میں تشریف لائے جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال و پختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا، اس لئے آپ کو وہ احکام دیئے گئے جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں بڑھوتری جاری رہتی ہے اور سال ڈیڑھ سال پر اس کے کپڑے تنگ ہونے لگتے ہیں، لیکن جب آدمی پوری طرح جوان ہوجائے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلوائے آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے، اسی طرح شریعتِ محمدی اس وقت دنیا میں آئی جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آگئی، اسی لئے یہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا، قرآن کی زبان میں اسی کا نام ''اکمالِ دین'' اور ''اتمام نعمت'' ہے۔ (مائدہ:۳)

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظامِ حیات ہے جو ''شریعتِ السامی'' یا ''اسلامی قانون'' کہلاتا ہے، یہ قانون فلاسفۂ یونان کے افکار کی طرح محض ''نظریہ'' نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر کبھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظامِ زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی معمولی سی مدت اسے بے نام ونشان کردے، بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے کم وبیش ایک ہزار سال ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا ہے، دنیا

میں جب بھی اس قانون کی آزمائش کی گئی، اس کی افادیت قانونِ فطرت سے مطابقت اور امن وسلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے، بدقسمتی سے خلافت عثمانیہ ترکی کے سقوط کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا، لیکن آج بھی دُنیا کے بعض ملکوں: سعودی عرب، افغانستان، سوڈان اور ایران میں اسلامی قانون کے اطلاق کو کسی حد تک وسعت دی گئی ہے، وہاں لوگ اس کی افادیت کا احساس کر رہے ہیں اور امن وسلامتی کی ٹھنڈی چھاؤں اسلام کی برکت سے ان کو حاصل ہے۔

اسی حساس نے گذشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ایشیاء وافریقہ میں کروٹ لی ہے اور بعض ملکوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کا اتنا شدید دباؤ ہوا، جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، وہاں بتدریج ان قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ایران اور سوڈان اس کی مثالیں ہیں، ان دونوں ممالک کو تو عرصہ سے بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیا ہی جارہا تھا، جب طالبان نے افغانستان میں حیرت انگیز فتوحات پائیں اور ایک ایسے ملک کو جو سخت بدامنی اور غارت گری کا شکار تھا، امن سے سرفراز کیا اور وہاں کے باشندوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت عرصہ کے بعد لاقانونیت اور خانہ جنگی سے امن واماں اور قانون وآئین کی طرف واپس ہوئے ہیں، تو پھر ایک نیا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور ذرائع ابلاغ میں ان کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کے افسانے تراشے جانے لگے۔

ابھی دو تین ہفتہ پہلے اچانک وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف نے شریعت بل کا اعلان کیا، جس کے تحت پاکستان میں قرآن وحدیث کو سب سے بالاتر قانون تسلیم کیا جائیگا، یہ اعلان کس قدر اخلاص پر مبنی ہے؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے! یہ ملک اسلام ہی کے نام پر بنا اور اسلام ہی کا نام لے کر مختلف حکمرانوں نے اقتدار کی سیڑھیاں طے کیں، لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں وہ پرسنل لا تک محفوظ نہیں جس کو کسی نے کسی درجہ ہندوستان میں دستوری تحفظ حاصل ہے، بظاہر اس قسم کا اعلان محض حکمرانوں کی گرتی ہوئی

ساکھ کو اونچا اٹھانے کی ایک تدبیر ہے، تاہم بعض دفعہ شر سے بھی خیر پیدا ہوتا ہے، اگر اس بہانہ بھی یہ بل پاس ہو جائے تو ایک خوش آئند بات ہوگی۔

لیکن اس اعلان نے بھی ایک بار مغرب اور مشرق کو چونکا دیا اور بعض لوگ اس طرح اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ گویا کوئی خوفناک زلزلہ یا طوفان آنے والا ہے، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بی، جے، پی گورنمنٹ جو خود رام راج کا نعرہ لگاتی ہے اور ہندوراشٹر کا خواب دیکھتی ہے، وہ بھی اسے مذہبی بنیاد پرستی کا نام دے رہی ہے، اس طرح کے بیانات سے عام لوگوں میں غلط فہمی کی فضاء قائم ہوتی ہے اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ واقعی یہ کوئی ''ڈراونی'' چیز ہے، حالاں کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ ایک اچھی خبر ہے نہ کہ بری اور انسانیت کے مفاد میں ہے، نہ کہ ان کے لئے نقصان اور پریشانی کا باعث۔

اسلامی شریعت کا اصل امتیاز دو باتیں ہیں: عدل اور اعتدال، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن وامان کا قیام اور اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں گی، کیوں کہ وہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُمورِ خانہ داری کی انجام دہی اور بچوں کی پرورش عورتوں کے ذمہ رہے گی، کیوں کہ وہ ان کاموں کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ حقوق وفرائض کی تعیین میں افراط وتفریط نہ ہو جائے، جیسے یہی خواتین کے حقوق کا مسئلہ ہے، بعض قوموں نے عورتوں کو اس درجہ گرایا کہ ان کو انسانیت کی آخری صف میں بھی جگہ نہیں دی، اور بعض نے اتنا اونچا اٹھایا کہ جن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دی، یہی حال مزدوروں کے معاملہ میں ہوا، کچھ لوگوں نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کا زرخرید غلام بنا دیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ حکمرانی مزدوروں ہی کا حق ہے، اس افراط وتفریط نے ہمیشہ سماج کو نقصان پہنچایا ہے، شریعتِ اسلامی کا اصل امتیاز یہی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین تقاضۂ عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط وتفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، خود حدود

قصاص کے قوانین جو جرائم اور سزاؤں سے متعلق ہیں، کو بنظر انصاف دیکھا جائے تو نہایت متوازن اور قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، اس درمیان دُنیا کتنی ہی معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات سے گذر چکی ہے، جو انسان بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش پر اُڑتا ہے اور سمندر کی تہوں میں غواصی کرتا ہے، ایسے فرسودہ عہد کے قوانین اس ترقی یافتہ اور متمدن عہد کے لئے کیوں کر کفایت کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے، دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں: ایک اس کی فطرت، دوسرے وہ وسائل و ذرائع جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، غور کیا جائے تو جو کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں، ان سب کا تعلق اسباب و وسائل کی دُنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کے اندرون میں کوئی تبدیلی نہیں، پکوان کے طریقے ضرور بدل گئے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے، لیکن بھوک و پیاس جیسے پہلے ہوتی تھی ویسے اب بھی ہے، انسان نے تلوار اور تیر کہ جگہ ایٹم بم اور میزاء بنالیا ہے، لیکن اس کے پس پردہ جو جذبۂ انتقام و مدافعت پہلے کارفرما تھا، اب بھی یہی حال زندگی کے تمام شعبوں میں ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے، نہ کہ اسباب و وسائل، وہ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ طاقت کا استعمال ظلم کو دور کرنے کے لئے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے، وہ کہتا ہے کہ دولت غریبوں کے گھر چراغ روشن کرنے پر صرف کرو، نہ کہ اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذہن اور فکری قوت انسان کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کرے، نہ کہ انسان کے لئے ہلاکت خیز وسائل کی ایجاد میں، وہ چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا استعمال سچی حقیقتوں کے اظہار اور سچائی کی مدد کے لئے ہو، نہ کہ جھوٹے پروپیگنڈے اور سچائی کو دبانے کے لئے، اس لئے جوں جوں وسائل واسباب کی دُنیا میں ترقی ہوتی جائے گی، اسلامی قانون کی اہمیت اور ضرورت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جائے گی، یہی وجہ کہ آج دنیا کا کوئی ایسا قانون نہیں جس نے اسلام سے خوشہ چینی نہ کی ہو، خاص کر سماجی

قانون میں تو اسلامی قانون سے اتنا فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ اس کا شمار نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں کہیں اور جس قدر اسلامی شریعت سے اعراض اور گریز کا راستہ اختیار کیا گیا، وہاں اسی قدر لوگ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس لئے اسلامی شریعت کا نفاذ ایک رحمت ہے نہ کہ زحمت، اس سے نہ کسی کو خطرہ ہے اور نہ اس پر دنیا ڈنیا کو اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ اسلام سراپا رحمت اور امن و سلامتی ہے، مسلمانوں کے لئے بھی مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی اور ان کے پڑوسیوں کے لئے بھی، خدا کرے کہ کچھ مسلم ممالک اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی زمین پر صرف خدا کی رضا کے لئے قانونِ شریعت کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ مصلحت اور حکمت کی رعایت کرتے ہوئے نافذ کریں، اگر واقعی انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا، جس سے دنیا سبق لے گی اور بہت سی زبانیں جو محض عناد اور حسد سے کھلتی ہیں گنگ ہو جائیں گی!

(۱/۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اہانت رسولؐ ــــــ ایک سنگین جرم

دُنیا کی معلوماتی تاریخ میں ہمیشہ ہی انسان کی غالب اکثریت مذہب پر یقین رکھتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اسلام اور خدا کے سامنے خود سپردگی انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے،'' فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا '' (الروم: ۳۰) یہ اور بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابِ ہدایت سے محرومی کی بنا پر جذبۂ بندگی کا غلط استعمال کرے اور اس کا سر خالق کے بجائے مخلوق کے سامنے خم ہونے لگے، لیکن بہر حال مذہب سے وابستگی انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مذہب اور اپنے مذہبی پیشوا سے وابستگی کا مسئلہ انسان کے لئے شاید سب سے زیادہ جذباتی اور حساس مسئلہ ہوتا ہے، جاں نثاری وفدا کاری اور قربانی کی جو مثالیں مذہب کی نسبت سے ملیں گی، شاید ہی کہیں اور مل پائے، اس راہ میں کتنے ہی لوگوں نے آگ پر چلنا، شعلوں میں جلنا، سمندر میں غرقاب ہونا اور زندہ پیوندِ خاک کیا جانا تو قبول کیا ہے، لیکن اپنے فکر وعقیدہ سے انحراف کسی طور پر گوارا نہیں کیا، اس لئے ہر عہد میں عدل وانصاف کی راہ چلنے والوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلتے ہوئے دوسرے مذاہب کے متبعین کے جذبات کا پاس رکھنا ضروری ہے اور یہ تو درست ہے کہ آدمی کسی فکر اور عقیدہ پر سنجیدہ علمی تنقید کرے، لیکن کسی مذہب اور مذہبی پیشوا کے ساتھ تنقیص وتمسخر اور سب وشتم کرنا کوئی بھی مذہب اور قانون روا نہیں رکھ سکتا۔

اسلام دین فطرت ہے، جس نے انسانی جذبات کی تکریم کا قدم قدم پر پاس رکھا ہے، وہ اس پہلو سے بھی ایک مکمل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ دین ہے، گزشتہ انبیاء کی نسبت قرآن مجید کو ''مصدق'' قرار دیا گیا، (البقرۃ: ۸۹) یعنی یہ کتاب گزرے ہوئے پیغمبروں کی

تصدیق کرتی ہے، ورد نیا کی بدنصیب قوموں نے ان برگزیدہ ہستیوں کی پاک زندگیوں پر تہمت اور بدگمانیوں کا جو غبار رکھ دیا تھا، یہ کتاب انہیں صاف کرتی ہے، بائبل حضرت نوحؑ کے بارے میں کہتی ہے کہ شراب پی کر برہنہ ہو گئے، (تکوین: ۲،۲۱) حضرت لوطؑ کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ (نعوذ باللہ) انہوں نے خود اپنی بیٹی کے ساتھ زنا کی، (پیدائش ۲۰: ۳۰) حضرت یعقوبؑ کے صاحبزادے یہودا کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی بہو سے بدکاری کی، (پیدائش ۳۸: ۱۸) وہ حضرت داؤدؑ کو اپنے سپاہی کی منکوحہ سے ملوث قرار دیتی ہے، (۲۔سموئیل ۱۱: ۲) حضرت سلیمان کے بارے میں کہتی ہے کہ وہ مرتد و بت پرست ہو گئے تھے، حضرت یوسفؑ کو بدقماش ٹھہراتی ہے، حضرت مسیحؑ کو لعنتی گردانتی ہے، قرآن اور حامل قرآن نے حضراتِ انبیاء کی پاکیزہ زندگیوں پر چڑھائی گئی بدگمانی اور تہمت اندازی کی ان دبیز چادروں کو چاک کیا اور ان کو برگزیدہ، خدا کے یہاں مقبول اور انسانوں کے لئے اسوہ و نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کو برگزیدہ، خدا کے یہاں مقبول اور انسانوں کے لئے اسوہ و نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا، اسی لئے ہر مسلمان پر اپنے پیغمبر کی طرح ہر پیغمبر پر ایمان لانا اور ان کے احترام کو برقرار رکھنا واجب ہے، ایک مسلمان محمد عربی ﷺ پر کتنا بھی یقین رکھتا ہو اور شریعتِ اسلامی پر عمل کرنے میں کتنا ہی پابند نظر آتا ہو، اگر اس نے ایک بھی رسول کا انکار کیا یا ان کی ہتکِ شان کی، تو وہ مسلمان باقی نہیں رہ سکتا۔

پھر قرآن مجید نے ایک اُصولی بات کہی ہے جو ہر مسلمان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اسلام سے پہلے کے تمام مذہبی پیشواؤں کا احترام کریں اور ان کے بارے میں محتاط لب و لہجہ اختیار کریں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار انبیاء بھیجے ہیں، ہر قوم میں اپنا پیغمبر مبعوث کیا ہے (فاطر: ۲۴) اور ہر زبان میں اپنا صحیفۂ ہدایت نازل فرمایا، (ابراہیم: ۴) یہ عقیدہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ مختلف اقوام جن مذہبی پیشواؤں پر ایمان رکھتی ہیں، عجب نہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اللہ کے رسول رہے ہوں اور ان کی تعلیمات میں انسانی تحریف اور ملاوٹ نے ان کو توحید سے دور کر دیا ہو، رام جی ہوں یا کرشن جی، بودھ مت ہوں یا کنفیوشس، مسلمان ان کے بارے میں بدگوئی نہیں کر سکتے، حضرت مسیحؑ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے درمیان

صرف پانچ سوستر سال کا فاصلہ ہے، اس کے باوجود بائبل (عہد جدید) میں کیا کچھ تحریف نہیں ہوئی، خود عیسائی علماء اور محققین کو اس کا اعتراف ہے، تو ان بزرگوں کا عہد تو اسلام سے بہت پہلے کا ہے، ان کی تعلیمات میں انحراف وتبدیلی کا پایا جانا بالکل عجیب نہیں!

یہ تو ان برگزیدہ ہستیوں کا ذکر ہے جو مقامِ نبوت پر فائز ہیں، یا جن کے بارے میں اس کا احتمال موجود ہے کہ وہ اپنے عہد کے پیغمبر رہے ہوں، قرآن نے تو معبودانِ باطل کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا کہ اس سے انسانی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ردعمل کی نفسیات جاگ اٹھتی ہے، (الانعام: ۱۰۸) قرآن کا مطالعہ کیجئے اور احادیث پر نظر ڈالئے! عقیدۂ توحید کا اثبات اور شرک کی تردید قرآن وحدیث کی تمام تعلیمات کا لب ولباب اور روح کا خلاصہ ہے، لیکن انبیاء ورسل کے احترام میں کہیں کوئی کمی نہیں اور مخالفین کی نہ کہیں دل آماری ہے اور نہ جذبات کو ٹھیس پہنچانے والی زبان اور بیان۔

اسلام جو رویہ دوسرے مذاہب کی بابت اختیار کرتا ہے، چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ بھی اسی سلوک کو روا رکھا جائے، نظریاتی تنقید نے کبھی مسلمان علماء یا عوام کو مشتعل نہیں کیا، مسلمانوں نے بلند حوصلگی اور علمی بلند نگاہی کے ساتھ ان کا سامنا کیا، اسلامی تھیالوجی جو ''علم کلام'' کے نام سے علومِ اسلامی کا ایک اہم شعبہ مانا جاتا ہے، کا موضوع ہی یہی ہے کہ اعتقادات کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کو مدلل طور پر پیش کیا جائے اور اسلامی معتقدات پر کئے جانے والے شبہات کا جواب دیا جائے، خود ہندوستان میں اسلام کے خلاف ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کی سرحد دل آمادی اور دریدہ دہنی سے جاملتی تھی، جیسے پنڈت دیانند سرسوتی جی کی ''ستیارتھ پرکاش''، لیکن مسلمانوں نے ایسی تحریروں پر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اس کا دندان شکن اور مسکت علمی جواب دیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بھی مذہب اور اس مذہب کے متبعین کے لئے یہ بات گوارا نہیں ہوسکتی کہ اس کے بارے میں سب وشتم اور یاوہ گوئی کا طریقہ اختیار کیا جائے، بلکہ کوئی بھی معقول قانون ایسے طرزِ عمل کو برداشت نہیں کرسکتا، جس سے لاکھوں انسانوں کے جذبات مجروح اور احساسات زخمی ہوں، آج منشیات کی اسمگلنگ کی سزا قتل ہے، کسی ملک کے جھنڈے

کی توہین کی جائے تو یہ سخت قابلِ مؤاخذہ ہے، تو کیا مذہبی پیشواؤں کی توہین اس درجہ کا جرم نہیں؟ اسی لئے اسلام میں رسولوں اور پیغمبروں کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی سزا قتل ہے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے بھی اس سنگین جرم کی یہی سزا منقول ہے، (فتح القدیر: ۶/۶۲) حقیقت یہ ہے کہ اگر اس سے بڑی بھی کوئی سزا ہو سکتی اور ایک مجرم کو ایک سے زیادہ دفعہ قتل کیا جانا ممکن ہوتا تو ایسا شخص اس کا بھی سزاوار تھا، کیوں کہ ایک انسان کے قتل کی سزا قتل ہے، حالاں کہ اس سے ایک خاندان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، ایک ملک سے بغاوت کی سزا قتل ہے، حالاں کہ اس سے بھی ایک محدود گروہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو ایک ایسی شخصیت کی بے احترامی جس سے کروڑوں انسانوں کے احساسات مجروح ہوتے ہوں، اس کا مجرم یقیناً اس سے بڑی سرزنش کا مستحق ہے۔

فقہاء کے یہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، فقہ کے چاروں دبستان حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ اس بابت متفق ہیں، (دیکھئے: رد المحتار: ۳/۲۹۰، المغنی: ۹/۳۳) اور علامہ ابن تیمیہؒ نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب "سیف اللہ المسلول علی شاتم الرسول" کے نام سے لکھی ہے، بلکہ بعض حنفی فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ رسول کے ساتھ گستاخی کرنے والے شخص کی دُنیا کے احکام کے اعتبار سے توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی، چاہے آخرت میں اس کی توبہ قبول ہو جائے، علامہ عبدالرشید طاہر بخاریؒ ممتاز فقہاء میں ہیں، لکھتے ہیں:

> "جس نے رسول ﷺ کو برا کہا، آپ ﷺ کی اہانت کی، آپ ﷺ کے دین، آپ ﷺ کی شخصیت یا آپ ﷺ کے اوصاف کی نسبت سے بدگوئی کی، تو چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہودی، عیسائی ہو یا مشرک، مسلم ملک کا مسلم باشندہ ہو یا دار الحرب کا، اس کی توجہ قبول نہیں کی جائے گی۔"
>
> (خلاصۃ الفتاویٰ: ۴/۳۸۶)

شاید یہ اس لئے کہ اگر اس معاملہ میں ایسی سختی کو روا نہ رکھا جائے تو اندیشہ ہے کہ بدقماش اور بد ذہن قسم کے لوگوں کو موقع مل جائے کہ وہ بدگوئی کریں اور پھر سزا سے بچنے کے لئے اپنے تائب ہونے کا اظہار کریں اور اس طرح حضرات انبیاء کرام، جو انسانیت کے لئے

چراغِ راہ اور خضرِ طریق تھے، کی حیاتِ طیبہ بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

اس وقت ذرائع ابلاغ میں پاکستانی عدالت کا وہ فیصلہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے، جس میں ''ایوب مسیح'' نامی ایک عیسائی کو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہانت کے جرم میں پھانسی کی سزا تجویز کی گئی، اس پر ۶۷/ سالہ کیتھولک بشپ جان جوزف نے عدالت میں احتجاجاً خودکشی کر لی اور وصیت کی کہ جب تک یہ قانون منسوخ نہ ہو، اس کی لاش اٹھائی نہ جائے، مغربی ممالک کو چاہئے تھا کہ وہ ایوب مسیح کی اس ناشائستہ حرکت کی مذمت کرتے اور عیسائیوں کو تلقین کرتے کہ وہ دوسروں کے جذبات کا پاس ولحاظ کریں اور بشپ کی اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی خودکشی کو ظلم اور ایک غیر قانونی کام میں تعاون تصور کرتے، مگر اس کے بجائے وہ ان مجرموں سے ہمدردی کا رویہ اختیار کر رہے ہیں اور پاکستان کو تلقین کر رہے ہیں کہ اس نامنصفانہ قانون کو منسوخ کرے۔

یہ بھی یک طرفہ تماشہ ہے کہ امریکہ و برطانیہ میں عیسائیت اور حضرت مسیح کی اہانت قابل سرزنش جرم ہو تو یہ غیر منصفانہ نہیں، مصر والجزائر میں مغرب نواز حکومتیں کسی معقول سبب کے بغیر سیکڑوں علماء کو آئے دن پھانسی دیتی رہیں، تو مغرب کے کانوں پر جوں نہ رینگے، بوسنیا میں انسانوں کو اتنی بے دردی سے ذبح کیا جائے کہ لگ سانپ اور درندہ جانوروں کے ساتھ بھی شاید ایسا رویہ نہیں برتتے ہوں، تو اس ''عیسائی دہشت گردی'' پر زبانی جمع خرچ سے آگے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، اسرائیل میں جبراً عربوں سے ان کا مکان خالی کرا لیا جائے اور عین مسجد میں مسلمانوں کا قتل عام ہو جائے تو مغربی اقوام کو خوابِ خرگوش سے فرصت نہ ہو، لیکن کروڑوں انسان کے جذبات کو مجروح کرنے والے ایک مجرم کے لئے انسانیت اور تہذیب کے یہ نام نہاد علمبردار ایک زباں ہو کر کھڑے ہو جائیں، افسوس کہ مغرب نے اپنے جسم سے حیا کا لباس تو اُتار ہی پھینکا تھا، انصاف وغیر جانبداری کا جو مصنوعی غازہ اپنے چہرہ پر مل رکھا ہے، یہ بھی معمولی واقعات ہی سے اُتر جاتا ہے اور اندر کا مکروہ چہرہ دیکھنے میں ذرا مشکل پیش نہیں آتی!

(۲۲/ مئی ۱۹۹۸ء)

اوھام پرستی اور اسلام

اسلام کا بنیادی عقیدہ ''توحید'' یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی یکتا ہے، خدا کا کوئی کنبہ اور خاندان نہیں اور نہ اس کے لئے اولاد اور اعزہ و اقارب ہیں اور خدا اپنی صفات اور اختیارات کے اعتبار سے بھی یکتا و بے مثال ہے، حیات و موت کی کلید اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، وہی رزق دیتا ہے، رزق میں وسعت اور تنگی بڑھاتا ہے اور رزق سے محروم کرتا ہے، وہی نفع پہنچاتا ہے اور وہی نقصان سے دوچار کرتا ہے، کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست اسی کے حکم سے وابستہ ہے۔ توحید کا یہ تصور در در سر جھکانے سے انسان کو بچاتا ہے اور بہت سی غلامیوں سے نجات عطا کرتا ہے، انہی میں ایک توہمات کی غلامی ہے۔

اوہام پرستی بھی ایک طرح کی غلامی ہے، کہ آدمی اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں رہنے والی چیزوں سے بھی ڈرنے اور خوف کھانے لگے اور اس سے اپنے نفع و نقصان کو وابستہ کر لے، اگر سامنے سے کوئی جانور نکل جائے تو آدمی سمجھے کہ یہ سفر ناکام ہوگا، گھر پر کوئی پرندہ بیٹھ جائے تو اس کو اپنے لئے مصیبتوں کا پیش خیمہ سمجھنے لگے، کسی خاص پتھر کی انگوٹھی سے کامیابی اور نفع کی امید رکھے، کسی مہینہ، دن اور گھڑی کو نامبارک، منحوس اور ''اشبھ'' تصور کرنے لگے: یہ سب توہمات کی غلامی ہے، جو شخص عقیدۂ توحید سے محروم ہو اور خدا پر اس کا یقین کامل نہ ہو، مشکل ہے کہ وہ اس غلامی سے آزاد ہو سکے، یہی وجہ ہے ایسے ترقی یافتہ ممالک جہاں صد فیصد تعلیم یافتہ لوگ پائے جاتے ہیں، وہاں بھی لوگ بعض اعداد کو منحوس سمجھتے ہیں، ہوٹلوں میں اس نمبر کے روم نہیں رکھے جاتے۔

جو شخص توحید پر جتنا پختہ یقین رکھتا ہو اور اللہ پر جس کا جتنا زیادہ ایمان ہو، وہ اسی قدر اوہام پرستی کی اس مصیبت سے آزاد اور توہمات کا اسیر بننے سے محفوظ رہے گا، اسلام کی آمد سے پہلے عربوں میں اس طرح کے توہمات پائے جاتے تھے، لوگ سفر کے لئے نکلتے، پرندے کو اڑایا جاتا، اگر وہ دائیں جانب اڑتا، تو اسے نیک فال تصور کرتے اور سفر کرتے اور اگر بائیں طرف سے اڑتا تو بدفالی لیتے اور سفر سے گریز کرتے، اسی طرح اُلو کو منحوس پرندہ خیال کرتے، کسی کے گھر پر بیٹھ جاتا تو سمجھتے کہ یہ گھر اجڑ جائے گا، صفر کے مہینہ کو نامبارک سمجھتے، سمجھتے کہ اس ماہ میں جو کاروبار ہوگا نقصان سے دوچار ہوگا، جو سفر ہوگا وہ نامراد ہوگا، جو شادی ہوگی وہ ناکام ہوگی، رسول اللہ ﷺ نے ان تصورات کی تردید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ: ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ (بخاری: باب الجذام)

دوسرے کو بیماری لگنے، پرندہ سے بدفالی، الو اور ماہِ صفر کو منحوس سمجھنے کی کوئی حقیقت نہیں۔

عربوں میں اور ایک خیال یہ تھا کہ صحراء میں کچھ شیاطین ہوتے ہیں، جو رنگ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور راہ گیروں کو راستہ سے بھٹکانے کا کام کرتے ہیں، عرب ان کو "غول" کہا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس تصور کی بھی نفی فرمائی (فتح الباری: ۱/۱۶۸) عرب شوال کے مہینہ کو بھی نامبارک اور شادی بیاہ کے لئے ناموزوں تصور کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے شوال میں نکاح فرمایا اور شوال ہی میں رخصتی بھی ہوئی، چنانچہ حضرت عائشہؓ اس خام خیالی کی تردید کرتے ہوئے فرماتی تھیں کہ میرے نکاح سے زیادہ بابرکت نکاح کون سا ہو سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ پر جس قدر قوی ایمان ہوگا، اوہام پرستی سے انسان اسی قدر دور رہے گا، اسلام نے توحید کے عقیدہ کو لوگوں کے ذہن میں ایسا راسخ کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کے تصور کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے، حضرت زنیرہؓ ایک صحابیہ ہیں، ایمان لائیں، لوگوں نے اتنا ظلم کیا کہ آنکھ کی بینائی جاتی رہی، لوگ کہنے لگے کہ دیویوں، دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے اور ان کا انکار کرنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہوگئی ہے، ہمارے

زمانہ میں عورتیں تو کیا مرد بھی اور جاہل وان پڑھ تو کیا پڑھے لکھے بھی ایسے موقعوں پر گرفتارِ اوھام ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت زنیرہؓ کی فکر میں ذرا بھی تزلزل نہیں آیا کہ ان کی صرف بصارت اللہ نے لی تھی، وہ ایمان اور ایمانی بصیرت سے محروم نہیں ہوئی تھیں، حضرت زنیرہؓ کہتی ہیں کہ یہ سب اللہ کے فیصلہ اور اس کے حکم سے ہے، رسول اللہ ﷺ ان کی استقامت اور ثابت قدمی سے بہت خوش ہوئے اور ان کے لئے دعا فرمائی، چنانچہ پھر ان کی بصارت لوٹ آئی۔

حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں جب مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر کی معیشت کا مدار دریائے نیل پر تھا، یہاں معمول تھا کہ یہ دریا جب خشک ہو جاتا تو ایک کنواری لڑکی کو دلہن بنا کر دریا کے بیچ میں ڈال دیا جاتا، دریا کی بلاخیز موجیں اٹھتیں اور اسے موت کی نیند سلانے کے بعد جاری ہو جاتیں، جب مصر کے خلافت اسلامیہ کے زیر نگیں آنے کے بعد دریا خشک ہوا اور گورنر مصر حضرت عمر ابن عاص ؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے اولاً تو انکار کیا، پھر لوگوں کے اصرار پر مشورہ کے لئے خلیفۂ راشد حضرت عمر ؓ کو خط لکھا، حضرت عمر ؓ نے اپنے جواب کے ساتھ ایک اور تحریر دریائے نیل کے نام لکھا اور ہدایت دی کہ اس تحریر کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے، حضرت عمر ؓ نے اپنی اس تحریر میں دریا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر تو اللہ کے حکم سے جاری ہے تو میں دعا کرتا ہوں کہ تو جاری ہو جائے اور اگر اللہ کے حکم سے جاری نہیں ہے تو ہمیں تیری ضرورت نہیں، حسبِ ہدایت یہ تحریر دریا میں ڈال دی گئی اور دیائے نیل اس شان سے جاری ہوا کہ دوسرے دن (جو ہفتہ کا دن تھا) سولہ ہاتھ پانی ہو گیا (البدایہ والنہایہ: ۷/۱۰۰) اور پھر آج تک کبھی نہیں تھما۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہندوستان کے ساحلی علاقہ میں پیش آیا، جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں کیا ہے کہ یہاں کے لوگ کافر تھے، یہاں ہر ماہ شیطان وارد ہوتا، اس کے لئے سمندر کے کنارے ایک بت خانہ بنا دیا تھا، جو ''بدخانہ'' کہلاتا تھا، جو دن شیطان کی آمد کا ہوتا، لوگ اس دن ایک کنواری لڑکی کو سنوار کر اس بدخانہ میں بٹھا لیتے،

رات میں وہیں چھوڑ دیتے، جب صبح کو آتے تو اسے اس حال میں پاتے کہ وہ مردہ ہوتی اور کنواری نہ ہوتی، اتفاق سے یہاں ایک ایک مغربی تاجر ابو البرکات بربری جو حافظِ قرآن تھے، آئے ہوئے تھے، وہ ایک بوڑھی خاتون کے مہمان تھے، ایک دن جب اپنے میزبان کے یہاں پہنچے تو دیکھا کہ خلافِ معمول وہ بوڑھی خاتون بہت سی عورتوں کے ساتھ مصروفِ گریہ وبکا ہے، ایک ترجمان کے واسطہ سے صورتِ حال دریافت کی تو معلوم ہوا کہ شیطان سے بچاؤ کے لیے آج اس کی اکلوتی بیٹی کے نام قرعۂ فال نکلا ہے۔

شیخ ابو البرکات کو داڑھی نہ تھی، انہوں نے پیشکش کی کہ آج اس لڑکی کی جگہ وہ جائیں گے، چنانچہ وہ بدخانہ میں بیٹھ گئے اور قرآن کی تلاوت کا سلسلہ جاری رکھا، اسی طرح پوری رات گذری، جب معمول کے مطابق لوگ صبح میں تحقیق حال کے لئے پہنچے تو دیکھا کہ وہ زندۂ وسلامت ہیں اور تلاوت میں مصروف ہیں، یہ خبر شدہ شدہ پورے علاقہ میں پھیل گئی اور علاقے کے راجہ تک اطلاع پہنچی، ابن بطوطہ نے اس کا نام ''وشنوازہ'' لکھا ہے، عجب نہیں کہ یہ ''وشنوراجہ'' کی بدلی ہوئی صورت ہو، شیخ نے راجہ پر بھی اسلام پیش کیا، اس نے کہا کہ آئندہ ماہ تک میرے پاس رہو، اگر آئندہ مہینہ میں بھی تم یہی عمل کر کے دکھاؤ اور ہم لوگوں کو اس شیطان کی ابتلاء سے بچا سکو تب ہم ایمان لے آئیں گے، اگلے ماہ بھی یہی واقعہ پیش آیا، چنانچہ راجہ مسلمان ہو گیا اور راجہ کے ساتھ رعایا کے اکثر لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ (رحلۃ ابن بطوطہ: ۱/۹۰-۵۸۹)

اگر ایمان قوی ہو اور اللہ سے نفع ونقصان کا سچا یقین ہو تو ایک جاہل اوران پڑھ شخص بھی ایسے اوہام وخرافات میں مبتلا نہیں ہوسکتا، تیمور لنگ کوئی عالم وفاضل حکمراں نہیں تھا، لیکن جب اس نے دریائے جمنا کو عبور کرنا چاہا تو جیوتشیوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ منحوس گھڑی ہے، تیمور نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور کہا کہ ہم اربابِ تنزیہ وتوحید ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے، یہ تو مشرکین اور تثلیث پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے اور اگر ایمان میں ناپختگی اور یقین میں کمزوری ہو تو اچھے خاصے پڑھے لوگ بھی ایسی چیزوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

اس ملک میں رہتے ہوئے جہاں ہم نے برادرانِ وطن سے زندگی کے دوسرے شعبوں اور سماجی رسوم و روایات میں ہندو معاشرت کا اثر قبول کیا، وہیں فکر و عقیدہ کے باب میں بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، ان ہی میں سے ایک اوہام پرستی کا مزاج و مذاق ہے، آج مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ بلی راستہ کاٹ دے تو سفر ملتوی کر دینا چاہئے، الو کا بیٹھنا نحس کی علامت ہے، اگر کسی بہو کے گھر میں آنے کے بعد سسرال میں کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کو منحوس تصور کیا جاتا ہے، گھر کی تعمیر شروع ہو تو ناریل پھوڑے جاتے ہیں، گاڑی خرید کی جائے تو چند لیموں لٹکائے جاتے ہیں اور اب ایک نئی بات گھر کی تعمیر میں ''واستو'' کی شروع ہوئی ہے، پنڈت بتاتا ہے کہ گھر کو کس ڈیزائن کا ہونا چاہئے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی میں بے برکتی ہوگی اور نقصان اٹھانا پڑے گا، حالانکہ شرعاً ایک مسلمان کے لئے صرف یہ رعایت ضروری ہے کہ بیت الخلا کی نشست ایسی ہو کہ قضاءِ حاجت کرتے ہوئے چہرہ یا پشت قبلہ کی سمت میں نہ پڑے اور بس، مکان کے سلسلہ میں اس کے علاوہ انجینئر سے مشورہ کرنا چاہئے کہ مکان کس طرح کا ہو، کہ ہوا اور روشنی پوری طرح بہم پہنچے، لیکن اس کا مشورہ بھی پنڈتوں سے کیا جاتا ہے، جو محض چند پیسوں کے لئے لوگوں کو اوہام میں گرفتار رکھنا چاہتا ہے، یہ تمام باتیں محض ایمان کی کمزوری اور ضعفِ عقیدہ کا نتیجہ ہیں، حد یہ ہے کہ اب بعض مسلمان بھی عقدِ نکاح کے وقت اور شادی کے جوڑوں کے سلسلہ میں عاملین سے مشورہ لیتے ہیں، گویا جس غلامی سے اسلام نے اسے آزاد کیا تھا، خود ہی اپنے آپ اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر بد قسمتی اور کیا ہوگی کہ آپ ﷺ نے کھلے لفظوں میں ''صفر'' کے منحوس ہونے کی تردید فرمائی، یہ تردید نہایت ہی صحیح اور مستند روایتوں سے ثابت ہے، اس کے باوجود ''صفر'' کی ۱۳ رتاریخ اور آخری چہار شنبہ کو منحوس دن تصور کیا جاتا ہے، کچھ لوگ چھلے فروخت کرنے اور اپنے روزگار کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے باور کراتے ہیں کہ اس دن ڈھیر ساری بلائیں نازل ہوتی ہیں اور وہ ان کا علاج کر سکتے ہیں، حالانکہ اسلام کی نگاہ

میں کوئی وقت منحوس نہیں، آپ ﷺ نے بعض مہینوں، راتوں اور گھڑیوں کو مبارک ضرور قرار دیا، لیکن کوئی وقت اور گھڑی نامبارک نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نحس ہوتا تو تین چیزوں میں ہوتا: عورت، گھر اور سواری، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز میں نحس ہے ہی نہیں، یہ مشرکانہ تصور ہے کہ انسان اللہ کے بجائے ایسی چیزوں سے نفع و نقصان کو متعلق سمجھے، اس سے بھی زیادہ بدقسمتی کچھ اور ہوسکتی ہے کہ کوئی قوم علم رکھنے کے باوجود انجانوں جیسا کام کرے اور خدا نے جس کی پیشانی چوکھٹوں کے داغِ مذلت سے آزاد کیا ہو وہ خود اپنی جبینِ شرافت کو داغ دار اور رسوا و خوار کرے؟؟

وندے ماترم

اپنے وطن سے محبت ایک فطری چیز ہے، انسان جس فضا میں بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے، وہاں کے ایک ایک ذرہ سے انس اور پیار ہوتا ہے، صحابہؓ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ پہنچے تو اہل مدینہ نے دل ونگاہ فرش راہ کردیئے، لیکن اس کے باوجود مہاجرین کی بے قراری کم نہ ہوتی تھی، وہ مکہ کے پہاڑوں، ریگزاروں اور گھاس کو یاد کرکر کے تڑپتے تھے، حضور ﷺ ان کو تسلی دیتے تھے اور دعاء بھی فرماتے تھے کہ مدینہ کی سرزمین ان کو محبوب ہو جائے، خود آپ ﷺ نے جب مکہ سے رخت سفر باندھا تو شہر سے باہر نکل کر مکہ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت درد سے فرمایا کہ مجھے تمہارا فراق گوارا نہیں تھا، لیکن اہل مکہ کی بدسلوکی نے مجھے اس پر مجبور کیا ہے، پھر جب مدینہ کو آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے اپنا وطن بنایا، تو مدینہ ایسا محبوب ہوا کہ آپ ﷺ کو اس کے خشک پہاڑ سے بھی پیار تھا، جب کبھی سفر سے تشریف لاتے اور اُحد پہاڑ پر نظر پڑتی، تو ایک خاص مسرت ہوتی، سواری کی رفتار بڑھا دیتے اور فرماتے کہ یہ پہاڑ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔

یہ محبت اگر جائز اخلاقی اور شرعی حدود میں ہو، تو اسلام اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، بشرطیکہ یہ محبت دل وانصاف اور حق وسچائی کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بنے اور عصبیت جاہلیہ کی حد میں داخل نہ ہو جائے، اسلامی اور انسانی اخوت اس سے مجروح نہ ہو، اسی لئے مسلمان جس ملک میں گئے، وہیں کے ہو رہے، انہوں نے ٹوٹ کر اس ملک سے محبت کی اور ملک کے باشندوں کے ساتھ بھائی بھائی بن کر رہے، مظلوموں کی دستگیری کی، ستم رسیدوں کے پشت پناہ ہوئے، دبے کچلے لوگوں کو اٹھایا، ظالموں سے پنجہ آزمائی کی اور

اخلاقی، معاشی اور سیاسی ہر اعتبار سے ملک کی خدمت کی۔

ہندوستان میں جب مسلمان آئے، تو ملک چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم تھا، ایک طبقہ نے دوسرے طبقہ کو غلام بنا رکھا تھا، ملک کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی جن کے سایہ کو بھی منحوس تصور کیا جاتا تھا اور جن کو حیوان سے بھی کم تر درجہ حاصل تھا، عورتیں سامان واملاک کے درجہ میں تھیں اور اس ملک میں دور دور تک انسانی وحدت واخوت کا کوئی تصور تک نہیں تھا، مسلمانوں نے اس ملک کو انسانی وحدت کا عقیدہ دیا، امتیام وتفریق کی دیواریں منہدم کیں، پست کو بالا کیا اور ہر طبقہ کو عمت واحترام عطا کیا، سیاسی اعتبار سے متحدہ ہندوستان کا تصور دیا، اقتصادی اور صنعتی اعتبار سے ملک کو ایسی ترقی دی کہ مشرق و جنوب کو اس پر رشک آتا تھا اور اس کو ''سونے کی چڑیا'' خیال کیا جاتا تھا، ملک کے طول و عرض کو ایسے مضبوط قلعہ، خوبصورت مقبرے، پرشکوہ مسجدیں، وسیع اور حسین باغات، کشادہ سڑکیں اور یادگار تاریخی عمارتیں دیں کہ وہی آج ہندوستان کی پہچان ہیں اور انہیں سے ملک کی تہذیبی اور تمدنی شناخت ہے۔

پھر جب ہندوستان میں انگریزوں نے قدم رکھا اور بتدریج پورے ملک کو غلام بنا لیا، تو پہلے جو لوگ ان کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے، وہ مسلمان ہی تھے، آمادی کی لڑائی میں مسلمانوں نے جس طرح خون ولہو نثار کئے اور ملک کے تمام طبقوں سے بڑھ کر محبت ووفاداری کا حق ادا کیا، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار مہر نیم روز کے انکار سے کم نہیں، آزادی کے بعد بھی مسلمانوں نے برادرانِ وطن کے دوش بدوش ملک کی ترقی میں حصہ لیا اور ملک کی حفاظت ومدافعت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے، یہ مسلمانوں کی حب الوطنی ہی ہے کہ ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کے جرم میں جو لوگ پکڑے جاتے ہیں، ان میں مسلمانوں کا تناسب شاید ایک فی صد بھی نہ ہو۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کی محبت ایمان اور عقیدۂ توحید کے دائرہ ہی میں ہوگی، ملک کی محبت ہو یا قوم کی، ماں باپ کی محبت ہو یا بال بچوں کی، ہر محبت حکم خداوندی کی پابند ہے کسی مسلمان کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ کسی انسان سے خدا اور رسول سے

بڑھ کر محبت کرے، اسی طرح اس کے لئے اس کی بھی گنجائش نہیں کہ وہ کسی جگہ اور مقام سے خواہ یہ اس کا گھر ہی کیوں نہ ہو، حرمین شریفین سے زیادہ محبت رکھے، کسی مسلمان کو اس کا پابند کرنا کہ وہ روئے زمین کے کسی خطہ کو ان مقاماتِ مقدسہ سے زیادہ مقدس اور قابلِ احترام سمجھے، اس سے ایمان وعقیدہ کی آزادی کو سلب کرنا ہے اور ملک کے ایک شہری کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کی طرح دوسرے مذاہب کے حاملین کا یہ حق بھی ہمیں تسلیم ہے کہ وہ اپنے مقدس مذہبی مقامات سے محبت واحترام کا خصوصی تعلق رکھیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ محبت اسی حد میں ہو جس کی اسلام اجازت دیتا ہے، اسلام کا سب سے بنیادی رکن عقیدۂ توحید ہے، توحید اس حقیقت کا اقرار واعتراف ہے کہ پرستش کے لائق صرف خدا ہی کی ذات ہے، خدا کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں اور انسان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں، نہ زمین و پہاڑ کا، نہ درخت اور دریا کا، نہ سورج اور چاند کا اور نہ کسی اور مخلوق کا، اس لئے وطن سے ایسی محبت کو اسلام روا نہیں رکھتا جو بندگی اور پرستش تک جا پہنچے اور جس میں محبوب کو معبود کا درجہ دیا جائے۔

اسی پس منظر میں اس نظم کو دیکھنا چاہئے جو ''وندے ماترم'' کے نام سے معروف ہے، یہ بنکم چند چٹرجی کا ترانہ ہے، جو انگریزوں کی خوشامد میں کہا گیا ہے، اسی لئے ملک کے حقیقی بہی خواہ رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر لوہیا وغیرہ نے بھی اس نزاعی نظم کو ناپسند کیا ہے اور نظم کے بارے میں مسلمانوں کے اختلاف کے معقول اور مبنی برحقیقت ہونے کا اعتراف کیا ہے، اس نظم کا آغاز ہی اس مصرعہ سے ہوتا ہے۔

میں تیرا بندہ ہوں اے میری ماں!

پھر آگے یہ مصرعہ آتا ہے:

تو ہی مرا علم ہے، تو ہی مرا دھرم ہے

نظم کا اختتام اس طرح ہوتا ہے:

میں غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں
غلام کے غلام کا غلام ہوں

اچھے پانی، اچھے پھلوں والی ماں! میں تیرا بندہ ہوں

اس نظم کے ایک مصرع میں ہندوستان کو دُرگا ماتا کا درجہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

تو ہی ہے درگا، دس مسلح ہاتھوں والی

اس نظم کے ایک ایک مصرعہ سے واضح ہے کہ شاعر مادرِ وطن کو محبوب سے آگے گزر کر ''معبود'' کا درجہ دیتا ہے، ظاہر ہے کسی مسلمان سے اس بات کا مطالبہ کرنا کہ وہ اس نقطۂ نظر کو قبول کرے اور وہ اپنے عقیدہ وضمیر کے آواز کے برخلاف مشرکانہ اشعار کو پڑھے، مذہبی تشدد کے سوا اور کیا ہے؟ یہ تو اس کا اعتقادی پہلو ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ نظم بنیادی طور پر بنگالی ناول ''آنند مٹھ'' کا حصہ ہے، جس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسایا گیا ہے، نفرت کے شعلے بھڑکانے کی کوشش کی گئی ہے اور انگریزوں کی آمد کا خیر مقدم کیا گیا ہے، کیا کوئی محبّ وطن ہندوستانی ایسے اشعار کو پسندیدگی اور تحسین کی نظر سے دیکھ سکتا ہے؟

ملک کے مختلف صوبوں میں جہاں بھاجپا برسراقتدار ہے ''وندے ماترم'' کو اسکولوں میں لانے کی سعی کی جارہی ہے اور عجب نہیں کہ اب کوشش کی جائے کہ پورا ملک اس ترانہ سے گونج اٹھے، لیکن مسلمان کے لئے نہ ان کا مذہب ان اشعار کے پڑھنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ان کی حب الوطنی اور جمہوریت پسندی ہی ان کے لئے اس کو روا رکھتی ہے!

(۲۴رمئی ۱۹۹۸ء)

اختلاف میں اعتدال

اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مسلمان ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں، اشتراکی نظام کی تباہی کے بعد پوری دنیا نے اسلام کے خلاف کمر کس لی ہے، اور اس مقصد کے لئے مشرق و مغرب کے روایتی حریف و رقیب بھی ایک دوسرے سے ہاتھ ملا چکے ہیں، خود ہمارے ملک میں جن لوگوں کو دریا کے دو کنارے کہا جاتا تھا انہوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے فاصلے ختم کر لیئے ہیں، ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو باتیں نہایت ضروری ہیں، ایک اتحاد و اتفاق، دوسرے حکمت و تدبیر۔

اتحاد و اتفاق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امت میں کوئی اختلاف ہی باقی نہ رہے، اختلاف رائے پہلے بھی رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا، اور اس کے باقی رہنے ہی میں خیر ہے، لیکن اختلافِ فکر نہ اتحادِ عمل میں مانع ہے، نہ باہمی توقیر و احترام میں، اگر ہم نے اس بات کو نہیں سمجھا تو یہ ایسی بدبختی کی بات ہوگی کہ شاید اس کی تلافی ممکن نہ ہو، اور تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے، ــــ مسلمانوں کے باہمی اختلاف کچھ تو عقائد میں ہے، اور زیادہ تر عملی احکام میں، عقائد میں بعض اختلاف یقیناً گمراہی کے قبیل سے ہے، لیکن جو لوگ اہلِ سنت والجماعت کی راہ سے منحرف ہوں ان کو بھی کافر کہنے میں سلف صالحین نے بہت احتیاط کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو باوجود ان کے فسادِ فکر و عمل کے کافر قرار دینے سے اجتناب فرمایا، معتزلہ سے دسیوں اعتقادی مسائل میں اختلاف کے باوجود اہلِ علم نے ان کی تکفیر سے گریز کیا، اور قدریہ و جبریہ وغیرہ کا شمار تقدیر کے مسئلہ میں اہلِ سنت والجماعت سے سخت اختلاف کے باوجود بھی مسلمان فرقوں میں کیا گیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف کے اختلاف رائے میں کس قدر اعتدال تھا!

خود اہلِ سنت والجماعت کے درمیان بھی بعض اعتقادی مسائل میں اختلاف رہا ہے، اور یہ عہدِ صحابہؓ سے ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ شبِ معراج میں رسول اللہ ﷺ کے باری تعالیٰ کو دیکھنے کے قائل تھے، حضرت عائشہؓ کو اس سے انکار تھا، بعض صحابہؓ اس کے قائل تھے کہ مردہ پر اس کے اہل وعیال کے رونے سے عذاب ہوتا ہے، حضرت عائشہؓ اس کی تردید کرتی تھیں، بعض صحابہؓ کی رائے تھی کہ مردے سنتے ہیں، اور جمہور اس کے قائل نہیں تھے، یہ اختلاف صحابہؓ کے بعد بھی صدیوں اہلِ علم بلکہ عوام کے درمیان بھی زیرِ بحث رہا۔

بعد کے ادوار میں جب اسلام کے اعتقادی تصورات علم کلام کے نام سے مرتب کئے گئے تو اصولی مسائل میں اتحاد کے باوجود ان عقائد کی تشریح وتوضیح اور تعبیر وتفہیم میں خاصا اختلاف پیدا ہوا، اور اشعری، ماتریدی اور حنبلی دبستان فکر ابھرے، لیکن اس اختلاف نے کبھی جھگڑے اور نزاع کی صورت اختیار نہیں کی، لوگ ایک دوسرے سے علمی استفادہ کرتے، ان کی اقتداء میں نماز ادا کرتے، ان کے علم وفضل، ورع اور تقویٰ کا برملا اعتراف کرتے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس طرح کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلف اس بات پر متفق تھے کہ اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ **اتفقوا علی عدم التکفیر بذالك** (مجموع الفتاویٰ: ۱۲/۴۹۵)

دوسری قسم کا اختلاف وہ ہے جو فقہی مسائل میں پیدا ہوا ہے، یہ اختلاف عہدِ صحابہؓ سے ہے، اور جو اختلاف صحابہؓ کے دور میں رہا ہے اس کے باقی رہنے میں خیر ہی ہے نہ کہ شر، غور کیا جائے تو اس اختلاف کو باقی رکھنا خود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا منشاء ہے، اور یہ بات ادنیٰ غور وتامل سے معلوم ہوسکتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے وضوء میں سر کا مسح کرنے کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے "**وامسحوا برؤسکم**" یہاں لفظ "ب" استعمال کیا گیا ہے، "ب" کے معنی عربی زبان میں بعض یعنی کچھ حصہ کے بھی ہوتے ہیں، اور "ب" زائد بھی ہوتی ہے، پہلی صورت میں معنی ہوگا سر کے بعض حصہ کا مسح کرلو، اور دوسری صورت میں معنی ہوگا کہ پورے سر کا مسح کرو، چنانچہ بعض فقہاء پورے سر کے مسح کو ضروری قرار دیئے ہیں، اور دوسری رائے کے مطابق سر کے کچھ حصہ کا مسح کافی ہوگا، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم

میں ''ب'' کے یہ دونوں معنی پہلے سے موجود ہیں، اگر اللہ چاہتے تو بعض کا لفظ استعمال فرماتے، اور متعین ہو جاتا کہ پورے سر کا مسح ضروری نہیں، یا ''کل'' کا لفظ ارشاد فرماتے اور یہ بات پوری طرح بے غبار ہو جاتی کہ پورے سر کا مسح کرنا فرض ہے، لیکن خدائے علیم وخبیر نے اس صراحت کے بجائے اپنی کتاب میں ایک ایسا لفظ ذکر فرمایا جس میں دو معنوں کا احتمال ہے، اس سے ظاہر ہے کہ ایسے مسائل میں اختلاف رائے کا باقی رہنا خود منشاء ربانی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں عورت کی عدت کے لئے تین ''قرء'' گذارنے کا حکم دیا گیا ہے، ''قرء'' کے معنی حیض کے بھی ہیں اور زمانہ پاکی کے بھی، اسی لئے بعض فقہاء نے تین حیض مدت قرار دی ہے اور بعض نے تین پاکی، ظاہر ہے کہ ''قرء'' کے دونوں معانی اللہ تعالیٰ کے علم محکم میں پہلے سے تھے، اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ احکام شرعیہ میں کوئی اختلاف رائے نہ ہو تو قرآن میں بجائے ''قرء'' کے صریحاً حیض یا طہر کا لفظ استعمال کیا جاتا، یہی صورتِ حال احادیثِ نبوی میں بھی ہے، مثلاً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حالت اغلاق کی طلاق واقع نہیں ہوتی، اغلاق کے معنی جنون و پاگل پن کے بھی ہیں اور اکراہ و مجبوری کے بھی، چنانچہ اپنے اپنے فہم کے مطابق بعضوں نے ایک معنی کو ترجیح دی ہے اور بعضوں نے دوسرے معنی کو، حالاں کہ رسول اللہ ﷺ **افصح العرب** یعنی عرب کے سب سے زیادہ فصیح شخص تھے، اگر آپ ﷺ چاہتے تو ایسی واضح تعبیر اختیار فرماتے کہ ایک ہی معنی متعین ہو جاتا، دوسرے معنی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

ایک ہی واقعہ میں مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ سے مختلف عمل ثابت ہے، جیسے نماز ہی کو لے لیجئے کہ تکبیر تحریمہ میں کبھی آپ ﷺ نے کانوں تک ہاتھ اٹھایا، کبھی مونڈھوں تک، اور کبھی ان دونوں کے درمیان، دونوں ہاتھ کبھی آپ ﷺ نے ابتداء نماز ہی میں اٹھائے ہیں، کبھی رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد بھی، کبھی دو سجدوں کے درمیان اور دوسرے مواقع پر بھی، ہاتھ آپ ﷺ نے کبھی ناف کے نیچے باندھے ہیں اور کبھی ناف سے اوپر، آمین کبھی آہستہ کہی ہے اور کبھی زور سے، قعدہ میں کبھی پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھے

ہیں اور کبھی کولھوں پر، عیدین میں کبھی چھ تکبیرات زوائد کہی ہیں کبھی اس سے زیادہ، یہ خدا نخواستہ تناقض اور تضاد نہیں، بلکہ اس کا مقصد توسع اور فراخی ہے۔

یہ اختلافِ رائے چنداں بُرا نہیں، اسی لئے علامہ ابنِ قدامہ نے اپنی شہرہ آفاق تالیف ''المغنی'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ فقہاء کا اتفاق حجت قاطعہ ہے، اور اختلاف رحمت واسعہ، اتفاقہم حجة قاطعة اختلافهم رحمه واسعة۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے مشہور فقیہ قاسم بن محمد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کے اختلاف سے فائدہ پہنچایا ہے کہ انسان ان میں سے کسی کی رائے پر عمل کر لے تو اسے خیال ہوگا کہ اس میں گنجائش ہے اور اس سے بہتر شخص نے اس پر عمل کیا ہے (جامع بیان العلم: لابن عبداللہ ۲/۸۰) طلحہ بن مصرفؒ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان کے سامنے فقہاء کے اختلاف کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے اسے اختلاف کا نام نہ دو بلکہ اسے فراخی اور گنجائش کہو، لا تقولوا الاختلاف و لكن قولوا السعة (حلیۃ العلماء: ۵/۱۱۹) علامہ ابن تیمیہ نے نقل کیا ہے کہ ایک صاحب نے فقہاء کے اختلاف کے بابت ایک کتاب تالیف کی، تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس کو ''کتابِ اختلاف'' کا نام نہ دو، بلکہ اسے وسعت وفراخی کی کتاب کہو۔ لاتسمه كتاب الاختلاف، ولكن سمه كتاب السعة (المجموع الفتاوی: ۳۰/۷۹)

یہی وجہ ہے کہ فقہاء کے درمیان یہ اختلاف کبھی باہمی توقیر واحترام، اور ان کے مرتبہ ومقام کے اقرار واعتراف میں مانع نہ ہوتا تھا، امام اوزاعی شام کے مشہور فقیہ ہیں، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں انہیں بعض غلط فہمیاں تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں امام صاحب کے شاگرد امام عبداللہ بن مبارکؒ سے انہوں نے کچھ دریافت کیا، ابن مبارک نے حکمت سے کام لیتے ہوئے خاموشی اختیار کی، اور اگلے روز امام صاحب سے سنے ہوئے کچھ مسائل کو تحریر کر کے اس پر شیخ ثابت بن نعمان جو امام صاحبؒ کا اصل نام تھا اور جس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں تھے تحریر فرما کر امام اوزاعیؒ کو پیش کی، امام اوزاعی پڑھ کر بہت متأثر ہوئے، اور ابن مبارک سے ان مضامین کی بہت تعریف کی، ابن مبارکؒ نے بتایا کہ

یہی اصل میں امام ابوحنیفہؒ ہیں، پھر جب حج کے موقع سے امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعی دونوں بزرگوں کی ملاقات ہوئی، اور امام صاحبؒ سے بالمشافہ ملاقات ہوئی تو امام اوزاعیؒ نے برملا اعتراف فرمایا کہ مجھے اس شخص پر ان کی کثرتِ علم اور دفور عقل کی وجہ سے رشک آیا، میں اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہوں، میں ان کے بارے میں نہایت واضح غلط فہمی میں مبتلا تھا، مجھے ان کے بارے میں جو کچھ بات پہنچی ہے، یہ تو اس کے بالکل برخلاف ہیں، اور ابن مبارک کو ہدایت فرمائی کہ ان کا ساتھ نہ چھوڑو۔ (مناقب ابی حنیفہ للکردری، ۴۵/)

اس سلسلہ میں امام مالک اور امام لیث کی باہمی مراسلت اختلاف رائے کے باوجود ایک دوسرے کی رعایت کے بارے میں خاص کر اس دور کے اہلِ علم کے لئے پڑھنے کی چیز ہے، جس سے غور وفکر کا ایک نیا منہج سامنے آتا ہے، امام شافعی کے ایک شاگرد یونس بن عبد الاعلیٰ صدفی ہیں، ان کا ایک بار اپنے استاذ امام شافعیؒ سے ایک مسئلہ میں بھی مباحثہ ہو گیا اور دونوں کسی ایک رائے پر متفق نہ ہو سکے، پھر جب امام شافعی کی ان سے ملاقات ہوئی تو امام صاحبؒ نے ہاتھ تھاما، اور فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ گو ایک مسئلہ میں بھی ہمارا اتفاق نہ ہو لیکن پھر بھی ہم بھائی بھائی بنکر رہیں الا یستقیم ان نکون اخوانا وان لم نتفق فی مسئلة (سیر اعلام النبلا ۱۶/۱۰۰) ـــــ یہ تھا ہمارے سلفِ صالحین کا طرز اختلاف!

یوں تو صحابہؓ اور بعد کے ادوار میں سینکڑوں فقہاء مقام اجتہاد پر فائز تھے، لیکن ان میں سے ائمہ اربعہ کو ایسے شاگرد ملے کہ انہوں نے اپنے تمام اساتذہ کی آراء کو جمع کر دیا، ان ائمہ اربعہ کی فقہ، کتاب وسنت کا نچوڑ اور صحابہؓ کے فتاویٰ کا خلاصہ ہے، اس نے قرآن و حدیث کے دائرہ میں آنے والے تمام مفاہیم اور رسول اللہ ﷺ کی تمام سنتوں کو نہایت ہی خوبی کے ساتھ جمع کر لیا ہے، چنانچہ کم سے کم گیارہ سو سال سے امت ان مکاتب فقہ پر متفق ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق یہ امت کبھی غلط بات پر اکٹھا نہیں ہو سکتی، اور ان کو دین کا شارح مان کر ان کی تشریحات کو قبول کیا گیا ہے، نہ یہ کہ ان کو شارع کا درجہ دیا گیا ہے، چونکہ یہ دور فتنہ اور خواہش نفس کی اتباع کا ہے اس لئے اہلِ علم نے ان میں سے کسی ایک فقیہ کی تشریحات کو مشعلِ راہ بنانے کا حکم ضرور دیا ہے، لیکن کبھی

کسی نے حق وصواب کو ان میں محدود و محصور نہیں سمجھا، اسی لئے خود احناف نے کئی مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی آراء اور شوافع نے امام شافعی کی آراء کے خلاف فتاویٰ دیئے ہیں، اور ان مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان کبھی کوئی نزاع، جنگ وجدال اور ایک دوسرے کی مذمت واہانت کی نوبت نہیں آئی، اس ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ میں مختلف قومیں دامن اسلام میں آئیں، لیکن ان کو کبھی یہ فیصلہ کرنے میں دقت پیش نہیں آتی کہ وہ کس فقہ پر عمل کریں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امت میں دین کے مزاج و مذاق کے بارے میں صحیح فہم تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ دین کے اصول و بنیاد اور اساس نہیں ہے، بلکہ ایسے مسائل ہیں جن میں ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہے، ان میں ایک رائے پر اصرار اور دوسری رائے کے بارے میں عناد کا رویہ رکھنا صحیح نہیں، اس لئے انہوں نے اس اختلاف کو کبھی اہمیت نہیں دی، علماء کا تو کیا ذکر سربراہان مملکت جن کا اصل میدان سیاست ہے نہ کہ علم وتحقیق، ان کا ذہن بھی اس بارے میں بہت واضح تھا، علامہ ابن قتیبہؒ نے اس سلسلہ میں مامون الرشید کا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، مامون کے زمانہ میں ایک شخص عسائیت کی طرف مُرتد ہوگیا، مامون نے اس پر سزا جاری کرنے سے پہلے اس کو مطمئن کرنے کی غرض سے دریافت کیا کہ تمہارے مُرتد ہونے کا کیا باعث ہوا؟ اس نے کہا کہ تم لوگوں کا اختلاف، مامون نے کہا کہ ہمارے اختلاف دو طرح کے ہیں، ایک تو جیسے اذان کے کلمات، جنازہ کی تکبیرات اور تشہد وغیرہ کے بارے میں تو یہ اختلاف نہیں، بلکہ تنگی کی بجائے توسع اور تخفیف ہے، اسی لئے جو اذان واقامت کے دہرے کلمات کہتا ہے وہ اس شخص کو غلط قرار نہیں دیتا جو اقامت کے اکہرے کلمات کہتا ہے، ان فقہی اختلافات کی وجہ سے نہ ہم ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہیں اور نہ بُرا بھلا کہتے ہیں، لا يتعايرون بذالك ولا يتعاتبون دوسرا اختلاف وہ ہے جو کسی آیت یا حدیث کی تشریح میں ہوتا ہے، اگر تم کو اس سے وحشت ہے تو تورات وانجیل کی تشریح میں بھی علماءِ یہود و نصاریٰ متفق نہیں ہیں، کیونکہ جب کوئی بات تفصیل طلب ہوگی تو اس کی تشریح میں یقیناً اختلاف کا امکان ہوگا، اگر اللہ کو یہ بات منظور ہوتی کہ ان کے

درمیان کوئی اختلاف ہی نہ ہوتو اللہ نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی بات نازل نہ کی ہوتی جو تفسیر وتشریح کی محتاج ہو، مامون کی اس بات نے اس شخص کے ذہن کی گتھی کھول دی، اور وہ فوراً ارتداد سے تائب ہوگیا۔ (عیون الاخبار: ۲/۱۵۴، الرد علی الملحدین)

غرض کہ کچھ مسائل میں اختلاف رائے عہدِ صحابہؓ سے ہے، یہ اختلاف امت کے لئے رحمت ہےاور یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منشاء کے عین مطابق ہے، اس اختلاف کو مذموم سمجھنا سلف کے طریقہ کے بھی خلاف ہےاور عقلِ سلیم کے بھی مغائر، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اختلافات کے معاملہ میں انسان کا قلب وسیع ہو، تمام سلفِ صالحین کے بارے میں اس کی زبان محفوظ اور اس کا قلم محتاط ہو، وہ صلحاءِ امّت کے اختلاف کے بارے میں حسنِ ظن رکھے، اور اختلافِ رائے کو برداشت کرے، یہ وہ مسائل نہیں ہیں جن کی امت پر تبلیغ کی جائے، اور اس کو اپنی دعوت کا موضوع بنایا جائے، اسی طرح اعتقادی احکام کی تشریح میں اہلِ سنت والجماعت کے درمیان جو معمولی سا اختلاف ہے، اور اکثر یہ اختلاف محض تعبیر کا ہوتا ہے، ان میں غلو، اور ان کی بنیاد پر دوسروں کو گمراہ قرار دینا نہایت ہی مذموم اور ناشائستہ بات ہے۔

جیسا کہ ایک زمانہ میں مغرب کی استعماری طاقتوں نے ان غیر اہم مسائل کو مسلمانوں میں اختلاف بھڑکانے اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کا ذریعہ بنایا تھا اسی طرح اس وقت بھی اسلام کے مخالفین اس قسم کے مسائل میں امت کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جس قدر مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہوگا ان کی راہ آسان ہوگی، وقت کی لکیر کو نہ پڑھنا اور غیر اہم باتوں میں اپنے آپ کو الجھا کر رکھنا کسی قوم کے انحطاط کی علامت ہوتی ہے، ہمیں تاریخ کا وہ واقعہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب مسلمان فوجیں صلیبیوں کو شکست دی تھیں تو عیسائیوں کے درمیان اس موضوع پر مناظرہ کا بازار گرم تھا کہ زمین افضل ہے یا آسمان؟ ___ کہیں ہم اسی تاریخ کو دھرا تو نہیں رہے ہیں؟؟

(۱۸ رمئی ر ۲۰۰۱ء)

اختلاف کا طریقہ

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ امت کے دو بڑے فقیہ صاحب اور صاحبِ علم اور صاحب فضل بزرگ گذرے ہیں، آج پوری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ تعداد امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کرنے والوں کی ہے، اس کے بعد فقہ شافعی ہی کے مقلدین کا نمبر ہے، امام شافعیؒ کو ہزاروں مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کے رائے سے اختلاف تھا، لیکن فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کی عیال ہیں، (الناس عیال فی الفقه علی ابی حنیفةؒ) یہی امام شافعیؒ ایک بار بغداد آئے، بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کی قبر ہے، امام شافعیؒ نمازِ فجر میں سال بھر قنوتِ نازلہ پڑھنے کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اس کے قائل نہیں، البتہ ایسے خصوصی مواقع پر قنوتِ نازلہ کی اجازت دیتے ہیں جب مسلمانوں پر کوئی آفت آئی ہو، امام شافعیؒ نے آج نمازِ فجر میں قنوتِ نازلہ نہیں پڑھی، لوگوں کو تحیر ہوا، عرض کیا گیا: آج آپ نے دعاءِ قنوت نہیں پڑھی؟ فرمایا کہ مجھے اس صاحب قبر سے حیا آتی ہے کہ میں ان کے شہر میں بھی ان کی مخالفت کروں، اختلاف کے باوجود اعتراف واحترام کی یہ ایک مثال ہے اور ایسی بہت سی مثالیں مسلمانوں کی تاریخ میں موجود ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد واتفاق کی ضرورت سے کسے انکار ہوگا؟ شاید ہی کسی ایسے شخص کو اس سے اختلاف ہوگا، جو فتورِ عقل سے محفوظ ہو، کیا عالم، کیا جاہل، کیا مسلمان کیا غیر مسلم، اس لئے دن رات اتحاد واتفاق کی اہمیت پر تقریریں بھی ہوتی ہیں، مضامین بھی لکھے جاتے ہیں، بلکہ بڑی بڑی کانفرنسیں خاص اسی مقصد کے لئے منعقد کی جاتی ہیں، اب تو اس کے لئے جلوس اور ریالیاں بھی نکالی جاتی ہیں اور مشاعروں اور سمیناروں کا بھی

اہتمام کیا جاتا ہے، یہ بھی بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کس طرح اتحاد و یکجہتی کو قائم رکھا جائے؟

لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسانی سماج میں اختلاف کا واقع ہونا بھی ایک ایسی ناگزیر بات ہے، جس سے مفر نہیں، اگر سونے چاندی یا مٹی اور پتھر کی مورتی بنادی جائیں، ان کو ایک جگہ بٹھا دیا جائے، تو یقیناً اختلاف نہ ہوگا، نہ کوئی اپنی جگہ سے آگے بڑھے گی، نہ پیچھے ہٹے گی، نہ ایک دوسرے کے خلاف اظہارِ خیال کرے گی، لیکن چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، جیتے جاگتے انسان کو اس طرح متفق اور مہر بہ لب رکھنا ممکن نہیں، خدا نے بھی جو عقل ودیعت فرمائی ہے، وہ سوچ اور غور وفکر کے بغیر رہ نہیں سکتی، یہی اس کی غذا ہے اور جیسے اللہ نے ناک، کان، رنگ وروپ اور چال ڈھال میں ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے مختلف بنایا ہے، اسی طرح ان کی عقل وفہم کی صلاحیت بھی مختلف ہے اور الگ الگ سمتوں کو لے جاتی ہے، اس لئے ان کے درمیان اختلاف فطری بھی ہے اور ضروری بھی، یہی اختلاف ہے جو انسان میں جذبۂ مسابقت پیدا کرتا ہے، اپنی رائے کی خامیوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں انسان کو رواں دواں رکھتی ہے۔

اس لئے جیسے ''اتحاد'' سیکھنے کی ضرورت ہے، اس لئے ''اختلاف'' بھی سیکھنے کی ضرورت ہے، کہ اگر کسی شخص سے اختلاف ہو جائے، تو آپ کا کیا رویہ ہونا چاہئے اور اختلاف کا اظہار کس طرح کرنا چاہئے؟ اور تو جہاں تک ممکن ہو اختلاف سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، بعض لوگوں کا مزاج بن جاتا ہے کہ جب بھی کوئی ایسی مجلس ہو جہاں مختلف نقطۂ نظر کے حامل موجود ہوں، وہاں ایسی ہی بات سے آغاز کرتے ہیں، جو اختلافی ہو، طنز وتعریض کی زبان استعمال کرتے ہیں اور تمسخر واستہزا کر کے اپنے مخالفین کو بے آبرو کرنا بڑا فن خیال کرتے ہیں، یہ محض جہالت کی بات ہے، آپ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے، تو یہاں آپ ﷺ کے مخاطب یہود تھے، یہود مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے اور کوئی موقع مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کا ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، لیکن قرآن مجید

نے ان سے بھی کہا کہ ایک ایسی بات پر آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدرِ مشترک ہے، یعنی توحید" تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ " (آل عمران:۶۴) اس لئے مشترکہ مجلسوں میں اس سے خوب احتراز کرنا چاہئے۔

دوسرے: ہر انسان میں خامیوں کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی ہوتی ہیں، خدا کی کوئی مخلوق ایسی ناقص نہیں ہوسکتی کہ اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی پہلو ہی نہ ہو، ان خوبیوں کا پوری کشادہ قلبی اور فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہئے، یہی اس کے ساتھ انصاف ہے۔ اس کی خامیوں کو یاد رکھنا اور اس کی خوبیوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی کوشش کرنا بھی ناانصافی ہے، قرآن مجید نے اسی لئے ہدایت دی ہے کہ "کسی قوم کی برائی اس کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کرنے میں حارج نہ ہوجائے"۔ "لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا" زمانۂ جاہلیت کا ایک شاعر "امیہ بن صلت" تھا، کافر تھا اور کفر ہی پر اس کی موت ہوئی، اس کے بعض اشعار بڑے اچھے تھے اور حقائق پر مبنی تھے، آپ ﷺ اس کے اشعار کے محاسن کا برملا اعتراف فرماتے تھے۔

تیسری: اہم بات یہ ہے کہ اختلاف برداشت کرنے کی قوت ہونی چاہیے، فرد ہو یا ادارہ، جماعت ہو یا تنظیم، آج کل مسلمانوں میں مشورہ سے عمل کرنے کا فقدان ہوتا جارہا ہے، کیوں کہ مشورہ میں اس شخص کی رائے اختلاف بھی ہوسکتا ہے، اس کی رائے کے خلاف بھی فیصلہ ہوسکتا ہے، اس کا محاسبہ بھی ہوسکتا ہے اور اختلاف واحتساب کو برداشت کرنے کی قوت ہی نہیں رہی، بعض لوگ ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی بداعمالی پر پردہ پڑا رہے اور بعض لوگ اس کو وقار کا مسئلہ سمجھتے ہیں، یوں تو اخلاص کا تعلق دل سے ہے، لیکن اپنے آپ کو "احتساب کے لئے تیار رکھنا" اخلاق کو جانچنے کی کسوٹی ہے، جس کا کام خدا کے لئے ہو، اس کو یہ فکر نہ ہوگی کہ اس کی رائے چلے اور نہ اسے اپنے احتساب سے خوف ہوگا، بلکہ وہ اسے پسند کرے گا کہ دنیا میں ہی حساب ہوجائے اور آخرت میں اس کا حساب آسان ہو۔

چوتھے: اختلاف میں بھی صلح ومحبت کا انداز ہونا چاہئے، نہ کہ اہانت کا، رسول اللہ ﷺ کو

کسی کی کوتاہی پر تنبیہ کرنا ہوتی تو اس میں محبت کا رنگ کارفرما ہوتا، اگر کسی کی انفرادی کوتاہی پر ٹوکنا ہوتا، تو تنہائی میں بلا کر کہتے، اگر مختلف لوگ ایک غلطی میں مبتلا ہوتے، تو کسی کا نام لئے بغیر متوجہ فرماتے، تاکہ کسی کی اہانت نہ ہو، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ کسی سے اختلاف ہو تو اس کی ایک ایک کمزوری کو تلاش کرتے ہیں اور پھر اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس قدر بدنام ہو جائے کہ کہیں منہ دکھانے کے لائق باقی نہ رہے!

بدقسمتی سے آج اختلاف مسلمانوں کی پہچان ہوگئی ہے، کوئی تنظیم ہو، ادارہ ہو، جماعت ہو، تحریک ہو، مسجد ہو، مدرسہ ہو، گھر ہو کہ سماج کا ماحول ہو، ہر جگہ دل ٹوٹے ہوئے اور کینہ و کدورت سے بسے ہوئے، کیوں کہ جو لوگ کسی ذمہ داری پر فائز ہیں ان میں اختلاف برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں اور جو لوگ اس کے ماتحت ہیں، ان میں اختلاف کا سلیقہ نہیں، اختلاف کا یہ انداز قدم قدم پر قوم کی ترقی میں رکاوٹ ہے، کاش! ہم اختلاف کے ساتھ اختلاف کا طریقہ سیکھیں اور ایک ایسے وقت میں جب کہ ہر چہار سمت سے عداوت و حسد کے تیر اس امت پر گر رہے ہیں، ہم اپنے ہاتھوں اپنی بے آبروئی کا سرو سامان نہ کریں!!

(۲۸/اپریل ۲۰۰۰ء)

بخش دو گر خطا کرے کوئی!

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (متوفی ۶۲۷ھ) ان بزرگوں میں ہیں جن کے مسکن ہونے پر ہندوستان کو بجا طور پر فخر ہے، ان کی انسانیت دوستی اور اخلاق و مروت کی وجہ سے ہر مذہب کے لوگ ان کے گرویدہ تھے، انہوں نے ایک ایسے علاقہ میں اپنی درویشی کا تخت بچھایا اور رشد و ہدایت کی محفل آراستہ کی، جہاں کی تندخوئی اور درشت طبعی ضرب المثل تھی اور آج بھی ایک حد تک ان کی یہ شناخت قائم ہے، یہ آپ کی نرم خوئی اور کریمانہ اخلاق ہی کی دین ہے کہ تلوار سے بھی جن گردنوں کو خم کرنا دشوار تھا، آپ کے ہاتھوں میں ان کا دل موم ہو جاتا تھا، ہندو ہوں یا مسلمان، سب آپ کے معتقد تھے، لاکھوں اشخاص نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور فسق و فجور سے تائب ہوئے۔

خواجہ صاحبؒ کا ایک نمایاں وصف عفو و درگذر تھا، ایک دفعہ ایک شخص کسی کے بہکاوے میں آکر آپ کے قتل کے درپے ہو گیا اور اسی ارادے سے حاضر مجلس ہوا، کسی طرح آپ نے اس کا ادراک کر لیا، آپ نہایت سیر چشمی سے ملے، اخلاق سے پیش آئے، پھر فرمایا کہ جس ارادہ سے آئے ہو اسے پورا کر لو، وہ بہت کانپنے لگا، بغل سے چھری نکال کر سامنے رکھ دی اور قدم بوس ہو کر عرض گذار ہوا کہ مجھے میری غلطی کی سزا دیجئے، بلکہ مجھے ہی قتل کر دیجئے، آپ نے فرمایا: ہم درویش تو تکلیف پہنچانے والوں اور بُرائی کرنے والوں کو بھی کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے، تم نے تو کوئی بُرائی کی ہی نہیں، آخر اس شخص نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور زندگی میں ایسی تبدیلی آئی کہ یا تو لوگوں کے جان و مال کے درپے رہتا تھا یا ایسا خدا ترس اور عبادت گذار ہوا کہ متعدد بار حج کی زیارت سے

سرفراز ہوا۔

جانی دشمنوں کو معاف کرنے اور اخلاق کی تلوار سے فولاد و آہن کی تلوار کو مفتوح کرنے کی یہ ایک مثال ہے، صحابہ کرامؓ، داعیانِ اسلام اور صوفیاء و عارفین کی زندگی میں ایسی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں، ''معاف کرنا'' بولنے میں ایک آسان لفظ ہے، لیکن عملی زندگی میں یہ ایک دشوار کام ہے، جان و زندگی کے درپے ہونا تو بڑی بات ہے، معمولی بے توقیری یا زمین و جائیداد اور روپے پیسے کا جھگڑا بھی انسان کو آتش فشاں بنا دیتا ہے، جب انتقام کی آگ سلگتی ہے تو انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا، بے قابو ہو جاتا ہے، ایسے ہی وقت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا کمال ہے۔

دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمر فاروق ﷛ حق کے معاملہ میں بہت پُر جوش واقع ہوئے تھے، کوئی غلط بات دیکھتے تو برداشت نہ کر سکتے، اسی لئے حضور ﷺ فرماتے تھے کہ عمر جس راہ سے جاتے ہیں، شیطان اس سے کترا کر نکل جاتا ہے، حضرت عمر ﷛ کا معمول تھا کہ روزانہ شب میں گشت فرماتے تھے کہ لوگوں کے حالات اور ان کی ضروریات سے واقف ہو سکیں، ایک دن نکلے تو ایک مکان سے نغمہ و سرور کی آواز سنی، ذرا جھانکا تو دیکھا کہ جام و سبو کا دور بھی چل رہا ہے، حضرت عمر ﷛ سے صبر نہ ہو سکا، دیوار پھاند کر اندر آ گئے اور کہا کہ دشمن خدا! تو شراب بھی پی رہا ہے اور گانے بھی باندی سے سن رہا ہے! وہ صاحب بھی حضرت عمر ﷛ کے مزاج سے واقف تھے، عرض کیا کہ امیر المومنین! کچھ عرض کرنے کی اجازت ہو، آپ ﷛ نے اجازت مرحمت فرمائی، کہنے لگا: مجھ سے دو غلطیاں ہوئی ہیں اور آپ سے قرآن مجید کے تین احکام کی خلاف ورزی ہوئی ہے، قرآن نے تجسس سے منع کیا ہے، (الحجرات: ۱۲) آپ نے میری کوتاہیوں کی بابت تجسس کیا، قرآن مجید نے کہا ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہو، (النور: ۲۷) آپ بلا اجازت داخل ہو گئے، قرآن نے کہا ہے کہ دروازے سے آؤ، (البقرہ: ۱۸۹) آپؓ دیوار پھاند کر آ گئے، حضرت عمر ﷛ کا غصہ کافور ہو گیا اور فرمایا کہ کیا میں ان تین باتوں کی وجہ سے تمہاری دو باتوں کو نہ معاف کر دوں، اس شخص نے اثبات میں جواب دیا

اور آپ واپس تشریف لے آئے، اس پر حضرت عمرؓ کے صبر و حلم اور عفو و درگذر کا گہرا اثر ہوا اور اپنی خراب عادتوں سے توبہ کر لی۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، وہ شخص کہ جس کے نام سے روم و فارس کے ایوانِ حکومت لرزہ براندام ہو جاتے تھے، خود حکمِ ربانی کے سامنے آتے ہی سرِ تسلیم خم کر دیتا تھا۔ رضی اللہ عنہ

غصہ اور جذبۂ انتقام پر صبر و حلم کو غالب رکھنے کا نام عفو و درگذر ہے، ایک ایسا شخص جو کوئی بدسلوکی کرنے والے پر قابو رکھتا ہو، وہ اسے کچل سکتا ہو، اس سے بدلہ لے کر بلکہ جائز انتقام کی حد سے تجاوز کر کے اپنی پیاس بجھا سکتا ہو، خیال کرے کہ وہ صبح و شام اور دن و رات اللہ کا حکم بجالانے میں کوتاہی کرتا ہے، خدا کتنا قادرِ مطلق ہے اور کیسی بے پناہ قدرت و طاقت رکھتا ہے، پھر بھی اس نے کس طرح نافرمان اور سرکش بندوں کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے رکھا ہے، اگر ہم خدا کے ایک بندے کے ساتھ درگذر کا معاملہ کریں تو خدا کا سایۂ درگذر ہم پر اور بھی دراز ہو جائے گا، تو اس طرح اس کے لئے معاف کرنا آسان ہو جائے گا، ایک بار ایک صحابی کسی غلطی پر اپنے غلام کو مار رہے تھے، آپ ﷺ کی نگاہ پڑی، آپ ﷺ نے آواز دی اور فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور ہاں، یاد رکھو کہ تم کو اس غلام پر جتنی قدرت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے، یہ سننا تھا کہ وہ صاحب کانپ گئے اور کہا کہ میں نے اس کو آزاد کر دیا۔

جب انسان کسی معاملہ کو اپنے اور دوسرے کے درمیان رکھ کر سوچتا ہے، تو غصہ بڑھتا ہے اور انتقام کی چنگاری شعلہ بن اٹھتی ہے اور وہی شخص جب اپنے اور اپنے بھائی کے درمیان خدا کو رکھ کر سوچتا ہے تو غضب کی آگ محبت کی شبنم میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاف کرنا نہ صرف آسان ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں ایک لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔

عام طور پر لوگ خیال کرتے ہیں کہ کڑوی کسیلی برداشت کر لینے میں بے عزتی ہوگی، رعب و وقار جاتا رہے گا، بدباطن لوگ بھی اس طرح کی بات کہہ کر اکساتے ہیں اور آگ پر تیل چھڑکتے ہیں، پیغمبرِ اسلام سے بڑھ کر نفسیات سے کون واقف ہوگا، اسی طرح

کی نفسیات کے پیشِ نظر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو معاف کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھا دیتے ہیں، یہ بڑی اہم بات ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے، ایک تو اس شخص کی تسکین ہوتی ہے جو غصہ پر قابو پانا چاہتا ہے، دوسرے یہ حقیقت بھی ہے کہ منتقم مزاج کا بھلے ہی ظاہری اور عارضی رعب قائم ہو جائے، لیکن ہر شخص کا دل اس سے نفرت کرتا ہے اور صابر و حلیم گو وقتی طور پر بے عزتی کو گوارا کر لے، لیکن دِلوں پر اس کی محبت کا نقش ثبت ہوتا ہے اور سماج میں اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔

(۱۴/اپریل/۲۰۰۰ء)

صبر خوش تدبیری ہے نہ کہ بزدلی

انسان کا جسم کتنی ہی بیماریوں کا مخزن ہے، یہ بیماریاں ہی ہیں جو انسان کو اس کے عجز و ناطاقتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں، اور بہت سے غفلت شعار قلوب واذہان کے لئے یہی خدا کو یاد کرنے کا سامان ہیں، ان ہی بیماریوں میں ایک مشہور اور ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے آج کل کثیر الوقوع بیماری وہ ہے جسے ''الرجی'' اور ''حساسیہ'' کہتے ہیں، اطباء کا خیال ہے کہ جسم میں بعض جراثیم قوت برداشت کھو دیتے ہیں، جیسے ہی کوئی بیرونی اور ناموافق چیز جسم میں داخل ہو، یہ فوج حرکت میں آجاتی ہے، اور غیر معمولی ردِ عمل ظاہر کرتی ہے، پھر تو مریض کا حال نہ پوچھئے، چھینکوں کا ایک طوفانی سلسلہ'' ناک اور آنکھ سے تو گویا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے''، پھر سینہ و حلق اور پیشانی تک بلغم کی تہیں جمتی ہیں، اور دِنوں، ہفتوں کھانس کھانس کر مریض بے سدھ ہو جاتا ہے، یہ بڑی تکلیف دہ بیماری ہے، بلکہ بہت سی بیماریوں کا سرچشمہ ہے۔

جیسے جسمانی سطح پر الرجی انسان کو کمزور کر دیتی ہے، اور اس کے معتدل کیفیت کو زِیر وزَبر کر کے رکھ دیتی ہے، اسی طرح قومیں بھی ''الرجی'' سے دو چار ہوتی ہیں، بعض قوموں اور گروہوں میں برداشت کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور ردِ عمل کی کفیت بڑھ جاتی ہے، وہ بات بات پر مشتعل ہوتی ہے، مخالفین کا ایک بیان مہینوں ان کو الجھا کر رکھتا ہے، اور بے برداشت ہونے کی وجہ سے ایسی جذباتیت کا ان سے مظاہرہ ہوتا ہے، جس کا نقصان خود ان کو پہونچتا ہے، ایسی قومیں دشمنوں اور بدخواہوں کی سازشوں کا شکار ہو کر اپنے حقیقی مسائل کی طرف توجہ نہیں دے پاتیں، ہمیشہ ردِ عمل میں الجھی رہتی ہیں، دوسری قومیں

تعلیمی، معاشی اور دوسرے پہلوؤں سے آگے بڑھتی رہتی ہیں، اور یہ شہراوقت مشتعل مزاج قوم ماتم وزاری اور سینہ کوبی میں گذار دیتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان اس وقت ان ہی حالات سے گذر رہے ہیں، ہم ایک طرح کی قومی الرجی میں مبتلا ہیں، ہمیں مشتعل کرنے کے لئے بے بنیاد افواہیں بھی کافی ہیں، ایک غیر معروف شخص بھی اگر کوئی معاندانہ بات کہہ دے، تو ہم لمحوں میں سڑک پر آجاتے ہیں، اور اس شدت سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں کہ معمولی شخص ہیرو بن جاتا ہے، اور معمولی تحریریں جن کی اصل جگہ ردّی کی ٹوکری ہے، محض تجسس میں قبولِ عام و خاص حاصل کرلیتی ہیں، اس مزاج کا نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں ہم نے پایا بہت کم ہے اور کھویا بہت زیادہ ہے، کچھ چیزیں یقیناً ایسی ہیں جن کے بارے میں حکومت سے ہمارا شکوہ بجا ہے، لیکن بہت سی چیزیں وہ ہیں جنہیں حاصل کرنے میں ہم حکومت کے محتاج نہیں ہیں، مسلمانوں میں خواندگی کی سطح سب سے کم ہے، ہماری خواتین کا تعلیمی تناسب کم نہیں، کمترین ہے، معمولی اور اوسط درجے کی تجارت جو سرکاری اجازت سے متعلق نہیں ہیں، ان میں بھی ہم بہت پسماندہ ہیں، زراعت میں نئے وسائل کے استعمال کی اہمیت کو اب تک ہم نے نہیں سمجھا ہے، حکومت کے بہت سے فلاحی پروگرام ہیں، اور بعض فلاحی پروگرام بین الاقوامی تنظیموں کے تحت انجام پاتے ہیں، مسلمان ان فلاحی پروگراموں سے بھی واقف نہیں، ان کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

حالانکہ مسلمانوں کے پاس بہترین ذہانتیں ہیں، افرادی وسائل ہیں، وہ اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، مسلمان مزدوروں اور ہنرمندوں کے بیرونی ممالک میں جانے سے ان کی معاشی حالت میں بھی فرق آیا ہے، مذہب سے جتنا تعلق آج بھی مسلمانوں کو ہے کسی اور قوم کو نہیں ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ ہماری پسماندگی کا کوئی علاج نہیں ہو پاتا ____ اس کی ایک اہم وجہ یہی اشتعال اور تحمل و برداشت کا فقدان ہے، ہم وقتی حالات پر اتنا سخت ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں، کہ ہماری پوری قوت وصلاحیت یا اس کا بڑا حصہ دفاعی کوششوں میں گذرتا ہے، اور ہم کوئی طویل العمل دوررس اثر کی حامل، ٹھوس اور تعمیری

منصوبہ بندی نہیں کر پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ سیاسی حالات کی ناموافقت نے مسلمانوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے، اور اب انہوں نے دوسروں کے سہارے جینے کے بجائے خود اعتمادی کے ساتھ جینے کا حوصلہ سیکھا ہے، بحمد اللہ پورے ملک میں مسلمان ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ اور فنی تعلیم کی طرف متوجہ ہیں، دینی تعلیم کی طرف بھی رجحان بڑھا ہے، ملازمت سے مایوس ہو کر تجارت کی طرف ان کے قدم بڑھ رہے ہیں، اور سیاست کی سنگلاخ وادی میں آبلہ پائی کرنے کی بجائے اب ان کی توجہ ایک طرف اگلی نسلوں کے ایمان کی حفاظت اور دوسری طرف تعلیم اور معیشت کی طرف ہو رہی ہے، یہ صورتِ حال فرقہ پرست قوتوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھ رہی ہے، اور وہ اس بات کے لئے سرگرداں ہیں کہ اس قوم کو دوبارہ اس کی بیماری میں مبتلا کریں، اسے مشتعل کریں، اس کے جذبات کو اکسائیں، اس کی انا کو ٹھیس لگائیں، اس کو بے برداشت کریں، تاکہ تعمیر سے اس کا ذہن ہٹ جائے اور یہ قوم ایسی ڈور کو سلجھنے میں لگ جائے جس کے سلجھنے کا اسے ایک پائی بھی فائدہ نہیں، اور جس میں اس کی انرجی اور صلاحیت کا بڑا حصہ ضائع ہو کر رہ جائے۔

ادھر کبھی وی، ایچ، پی کی طرف سے مسجد اور مندر کے مسئلہ کو گرم کرنے کی کوشش کی گئی، کبھی بجرنگ دل نے علانیہ مسلمانوں کے خلاف عسکری تربیت کے کیمپ قائم کئے، کبھی بیان دیا گیا کہ مسلمانوں پر نظر رکھی جائے گی، جناب بال ٹھاکرے نے مسلمانوں کو سانپ کہا، اور ان کی گرفتاری کے مسئلہ کو بھی پر جوش اور پر خروش بنانے کی کوشش کی گئی، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے ان خبروں کو اخبار میں پڑھا، ریڈیو سے سنا، اور دیکھی ان دیکھی اور سنی ان سنی کر دی، مسلمان قائدین نے بھی مسئلہ کو سڑک پر لانے کے بجائے صحافتی بیانات اور حکومت کو توجہ دلانے پر اکتفا کیا، اس طرح بات آئی گئی ہوگئی، ورنہ یہ چنگاری آتش فشاں بننے کے لئے کافی تھی، مسلمان نوجوان سڑکوں پر آتے، فسادات ہوتے، مظلوم اور بے کس مسلمانوں پر پولیس مشق ناز کرتی، مجرم ان کی بے بسی پر قہقہے لگاتے، اور مظلوم صعوبت خانوں میں نشانہ جور بنتے ___ ان اشتعال انگیز بیانات کا اصل مقصد یہی

تھا، لیکن مسلمانوں نے اپنی سمجھداری کے ذریعہ اس سازش کو ناکام کیا ہے۔

یہ بزدلی نہیں، بلکہ خوش تدبیری ہے، یہ فرار نہیں، بلکہ دشمن کے وار کو خالی کرنا ہے، یہ ہزیمت نہیں، بلکہ معاندین کی سازشوں کو ناکام و نامراد بنانا ہے، اور اس لئے یہ شکست نہیں بلکہ فتح مندی اور ظفریابی ہے ــــ قرآن کی زبان میں اس کا نام ''صبر'' ہے۔ صبر صرف شخصی مصیبت کو سہنے کا نام نہیں، بلکہ اجتماعی اور قومی زندگی میں ضبط وتحمل کا راستہ اختیار کر کے دشمن کے عزائم کو ناکام بنانے کا نام بھی صبر ہے، صبر سے انسان دوہرا فائدہ اٹھاتا ہے، ایک تو اپنی قوت کے ضائع ہونے سے بچتا ہے؛ دوسرے اپنے تعمیری کام میں تسلسل کو برقرار رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آخرت کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے، کہ صبر پر دوہرا اجر دیا جائے گا ''اولئك يوتون اجرهم مرتين بما صبروا'' (القصص:۵۴) اس میں گویا اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ دنیا میں بھی صبر دوہرے فوائد کا حامل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو آخرت کی مثال بنا کر پیدا کیا ہے۔

''صبر'' کامیابی اور ظفرمندی کی کلید ہے، اللہ تعالیٰ نے بنواسرائیل کے بارے میں یہی بات ارشاد فرمائی کہ ان کے صبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ انعام ان کے حق میں پورا ہوا، ''تمت كلمة ربك الحسنى على بني اسرائيل بما صبروا'' (الاعراف:۱۳۷) صبر میں بہ ظاہر ہزیمت محسوس ہوتی ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ مژدہ فتح ونصرت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ'' (البقرہ:۱۵۵) کہ صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنایئے، قرآن نے یہ بات بہت واضح طریقہ پر کہی ہے کہ اللہ کی نصرت کو پانے کا ذریعہ دو چیزیں ہیں، صبر اور صلاۃ، اور پھر خاص طور پر صبر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، ''يا ايها الذين آموا استعينو ابالصبر والصلاة ان الله مع الصابرين'' (البقرۃ:۱۵۳)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص مال یا جان کے معاملہ میں آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے، اور وہ لوگوں سے اس کا شکوہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ اسے معاف کردے، (مجمع الزوائد:۱۰/۲۵۶)

جیسے یہ بات افراد کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، یہی بات قوموں اور گروہوں کے بارے میں کہی جائے تو بے جا نہ ہو، کہ جو قوم دوسروں کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر کھڑی رہے، اور محض ناانصافی کا رونا روتی رہے، وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی اس کی طرف سے ہٹ جاتی ہے، اور جو قوم اللہ پر بھروسہ کر کے ناموافق باتوں کو برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتی جائے، کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، اور اللہ کی رحمت اس پر سایہ فگن رہتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک بار صبر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے امن اور ہدایت ہے، ''**اولٰئك لهم الامن وهم مهتدون**'' (مجمع الزوائد: ۱۰/۲۸۴) یعنی صبر کی وجہ سے امن وامان کی حالت رہتی ہے، اور وہ صحیح راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے عملی زندگی میں اسے برت کر دکھایا، مکی زندگی میں صحابہؓ بار بار قتال کی اجازت مانگتے لیکن آپ ہمیشہ صبر کی تلقین فرماتے رہے، مدینہ میں منافقین نے مسلمانوں کو کس طرح دق کیا، اور بغلی دشمن کا کردار ادا کیا، حضرت عمر ؓ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت چاہی، یہاں مسلمان طاقت ور موقف میں تھے، اور وہ منافقین کو کیفر کردار تک پہونچا سکتے تھے، لیکن آپ ان کی گستاخیوں اور ایذاء رسانیوں کو برداشت کرتے رہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر انہیں قتل کیا جائے، تو لوگ ان کے نفاق سے واقف نہیں ہیں، عرب سمجھیں گے کہ دیکھو پہلے دشمنوں پر ہاتھ اٹھاتے تھے، اب طاقت ہوئی تو اپنوں پر تلوار اٹھانی شروع کر دی، صلح حدیبیہ بہ ظاہر آپ نے کتنی دب کر فرمائی، کہ پُر جوش صحابہ کو بھی یہ صلح ناگوار خاطر تھی، اور محض آپ ﷺ کے احترام میں وہ خاموش تھے، اس صلح کو سبوتاج کرنے کی بھی کوشش کی گئی کہ چالیس مشرکین کے جتھے نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، وہ گرفتار کئے گئے، اور آپ ﷺ نے انہیں یونہی رہا فرما دیا، کیونکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر اہلِ مکہ سے تعلقات بہتر ہوں، تا کہ وہ قریب سے اسلام کو دیکھ اور سمجھ سکیں، فتح مکہ کے موقعہ سے بھی آپ نے جو عفو و درگذر سے کام لیا، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عربوں کے درمیان حرم کی جو حرمت تھی، اس سلسلہ میں مسلمانوں

کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

غرض، غور کیجئے تو آپ ﷺ کی پوری زندگی صبر سے عبارت ہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے اصل کام سے غافل اور دور نہ ہو جائیں، یہی صبر ہے جس کی ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو ضرورت ہے، ہم بزدل اور کم ہمت نہ ہوں، ہم کوتاہ حوصلہ اور بے غیرت بن کر نہ جئیں لیکن ہم اپنی فراستِ ایمانی کی آنکھ کو کھلی رکھیں، اور دشمن کی سازش اور منصوبہ بندی کو سمجھیں، اور دوسرے کے ہنگامہ سے متأثر ہو کر راستہ میں اس طرح نہ الجھ جائیں کہ کبھی ہماری منزل نہ آسکے، اسی خوش تدبیری اور معاملہ فہمی کا نام "صبر" ہے۔

(۲۵/اگست ۲۰۰۰ء)

صلح کرانا —— ایک اہم اسلامی فریضہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک جیتا جاگتا، ہنستا بولتا، اور چلتا پھرتا وجود عطا کیا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، غور وفکر کا ملکہ ودیعت فرمایا ہے، اور ارادہ واختیار کی قوت سے اسے نوازا گیا ہے، اس لئے کسی بھی انسانی سماج سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اس میں اختلاف پیدا ہی نہ ہو اور وہ پتھر کی مورتوں کی طرح خاموش اور بے زبان رہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سوچنے کے انداز میں فرق رکھا ہے، ذوق ونظر کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور مفادات میں ٹکراؤ بھی، پس کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف کا وقوع پذیر ہونا فطری بات ہے، اور اس سے کوئی مفر نہیں، اگر یہ اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ ہو بلکہ ضد، انا اور خود غرضی کی وجہ سے ہو تو یہ مہذب اور شائستہ اختلاف رائے کی حدوں سے گذر کر باہمی جنگ و جدال، قیمت اندازیوں اور الزام تراشیوں کا باعث بن جاتا ہے، معاشرہ میں ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی نزاع اور اختلاف کا حل کیا ہے؟ —— قرآن اللہ کی کتاب ہے، جو زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے، اس نے یقیناً اس سلسلہ میں بھی رہنمائی کی ہے —— کسی بھی نزاع سے بنیادی طور پر تین طبقے متعلق ہوتے ہیں، دو فریق تو وہ جو باہم ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں، اور تیسرے وہ سماج اور معاشرہ جس میں اس طرح کی نزاع پیش آتی ہو، قرآن کی نگاہ میں فریقین کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے سے قریب آنے کو تیار نہ ہوں اور وہ اپنے

طور پر اس فاصلہ کو سمجھنے اور اس خلیج کو پاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو دونوں فریق اپنی صف سے کسی مخلص، دین دار، سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی کا انتخاب کریں، اور ان کو اپنا ''حکم'' مان لیں، یہ دونوں حکم کی حیثیت سے جو بھی فیصلہ کریں اسے دونوں فریق قبول کرلیں، اور حکم حضرات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان دونوں فریق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھرپور سعی کریں، قرآن کہتا ہے کہ اگر حکم طرفدار بنے بغیر نیک نیتی اور صدق دلی کے ساتھ صلح کی کوشش کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کو کامیابی سے ہمکنار فرمائیں گے۔ ''اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا''۔ (النساء:۳۵)

صلح اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا یہ نہایت بہترین طریقہ ہے، بلکہ یہ اختلافات سے باہر آنے کا باعزت راستہ ہے، اس لئے کہ اس میں نہ کسی فریق کی فتح ہے اور نہ کسی فریق کی شکست، اس سے سماج میں بھی انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کی جو دولت حاصل ہوتی ہے وہ ان سب سے بڑھ کر ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ''انا'' کے خول سے باہر آئے، بڑائی کے احساس سے اپنے ذہن کو فارغ کرے، اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھے، اس کے اندر حقائق کو قبول کرنے کی جرأت ہو، اور اس کی نگاہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہو،

تیسرا طبقہ جو دو مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا وہ ہمارا سماج ہے، یہ سمجھنا کہ یہ فلاں اور فلاں شخص کا اختلاف ہے، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ یہ صحیح فکر اور مثبت سوچ نہیں، مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ جب وہ دو افراد کے درمیان آویزش اور اختلاف محسوس کریں تو ان میں صلح کرانے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے درمیان میل ملاپ کرادیا کرو۔ ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ'' (الحجرات:۱۰) یہ نہایت ہی اہم فریضہ ہے، افسوس کہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا نہ ادراک ہے اور نہ احساس۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو روزہ،

صدقہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل چیز نہ بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ ہے باہمی خلش کو دور کرنا اور صلح کرانا، اصلاح ذات البین، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں تعلقات کا بگاڑ مونڈ دینے والی چیز ہے، (الادب المفرد، حدیث نمبر: ۳۹۰) ''مونڈ دینے والی چیز'' سے مراد یہ ہے کہ یہ چیز صفایا کر دینے اور تباہ و برباد کر دینے والی ہے، خود رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کا کس قدر پاس و لحاظ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ نماز میں جماعت کا آپ کو حد درجہ اہتمام تھا، عین میدان جنگ میں بھی غیر معمولی حالات کے بغیر آپ ﷺ کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی، اور مرضِ وفات میں اس وقت بھی آپ ﷺ نے جماعت میں شرکت کا اہتمام فرمایا، جب خود چلنے کی طاقت بھی باقی نہیں رہی لیکن اس کے باوجود قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا رفع کرنے اور مصالحت کرانے کے لئے آپ اپنے رفقاء کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لے گئے اور اس فریضۂ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امامت کے لئے آگے بڑھا دیا، نماز شروع ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، (بخاری حدیث: ۲۶۹) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کیا اہمیت تھی؟

مدینہ میں انصار کے دو مشہور خاندان اوس اور خزرج آباد تھے، رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے یہ ہمیشہ باہم دست و گریباں رہتے تھے، اسلام ان کے لئے ابر رحمت بن کر آیا، اور صدیوں سے عداوت کی جو آگ بجھائے نہ بجھتی تھی وہ لمحوں میں سرد ہو کر رہ گئی، اور دونوں قبیلے اُخوت اسلامی کے رشتہ سے شیر و شکر ہو کر رہنے لگے، یہودیوں کو ان قبائل کا اتحاد اور آپسی محبت ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی اوس و خزرج کے لوگوں کے پاس سے گذرا اور ان کی باہمی محبت کو دیکھ کر بڑا رنجیدہ ہوا، چنانچہ اس نے اوس و خزرج کی لڑائی کے پرانے قصے چھیڑ دئے اور اس زمانہ میں دونوں قبیلے کے شعراء نے ایک دوسرے کے خلاف مذمت کے جو اشعار کہے تھے، ان کا بھی ذکر نکالا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان کی جاہلی حمیت لوٹ آئی، رسول اللہ ﷺ

کو جیسے ہی اس کی اطلاع ملی، بہت تیز تیز تشریف لائے، لوگوں کو شیطان کی اس وسوسہ اندازی سے باخبر کیا اسی موقع سے سورۂ آل عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں:

> اے ایمان والوں! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم پر اسلام ہی کی حالت میں موت آنی چاہئے۔ سب مل کر اللہ کی ڈوری کو تھام لو، پھوٹ نہ پیدا کرو، اور اپنے اوپر اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، اور تم اللہ کے کرم سے بھائی بھائی بن گئے، نیز تم دوزخ کے گڈھے کے کنارہ پر تھے، تو اللہ نے تم کو اس سے نکالا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تم لوگوں کو احکام بتاتے رہتے ہیں، تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو، (آل عمران: ۱۰۲، ۱۰۳)

— زبانِ مبارک سے ان آیتوں کا سننا تھا کہ دلوں کی کایا پلٹ گئی، لوگوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے، اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے۔ (طبرانی: ۲۰/۴)

غرض، کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف ونزاع کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، جس سے بچنا ممکن نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ جہاں آگ لگے وہاں پانی ڈالنے والے لوگ بھی موجود ہوں، جہاں سیلاب آتا ہے، تو وہاں ہر شخص پانی کی ظالم موجوں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتا ہے، ورنہ آگ پوری بستی کو اپنا لقمہ بنا لے گی، اور سیلاب پوری آبادی کو غرقاب کر کے رہے گا، اس لئے مسلمانوں میں جو ''اربابِ حل وعقد'' ہوں، یعنی ذمہ دار، سمجھ دار، بااثر اور اہلِ علم ودانش، علماء ومشائخ، مذہبی اور سماجی قائدین، ملی تنظیموں اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں ابھرتے ہوئے اختلاف کی بروقت تشخیص کریں، اس کے اسباب وعوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ یقیناً عند اللہ وہ اس سلسلہ میں جوابدہ ہونگے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کم سے کم ہندوستان میں مسلمانوں کے جتنے تعلیمی، اصلاحی اور دعوتی ادارے ہیں، مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں، اصلاحی تحریکیں ہیں، ان میں سے اکثر اختلاف وانتشار سے دوچار ہیں، یہ جماعتیں اور تنظیمیں دولخت بلکہ سہ لخت

ہو چکی ہیں، ایک تنظیم کے دو ٹکڑے اور پھر ان ٹکڑوں کے کئی ٹکڑیاں، یہ اختلاف وانتشار اور صلاحیتوں کا بٹوارہ بحیثیت مجموعی ملت کی طاقت کو کمزور اور بے اثر کر دیتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ہر سطح پر مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہے ہیں، کسی بھی جمہوری ملک میں سیاسی احوال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، خاص کر اقلیتوں کے لئے ان کے ووٹ کی بڑی اہمیت ہے، اگر مسلمان سیاست کی ترازو میں بے وزن ہو جائیں تو اس ملک میں کوئی بھول کر بھی ان کو پوچھنے والا اور اشک شوئی کرنے والا نہ ہوگا، اور اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ووٹ کی قیمت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا دوست دشمن سبھوں کو اقرار ہے، لیکن افسوس کہ مسلم جماعتوں کی باہمی آویزشوں اور اختلاف نے ان کو بے وزن کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے ان حالات میں سربرآوردہ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف مسلم جماعتوں کی باہمی رقابتوں کا قابل قبول حل تلاش کریں ان کو ایک میز پر جمع کریں اور ان کو اختلاف کے باوجود اتحاد پر آمادہ کریں، یہ وقت کا سب سے بڑا اجہاد اور موجودہ حالات کی سب سے بڑی ضرورت ہے!

(۲۷ راگست ۱۹۹۹ء)

خدا ترس قیادت

بنوامیہ میں ساتویں حکمراں حضرت عمر بن عبدالعزیز ہوئے، بنوامیہ کا عہد عام طور پر ظلم و جور کا عہد رہا ہے، اس دور میں حضور ﷺ کے اہلِ بیت پر لرزہ خیز مظالم ہوئے، نواسہ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے رفقا اور اکثر اہلِ بیت کے ساتھ مظلومانہ شہید کئے گئے، مکہ پر ایسی فوج کشی کی گئی کہ بیت اللہ شریف کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، مدینہ منورہ پر ایسا حملہ ہوا کہ ہزاروں مسلمان شہید ہوئے اور بدمست حملہ آور، خواتین کی بے آبروئی سے بھی باز نہ رہے، حجاج ابن یوسف جیسا شخص بنوامیہ ہی کے دور میں ''مدارالمہام'' بنا، جس پر سینکڑوں صحابہؓ کا خونِ ناحق ہے اور جس کے بارے میں حسن بصریؒ نے کہا کہ اگر تمام امتیں اپنے اپنے ظالموں کو پیش کریں اور امتِ محمدیہ حجاج کو، تو حجاج کے ظلم کا پلڑا جھک جائے گا، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عدل وانصاف گویا بنوامیہ کے مظالم کا کفارہ ہے، جس نے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یاد تازہ کردی، اس لئے آپ کو ''عمر ثانی'' بھی کہا جاتا ہے اور آپؒ کا ننھیالی سلسلہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز ناز و نعم کے پروردہ تھے اور خلافت سے پہلے ان کی نازک اندامی ضرب المثل تھی، جس گلی سے گزر جاتے، پوری گلی معطر ہو جاتی، ۱۰ رصفر جمعہ ۹۹ھ کو سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد زمامِ اقتدار آپؒ کو سونپی گئی، خلافت کی ذمہ داری نے آپؒ کی زندگی کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا، اب آپؒ کی زندگی کتنی سادہ تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے، جسے ابنِ حکم نے ''سیرت عمر بن

عبدالعزیز'' (ص: ۱۷۷) میں نقل کیا ہے، کہ عراق سے ایک خاتون آپ سے باریابی کے لئے آئیں، جب آپ کے گھر پہنچیں، تو معلوم ہوا کہ یہاں نہ دربار ہے نہ دربان، دریافت کیا کہ خلیفہ کے دولت خانہ پر کوئی باڈی گارڈ بھی نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں، عام اجازت ہے۔

گھر میں ان کی ملاقات فاطمہ نامی خاتون سے ہوئی، یہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زوجہ تھیں، جو معمولی حالت میں بیٹھی روئی درست کر رہی تھیں، خاتون نے سلام کیا، فاطمہ نے جواب دیا اور اندر آنے کی خواہش کی، آنے والی خاتون نے پورے گھر پر ایک نگاہ تجسس ڈالی اور دیکھا کہ خلیفہ کے گھر میں کوئی قابلِ ذکر چیز موجود نہیں ہے، یہ صورتِ حال ان کے لئے مایوس کن تھی، بے ساختہ زبان سے نکلا: ''ہائے میں اس ویران و برباد گھر سے اپنے گھر کو آباد کرنے کی اُمید لے کر آئی ہوں!'' فاطمہ نے کہا کہ: ''تمہیں جیسے لوگوں کے گھروں کو آباد کرنے کی کوشش میں اس گھر کا یہ حال ہوگیا ہے''۔

تھوڑی دیر گذری ہوگی کہ عمر بن عبدالعزیز بھی آئے، مکان کے ایک گوشہ میں کنواں تھا، آپ نے خود اس سے پانی کھینچا اور مکان کے سامنے پڑی ہوئی مٹی پر پانی ڈالنا شروع کیا، آپ پانی بھی کھینچتے جاتے اور بیوی فاطمہ کی طرف بار بار دیکھتے بھی جاتے، نووارد خاتون نے ان کو معمولی مزدور سمجھا اور از راہِ خیر خواہی فاطمہ سے کہا: اس مٹی کا کام کرنے والوں مزدور سے پردہ کا خیال رکھو، میں دیکھ رہی ہوں کہ بار بار وہ تمہیں گھور رہا ہے، فاطمہ نے جواب دیا: وہ مزدور نہیں ہیں، امیر المومنین ہیں! اس کام سے فارغ ہوکر حضرت عمر صحن سے اندر آئے، کمرہ میں ایک طرف مصلیٰ بچھا ہوا تھا، جہاں آپ نماز ادا کیا کرتے تھے؟ وہیں بیٹھے اور اپنی بیوی سے نووارد خاتون کے بارے میں دریافت فرمایا، بیوی نے تعارف کرایا، ایک تھیلی میں کچھ انگور رکھا ہوا تھا، حضرت عمرؒ اٹھے اور اس میں سے کچھ انگور ان مہمان خاتون کے لئے منتخب کئے، پھر ان کی ضروریات دریافت کی۔

خاتون نے کہا میری پانچ لڑکیاں ہیں، لوگوں کے لئے ان سے نکاح کرنے میں

رغبت کا کوئی سامان نہیں، میں آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ ان کے گذران کا کچھ سامان کریں، یعنی ان کے لئے کچھ وظیفہ مقرر ہو جائے، حضرت عمرؒ پر ان کی بے بسی کا حال سن کر گریہ طاری ہو گیا، رونے لگے، قلم دوات لیا اور والیٔ عراق کے نام خط لکھنے لگے، آپؒ ان کی ایک ایک لڑکی کا نام پوچھتے جاتے اور ان کے لئے وظیفہ مقرر کرتے جاتے اور ضرورت مند خاتون ''الحمد للہ'' کہتی جاتیں، جب چار لڑکیوں کا وظیفہ مقرر ہو گیا تو خوشی میں بے ساختہ زبان سے آپ کی تعریف اور آپ کے لئے دعا نکلی، آپ نے ہاتھ روک لیا، فرمایا: جب تک تم اس ذات کی تعریف کر رہی تھیں جو لائق تعریف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، ہم وظیفہ مقرر کرتے رہے، اب ان چاروں لڑکیوں سے کہو کہ وہی پانچویں لڑکی پر خرچ کریں۔

خاتون فرحاں وشاداں فرمان لے کر والیٔ عراق کے پاس پہنچیں، والیٔ عراق نے خط دیکھا تو رونے لگا اور کہتا جاتا کہ اللہ صاحبِ مکتوب پر رحم فرمائے! عراقی خاتون نے پوچھا کہ کیا خلیفہ کا انتقال ہو گیا ہے؟ والی نے اثبات میں جواب دیا۔ خاتون کی چیخ نکل گئی اور سوچا کہ ساری محنت ضائع ہو گئی، مگر والیٔ عراق نے تسلی دی اور کہا کہ میں اس خط کو رد نہیں کر سکتا اور مقررہ وظائف جاری ہو گئے۔

یہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ ایک دفعہ گھر میں داخل ہوئے، تو جس لڑکی سے گفتگو کرتے، وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی، حضرت عمرؒ نے بیوی سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ بیوی نے عرض کیا: گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، صرف دال اور پیاز تھی، وہی سب نے کھائی ہے اور منہ میں بو ہے، اس لئے یہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ رہی ہیں، آپ رونے لگے اور صاحبزادیوں سے فرمایا: کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم قسم قسم کی عمدہ غذائیں کھاؤ اور تمہارا باپ دوزخ میں داخل کیا جائے؟ یہ سُن کر صاحبزادیوں کو بھی رونا آ گیا۔

خدا ترس اور خدا ناترس قیادت میں یہی فرق ہے، جہاں خدا ترسی، عند اللہ جواب دہی کا احساس اور خوفِ آخرت ہو، وہاں قیادت انسان کو ایک بوجھ محسوس ہوتی ہے، وہ اسے ایک ذمہ داری تصور کرتا ہے، نہ کہ اعزاز، وہ اسے فکر مند بناتی ہے، نہ کہ

فارغ البال، وہ عیش ونعم کی پروردہ کو مزدور بنا کر رکھ دیتی ہے اور جمالیاتی ذوق کے غلبہ کے بجائے انسان کی شخصیت کو سادگی کا مرقع بناتی ہے، اسے نرم بستر چبھنے لگتا ہے اور ٹھنڈی چھاؤں بے سکون کر دیتی ہے اور جہاں قیادت کی منزل شہرت، نام ونمود، سیم وزر کا حصول، سکون وآرائش اور اگلی سات پشتوں کے لئے روزگار کا انتظام وانصرام ہوتا ہے، وہاں قیادت عیش وعشرت کے نقشے بناتی اور آرزوؤں کا محل تعمیر کرتی ہے، یہاں تک کہ انسان اپنے ماضی کو بالکل ہی بھول جاتا ہے اور رعایا کے دُکھ درد سے اس طرح بے نیاز ہو جاتا ہے، جیسے سویا ہوا شخص اپنے ماحول اور گردوپیش سے!!

(۳۱/مارچ/۲۰۰۰ء)

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے......

الیکشن ختم ہوا اور الیکشن کی معرکہ آرائیاں بھی اپنے پایۂ انجام کو پہنچیں، کہیں خوشی کے شادیانے بجے اور کہیں غم کے تازیانے لگے، کوئی جیتا اور کوئی ہارا، کسی نے فتح پائی اور کسی نے شکست کھائی۔ جیت اور ہار، فتح اور شکست زندگی کے ساتھی ہیں، دنیا کو اللہ نے بسایا ہی اس لئے ہے کہ انسان کبھی خوشی کی حلاوت اور مٹھاس پائے اور کبھی غم واندوہ کی تلخیاں چکھے اور یہ ضروری بھی ہے، اگر انسان ہمیشہ فتح مند اور ظفریاب ہی ہو، شکست و ہزیمت سے آشنا نہ ہو، تو مشکل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کبر ونخوت سے بچا سکے اور اس کا اخلاقی توازن درست رہے، انسان جب دُکھ، شکست اور نامرادی سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہے تو فرعون بن جاتا ہے، اسی طرح اگر انسان ہمیشہ نامرادی اور شکست وناکامی ہی سے دوچار رہے تو حوصلہ وہمت کھودیتا ہے، دناءت اور پستی اس کی فطرت میں داخل ہوجاتی ہے اور دو متقابل قوتوں کے مفقود ہونے کی وجہ سے جذبۂ مسابقت فوت ہوجاتا ہے اور یہ کسی بھی معاشرہ کے لئے بہت ہی نقصان دہ اور ترقی کے سفر میں رکاوٹ ہے، صرف حضرات انبیاء کی خصوصیت ہے کہ فتح ہو یا شکست اور شادکامی حاصل ہو یا ظاہری ناکامی، ان کے مزاج واخلاق میں کبھی بے اعتدالی پیدا نہیں ہوسکتی، باقی کوئی بھی انسان مسلسل ایک حالت میں تو عدل اور اعتدال کا دامن چھوڑ دیتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ حالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی دولت، کبھی غربت، کبھی جیت اور کبھی ہار، کبھی صحت اور کبھی بیماری، کبھی خوشی اور کبھی غم، کہ انسان کی تربیت کے لئے یہ ایسا ہی ضروری ہے جیسے انسانی جسم کو دو متضاد اثرات کی حامل غذاؤں کی ضرورت پڑتی ہے، وہ جتنا پانی کا حاجت مند ہے، قریب قریب اسی قدر

آگ کا بھی، شبنم کی ٹھنڈک اس کے لئے جس قدر فرحت بخش ہے، دھوپ کی تمازت اس سے کم ضروری نہیں، خوشی پر کبھی غم کا سایہ نہ پڑے اور رنج وتکلیف کے ساتھ کبھی راحت کی آمیزش نہ ہونے پائے، اس کی جگہ صرف آخرت ہے۔

اسلام نے ہمیں یہ سبق بھی سکھایا ہے کہ جیت اور ہار کے موقع پر ہمارا کیا رویہ ہو؟ اور ہم کس طرح ان واقعات کا سامنا کریں؟ سیاسی مقابلہ آرائی میں بنیادی طور پر تین گروہ ہوتے ہیں: ایک فاتحین کا، دوسرے مفتوحین کا، تیسرے عوام کا، جو لوگوں کو شکست سے دو چار کرتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن کی جیت ہوئی ہو، فاتحین کے لئے رسول اللہ ﷺ کا اسوہ بنیادی طور پر تین باتیں ہیں: اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کا شکرادا کیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقعہ سے فتح یابی کے بعد شکرانہ کی نماز ادا فرمائی، آج کل اسی جگہ پر مسجد فتح بنی ہوئی ہے، جو مدینہ منورہ میں واقع ہے اور زائرین کو وہاں جانے کا موقعہ ملتا ہے، فتح مکہ کے بعد بھی آپ ﷺ نے نمازِ شکرانہ ادا کی ہے، اولاً مکہ میں داخل ہونے کے بعد حضرت ام ہانیؓ کے گھر میں، جس کو بعض محدثین نے نماز اشراق شمار کیا ہے اور بعض نے نمازِ شکر، پھر کعبہ میں داخل ہونے کے بعد کعبہ کے اندر، اگر مکمل نماز ادا نہ کی جائے تو کم سے کم سجدۂ شکر ہی ادا کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ جب آپ کو کوئی خوش کن بات پیش آتی تو سجدہ میں گر پڑتے اور اللہ کا شکر بجالاتے، کان اذا اتاہ امر یسر بہ او بشر بہ خر ساجدا شکرا للہ (ترمذی: ۱/۲۸۷، باب ماجاء فی سجدۃ الشکر) مسلمانوں کا اظہارِ مسرّت کا طریقہ یہی ہے، حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو جنگ یمامہ میں فتح ہوئی اور حضرت علی ؓ نے خوارج کے مقابلہ میں فتح پائی تو یہی سجدۂ شکر ادا فرمایا، (المغنی: ۱/۳۶۲) حضرت عمرؓ اور حضرت کعب بن مالکؓ سے بھی سجدہ شکر ادا کرنا ثابت ہے، (شرح مہذب: ۴/۷۰) خوشی کے اظہار کے لئے جلوس اور ریلی نکالنا، تفاخر آمیز نعرے لگانا، پٹاخے چھوڑنا اور غیر مسلم اقوام کی طرح ایک دوسرے پر گلال پھینکنا، یہ سب اللہ کو ناراض کرنے اور اس کے غضب کو دعوت دینے والی باتیں ہیں۔

فاتحین کے لئے دوسرا اسوہ یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت وہ جتنا پر اعتماد اور باحوصلہ ہو،

فتح یاب ہونے کے بعد اسی قدر متواضع اور سراپا انکسار، اس کی چال ڈھال سے، اس کے بول سے، اس کے طرز تخاطب سے، اس کی تقریر و خطاب اور تحریر و بیان سے کسر نفسی اور فروتنی جھلکتی ہو، رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے موقع سے جب فاتحانہ حرم اقدس میں داخل ہوئے تو تواضع اور خشیت کا اس قدر غلبہ تھا کہ سر مبارک مسلسل جھکا ہوا تھا اور جبینِ اقدس بار بار اونٹ کی کوہانوں سے لگ جاتی تھی، نہ نعرۂ افتخار تھا، نہ دعویٰ عز و وقار، نہ گردن اکڑی ہوئی، نہ سینے تنے ہوئے اور نہ سر اٹھے ہوئے، ایک صاحب نے جوش میں کہہ دیا کہ آج کشت و خون کا دن ہے، الیوم یوم الملحمة، تو آپ ﷺ نے فوراً ان کی بات کاٹی اور فرمایا کہ آج رحم دلی، مہربانی اور عفو و درگذر کا دن ہے، الیوم یوم المرحمة، زبانِ مبارک پر اللہ کی حمد اور تسبیح و تقدیس کے کلمات رواں تھے اور کسی عمل سے اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا اظہار نہیں ہوتا تھا، افسوس کہ آج بھی بہت سے غیر مسلم قائدین کے یہاں یہ کیفیت موجود ہے، یاد آتا ہے کہ ایمرجنسی کے بعد جب الیکشن ہوا، جس میں جگ جیون رام اندرا جی کی پارٹی سے الگ ہو گئے اور اندرا جی کو شکست فاش ہوئی، الیکشن کی تمام تر معرکہ آرائیوں کے باوجود لکھنؤ کی پریس کانفرنس میں ایک شخص نے اندرا گاندھی پر کچھ رکیک ریمارک کیا، جگ جیون رام حالانکہ اس وقت اندرا جی کے مخالفین کے سرخیل تھے، لیکن انہوں نے اس ریمارک کا بُرا مانا اور کہا کہ اندرا جی ایک باعزت اور قابلِ احترام قائد ہیں اور انہوں نے ملک کی بہت کچھ خدمت کی ہے اور آج ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو اچھے دن دکھائے تو وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا، متکبرانہ نعرے اور تفاخر آمیز بیانات سے اسے ایک لذت سی آنے لگتی ہے، ہم لوگوں کا یہ حال زندگی کے ہر شعبہ میں ہو گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خدا سے بے خوفی کی وجہ سے ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ جب ہم اپنی کسی مہم میں کامیاب ہوں تو اس وقت خاص کر اپنی زبان اور اپنے کلام کو متکبرانہ دعووں سے اور بیانات سے محفوظ رکھیں۔

فاتحین کے لئے رسول اللہ کا تیسرا اسوہ شکست کھانے والوں کے ساتھ فراخ دلی اور سیر چشمی کا ہے، غزوۂ اُحد کے موقع سے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور روئے انور لہو

لہان ہو گیا، لیکن اس کے باوجود زبانِ مبارک پر اپنے دشمنوں کی جانب سے معذرت کے کلمات تھے، کہ یہ مقامِ نبوّت سے نا آشنا ہیں، اس لئے انہوں نے ایسی حرکت کی ہے، فتح مکہ کے موقعہ سے کیسے کیسے جانی دشمن سامنے کھڑے تھے، انہوں نے آپ کو کیسی کیسی تکلیفیں نہ پہنچائیں، کیا آپ کا بائیکاٹ نہیں کیا؟ ایک ایک دانہ کے لئے تڑپایا نہیں؟ بیٹی کو طلاق نہیں دلوائی؟ گلے میں پھندا نہیں ڈالا؟ عین صحن کعبہ میں پشتِ مبارک پر غلاظت نہیں ڈالی گئی؟ قتل کے منصوبے نہیں بنائے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی کو اجاڑنے کی کیسی کیسی کوششیں نہ کیں؟ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ زبان پر ایک حرفِ ملامت بھی نہیں ہے، نہ طعنہ و تشنیع ہے، نہ اہانت وتحقیر ہے، نہ شماتت ہے اور نہ اظہارِ عداوت، آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ تم سب آزاد ہو، تم پر کوئی گرفت اور مواخذہ نہیں، انتم الطلقاء، لا تثریب علیکم الیوم، عثمان بن طلحہؓ کے پاس کعبۃ اللہ کی کلید تھی، ہجرت سے پہلے ایک بار آپ ﷺ نے کعبہ میں داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کرنی چاہی تو انہوں نے بہت تمسخر آمیز انداز پر آپ ﷺ کی خواہش رد کر دی۔

آج آپ ﷺ نے انہیں سے کنجی لے کر کعبہ میں نماز ادا فرمائی، متعدد اکابر صحابہؓ اور خود آپ کے اہلِ خاندان چاہتے تھے کہ کعبہ کی کنجی انہیں حوالہ کی جائے، کیوں کہ کلید بردار کعبہ ہونا عربوں میں بہت شرف کی بات سمجھی جاتی تھی، لیکن آپ ﷺ نے کنجی پھر انہیں کو دوبارہ واپس کر دی اور فرمایا کہ آج حسنِ سلوک اور وفا شعاری کا دن ہے، الیوم بر وفـــاء، غزوۂ بدر میں اساطینِ کفر اسلام کے مقابلہ میں کھڑے تھے، رؤساءِ قریش قیدی بنائے گئے، ان کی عداوت ودشمنی دوپہر سے زیادہ روشن تھی، لیکن آپ ﷺ نے کس مروت اور رواداری کا معاملہ فرمایا، مہمان کی طرح رکھا اور نئے کپڑے پہنا کر اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ سلوک کافروں اور دینِ حق کے باغیوں کے ساتھ تھا اور آج ہمارا رویہ ایک کلمہ گو کے ساتھ بھی اس سے مختلف ہے، برادرانِ وطن ہمارے اس طور و طریق پر ہنستے ہیں اور ہماری شدّت پسندی اور اشتعال انگیزی کا مذاق اڑاتے ہیں۔

مفتوحین یعنی جو لوگ شکست سے دوچار ہوئے، ان کے لئے بھی حیاتِ نبویؐ میں

اسوہ موجود ہے، تکلیف دہ اوقات میں صبر وتحمل، اشتعال سے اجتناب اور توازن واعتدال کو قائم رکھنا شکست سے دو چار ہونے والوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہے، اکثر ردِ عمل میں انسان انصاف کی حدوں میں قائم نہیں رہ پاتا اور جس سے اختلاف ہو اس کے بارے میں سچ اور جھوٹ ہر طرح کی بات کہہ جاتا ہے، اس سے خوب اجتناب کی ضرورت ہے، ایسے لوگوں سے اللہ کی مدد روٹھ جاتی ہے اور انسان دنیا اور آخرت دونوں سے محروم ہو جاتا ہے، یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ جو کام منفی اساس پر کیا جاتا ہے اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے، جو کام مثبت بنیادوں پر ہوتا ہے اس میں بقا اور ارتقاء ہے، اس لئے ہمیشہ اپنی مہم کو مثبت سمت میں رکھنا چاہئے، مثبت طریقہ پر جو کام کیا جائے، اس کے اوپر اٹھنے میں کچھ وقت لگتا ہے، لیکن اس کی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں اور وہ کام دیر پا ہوتا ہے، جو تحریک منفی مقاصد کے تحت اٹھتی ہے وہ طوفان بن کر چھا جاتی ہے، لیکن طوفان کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور اس طرح ختم ہوتی ہے کہ اس کے نقوش راہ بھی زمین پر باقی نہیں رہتے، اس لئے ہمیشہ مثبت فکر کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔

شکست ہمیں ''خود احتسابی'' کی دعوت دیتی ہے، کہ ہم آپ اپنا احتساب کریں اور پوری دیانت داری اور جرأت کے ساتھ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو محسوس کر کے مستقبل کا منصوبہ طے کریں، اگر واقعی دیانت کے ساتھ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم حق اور سچائی پر ہیں، تو شکست سے مایوس نہ ہوں، شکست تو اللہ کے پیغمبروں اور اس کے مقبول بندوں کو بھی ہوئی ہے، بلکہ نئے عزم اور نئے حوصلوں کے ساتھ ہم دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں اور اشتعال سے بچتے ہوئے سنجیدہ طریقہ پر دوبارہ متحرک ہو جائیں اور اگر ہم ایمانداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ ہم ایک غلط بات کو اپنی کوششوں کا موضوع بنا رکھا ہے، تو پوری دیانت کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے رویہ میں تبدیلی لائیں، کہ غلطی کا اعتراف غلطی پر اصرار سے کہیں بہتر اور دین و دنیا دونوں کی فلاح کا ضامن ہے، جو لوگ حق و راستی پر رہتے ہوئے شکست کھائیں، ان کے لئے بھی صحیح راستہ رجوع الی اللہ ہی ہے، خدا کے سامنے جھکنا، اسی کے سامنے اپنا دردِ دل رکھنا، اس کے فیصلہ پر راضی رہنا اور

ہر بات کو من جانب اللہ تصور کرنا، یہ اصحابِ ایمان کا طریقہ ہے۔

عام مسلمان جو اپنے حق رائے دہی کے ذریعہ جیت اور ہار کا فیصلہ کرتے ہیں، ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ اب جب کہ معرکہ انتخاب گذر چکا ہے، اختلاف وانتشار کی فضا کو ختم کریں، اخوت اور بھائی چارگی کا ماحول پیدا کریں اور اختلاف کے باوجود اتحاد قائم رکھنے کا سبق سیکھیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی ایسے امیدوار کو ووٹ دیا ہو جو کامیاب ہوا ہے، تو اسے اپنی فتح سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ امیداوروں کی شکست و فتح تو ہوسکتی ہے، ووٹروں کی شکست و فتح نہیں ہوسکتی، اگر آپ نے کسی امیدوار کو دیانت داری کے ساتھ موزوں امیدوار سمجھ کر ووٹ دیا ہے، تو گو وہ شکست کھا جائے، پھر بھی آپ کی فتح ہے، کہ شرعاً آپ جس بات کے مکلّف تھے، آپ نے اسے پورا کردیا اور اگر آپ کا ووٹ فتح یاب امیدوار کے حق میں گیا، لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے، یا آپ نے کوئی مفاد حاصل کر کے ووٹ دیا اور گویا رشوت لے کر مستحق یا غیر مستحق شخص کے حق میں اپنے حق رائے دہی کو استعمال کیا تو امیدوار کے جیتنے کے باوجود آپ نے شکست کھائی ہے اور آپ نے پایا نہیں ہے بلکہ کھویا ہے، کیوں کہ آپ ایک فعل گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس کی کوتاہ کاریوں میں عند اللہ آپ شریک سمجھے جائیں گے، کتنی گھبرا دینے والی ہے یہ بات اور کتنا تشویش انگیز ہے الیکشن کا شرعی پہلو!! ایسے موقع کے لئے شاعر حقیقت ترجمان اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا
خواہ کیسا ہو وہ صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

(۱۵/۱/اکتوبر ۱۹۹۹ء)

قومی یکجہتی ــــــ کیوں اور کس طرح؟

یوں تو تمام انسانیت کی ابتداء حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے ہوئی ہے اور بنیادی طور پر تمام انسان ایک ہی خاندان اور کنبہ کے افراد ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی سماج کو ایک گلدستہ کی صورت میں وجود بخشا ہے، یہ وحدت میں کثرت کا خوبصورت مظہر ہے، انسان کالے بھی ہیں اور گورے بھی، خوبصورت بھی ہیں اور بدصورت بھی، ذہین وذکی اور ایسے کہ کائنات ان کے دستِ تسخیر سے اپنے آپ کو بچانے سے عاجز اور کمزور وناتواں ایسے کہ مریض ومعذور ہوں تو پانی کا ایک گلاس بھی نہ اٹھا سکیں، بعض ایسے تیز مزاج کہ آگ بھی ان کے سامنے پانی پانی ہو جائے اور بعض اتنے نرم خو کہ برف کی ٹھنڈک بھی ان پر نثار ہو، تہذیب وتمدن، زبان اور ذریعۂ اظہار کا فرق سب سے نمایاں، جو ہر سو دو سو کیلومیٹر پر تبدیل ہوتا رہتا ہے، چوں کہ انسان عقل وخرد کی نعمت سے سرفراز ہے، اس لئے ان کے درمیان فکر وعقیدہ کا اختلاف پایا جانا بھی فطری امر ہے، غرض انسان ایک گلدستہ ہے جس میں مختلف رنگ وبو اور ذائقہ کے پھول جمع ہیں۔

اگر کوئی انسان چاہے کہ تمام انسان اسی کے ہم رنگ ہو جائیں، جس طرح وہ سوچتا ہے، اسی طرح سب سوچے، اس کی پسند سب کی پسند ہو اور اس کی ناپسند سب کی ناپسند، تو انسانی سماج مختلف پھولوں کا گلدستہ نہ رہے گا، بلکہ سرسوں کا کھیت بن جائے گا کہ پورا کھیت زرد اور یک رنگ نظر آئے، اسی سوچ اور مزاج کے خلاف کی وجہ سے مختلف انسانی طبقات کے درمیان انتشار وافتراق پیدا ہوتا ہے، سماج میں زندگی گزارنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ سماج کے گلدستہ ہونے کی حیثیت کو تسلیم کرے یعنی وہ وحدت میں کثرت کو قبول کرتا ہو اور اختلاف کے باوجود اتحاد کا قائل ہو، یہی صورت سماج میں امن و

امان کے برقرار رہنے کی ضامن ہے اور اسی کا نام ’’قومی اتحاد‘‘ یا ’’قومی یکجہتی‘‘ ہے۔

دُنیا کا کوئی بھی خطہ ہو، اس کے لئے قومی یکجہتی انتہائی اہم ضرورت ہے، لیکن جو ملک جس قدر کثیر قومی اکائیوں پر مشتمل ہو، قومی اتحاد و یکجہتی اس کے لئے اسی قدر ضروری ہے، ہمارا ملک ہندوستان دُنیا کے ان ملکوں میں ہے جن میں بے شمار مذہبی، تہذیبی اور لسانی اکائیاں پائی جاتی ہیں، اس لئے قومی یکجہتی نہ صرف اس ملک میں امن وامان اور فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے، بلکہ ملک کی سلامتی اور اس کا بقاء بھی اس سے متعلق ہے، اس لئے ہمیشہ محبّ وطن اور مخلص رہنماؤں نے قومی یکجہتی اور اتحاد پر زور دیا ہے۔ کل ہی ۱۹/ نومبر کی تاریخ گزری ہے، ہمارے ملک میں اس دن کو ’’قومی یکجہتی‘‘ کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔

یکجہتی اس طرح تو ممکن نہیں کہ تمام انسانیت ہم رنگ ہو جائے، ان میں فکر و نظر، تہذیب و تمدن اور زبان و بیان کا کوئی فرق باقی نہ رہے، ایسی یکجہتی تو شاید قبرستان کے شہر خموشاں کے سوا کسی زندہ انسانی آبادی کے درمیان ممکن نہ ہو، یکجہتی ’’جیو اور جینے دو‘‘ کے اُصول پر ہی پیدا ہو سکتی ہے، اسلام جس کی تمام تعلیمات و احکام کا بنیادی مقصد ہی انسانیت کو امن و سلامتی سے ہمکنار کرنا ہے، اس نے قومی یکجہتی کے لئے ایک پورا نظامِ قانون عطا کیا ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا ہے۔

اسلام نے مخلوط سماج میں زندگی گزارنے کا جو تصور دیا اس کا پہلا اُصول ’’بقاءِ باہم‘‘ ہے، یعنی مختلف لوگوں کو اپنے اپنے مذہب اور تہذیب کے ساتھ زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا کہ دین کے معاملہ میں اِکراہ اور دباؤ کی گنجائش نہیں، گو مذہب حق ’’اسلام‘‘ ہی ہے اور اللہ کے نزدیک یہی دین مقبول ہے، لیکن دُنیا میں کسی کو کسی مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، ’’ لا اکراہ فی الدین ‘‘ (البقرہ:۲۵۶) جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اسی بنیاد پر آپ ﷺ نے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان باضابطہ تحریری معاہدہ کرایا اور نام بنام مدینہ کے تمام قبائل کا اس میں ذکر فرمایا، اس دستاویز میں ایک فقرہ اس طرح ہے، ’’یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک

گروہ ہیں، یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین۔''

کسی قوم کے لئے اس حق کو تسلیم کرنا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں، ان کے تمام مذہبی حقوق کا اقرار واعتراف ہے، یہ اس بات کو بھی شامل ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کا حق حاصل ہے، یہ مذہبی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ضمانت بھی ہے، مروان بن عبدالملک نے اپنے عہد میں دمشق کی جامع مسجد سے متصل چرچ کی چھوٹی سی زمین کو جامع دمشق میں شامل کر دیا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تخت خلافت پر بیٹھے اور عیسائیوں نے استغاثہ کیا، تو آپ نے مسجد کے اس حصہ کے منہدم کرنے کا حکم جاری فرمادیا، لیکن خود عیسائی حضرات نے اس کے عوض دوسری جگہ کا لینا قبول کرلیا، حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے موقعہ سے بعض راہبوں کی خواہش کے باوجود ایک چرچ میں نماز ادا کرنے سے گریز کیا، کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے مسلمان اس جگہ کو زبردستی مسجد بنانا چاہیں۔

اسی طرح نجی زندگی میں اپنے مذہبی قوانین پر چلنے کی گنجائش بھی مذہبی آزادی میں داخل ہے، اسلامی ملک میں غیر مسلم نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین میں اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں گے، کھانے، پینے میں بھی اسلام کا قانونِ حلال وحرام ان پر نافذ نہ ہوگا، شراب مسلمانوں پر حرام ہے، لیکن جن کے مذہب میں اس کی ممانعت نہیں، اس کے لئے شراب کی پابندی نہ ہوگی، خنزیر اور مردار اسلام میں حرام ہے، لیکن غیر مسلم اس کے کھانے اور خرید وفروخت کرنے میں آزاد ہوں گے۔

یہی حال تہذیبی اور لسانی اکائیوں کا ہے، ہر شخص اپنی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنے میں آزاد ہوگا، بشرطیکہ اس سے دوسری قوموں کو ایذاء نہ پہنچے، زبان کے بارے میں بھی اسلام بڑا فراخ دل مذہب ہے، اس کی نگاہ میں ہر زبان اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے، ہر قوم کی زبان میں اللہ کے پیغمبر آئے ہیں، اس طرح گویا بے شمار زبانیں ہیں، جن کو احکامِ خداوندی کے ترجمان بننے کا شرف حاصل ہے، کسی شخص کو اس کی زبان سے محروم نہیں کیا جاسکتا، فارس کا علاقہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں مسلمانوں کے ہاتھ آچکا تھا، اگر

مسلمان جبراً زبان کی تبدیلی کے فلسفہ پر یقین رکھتے ،تو یقیناً آج اس خطہ کی زبان عربی ہوتی ،لیکن آج تک اس خطہ کی زبان فارسی ہے،کم وبیش یہی بات وسط ایشیائی علاقوں اور ہندوستان کے مغرب کے علاقوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

دوسرا اہم اُصول جس کو اسلام نے سماجی اور سیاسی نظام میں برتا ہے، وہ ''مساوات وبرابری'' کا اصول ہے،قرآن نے صرف تقویٰ کوفضیلت کا معیار قرار دیا ہے، ''ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ''(الحجرات:۱۳)نسل ونسب،رنگ اورزبان فضیلت و شرافت کا معیار نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں، یہ تصور ذات پات کی بنیاد پر تفریق کی نفی کرتا ہے اور تفریق کی یہی آگ ہے جس نے ہزاروں سال سے ہمارے ملک میں انسانیت کو جھلسا رکھا ہے، اسلام میں خلافت کا تصور سیاسی اعتبار سے تمام انسانوں کے مساوی ہونے پر روشن دلیل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ناک کٹا حبشی غلام بھی تم پر امیر بنادیا جائے ،تو اس کی بھی پیروی کرو، معلوم ہوا کہ سماج کا ایک معمولی سے معمولی سطح کا آدمی بھی صلاحیت کے ذریعہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ حاصل کرسکتا ہے، اسلام کے امتیازی اوصاف میں سے یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہر شخص برابر ہے، اس میں دولت منداور غریب ، اونچی ذات نیچی ذات، حکمراں اور محکوم کا فرق نہیں، جس طرح رکشہ چلانے والے مزدور کو عدالت میں جواب دہی کرنی ہے، ٹھیک اسی طرح ایک سربراہِ ملک کو بھی ایوانِ عدل میں اپنے آپ کو ایک معمولی شخص کی حیثیت سے پیش کرنا ہے، مساوات و برابری کے اس تصور اور عمل کے بغیر مختلف قومی اکائیوں کا ایک دوسرے پر اعتماد کرنا، اس اعتماد کا باقی رہنا اور حقیقی معنوں میں قومی اتحاد کا وجود میں آنا ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف رائے کا پایا جانا اسی قدر یقینی ہے جتنا دن میں سورج کا وجود، اس اختلاف کے باوجود اتحاد کو باقی رکھنے کی صورت اس کے سوا نہیں ہوسکتی کہ ہم لوگوں کو اختلاف رائے کرنے کا، اپنی رائے کے اظہار کا اور احتجاج کا حق دیں،

احتجاج واختلاف کا جائز راستہ کھلا رکھا جائے، تب ہی اس کے ناجائز اور غیر قانونی راستے بند ہو سکتے ہیں، اسلام نے سماجی زندگی میں باہم مل جل کر رہنے کے جو اُصول مقرر کئے ہیں ان میں ایک اہم حق اظہارِ رائے اور تنقید واحتجاج کا حق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کی سیر چشمی کا حال یہ تھا کہ خود آپ ﷺ کے رفقاء انتظامی اُمور میں بعض اوقات آپ ﷺ سے اختلاف رائے کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، قرآن کی نگاہ میں ''منکر'' پر ٹوکنا ہر انسان کا فطری حق ہے، جس کو ''نہی عن المنکر'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ گویا شرافت کی حدوں میں رہتے ہوئے تنقید واحتجاج کے حق کا اعتراف واعلان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر قومی یکجہتی پیدا کرنی ہے، تو اس کے لئے انہیں اُصولوں کو اختیار کرنا ہوگا کہ ہر طبقہ اپنی طرح دوسروں کے لئے بھی اس حق کو تسلیم کرے کہ اسے اپنے مذہب، اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے سماجی تشخصات کے ساتھ جینے کا حق حاصل ہے، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش نہ کرے کہ اس سے گروہ واریت میں اضافہ ہوگا اور فاصلے بڑھتے جائیں گے، ہر قوم کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے، ذات پات، مذہب اور علاقہ کی بنیاد پر تفریق نہ برتی جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا، تو بجا طور پر کچھ لوگ احساسِ محرومی میں مبتلا ہوں گے اور جب ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے بارے میں یہ احساس رکھتا ہو کہ اس نے اس کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے تو یہ احساس یقیناً حقیقی اتحاد میں رکاوٹ بنے گا، قومی یکجہتی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر طبقہ بلکہ ہر شخص کو جائز تنقید کا موقع دیا جائے، جہاں جائز تنقید کا راستہ بند کیا جاتا ہے، وہاں تخریب کی راہیں کھلتی ہیں اور قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

موجودہ حالات میں ان لوگوں کو جو حقیقی معنوں میں محبِّ وطن ہیں، یہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہندوتوا، برہمن واد اور طاقت کے ذریعہ اختلاف کو کچلنے کا اندازِ فکر قومی یکجہتی کے لئے زہر ہلاہل ہے، قومی یکجہتی نفرت کا پتھر پھینک کر حاصل نہیں کی جاسکتی، اس کے لئے محبت اور پیار کے پھول برسانے ہوں گے۔

(۱۸ر نومبر ۱۹۹۸ء)

کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے!

روزنامہ ''منصف'' (۲۳/ جولائی) ''یو۔این۔آئی'' کے واسطہ سے ایک خبر شائع ہوئی ہے، اس خبر کے مطابق ''اتر پردیش میں الہ آباد کے ایک ایڈیشنل ضلع جج نے درجِ فہرست طبقہ سے تعلق رکھنے والے ایک جج سے جائزہ حاصل کرنے کے بعد اپنے اجلاس کی گنگا کے پانی سے دھلائی کی''، یہ ایک اہم خبر ہے، جس سے ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی پائی جانے والی ذہنی پستی اور تنگ نظری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، دل میں چبھنے اور ضمیر کو زخمی کرنے والی اتنی اہم خبر کو ذرائع ابلاغ نے ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور یہ ایک آئی گئی بات ہوگئی، نہ ملکی اور قومی اخبارات نے اس کو اپنے اداریہ کا موضوع بنایا، نہ اخبارات کی شہ سرخیوں میں اس نے جگہ پایا اور نہ قومی سطح کے سیاسی قائدین نے اس پر اظہارِ خیال کی ضرورت محسوس کی، نہ معلوم یہ بے التفاتی دانستہ ہے یا نادانستہ، کیوں کہ یہ ذرائع ابلاغ مسلمانوں کے بارے میں اس قدر ''چوکس'' اور ''حاضر دماغ'' ہیں کہ اگر معمولی سی بھی کوئی ایسی خبر آجائے جس سے مسلم سماج کی تصویر بگاڑی جاسکتی ہو، تو وہ میڈیا کے لئے دلچسپ موضوع بحث بن جاتا ہے، انگریزی اور ہندی اخبارات جلی عنوان اور شہ سرخیوں کے ساتھ ایسی خبروں کو شائع کرتے ہیں اور مرچ مصالحہ ڈال کر فرقہ پرست حلقہ کے لئے اس کو لذیذ اور ذائقہ دار بناتے ہیں اور واقعہ کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ گویا ہر مسلمان خاندان اس میں ملوث ہے، حقیقت یہ ہے کہ رائی کو پہاڑ بنانے اور پہاڑ کو رائی میں سمیٹنے کی مثال کوئی شخص دیکھنا چاہے تو صحافت کی ''افسانوی دنیا'' میں دیکھ سکتا ہے!

کسی ملک کی ترقی یہ نہیں ہے کہ وہ کتنے طاقتور اسلحہ رکھتا ہے اور انسان کو زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد تباہ و برباد کرنے کی کیسی صلاحیت سے مالا مال ہے کہ ہلاکت خیزی و تباہ کاری کی قوت تو درندوں میں انسان سے زیادہ ہے، اگر یہ قابل توصیف بات ہوتی تو لوگ

زلزلہ وطوفان کی تحسین وستائش کرتے اور شیر اور بھیڑیے کا خیر مقدم کرتے ، ملک وقوم کی اصل ترقی انسانی اقدار کے اعتبار سے اس کی بلندی وارتقاء میں ہے ، وہ سماج قابلِ تعریف ہے ، جو انسانی ضمیر رکھتا ہو ، جو محبت سے بھرپور دل رکھتا ہو ، جو انسان کے لئے کڑھنا اور دبے کچلے لوگوں کے لئے سسکنا جانتا ہو ، جو ہر انسان کو اپنے کنبہ کا ایک حصہ سمجھتا ہو ، جو قدر ومنزلت اور نجابت وشرافت کو رنگ ونسل میں ، خاندان وقبیلہ میں ، زبان وبیان میں اور جغرافیائی وعلاقائی تنگنائیوں میں تلاش نہ کرتا ہو ، بلکہ کردار واخلاق کی عظمت پر یقین رکھتا ہو ، جو اپنے جیسے انسانوں کے لئے عناد وحقارت کا شعلہ نہ ہو بلکہ محبت وپیار کی شبنم ہو ، جو سمومِ نفرت نہ پھیلاتا ہو ، بلکہ محبت کی بادِ نسیم بن کر انسانیت کو عطر بار کرتا ہو ، اگر کوئی سماج آدمیت ہی سے خالی ہو جائے ، وہ خون اور خون میں فرق کرنے لگے ، تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے ، ''مہذب انسانی سماج'' کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یوں تو دُنیا میں مختلف قومیں گزری ہیں ، جو انسان کی طبقاتی تقسیم پر یقین رکھتی تھیں ، ہٹلر کی ''نازی تحریک'' کو ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری جو پیدائشی طور پر کچھ لوگوں کی برتری اور حاکمیت کے استحقاق پر مبنی تھی اور اس نے دنیا میں جو ظلم وفساد برپا کیا ، وہ آج بھی ایک ضرب المثل ہے ، اس قسم کے تصورات اسلام سے پہلے عربوں ، ایرانیوں اور یونانیوں کے یہاں بھی پائے جاتے تھے ، لیکن کسی مذہبی اور قومی تعصب کے بغیر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انسانیت کی طبقاتی تقسیم کی جڑیں یہودی اور ہندو قوم میں جتنی گہری ہیں ، شاید ہی کہیں انسانوں اور انسانوں کے درمیان تفریق وامتیاز کا اتنا گہرا عقیدہ پایا جاتا ہو ، یہودیوں کے یہاں حکومت واقتدار بنی اسرائیل کا پیدائشی حق ہے ، ان کے عقیدہ کے مطابق وہ خدا کی نگاہ میں معزز اور محترم ہیں اور خدا کے کنبہ کا درجہ رکھتے ہیں اور باقی پوری انسانیت ان کی نسبت سے کمتر درجہ کی حامل ہے ، جن لوگوں نے بائبل کے عہد عتیق اور تالمود کا مطالعہ کیا ہو ، ان پر یقیناً یہ حقیقت کھلی کتاب کی طرح ظاہر ہے۔

ہندو مذہب کو انسان کی طبقاتی تقسیم کے باب میں یہودیت پر بھی سبقت حاصل ہے ، ہندو مذہب کے مطابق انسان پیدائشی طور پر چار گروہوں میں منقسم ہے : برہمن ،

چھتی، ویش اور شودر۔ برہما سے مراد خدا کی ذات ہے، اسی لئے برہمن کا لفظ ہی اس طبقہ کی خدا سے قربت کو بتلاتا ہے، برہمن بنیادی طور پر مذہبی نمائندہ ہوتا ہے، ''وید'' کی تعلیم حاصل کرنا اور نذر و نیاز کا لینا صرف برہمن کا حق ہے، برہمن پیدائشی طور پر مخلوق میں اعلیٰ درجہ کا حامل ہے، جو کچھ اس دنیا میں ہے اصل برہمن کا ہے، جن جرائم پر دوسرے لوگ سزائے موت کے مستحق ہیں، برہمن کا اس جرم میں سر مونڈا جا سکتا ہے، دس سال کا برہمن سو سال کے چھتری کے لئے بھی باپ کا درجہ رکھتا ہے، وہ ہر طبقہ کی عورت سے شادی کر سکتا ہے، کسی دوسرے طبقہ کا آدمی برہمن عورت سے نکاح نہیں کر سکتا، تاہم اگر براہمن کسی شودر عورت سے نکاح کرتا ہے تو گویا اپنے آپ کو نرک (جہنم) کا مستحق بناتا ہے، براہمن خواہ کتنا بھی برا عمل کرے وہ تعظیم و احترام کا مستحق ہے، چھتری کا کام دان دینا، چڑھاوے چڑھانا اور حفاظت و صیانت کا کام انجام دینا ہے، ویش تجارت و زراعت، مویشیوں کی پرورش کا کام کریں گے اور دان دیں گے، یہ سب گویا برہمن کی خدمت کے لئے ہیں۔

لیکن ان میں سب سے بدقسمت طبقہ ''شودروں'' کا ہے، یہ وید کی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، برہمن کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتے، ان کا سب سے اہم کام پورے اخلاص سے برہمنوں کی خدمت کرنا ہے، برہمن شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے، اگر وہ اپنے سے اُونچی ذات پر لکڑی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے اور غصہ میں لات مارے، تو پیر کاٹ ڈالا جائے، اگر شودر نے برہمن کو گالی دی، تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اور اگر شودر مدعی ہو کہ وہ برہمن کو تعلیم دے سکتا ہے، تو اس کو کھولتا ہوا تیل پلایا جائے، یہاں تک کہ کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوّے، الو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ وضاحت اور قوت و تاکید کے ساتھ انسانیت کو جو پیغام دیا، وہ دو بنیادی فکر و عقیدہ پر مشتمل ہے: ایک وحدتِ الٰہ، دوسرے وحدتِ انسانیت، انسانی وحدت کا تصور مساوات و برابری کی سب سے بڑی تعلیم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی عربی کو کسی عجمی اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، بلکہ تم میں سے سے زیادہ قابلِ احترام اللہ کی نگاہ میں وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ پر کاربند ہو'' ان

اکرمکم عند الله اتقکم ‘‘ آپ ﷺ نے نسلی امتیاز کی جڑ ہی کاٹ دی اور فرمایا تم سب ایک ہی آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، مٹی کی فطرت میں بچھنا اور آنے جانے والے کے لئے اپنے سینہ کو کشادہ رکھنا ہے، وہ امیر وغریب، خوبصورت وبد صورت اور حاکم ومحکوم کے ساتھ ایک معاملہ روا رکھتی ہے، اس طرح آپ ﷺ نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے تئیں تواضع اور تکریم کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

اسلام نے نہ مذہبی اعتبار سے تفریق وامتیاز کو روا رکھا ہے، نہ قانونی اور سیاسی اعتبار سے، اسلام نے مذہبی تعلیم کو کسی طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور نہ کسی طبقہ پر اس کا دروازہ بند کیا، بلکہ ہر مسلمان پر حصولِ علم کو یکساں طور سے فرض قرار دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا۔: ’’طلب العلم فریضة علی کل مسلم‘‘(......) نماز اسلام کا رکن اعظم ہے اور نماز کی امامت مسلمانوں کی مذہبی قیادت سے عبارت ہے، رسول اللہ ﷺ ہمیشہ خود امامت فرماتے رہے، آپ ﷺ کے بعد خلفاء اور گورنر امامت کرتے تھے، لیکن اس امامت کے لئے بھی آپ ﷺ نے کسی نسل ورنگ کی قید نہیں رکھی، بلکہ فرمایا کہ جو زیادہ بہتر طور پر قرآن پڑھ سکتا ہے وہ سب سے زیادہ امامت کا مستحق ہے، پھر وہ جو احکام شریعت سے سب سے زیادہ واقف ہو، اس کے بعد وہ جو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ محتاط اور متورع ہو، پھر وہ جس کی عمر زیادہ ہو، خاندان، حسب ونسب اور پیشہ کو کہیں بناءِ استحقاق نہیں بنایا گیا، تمام مسجدیں ہر مسلمان پر کھلی ہیں، پھر جو پہلے آئے وہ اگلی صف میں ہوگا اور جو بعد میں آئے وہ اپنے آنے کی ترتیب سے پیچھے کی صفوں میں، اگر ایک نو مسلم چمار کو قرآن زیادہ یاد ہو تو وہ امام ہوگا اور ایک قدیم سید مسلمان اس کا مقتدی، جہاں اس نو مسلم کے پاؤں ہوں گے وہاں سے قریب ہی اس سید زادہ کی پیشانی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک ناک کٹا ہوا حبشی بھی تم پر امیر ہو، تو اس کی بھی اطاعت کرو، معلوم ہوا کہ کوئی بھی مسلمان جس پر عام مسلمان اتفاق کرلیں، مسلمانوں کا امیر اور فرماں روا ہو سکتا ہے، حضرت زید بن حارثہؓ ایک غلام تھے اور عربوں میں غلام کی کوئی قیمت نہیں تھی، آپ ﷺ نے ان کو اور ان کے صاحبزادہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کو ایک ایسی فوج پر امیر بنایا، جس میں اکابر قریش ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے شریک تھے، حضرت عمرؓ فرمایا

کرتے تھے کہ اگر حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ زندہ رہتے تو وہ انہی کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرتے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی پہلو سے بھی اسلام نے کس درجہ مساوات اور برابری کا تصور دیا ہے، آپ ﷺ نے قانون کے اعتبار سے بھی سب کو ایک درجہ میں رکھا، یہ نہیں کہ ایک ہی فعل اسرائیلی کے لئے جائز ہو اور غیر اسرائیلی کے لئے ناجائز، ایک ہی جرم کی سزا عام لوگوں کے لئے قتل ہو تو برہمن کے لئے سر کا مونڈانا، ایک عرب خاتون نے چوری کی اور آپ ﷺ نے قرآن کی ہدایت کے مطابق ان کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر فرمائی، لوگوں نے سفارشیں کیں اور خود آپ ﷺ ہی کے پروردہ محبوب صحابی حضرت اسامہؓ کو ترجمان بنایا، آپ ﷺ اس بات پر بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ اگر اس خاتون کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتی، تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے، پچھلی قومیں اسی طرح ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے معمولی لوگوں پر سزائیں جاری کیں اور سماج کے معزز لوگوں کو سزا سے بری کر دیا، غرض اسلام نے ہر سطح پر انسانی مساوات و برابری اور اخوت و بھائی چارگی کا سبق انسانیت کو پڑھایا۔

مسلمان جب اس ملک میں ابر رحمت بن کر داخل ہوئے تو اس ملک کے باشیوں کے لئے ان کے ہاتھ میں سب سے بڑا تحفہ یہی ''انسانی وحدت'' کا پیغام تھا، وہ ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، رہتے سہتے اور کھاتے پیتے، نہ کوئی اعلیٰ تھا اور نہ کوئی ادنیٰ، نہ کوئی شودر تھا اور نہ کوئی نجس، نہ خاندانی اعتبار سے کوئی بڑا تھا اور نہ چھوٹا، ان کی عبادتیں مساوات کا مظہر تھیں، وہ ایک برتن میں ایک ساتھ کھایا کرتے تھے، چھوا چھوت کا کوئی تصور نہیں تھا، جو نئے لوگ مسلمان ہوتے وہ ان کے یہاں اتنے ہی معزز ہوتے جتنے پرانے مسلمان، اس مذہبی و سماجی مساوات و برابری نے ہندوستان کے دبے کچلے لوگوں میں حوصلہ و ہمت کے چراغ روشن کئے اور آہستہ آہستہ ہندوستان میں اس طبقاتی تقسیم کے خلاف آواز اٹھنے لگی، بھکتی تحریک اور مختلف تحریکیں جو طبقاتی تقسیم اور مورتی پوجا کے خلاف ہندوستان میں اٹھیں، وہ اس ملک میں خورشیدِ اسلام ہی کے طلوع ہونے کا اثر تھیں۔

منصف مزاج ہندو دانشوروں اور خود ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، نہرو جی لکھتے ہیں: ''اسلامی اخوت و مساوات نے ___ جس پر

مسلمانوں کا ایمان و عمل تھا ___ ہندوؤں کے ذہنوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور اس سے خاص طور پر وہ محروم لوگ زیادہ متاثر ہوئے ، جن پر ہندوستانی معاشرہ نے برابری اور انسانی حقوق سے استفادہ کا دروازہ بند کر رکھا تھا''۔ (ڈسکوری آف انڈیا: ۲۲۵) یہ بات بظاہر عجیب لگتی ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے ہندو سماج کی اصلاح کی کوششیں جاری ہیں ، بابائے قوم گاندھی جی ، راجہ رام موہن رائے ، ڈاکٹر امبیڈکر اور کتنی ہی برگزیدہ ہندو شخصیتوں نے اس کے لئے بے شمار کوششیں کیں ، آزادی کے بعد پسماندہ طبقات کے لئے تحفظات کی سہولت بھی فراہم کی گئی ، لیکن آج بھی صورتِ حال ''ہنوز روزِ اول'' کا مصداق ہے اور ایک ایسا شخص جو انصاف کی کرسی پر متمکن ہے اور مظلوموں کو انصاف کی فراہمی جس کا فریضۂ منصبی ہے ، وہ بھی اپنے ہم منصب دوسرے شخص کو محض اس لئے ذلیل و حقیر گردانتا ہے کہ وہ اس کے خیال کے مطابق نیچی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہندو قوم میں ذات پات کا مسئلہ محض ایک سماجی اور رواجی مسئلہ نہیں ، بلکہ ایک اعتقادی مسئلہ ہے ، طبقاتی تقسیم کا تصور ان کے عقیدہ کا جزو ہے ، رسم و رواج کی اصلاح نسبتاً آسان ہے اور سماجی برائیوں کو دور کرنا کم دشوار ہے ، لیکن جس تصور نے ایمان و عقیدہ کا درجہ حاصل کر لیا ہو اور جس کی جڑیں افکار و تصورات میں پیوست ہوں ، ان کو اکھاڑنا آسان نہیں ہوتا ، نہ اعلیٰ تعلیم اس کی اصلاح کر سکتی ہے اور نہ اُونچا سے اُونچا عہدہ ، قلب و ضمیر اور فکر و عقیدہ میں تبدیلی کے بغیر کوئی چیز نہیں ، جو اس برائی کی اصلاح کر سکے ، کاش ، مسلمان برادرانِ اسلام تک ایمان و عقیدہ کا یہ قیمتی اور انمول تحفہ پہنچا سکتے !! اور اس ملک سے محبت اور خیر خواہی رکھنے والے تعصب کا چشمہ اپنی نگاہوں سے اُتار کر اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کی نجات کا راستہ کہاں ہے اور جو نسخۂ کیمیا اس قومی مرض کے لئے مطلوب ہے ، وہ کس کے پاس ہے؟ ورنہ اگر اتنی اعلیٰ سطح پر چھوا چھوت کے اس تصور کے ساتھ پائی جانے والی دستوری جمہوریت ہی کا نام انصاف اور مساوات ہے تو بقولِ شخصے : کہتے ہیں مساوات اسی کو تو ستم ہے!

(۷/اگست ۱۹۹۸ء)

بوڑھے اور ہمارا سماج

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں نشو ونما کا ایک تدریجی نظام مقرر کیا ہے کہ ہر چیز جب پیدا ہوتی ہے اور وجود میں آتی ہے تو اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے ناقص اور ناتمام ہوتی ہے، چاند ایک باریک دائرہ کی صورت میں نکلتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا قالب نور کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے، سورج جب مشرق کی طرف اپنے رُخ سے نقاب الٹتا ہے تو اس کی کرنیں ہلکی بھی ہوتی ہیں اور پھیکی بھی بڑا سے بڑا درخت بھی جب زمین کے شکم سے باہر آتا ہے تو ایسے معمولی اور کمزور پودوں کی صورت میں کہ ہوا کا معمولی جھونکا اور پانی کی ہلکی سی لہر بھی اس کے لئے موت کا پیغام بن جاتی ہے، پھر یہی ناقص و ناتمام چیزیں اپنے شباب کو پہنچتی ہیں، اس کی صلاحیتیں جوان ہوتی ہیں اور اس کی طاقت اوجِ کمال پہ پہنچ جاتی ہے لیکن اس کمال کے بعد پھر انحطاط اور زوال شروع ہوتا ہے اور یہ انحطاط اسے موت اور فنا تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے، سورج رات کے پردہ میں چھپ جاتا ہے، چاند چند دنوں کے لئے افق سے غائب ہو جاتا ہے، درخت سوکھ اور مرجھا جاتے ہیں۔

قدرت نے یہی تدریجی نظام انسان کی زندگی میں بھی رکھا ہے، جب وہ ماں کے پیٹ سے اس لمبی چوڑی، ہنگامہ خیز اور پُرشور کائنات میں آتا ہے تو نہایت کمزور اور طاقت وقوت سے محروم بچہ کی صورت میں، نہ خود کھا سکتا ہے، نہ پی سکتا ہے، اگر خدا نے ماں باپ کے دل میں اس کے تئیں اتھاہ محبت نہ ڈال دی ہوتی تو اس کی پرورش شاید ممکن نہ ہوتی، پھر بچے بڑھتے ہیں، جسم میں نشو ونما کا عمل جاری رہتا ہے، عقل بیدار ہوتی ہے، شعور جاگتا ہے، اور انسان جوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے، جو ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا، آج اپنی تقریروں سے دلوں کو گرماتا ہے اور شعر وسخن کی بزم میں آراستہ کرتا ہے، جو اپنے پاؤں پر

کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا، آج کودتا اور دوڑتا پھرتا ہے اور طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے، کل جو ایک لقمہ اٹھا کر اپنے منہ میں رکھنے کی طاقت سے بھی محروم تھا، آج اس کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ سے ایک پورے خاندان کا گذر بسر وابستہ ہے اور اللہ نے اس کو ان کے رزق کا ذریعہ بنایا ہے، یہ جوانی کا زمانہ طاقت کے عروج اور صلاحیتوں کے کمال کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں آدمی کے لئے یہ سوچنا بھی دشوار ہوتا ہے کہ پھر کبھی کمزوری اس پر اپنا سایہ ڈال سکے گی، چلتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑائیں گے، بینائی اس کا ساتھ چھوڑ دے گی اور جسم کی ایک ایک صلاحیت دامن وفا چھوڑ کر رخصت ہوجائے گی، لیکن آخر ہوتا وہی ہے جس سے انسان بھاگنا چاہتا ہے، جوانی رخصت ہوتی ہے اور بڑھاپا اپنی پوری شان کے ساتھ سایہ فگن ہوجاتا ہے، اب آنکھوں پر موٹے چشمے ہیں، چہروں پر جھریاں ہیں، ہاتھوں میں عصا ہے، قدموں میں لرزہ ہے، حافظہ اور یادداشت نے بھی ساتھ چھوڑ رکھا ہے، منہ دانت سے خالی ہے اور آواز ایسی ہے کہ بازو کا آدمی بھی بات سمجھ نہیں پاتا ہے، اس منزل کے بعد قبر ہی کی منزل ہے، انسان بچپن میں بھی محتاج اور عجز و ناطاقتی کا نمونہ ہوتا ہے اور بڑھاپے میں بھی، لیکن بڑھاپے میں یقیناً مجبوری کا احساس زیادہ ستاتا ہوگا، جوانی کے ایک ایک قصے یاد آتے ہوں گے اور اشکِ افسوس سے داڑھی تر ہوتی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپے کا زمانہ انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ قابلِ رحم اور لائقِ ترس ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے بوڑھوں کی خصوصی رعایت اور ان کے احترام وتوقیر کا حکم دیا ہے، مغربی دنیا میں خاندانی نظام کے بکھر جانے کی وجہ سے بوڑھے اور ضعیف العمر لوگوں کے مسائل نے بڑی نازک صورتِ حال اختیار کرلی ہے، اسی لئے اب عالمی سطح پر اس مسئلہ کو محسوس کیا جارہا ہے، اقوام متحدہ کی طرف سے یکم اکتوبر کو ''بوڑھوں کے دن'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، لیکن اسے کافی نہ سمجھتے ہوئے ۱۹۹۹ء کے پورے سال کو ''بوڑھوں کا بین الاقوامی سال'' قرار دیا گیا ہے، ایک اندازہ کے مطابق اس وقت دنیا میں بوڑھے اور ضعیف لوگوں کی تعداد چالیس کروڑ کے قریب ہے اور توقع ہے کہ ۲۰۰۰ء تک یہ تعداد ساٹھ کروڑ سے بھی تجاوز کرجائے گی، ہندوستان میں اس وقت ساٹھ سال سے زیادہ

سن رسیدہ لوگوں کی تعداد چھ کروڑ سے بھی زیادہ ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ دو برس بعد یہ تعداد سات کروڑ انسٹھ لاکھ ہو جائے گی، بوڑھوں کی تعداد میں آزادی کے بعد سے ایک سو ستر فیصد اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ وسائل علاج میں بہتری بھی ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کی وجہ سے شرح پیدائش میں کمی بھی۔

آج بوڑھے اور ضعیف العمر افراد جن مشکلات سے دو چار ہیں، وہ دراصل مغربی نظامِ معاشرت کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ان ہی سے مشرق میں بھی یہ سماجی دشواریاں برآمد ہوئی ہیں، مشرق پر ہمیشہ سے مذہبیت کا غلبہ رہا ہے اور دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس میں والدین اور بزرگوں کی خدمت اور ان کے احترام وتوقیر کا سبق نہ پڑھا گیا ہو، اس لئے بزرگوں کی خدمت کا جذبہ اور ان کو بوجھ کے بجائے اپنے لئے رحمتِ خداوندی تصور کرنا مشرق کے مزاج میں رہا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ تم لوگوں کو ضعفاء اور کمزوروں ہی کی وجہ سے رزق دیجاتی ہے، ''اِنَّکُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِکُمْ''، یہ بڑی اہم بات ہے، آدمی ایسے بوڑھے اور معذور لوگوں کو اسی لئے تو بوجھ سمجھتا ہے کہ وہ صرف کھاتے ہیں، کچھ لاتے نہیں ہیں، ان کے پاس کھانے والے ہاتھ ہیں کمانے والے ہاتھ نہیں، آپ ﷺ نے اس تصور ہی کی جڑ کاٹ دیا اور فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ تم ان کو رزق فراہم کرتے ہو، بلکہ ان کی وجہ سے اللہ تم کو رزق عطا فرماتے ہیں، گویا وہ تمہارے محسن ہیں، نہ کہ تم ان کے اور وہ تم کو کھلاتے ہیں نہ کہ تم ان کو، اگر یہ بات دل میں اتر جائے تو لوگ ایسے بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو خدا کی بہت بڑی نعمت تصور کریں اور سایۂ رحمت سمجھیں۔

مغربی سماج کی بنیاد مادیت پر ہے اور مادیت پرستی ہمیشہ خود غرضی کو جنم دیتی ہے، اسی لئے خود غرضی مغربی معاشرہ کا ایک اہم اور بنیادی عنصر ہے، طلاق کی کثرت ان ممالک میں کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب میاں بیوی کا دل ایک دوسرے سے بھر گیا تو اب محبت کی ایک رمق بھی باقی نہیں رہی، زنا کی کثرت کیوں ہے؟ اسی لئے کہ مرد و عورت کا تعلق محبت کے بجائے وقتی اغراض اور ہوس پر مبنی ہے، سود نے کاروبار میں غلبہ

کیوں پایا ہے؟ اسی لئے کہ سرمایہ دار کو غریبوں کی پریشان حالی سے کوئی غرض نہیں، اس کو صرف اپنا بے خطر سود عزیز ہے، منشیات کی وباء کیوں عام ہے؟ اسی لئے کہ خود تو دو لمحوں کا سکون حاصل ہو جائے، چاہے یہ عیاشی اس کے متعلقین کے لئے کسی قدر بھی سامانِ مصیبت ثابت ہو، غرض ہر شعبہ زندگی کی روح یہی ہے، ایسے سماج میں اگر بوڑھے گھر سے نکال دیئے جائیں، ان کو ہاسٹل میں رکھا جائے، جہاں اپنے بچوں کو دیکھنے کے لئے دل تڑپتا ہو اور نگاہیں ترستی ہوں اور گھڑی دو گھڑی کی ملاقات کے لئے کرسمس کا انتظار کرنا پڑتا ہو، تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے، مغربی تہذیب کی بادِ سموم کو مشرق کے لوگوں نے بادِ نسیم سمجھا اور ایک نعمتِ عظمیٰ کی طرح ان کا استقبال کیا، تو جو بگاڑ اس نے اپنی جگہ پیدا کیا ہے، یہاں بھی ان کا ظہور میں آنا چندا عجیب نہیں، چنانچہ اب ہندوستان میں بھی ایسے لوگوں کے لئے ہاسٹل بنے ہیں اور خود ہمارے شہر حیدرآباد کے مضافات میں اس طرح کے ہاسٹل بن چکے ہیں۔

اسلام میں بوڑھوں کے لیے بڑی رعایت بھی ہے اور قدر و منزلت بھی، قدم قدم پر ان کے لئے احکام میں سہولتیں برتی گئی ہیں، نماز میں قیام یعنی کھڑا ہونا فرض ہے، کھڑی ہوئی حالت میں جھک کر رکوع کرنا اور بیٹھی ہوئی حالت میں سجدہ کرنا بھی فرض ہے۔

لیکن جو لوگ بڑھاپے اور ضعف کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکیں، وہ بیٹھ کر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں اور اشارہ سے بھی رکوع و سجدہ کیا جا سکتا ہے، ایسے ضعیف اور سن رسیدہ لوگوں کے لئے گنجائش ہے کہ روزہ رکھنے کے بجائے فدیہ ادا کریں، بڑھاپے کی وجہ سے سفر کی قدرت نہ ہو تو کسی اور شخص سے حج بدل کرانے کی گنجائش ہے، فریضۂ جہاد ایسے شخص سے معاف ہے۔

ایسے لوگوں کی کفالت شرعاً واجب ہے، اگر ماں باپ کا معاملہ ہو تو گو ان میں کمانے اور کسبِ معاش کرنے کی صلاحیت ہو پھر بھی ان کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ بال بچوں پر ان کی ضروریات کی تکمیل ضروری ہے، دوسرے اقارب کا حکم ذرا مختلف ہے، اگر کوئی شخص بڑھاپے کی وجہ سے کسبِ معاش کی طاقت نہیں رکھتا اور وہ لاولد ہو تو قریب

ترین رشتہ دار پر اس کی ضروریات پوری کرنا واجب ہے اور اگر وہ خود اس کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر دوسروں پر اس کی ذمہ داری نہیں۔ (دیکھئے رد المحتار: ۵/۵۵۔۳۵۲ ودیگر کتب فقہ)

بڑھاپے کی نفسیات کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس عمر میں انسان چاہتا ہے کہ اس کے چھوٹے اس کے ساتھ عزت وتوقیر کا معاملہ کریں، اس کو سماج میں بہتر مقام دیا جائے آپ ﷺ نے اس کا بھی پاس ولحاظ فرمایا ہے، ایک سن رسیدہ شخص آپ ﷺ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے، لوگوں نے جگہ دینے میں دیر کی، تو آپ ﷺ نے تنبیہ کی اور فرمایا کہ جو شخص چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، **لیس منا من لم یرحم صغیرنا و یؤقر کبیرنا** (ترمذی، باب ماجاء فی رحمة الصبیان) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک روایت میں ہے کہ جو بڑوں کا مقام نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں، (حوالہ سابق) انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو نوجوان کسی بوڑھے شخص کی اس کی عمر کی رعایت کرتے ہوئے تعظیم کرے گا تو جب وہ نوجوان اس عمر کو پہنچے گا تو اللہ اس کے لئے بھی ویسا ہی تعظیم کرنے والا مہیا کردیں گے۔ **ما اکرم شاب شیخا لسنه الاقیض الله له من یکرمه عند سنه۔**

(ترمذی، باب ماجاء فی اجلال الکبیر)

بزرگوں کی تعظیم اور اکرام کے عمومی احکام تو آپ ﷺ نے دیئے ہی، مختلف خصوصی مواقع پر اس احترام کو برتنے کا بھی حکم دیا، آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ جب کئی لوگ ہوں اور ان کو اپنی بات پیش کرنی ہو تو بڑے کو گفتگو اور نمائندگی کا موقع دینا چاہئے۔ "**کبر الکبیر**" (مسلم: ۲/۵۵) اسی طرح اگر دو اشخاص علم، قرأت اور دروع وتقویٰ کے اعتبار سے برابر ہوں تو جوان میں عمر دراز ہو اس کو حق امامت میں اولیت حاصل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دو رفقاء کو رخصت کرتے ہوئے اس کی نصیحت فرمائی، **ولیؤمکما اکبرکماسنا** (بخاری ومسلم) اسی طرح فقہاء لکھتے ہیں کہ سلام کرنے میں بھی چاہئے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرنے میں سبقت کرے۔ (ہندیہ: ۵/۳۲۵)

ادب واحترام کا کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں، بلکہ مواقع اور حالات کے لحاظ

سے تکریم واحترام مطلوب ہے؛ کوئی بوڑھا شخص جارہا ہو، بوجھل سامان اُن کے ہاتھ میں ہو، آپ نوجوان ہیں، آپ کا اخلاقی فرض ہے کہ آپ ان کا تھیلا اپنے کاندھوں پراٹھالیں اور منزل تک پہنچادیں، آپ بس یا ٹرین میں سفر کررہے ہوں، آپ کو سیٹ مل چکی ہو، لیکن ایک بوڑھا، ضعیف شخص کھڑا ہوا ہے، ایسے موقع پر احترام یہ ہے کہ آپ خود اٹھ کران کو جگہ دے دیں، اگر آپ ان کو نہیں پہچانتے تو نانا، چچا کہہ کران کو مخاطب کریں، غرض، موقع ومحل کے اعتبار سے ان کی خدمت اور توقیر کو ملحوظ رکھیں اور رسول اللہ کی وہ حدیث آپ کے سامنے ہو کہ اگر آج آپ کسی بوڑھے شخص کا پاس ولحاظ کریں گے تو کل جب آپ عمر کی اس منزل کو پہنچیں گے تو دوسرے یہی برتاؤ آپ کے ساتھ کریں گے اور اگر آج آپ نے کسی بوڑھے ضعیف شخص کا مذاق اڑایا، اس کا تمسخر کیا، بے احترامی اور بے توقیری کی، مدد اور تعاون کا ہاتھ نہیں بڑھایا، تو کل یہی سلوک آپ کے ساتھ کیا جائے گا، کہ یہ ''اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے'' کا معاملہ ہے!

(۲۱ر مئی ر ۱۹۹۹ء)

جرائم ـــــ مرض اور علاج

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں دو چیزیں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں: ایک گرانی اور دوسرے جرائم، حد یہ ہے کہ جو لوگ نفرت کی آگ لگانے اور شعلہ بھڑکانے میں قیادت کے منصب پر فائز ہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ان کا خصوصی سایۂ عاطفت حاصل ہے، ان کا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے، چنانچہ بی، جے، پی قائد اور ملک کے وزیر داخلہ نے پچھلے دنوں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان پر سخت تشویش ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنی اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ جبری عصمت ریزی کے مجرم کو پھانسی کی سزا دی جانی چاہئے، اسکولوں اور مخلوط تعلیم گاہوں میں لڑکیوں کے ساتھ زیادتی کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پس منظر میں دہلی کی بی، جے، پی گورنمنٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسکرٹ کے بجائے یونیفارم میں شرٹ، شلوار اور دوپٹہ کو لازم قرار دیا جانا چاہئے، دراصل گزشتہ چند سالوں سے ملک اور ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جرائم کے اعداد و شمار کی جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں، اس نے ہر شخص کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کس طرح جرائم کی روک تھام کی جائے؟ اور ان حضرات نے اس روک تھام کے لئے جن تدابیر کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل اسلام کے تصورِ جرم و سزا اور طریقۂ اصلاح کا خاموش اعتراف ہے!

پیغمبر اسلام ﷺ جس سماج میں پیدا ہوئے، وہ نہایت جرائم پیشہ سماج تھا، چوری، ڈاکہ زنی، قتل ناحق، دختر کشی، اخلاقی اور سماجی برائیاں، کون سے جرائم تھے جو وہاں بکثرت نہ ہوتے تھے؟ شراب جو تمام برائیوں کی جڑ ہے، وہ لوگوں کے گھٹی میں پڑی تھی، زمانۂ جاہلیت میں شراب کے قریب سو نام ملتے ہیں، جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کم سے کم سو قسم کی شراب اس زمانہ میں پائی جاتی تھی، قتل و غارت گری اور ڈاکہ زنی کا حال یہ تھا کہ لوگ قافلہ کے بغیر تنہا

ایک دو آدمی سفر کے لئے نہیں نکلتے تھے کہ اس کے بغیر بہ سلامت واپس آنے کی امید ہی نہیں رہتی تھی، بدکاری کا حال یہ تھا کہ لوگ اس بات کو بھی درست سمجھتے تھے کہ اچھی نسل حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کو دوسرے مرد کے پاس بھیجا جائے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک عورت سے کئی مرد ہم آغوش ہوتے اور جب بچہ ہوتا تو قیافہ شناس سے نسب کی شناخت کرواتے، اس کو ''نکاح رھط'' کہا جاتا تھا، (بخاری: ۲/۷۶۹) بے حیائی اور فحاشی اس عروج پر تھی کہ لوگ اپنی بدکرداریوں کو لکھ کر غلافِ کعبہ سے آویزاں کر دیتے تھے اور بے تکلف اپنے اشعار میں اس کا ذکر کرتے تھے، جنگ وجدال تو گویا ان کی طبیعتِ ثانیہ تھی اور معمولی واقعات پر مدتوں بلکہ نسلوں معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔

ان حالات میں رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے جرم وگناہ کے اس جنگل کو صدق وصفا اور محبت ووفا کی بستی بنا دیا، آپ ﷺ نے اس کے لئے تین طریقے اختیار کئے: اول دلوں کا تزکیہ اور لوگوں کی فکر اور سوچ میں انقلاب، دوسرے ان اسباب ومحرکات کا سد باب جو جرم میں معاون ہوتے ہیں، تیسرے سنگین جرائم پر سخت سزائیں، یہی طریق کار تھا جس نے جرائم کے خوگر عرب سماج کی حالت بدلی اور انسانیت کے قاتلوں کو انسانیت کا محافظ اور نگہبان بنا کر کھڑا کیا۔

آپ ﷺ نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ دلوں کی دنیا میں انقلاب لایا جائے، دل میں خدا کا ایسا خوف بٹھایا جائے اور آخرت کی جواب دہی کا ایسا احساس جاگزیں کیا جائے کہ انسان جیتے جی موت کے بعد کی زندگی کو دیکھنے لگے، آخرت سے پہلے ہی آخرت اس کے سامنے آجائے، وہ محسوس کرلے کہ گویا وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے، یہی انقلاب تھا جس کے نتیجہ میں صحابہ معمولی معمولی گناہوں پر تڑپ اٹھتے تھے اور بے چین ہو جاتے تھے۔

کتبِ احادیث میں ایک صحابی حضرت ماعز اسلمیؓ اور ایک صحابیہ حضرت غامدیہؓ کا ذکر آتا ہے، از راہِ بشریت ان سے برائی کا صدور ہوگیا، ان کی غلطی کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ اس پر کسی زبان نے ٹوکا، نہ کسی مدعی نے ان کے خلاف بارگاہِ نبوی ﷺ میں دعویٰ کیا، لیکن احساسِ گناہ نے ان کے زندہ اور صاحب ایمان ضمیر کو ایسا تڑپا دیا کہ از خود دربارِ نبوی ﷺ میں

حاضر ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس جرم کی سزا نہایت ہی سخت اور عبرت انگیز ہے، اعتراف جرم فرمایا، یہ احساس اتنا شدید تھا کہ یہ بھی نہیں فرمایا کہ مجھ سے فلاں برائی ہوئی ہے بلکہ عرض کیا :''انی هلكت يا رسول الله !''،''اللہ کے رسول! میں تو لٹ گیا، میں ہلاک و برباد ہو گیا''، گویا کسی گناہ کے صدور کو وہ اپنے لئے سب سے بڑی ہلاکت اور بربادی کی بات سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے بار بار چہرہ پھیرا اور ایسا عنوان اختیار فرمایا کہ ان کو اپنے اعتراف کی تعبیر و توجیہ اور انکار کا موقع میسر آ جائے، لیکن وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ مجھے پاک فرما دیجئے، یہاں تک کہ ان پر شرعی حد نافذ فرمائی، یہی وجہ تھی کہ پورے عہد نبوت میں ایسے جرائم جن پر حد شرعی مقرر ہے، کے صرف چھ سات واقعات ملتے ہیں۔

انسانی ضمیر کو بیدار کرنے اور جرم کی شناعت کو ذہن میں بیٹھانے کے لئے آپ ﷺ لوگوں کی نفسیات کے مطابق ان کی تفہیم فرمایا کرتے تھے، ایک صاحب نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ وہ اور گناہوں سے تو باز آ سکتے ہیں، لیکن زنا سے باز نہیں آ سکتے، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ اگر کوئی تمہاری ماں سے بدکاری کرے تو کیا تم اس کو پسند کرو گے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا، آپ ﷺ اسی طرح بہن، بیوی، بیٹی کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور وہ کہتے گئے کہ میں ایسا بالکل پسند نہیں کروں گا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم جس عورت کے ساتھ بدکاری کرو گے وہ بھی تو کسی کی ماں، بیوی، بہن یا بیٹی ہوگی، ان کی سمجھ میں بات آ گئی اور وہ تائب ہو گئے، ایک دفعہ فرمایا کہ جب کسی اجنبی عورت پر نگاہ پڑ جائے اور طبیعت کا میلان ہو جائے تو اپنے گھر جاؤ، اس لئے کہ تمہاری بیوی بھی تمہاری خواہش کی تکمیل کا وہی سامان رکھتی ہے جو وہ عورت۔

عام طور پر مجرمانہ واقعات مال و زر کے حصول کے لئے پیش آتے ہیں، مال کی بے وقعتی اور دنیا کی بے ثباتی آپ ﷺ نے لوگوں کے ذہن میں اس درجہ بٹھا دی تھی کہ وہ دوسروں کا مال لینے سے خوب اجتناب کرتے تھے، جب کبھی آپ ﷺ ایسی جگہ تشریف لے جاتے جہاں آسائش اور آرائش کے اسباب نظر آتے اور عیش و مستی کا سروسامان ہوتا، تو فرماتے کہ عیش تو آخرت ہی کا عیش ہے، جو بے پناہ اور لافانی ہے''لا عيش الا عيش الآخرة''۔

اس طرح آپ ﷺ اپنے رفقاء کو تعلیم دیتے کہ جب اسبابِ دنیا پر دل رکھنے اور طبیعت مچلنے لگے تو آخرت کے سامانِ عیش کو یاد کرلیں، اس سے نفس کی حرص وطمع کا علاج ہوجائے گا۔

ایک صاحب کا مقدمہ خدمتِ اقدس ﷺ میں آیا، گواہان نہیں تھے، اس لئے فریقین کا بیان سن کر آپ ؐ نے ایک کے حق میں فیصلہ فرمایا، پھر فرمایا کہ ممکن ہے کہ میں نے تمہاری چرب زبانی سے متاثر ہوکر تمہارے حق میں فیصلہ کردیا ہو، حالاں کہ فی الحقیقت وہ زمین تمہاری نہ ہو، تو اگر ایسا ہو، تو یہ تمہارے حق میں زمین کا نہیں بلکہ جہنم کا ٹکڑا ہے، آپ ﷺ کی یہ بات سنی تھی کہ وہ صاحب زمین سے دستبردار ہوگئے اور دوسرے فریق نے بھی قبول کرنے سے انکار کردیا، بالآخر آپ ﷺ نے وہ زمین دونوں میں نصف نصف تقسیم فرمائی، اس لئے جب تک دل کی دنیا نہ بدلے اور بنیادی فکر اور سوچ میں انقلاب نہ آئے، سماج کو جرائم سے پاک کرنا ممکن نہیں۔

دوسرے آپ ﷺ نے ان راستوں کو بند کیا جو آدمی کو گناہ تک لے جاتے ہیں، مثلاً اسلام میں زنا حرام ہے، تو شریعت نے اس جرم کو روکنے کے لئے ممکنہ تدبیریں بھی اختیار کی ہیں پردہ کا نظام قائم کیا گیا، غیر محرم خواتین کے ساتھ تنہائی کو منع فرمایا گیا، مخلوط تعلیم اور عبادت کی ممانعت کی گئی، شراب اور نشہ جو ایسی برائیوں کا سب سے بڑا محرک ہے، اس کو سنگین جرم قرار دیا گیا، نکاح کی حوصلہ افزائی کی گئی، نکاح میں تاخیر اور تجرد کی زندگی کو آپ ﷺ نے ناپسند فرمایا، فحش لٹریچر اور پوسٹرس کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، غرض وہ تمام راہیں بند کردی گئیں جو انسان کو اس گناہ تک لے جاتی ہوں، اس کے ساتھ جب زنا کو حرام قرار دیا گیا تو نہ جرم سے بچنا لوگوں کو دشوار ہوا اور نہ جرم سے روکنے کے لئے کوئی مہم جوئی کرنی پڑی۔

یہی حال شراب کا ہے، آپ ﷺ نے نہ صرف شراب پینے کو حرام قرار دیا بلکہ شراب کی خرید وفروخت اور اس کی صنعت، نیز اس کے حمل ونقل کو بھی، اس طرح شراب کا حاصل کرنا ہی کارِ دشوار ہوگیا، اگر ایسا ماحول پیدا کردیا جائے تو جو لوگ منشیات کا رجحان رکھتے ہیں، پہلے مجبوراً منشیات سے باز آئیں گے اور پھر یہی ان کی عادت ہوجائے گی۔

جرم کو روکنے کے لئے تیسرا طریقہ قانون کا ہے، بعض انسانی طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ

آپ کتنی ہی محبت کی زبان استعمال کرلیں اور نصح و ہمدردی کے ساتھ دل کے بند دروازوں پر دستک دیں، لیکن قانون کی تلوار کے سوا کوئی چیز ان کو سرخمیدہ نہیں کر پاتی، ایسے لوگوں کے لئے سخت قانون بھی ایک ضرورت ہے، اس وقت ایک رجحان یہ پیدا ہوگیا ہے کہ مجرم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رحم دلی اور عفو درگزر سے کام لیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، ثبوتِ جرم کے قانون کو سخت اور سزا کے قانون کو ہلکا بنایا جائے، گویا مجرم کو دوہرا فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسلام کا تصورِ جرم وسزا یہ ہے کہ ثبوت جرم کے لئے تو مناسب شواہد کا فراہم ہونا ضروری ہے، تا کہ بے قصور قصوروار نہ ٹھہرے اور کسی کو جرمِ بے گناہی کی سزا ملنے نہ پائے، لیکن جب جرم ثابت ہوجائے تو سزا عبرتناک ہو اور سزا کے نفاذ میں نرم روی اختیار نہ کی جائے، اِلّا یہ کہ جرم کا تعلق کسی خاص انسان کے حق سے ہو اور وہ خود مجرم کو بخوشی معاف کردے، سزاؤں کے سخت ہونے کا فائدہ ماحول کی تطہیر اور عبرت انگیزی ہے، سزائیں اگر سخت نہ ہوں، تو اس سے مجرم کو شہ ملتی ہے اور جرائم پسند طبیعتوں کا حوصلہ بڑھتا ہے، آج کل بڑے بڑے جرائم پر چند ہزار کے جرمانے عائد کئے جاتے ہیں، چند ماہ یا سال سزائے قید ہوتی ہے، یہ جرائم کو روکنے اور مجرمین کے حوصلے پست کرنے کے لئے بالکل ناکافی اور غیر تشفی بخش ہیں، یہی وجہ ہے کہ مجرم سزا پانے کے بعد جرم سے بچنے کے بجائے اور بھی مہارت کے ساتھ جرم کا ارتکاب کرتا ہے، پولیس اسٹیشنوں میں ایک مجرم پر بیسیوں بار مقدمات دائر ہوتے ہیں اور وہ تھانہ اور جیل کو ''مہمان خانہ'' باور کرنے لگتا ہے۔

سزاؤں کے نفاذ میں سختی کی وجہ سے ردِعمل کے طور پر پیدا ہونے والے جرائم کا سد باب ہوتا ہے، کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی ہوئی ہو اور مجرم کو کما حقہ سزا مل جائے، تو مظلوم کی تشفی ہوجاتی ہے اور آتش انتقام بجھ جاتی ہے، اگر اسے یہ احساس ہو کہ ان کے مجرم کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا اور اسے اس کے جرم کی نسبت سے سزا نہیں مل پائی تو اندر ہی اندر شعلۂ انتقام بھڑکتا اور موقع کی تاک میں رہتا ہے اور جب بھی کوئی موقعہ ہاتھ آجائے وہ جوابی وار کئے بغیر نہیں رہتا، اس طرح سماج میں جرائم کو پنپنے کا موقعہ ملتا ہے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا خیال جڑ پکڑتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ قصاص یعنی مقتول کے بدلہ قاتل کو قتل کرنے میں

تمہارے لئے زندگی اور حیات مضمر ہے" ولکم فی القصاص حیوٰۃ "۔ (البقرۃ:۱۷۹)

یہ حقیقت تجربات کی کسوٹی پر پرکھی ہوئی اور مہر امروز سے بھی زیادہ روشن ہے کہ اگر انسان کو جرائم سے پاک، محفوظ اور پرسکون سماج مطلوب ہو، تو اسے ماضی کی طرف لوٹنا ہوگا اور اسی سماج اور سماج کے طریقۂ اصلاح کو اپنے لئے اسوہ ونمونہ بنانا پڑے گا، جسے صحراءِ عرب کے بدوؤں پر پیغمبر اسلام محمد عربی ﷺ نے اختیار کیا تھا، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ لوگوں کے مردہ ضمیر کو زندہ کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی نہیں کی جارہی ہے، حکومت کی انتظامی مشنری جس کی تربیت اور ذہن سازی سرکار کا فریضہ ہے، وہ سرتک کرپشن میں ڈوبی ہوئی ہے اور ظلم وجور اور بداخلاقی کا اعلیٰ نمونہ ہے، جرائم کے اسباب وعوامل پر تو کیا روک لگے گی، ایسے راستے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جارہے ہیں جو نوجوانوں کو جرم پر اکسائیں اور تشدد کے طریقے بتائیں، بد اخلاقی سکھانے اور مجرم بنانے کے لئے فلمیں ہی کیا کم تھیں کہ ٹی وی کا سیل رواں بھی گھر گھر داخل ہوا، پھر اسٹار ٹی وی کی لعنت آئی جو لوگوں کو دُنیا کے کونے کونے میں پائے جانے والے مجرمانہ طریقے اور حیا سوزی کے نت نئے انداز سے روشناس کراتی ہے، سنا ہے کہ انٹرنیٹ کا جادو اور اس کا مفسدانہ استعمال ان فتنوں سے بھی ماسوا ہے، پرنٹ میڈیا میں جو اخلاق سوز مواد آرہا ہے، وہ اس کے علاوہ ہے، اب تو جرائم کی زندہ کہانیاں بھی چھپ رہی ہیں اور منہ مانگے دام بک رہی ہیں، تا کہ لوگ جرائم و بداخلاقی کے نت نئے انداز سیکھ لیں اور حسب "توفیق" ان کا تجربہ کریں۔

تو کیا جرائم کی اتنی اثر انگیز اور وسیع الاثر تعلیم، نیز ان کے لئے ممکنہ اسباب ووسائل کی فراہمی کے باوجود پرامن اور جرائم سے محفوظ سماج کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے اور کیا رات کی تہہ در تہہ تاریکی میں سورج کی کرنیں ہاتھ آسکتی ہیں؟؟

(۲۱/اگست ۱۹۹۸ء)

گناہ جو کبھی معاف نہیں ہوگا

اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک اور کفر ہے، اس کی سزا ہمیشہ کے لئے دوزخ ہے، جو شخص کفر کی حالت میں دنیا سے چلا جائے، اس پر جنت کے دروازے بند ہیں، اور ہمیشہ کے لئے دوزخ آتشیں آغوش اس کی رفیق رہے گی، کفر کے بعد ایک ہی عمل ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اس کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہوتا رہے گا، اور اللہ کی لعنت برستی رہے گی، کتنا گھبرا دینے اور تڑپا دینے والا ہے یہ ارشادِ ربانی:

"وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ، خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا" (النساء:۹۳)

جو جان بوجھ کر کسی مسلمان کو قتل کرے اس کا بدلہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہو، اور اللہ نے اس کے لئے بھیانک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

کتنی لرزہ براندام کر دینے والی ہے یہ آیت! ____ لیکن اس شخص کے لئے جس کے دل میں خوفِ خداوندی کا کوئی گوشہ موجود ہو، جس کی آنکھ کبھی کبھی سہی، اللہ کے خوف سے نم ہونا جانتی ہو، جس کا دل آخرت کے تصور سے مولول لمحہ دو لمحہ سہی لرزنے سے آشنا ہو، جو آخرت کے وسعتوں پر یقین رکھتا ہو، جسے جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی ہولناکیوں پر ایمان ہو، اور جس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہو، جن سینوں میں دل کے بجائے پتھر کی سل رکھی ہوئی ہو اور جن قلوب میں محبت کی شبنم جگہ پانے کی بجائے نفرت اور ظلم و جور کی بھٹیاں سلگتی ہوں ان کے بارے میں کیوں کر سوچا جا سکتا ہے، کہ خالقِ کائنات کا یہ ارشاد

بھی ان کو تڑپا سکے گا؟ خدا اور رسول کی بات بھی ان کے دلوں پر دستک دے سکے گی؟؟

آہ! کس قلم سے لکھا جائے اور کس زبان سے بولا جائے کہ ہمارے شہر میں ابھی چند دنوں قبل ایک مسلمان کا بے دردانہ قتل ہوا ہے، کن کے ہاتھوں؟ کیا کسی غیر مسلم کے ہاتھ؟ کیا کسی دشمن اسلام کے ذریعہ؟؟ نہیں، حیرت کے کانوں سے سنئے، کہ ایک کلمہ گو نے دوسرے کلمہ گو کو ناحق قتل کیا ہے، ایک مسلمان کی تشنہ تلوار نے ایک مسلمان ہی کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی ہے، سستے داموں خدا کا غضب خرید کیا ہے، اپنے گلے کو لعنتِ خداوندی کے طوق سے آراستہ کیا ہے، اور ابدی دوزخ حاصل کی ہے، اس بے حسی پر آنکھیں جس قدر آنسوں بہائیں، دل جتنا بھی تڑپے اور روئے کم ہے۔ ہائے، یہ اس امت کا حال ہے جس کو آخر آخر دم تک اس کے نبی ﷺ نے مسلمان کے خون کی حرمت بتائی تھی، اور ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو سے ہاتھ رنگنے کو منع فرمایا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادیں گے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص شرک کی حالت میں مرے یا کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کردے، (ابوداؤد: ۴۲۷۰) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مومن کو قتل کیا اللہ تعالیٰ نہ اس کی کوئی فرض نماز قبول فرمائیں گے اور نہ نفل، **لم یقبل اللہ منہ صرفا و لا عدلا**، (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۲۷۰) اور کیوں نہ ہو کہ مومن کا قتل اللہ کے نزدیک دنیا کے ختم ہوجانے سے بہتر ہے۔ **قتل المومن اعظم عند اللہ من زوال الدنیا** (نسائی: حدیث: ۳۹۹) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمام اہلِ زمین اور اہلِ آسمان بھی ایک مسلمان کی موت میں شریک ہوں، تو اللہ ان سب کو جہنم میں اوندھے منہ ڈال دے گا، (ترمذی: حدیث نمبر: ۱۳۹۸) اس سے اندازہ کیجئے کہ مومن کے خون کی کیا حرمت اور عظمت ہے؟ اور کسی مسلمان کا جان لینا کیسی لعنت اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینا ہے؟ اس لئے حضور نے فرمایا کہ مومن برابر دین کے معاملہ میں وسعت و گنجائش میں رہتا ہے، جب تک کہ کسی خون حرام کا مرتکب نہ ہو۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۸۶۲)

جیسے قتل کرنا گناہ ہے، اسی طرح قتل میں تعاون بھی گناہ ہے، بلکہ اگر کسی شخص نے دوسرے کو قتل پر اکسایا ہو، یا دوسرے کو قتل پر استعمال کیا ہو، تو اس کا گناہ اصل قاتل سے بھی بڑھ کر ہے، ایک بار آپ ﷺ سے قاتل اور قتل کا حکم دینے والے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ جہنم کے ستر حصے کئے جائیں گے جس میں انہتر (۶۹) حصہ قتل کا حکم دینے والے کے لئے ہوگا اور ایک حصہ خود اس قاتل کے لئے، اور یہ ایک حصہ بھی اس کے لئے بہت کافی ہوگا۔ وللقاتل جزء و حسبه

(مسند احمد، حدیث: ۲۲۵۵۷، عن مرثد بن عبداللہ)

نہ صرف یہ کہ قتل پر اُکسانا اور اُبھارنا بہت بڑا گناہ ہے، بلکہ مقتول کو بچانے کی کوشش نہ کرنا اور پہلوتہی سے کام لینا بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی لعنت کا مستحق بنا دیتا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں کسی شخص کا ظلماً قتل ہو، وہاں تم کھڑے نہ ہو، وہاں موجود رہنے والوں پر بھی اللہ کی لعنت ہوتی ہے، کہ انہوں نے اسے بچایا کیوں نہیں؟ اور جہاں کسی شخص کو ظلماً زدوکوب کیا جارہا ہو وہاں بھی نہ ٹھہرو، کیوں کہ حاضرین پر بھی اللہ کی لعنت ہوگی، کہ انہوں نے مدافعت کیوں نہیں کی،

(طبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر: ۱۱۶۷۵)

اصل یہ ہے کہ کسی شخص کو قتل کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی زندگی میں انسانی خون اور انسانی زندگی کا احترام نہیں، اور یہ بہت ہی خطرناک بات ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''ایک نفسِ انسانی کا قتل پوری انسانیت کو قتل کرنے اور ایک انسان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے'' ''مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَاِنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا'' (المائدہ: ۳۲)

اس جرم کے شدید ہونے کی وجہ ظاہر ہے، زندگی اللہ کی امانت ہے، جان دینا اور جان لینا اللہ ہی کا حق ہے، قاتل گویا اللہ کا حق اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، اس سے بڑھ کر تعدی اور کیا ہوگی؟ پھر خود مقتول کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی ہے، قتل کی تکلیف کو جس سے

بڑھ کر کسی اور تکلیف کا تصور نہیں کیا جا سکتا، پھر قاتل اسے ایسی نعمت سے محروم کرتا ہے، جس کی واپسی ممکن نہیں، اور جس کا بدل نا قابلِ حصول ہے، یہ تو خود قاتل کا معاملہ ہے، پھر غور کیجئے کہ ہر انسان کے ساتھ کتنے ہی حقوق متعلق ہیں، معصوم بچوں اور بچیوں کی تربیت اس کے ذمہ تھی، جوان بہنوں کی شادی کا وہی ذمہ دار تھا، بوڑھے ماں باپ کی کفالت اسی کے سر تھی، بیوی کا سہاگ اس کے دم سے قائم تھا، خاندان کی کتنی ہی آرزوئیں اور تمنائیں اس سے متعلق تھیں، اور سماج کی کتنی ہی اُمیدیں اور توقعات اس سے وابستہ تھیں، بہ ظاہر یہ ایک جان کا قتل ہے، لیکن درحقیقت وہ کتنی ہی تمناؤں، حسرتوں، امیدوں اور آرزوؤں کا قاتل ہے، اس نے ایک بے قصور عورت کو بیوہ کیا، معصوم بچوں کو یتیم اور بے سہارا بنایا، بوڑھے ماں باپ سے اس کا عصائے پیری چھینا ہے اور چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی امیدوں کے محل کو خاکستر کر کے رکھ دیا ہے، اس لئے یقیناً اس نے ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک خاندان اور ایک کنبہ کا اور انسانیت کا قتل کیا ہے۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انتقام کا قانون رکھا کہ یا تو خود قاتل کیفرِ کردار تک پہونچا دیا جائے، (البقرہ:۱۷۸) اگر مقتول کے اولیا، رضامند ہو جائیں تو ان کو دیت ادا کی جائے، جو سو اونٹ یا اس کی قیمت ہے، احادیث میں اس کی تفصیل موجود ہے، مقصد اس دیت کا یہی ہے کہ ایک شخص کے قتل کی وجہ سے مقتول کے خاندان کو جو نقصان پہونچا ہے وقتی طور پر سہی، کچھ تو اس کی اشک شوئی ہو جائے، اور ہنگامی مدد تو اسے حاصل ہو، یہ خون بہا اس وقت بھی واجب ہے، جب کسی شخص کو دھوکہ میں قتل کر دے، (النساء:۹۲) اور اس غلطی کی صورت میں صرف دیت ہی کافی نہیں، بلکہ کفارہ بھی واجب ہے، کہ مسلسل دو ماہ روزے رکھے جائیں، (النساء:۹۲) اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہو تو اس کے لئے کوئی کفارہ متعین نہیں کیا گیا، زندگی بھر توبہ واستغفار کرتا رہے، کیوں کہ یہ اتنا بڑا جرم اور اتنا شدید گناہ ہے کہ کوئی عمل اس کا کفارہ بن نہیں سکتا، یہ کفارہ اسی لئے ہے کہ حقوق اللہ میں جو دست درازی ہوئی اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ سے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے

فرمایا: کہ آج کون سا دن ہے؟ یہ کون سا مہینہ ہے؟ اور یہ کون سی جگہ ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ حرام مہینہ، حرام دن، اور حرام سرزمین یعنی حدودِ حرم کا علاقہ ہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو اس سے بھی زیادہ قابلِ حرمت ہیں۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۷) اگر اس پیغمبر رحمت کی امت بھی مسلمانوں کے بلکہ انسانوں کے خون کی اہمیت و حرمت کو نہ سمجھ سکے اور اس کے ہاتھ بھی ایک دوسرے کے خون سے رنگین ہوں تو اس سے بڑھ کر بھی قابلِ افسوس، لائقِ حیرت اور تعجب انگیز کوئی بات ہوگی؟؟

(۲۴ ر دسمبر ۱۹۹۹ء)

ایک حادثہ ——— لرزہ خیز، الم انگیز

گزشتہ دنوں شہر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ہر اس شخص کو تڑپا دیا، جس کے سینہ میں دل اور دل میں دھڑکن ہو، اخبار کی اطلاع کے مطابق ۱۹/ اور ۲۰/ جون ۱۹۹۸ء کی درمیانی شب میں محلّہ جہاں نما میں ایک خاندان نے اپنی دو بہوؤں کو نہایت ہی بے دردی اور شقاوتِ قلبی کے ساتھ مار مار کر ہلاک کر دیا، ان کو مسلسل زدوکوب کیا گیا اور بدن پانی سے تر کر کے مارا گیا، تا کہ زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچ سکے اور بالآخر ان کے گلے گھونٹ دیئے گئے، ان خواتین کی عمر ۲۰/ اور ۲۰.۶/ سال تھی، ان میں ایک نے تو صرف سات ماہ قبل ہی اس گھر میں قدم رکھا تھا اور ایک کے چار بچے تھے، جن میں دو بقیدِ حیات ہیں اور یہ سب کچھ محض جادو ٹونے کے وہم میں ہوا۔

آپ سمجھیں گے کہ شاید یہ سب کچھ ان لوگوں نے کیا ہوگا جو خدا پر ایمان اور آخرت پر یقین کی دولت سے محروم ہیں، جن کے یہاں حساب و کتاب کا کوئی تصور نہیں اور جو اس دُنیا کے بعد کسی اور دُنیا کا یقین نہیں رکھتے، لیکن حیرت کے کانوں سے سنئے اور یقین نہ آئے تو پھر بھی یقین کیجئے کہ یہ سب "مسلمان" کہلاتے تھے اور ان کے نام مسلمانوں ہی جیسے تھے، حقیقت یہ ہے کہ ایسے واقعات ہمارے سماج پر شرمناک داغ ہیں، ایسے داغ جن کو خون کے آنسو بھی نہیں دھو سکتے، برائی اور بدی کا ارتکاب گو افراد و اشخاص کرتے ہیں، ظلم و جور کا واقعہ ایک گھر میں پیش آتا ہے، لیکن در حقیقت پورا سماج اس کا مجرم ہے اور پوری سوسائٹی اس جرم میں شریک و سہیم ہے، جب سماج میں برائیوں پر ٹوکنے والی زبان نہ رہے، ہاتھ ہوں؛ لیکن ظالموں سے پنجہ آزمائی سے محروم، آنکھیں ہوں، لیکن ظلم و تعدی کے مقابلہ نابینا، طاقت وقوت اور اثر و رسوخ ہو، لیکن جرائم پیشہ عناصر کے مقابلہ

مفلوج اور کم ہمت، تو اس سماج میں ایسے واقعات کا پیش آنا بلکہ خدانخواستہ بار بار پیش آتے رہنا نہ حیرت انگیز ہے اور نہ تعجب خیز!

اسلام میں انسانی جان کی کتنی اہمیت ہے! قرآن کی نظر میں کفر کے سوا قتل مسلم ہی ایسا جرم ہے جس کی سزا ہمیشہ کے لئے جہنم رسید ہونا بتایا گیا ہے، (نسا: ۹۳) قرآن نے خوب کہا ہے کہ ایک انسان کا قتل گویا پوری انسانیت کا قتل ہے، (مائدہ: ۳۲) کیوں کہ جب انسانی زندگی کا احترام ہی رخصت ہوگیا تو کیا مرد اور کیا عورت، کیا بڑے اور کیا چھوٹے اور کیا امیر اور کیا غریب، ہر شخص کی زندگی ایسے مجرم شخص کے ہاتھوں غیر محفوظ ہے، آخری حج کے خطبہ میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ اس مہینہ، اس دن، اس مقام یعنی حرام مہینہ حدودِ حرم سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کی جان کی حرمت ہے، (بخاری: ۱۰۴۸/۲) ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس گناہ کے بارے میں حساب و کتاب اور فیصلہ ہوگا، وہ یہی انسانی خون کا مسئلہ ہے، (ترمذی: ۲۵۹/۱) اسی لئے اسلام نے قتل کی سزا بھی قتل ہی رکھی ہے اور قرآن نے کہا کہ اس میں تمہارے لئے زندگی ہے " ولکم فی القصاص حیوۃ" (البقرۃ: ۱۷۹) کہ جب تک قاتل کو اپنے جرم کی قرار واقعی سزا کا خطرہ نہ ہو، بدقماش، بد طینت، خدا سے بے خوف، جرائم کے خوگر اور شر پسند عناصر کو نہ پند و موعظت کی زبان جرم سے باز رکھ سکتی ہے، نہ جرمانہ کا خوف اور نہ مختصر مدت کے لئے قید و بند کی صعوبت کا اندیشہ۔

پھر خاص کر اسلام نے مردوں پر عورتوں کی حفاظت کی ذمہ داری رکھی ہے اور یہی مطلب ہے مرد کے "قوّام" ہونے کا، (تفسیر قرطبی: ۱۱۰/۵) اسی لئے سماجی حقوق میں اسلام نے اکثر مواقع پر خواتین کو مقدم رکھا ہے، لڑکے بالغ ہو جائیں اور خود کسب معاش کے لائق ہوں تو باپ پر ان کا نفقہ واجب نہیں، لیکن لڑکیوں کا نفقہ بہر حال ان کی شادی تک واجب ہے اور شادی کے بعد بھی اگر خدانخواستہ طلاق یا بیوگی کی نوبت آجائے تو پھر والدین پر ان کی کفالت کی ذمہ داری لوٹ آتی ہے، (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۷/ ۷۲۴) اگر ماں، باپ میں سے ایک اور بیٹے بیٹی میں سے ایک ہی کا نفقہ ادا کرنے کی صلاحیت

ہے تو ماں کو باپ پر اور بیٹی کو بیٹے پر ترجیح حاصل ہے۔

غور کیا جائے تو طلاق اور ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت کا ایک اہم مقصد عورت کا تحفظ بھی ہے، اگر زوجین کے درمیان شدید نفرت ہو جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنا دشوار ہو جائے، پھر اس رشتے کو ختم کرنے کے لئے طلاق کا جائز راستہ مہیا ہے، تو مرد طلاق دے کر نجات حاصل کر لیتا ہے، عورت کی جان کے درپے نہیں ہوتا اور اگر اس کے لئے جائز راستہ باقی نہ رہے، تو پھر بد قماش لوگ اس کے لئے ناجائز اور غیر قانونی راستہ اختیار کرتے ہیں، یہی حال تعدادِ ازدواج کا ہے، اگر مرد کسی اور عورت کی طرف راغب ہو، قانوناً ایک سے زیادہ نکاح کی گنجائش نہ ہو اور طلاق حاصل کرنی بھی دشوار ہو تو پھر وہ ایک عورت کا قتل کر کے دوسری عورت کو اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کرتا ہے، اگر ایک سے زیادہ نکاح کی گنجائش ہو تو وہ قانونِ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے، غرض طلاق اور کسی مناسب ضرورت کے بغیر دوسرا نکاح ایک ''ناخوشگوار واقعہ'' ہے، لیکن یہ اس سے زیادہ ناخوشگوار واقعہ کو روکنے کا باعث ہے، اسی لئے اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔

پھر نکاح کتنا پاکیزہ رشتہ ہے، شریعت کی نگاہ میں بیوی کا وجود مرد کا ایک حصہ ہے''وخلق منها زوجها ''(نساء:۱) انسان کو اپنے حصۂ بدن سے کیسی محبت ہوتی ہے؟ اپنے بدن کا حصہ خوبصورت ہو یا بدصورت، گورا ہو یا کالا، اور صحت مند ہو یا بیمار، لیکن بہر حال وہ اسے محبوب رکھتا ہے، اسی طرح شریعت نے بیوی کو محبوب رکھنے کا حکم دیا ہے، پھر نکاح کی وجہ سے بہو اور خسر، ساس اور داماد ایک دوسرے کے لئے محرم ہو جاتے ہیں، گویا بہو کی حیثیت اپنی اولاد کی ہوتی ہے، انسان کچھ بیٹیوں کو گھر سے رخصت کرتا ہے اور کچھ بیٹیوں کو اپنے گھر میں لاتا ہے، کہ یہ دونوں ہی بیٹیاں ہیں، یہاں تک کہ اگر شوہر فوت ہو جائے یا طلاق دے دے، جب بھی بہو اپنے خسر کے لئے محرم ہی رہتی ہے، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خسر اور خوش دامن اپنی بہو کو ''بیٹی'' کی نظر سے دیکھیں اور بہوئیں ان کو والدین تصور کریں، اگر لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیں تو شاید سماج میں ایسا کوئی

جھگڑا اور اختلاف باقی نہ رہے اور ہر گھر جنت نشان بن جائے۔

عورت کا قتل تو اتنا بڑا جرم ہے کہ عین میدانِ جنگ میں بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی، پیغمبر اسلام ﷺ فوجیوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ وہ خواتین پر ہاتھ نہ اٹھائیں، (مسلم: ۲/۱۸۴) ایک بار سپہ سالار فوج حضرت خالدؓ کو خاص تاکید کے ساتھ فرمایا کہ عورتوں اور مزدوروں کو ہرگز قتل نہ کیا جائے، لاتقتلن امرأة و لا عسيفا (ابوداؤد: ۲/ ۳۶۲) ایک غزوہ کے موقعہ سے آپ ﷺ نے ایک خاتون کی لاش دیکھی تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، (مسلم: ۲/۸۴) اسی لئے مشہور محدث اور فقیہ امام نوویؒ نے نقل کیا ہے کہ غیر مسلم عورتوں اور بچوں کے قتل کے حرام ہونے پر پوری اُمت کا اجماع واتفاق ہے، (شرح نووی علی مسلم: ۲/۸۴) جب عین جنگ کے دوران اور دشمن کی عورتوں پر بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تو کسی مسلمان اور وہ بھی اپنے رشتہ داروں اور قرابت مندوں پر ہاتھ اٹھانا کتنا بڑا گناہ، کتنا شرمناک عمل اور اللہ اور اس کے رسول کے دربار میں کتنا مبغوض فعل ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔

شریعت نے شوہر کو اس کی اجازت ضرور دی ہے کہ وہ بیوی کی نافرانی کی صورت میں مناسب حد میں رہتے ہوئے اس کی تادیب کرے، لیکن یہ بھی اس وقت جب تین باتیں پائی جائیں: اولاً تو بیوی ایسی غلطی کرے جس کو شریعت غلطی قرار دیتی ہو، جیسے غیر محرموں کے سامنے نکلنا، قدرت کے باوجود شرعی حدود میں شوہر کے لئے زیبائش وآرائش نہ کرنا، کسی عذر کے بغیر شوہر کی فطری ضرورت کی تکمیل میں حارج ہونا، شوہر کو گالی گلوچ کرنا، غسل جنابت نہ کرنا اور نماز وغیرہ سے غفلت برتنا، دوسرے: پہلے ان باتوں کی فہمائش اور نصیحت کی خوب کوشش کی گئی ہو اور بار بار کی نصیحت بھی رائیگاں ہوگئی ہو، پھر چند دنوں شوہر نے ایک ہی کمرہ میں رہتے ہوئے اپنا بستر الگ رکھا ہو اور دو چار روز ترکِ تعلق کر کے اس کو متنبہ کرنے کی کوشش کی ہو، اس کے باوجود بیوی اپنی غلط روی سے باز نہ آتی ہو، تب جسمانی سرزنش کی اجازت ہے۔

پھر سرزنش بھی شرعی حدود کے اندر ہو، اس طرح نہ مارے کہ جسم پر اور جسم کے

نازک حصہ پر نہ مارا جائے، لاٹھی اور کوڑے سے نہ مارے، ایک ہی جگہ مسلسل نہ مارے، رومال سے یا ہاتھ سے مارے، لوگوں کے سامنے سرزنش نہ کرے کہ اس سے عورت کی تذلیل ہوتی ہے، اس کو یا اس کے ماں، باپ کو گالی دینا کسی صورت جائز نہیں، نہ اس کو بھوکا رکھنا جائز ہے، حدیث اور فقہ کی کتابوں میں بیوی کی تادیب اور سرزنش کے سلسلہ میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں اور ان سب کے باوجود حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو بدترین لوگ ہوں گے وہی عورتوں پر ہاتھ اٹھائیں گے، خسر، خوش دامن، نند، دیور، جیٹھ، جٹھانی، بھاوج کو کسی عورت کی سرزنش کا قطعاً اعتبار نہیں۔

شریعت میں کسی بات پر اس وقت تک یقین کرنے کی گنجائش نہیں، جب تک کہ اس کے لئے مناسب شرعی ثبوت فراہم نہ ہو جائے، ضعیف الاعتقادی اور ایمان ویقین میں کمی کی وجہ سے آج کل توہمات اور شکوک وشبہات کی ایک عام فضا بن گئی ہے، بیماری، ابتلائیں اور آزمائشیں، حادثات، کاروبار میں نفع ونقصان، یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا اور جب تک اللہ کی مشیت نہ ہو، کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، مصیبتوں سے بچنے کے لئے خود رسول اللہ ﷺ نے بعض آیتیں بتائیں ہیں اور بعض دُعائیں آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے منقول ہیں، آپ ﷺ نے سورۂ فاتحہ کو باعثِ شفا قرار دیا، آیت الکرسی کو ابتلاؤں سے حفاظت کا ذریعہ بتایا، قرآن کی آخری دوسورتیں ''معوذتین'' کو سحر سے تحفظ کے لے اکسیر قرار دیا، ایک صاحبِ ایمان کے لئے ایسی چیزوں کا پڑھنا اور خدا پر بھروسہ رکھنا کافی ہے۔

خدا کے سوا کوئی غیب کی باتوں سے باخبر نہیں، کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص جادوگر ہے، مریض اگر خود کہے کہ مجھے فلاں نے جادو کیا ہے جب بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ خود عامل حضرات کے بقول یہ شیطان ہے، جو مریض پر سوار ہوکر اس کی کیفیت بیان کرتا ہے، غور کیجئے کہ جب انسان جھوٹ بولتے نہیں تھکتا، تو شیطان جس کو حدیث نبوی ﷺ کے مطابق دو مسلمانوں کے درمیان تفریق ونفرت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ دلچسپی ہے، کیا وہ جھوٹ بولتا ہوگا؟؟

درحقیقت یہ سب توہمات و بدگمانیاں ہیں، جو بے دینی اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، یہ کچھ بیکار قسم کے لوگوں کا ذریعۂ معاش ہے اور کم ہمت و کم حوصلہ لوگ ان کی خوراک ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ بعض حضرات ڈاکٹر سے رجوع کرنے کے بجائے ایسے پیشہ ور ''کھاؤ پکاؤ'' لوگوں سے مل کر اپنا مرض بڑھاتے رہتے ہیں اور اپنی دُنیا بھی ضائع کرتے ہیں اور آخرت بھی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کو اس سلسلے میں باشعور بنایا جائے، تو ہماتی تصورات سے ان کو آزاد کیا جائے، معاشرہ میں حوصلہ وہمت پیدا کیا جائے کہ اگر ایک ہاتھ ظلم و جور کے لئے اٹھے، تو کتنے ہی ہاتھ اس ہاتھ کو روکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، کتنی ہی زبانیں اس پر لعن طعن کے تیر برسائیں اور سماج میں وہ اپنے آپ کو تنہا اور الگ تھلگ محسوس کرنے لگے، ہر آنکھ جو اس پر اٹھے وہ اسے اس کی ذلت و رسوائی کا احساس دلائے اور ہر زبان جو اس پر کھلے وہ اس کی شناعت اور گراوٹ کا اعلان کرنے لگے۔

(۱۰/جولائی ۱۹۹۸ء)

مظلوموں کی مدد — اسلامی اور انسانی فریضہ

اسلام اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا دین ہے، یہ کوئی نیا دین نہیں، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کے وقت سے یہ دین چلا آرہا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے اسی نظامِ حیات اور طریقۂ زندگی کو پسند فرمایا ہے، قرآن کا ارشاد ہے، ''ان الدین عند اللہ الاسلام'' (آل عمران: ۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک جو دین معتبر ومقبول ہے وہ صرف اسلام ہے، اس دین کو آخری اور مکمل صورت میں محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا گیا، اب جو لوگ اس سچے دین پر ایمان لے آئیں، وہ سب گویا ایک خاندان کے افراد ہیں، اور ایمان کے رشتہ نے ان کو جوڑ رکھا ہے۔

یہ ایک آفاقی اور عالمگیر خاندان ہے، جیسے پانی کے ایک قطرہ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، ہوا اُسے اڑا لے جاتی ہے، اور دھوپ اُسے لمحوں میں جلا کر رکھ دیتی ہے، لیکن یہی قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے تو وہ سمندر کی وُسعت و طاقت کا ایک حصہ بن جاتا ہے، اور ایک ناقابلِ تسخیر طاقت قرار پاتا ہے، اسی طرح جب کوئی انسان ایمان لاتا ہے، تو وہ سمندر سے بھی زیادہ وسیع اور طاقتور خاندان کا ایک حصہ بن جاتا ہے، علاقے اور جغرفیائی سرحدیں، برادریاں اور زبانیں یہ سب انسانی تقسیمیں اور بٹوارے ہیں، اسلام کی نگاہ میں پوری انسانیت صرف دو گروہ میں بٹی ہوئی ہے، ایک وہ جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ابدی سچائی پر یقین رکھتا ہو، یہ قرآن کی زبان میں مسلم ہے، دوسرے وہ جو اس سچائی کے منکر ہیں، جنہیں قرآن کافر سے تعبیر کرتا ہے۔

افسوس کہ مغرب نے اخوت ایمان پر تیشہ چلانے اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے قومیت کے جاہلی تصور کو جگایا اور انہیں علاقہ اور زبان اور قبیلہ

وخاندان کے نام پر تقسیم کرنے کی بے جا کوشش کی، اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک کنبہ اور خاندان ہیں اور ہم سب اس خاندان کے افراد ہیں، اُخوت اسلامی کا یہ رشتہ تمام رشتوں سے زیادہ عزیز اور یہ تعلق تمام تعلقات سے زیادہ محبوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آفاقی خاندان کے باہمی رشتہ محبت کو کس خوبصورتی کے ساتھ بیان فرمایا، آپ نے فرمایا:

تم اہلِ ایمان کو باہمی رحم دلی اور محبت ومودت میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے، کہ اگر ایک عضو کو بھی تکلیف ہو تو اس کے لئے پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

(بخاری، عن نعمان بن بشیر، حدیث نمبر:۶۰۱۱)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے، پھر خود رسول اللہ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر اس کو عملی مثال کے ذریعہ سمجھایا: المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضاً

(بخاری، حدیث نمبر:۶۲۰۶)

یہ رشتہ درد و محبت کا رشتہ ہے، دنیا میں کہیں کسی مسلمان پر کوئی آزمائش آئے، ہر مسلمان کو اس پر تڑپ اٹھنا چاہئے، ایک مسلمان کو کوئی زخم لگے تو دوسرا اپنے سینے پر اس کی کسک محسوس کرے، ایک مسلمان پر کوئی پتھر پھینکا جائے، تو دوسرے کو اپنے کلیجہ پر اس کی چوٹ محسوس ہو، اس وقت ہمارے ملک میں گجرات کے مسلمان بھائی ہندو دہشت گردوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، ہزاروں افراد قتل کر دیئے گئے، سینکڑوں مرد وعورت زندہ نذر آتش کر دیئے گئے، چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں بلکہ پیٹ میں پرورش پانے والے بچہ تک کو ظلم وجور کا نشانہ بنایا گیا ہے، شاید آسمان کی آنکھوں نے ایسے مظالم کم دیکھے ہوں گے، اس صورتِ حال نے بجا طور پر نہ صرف مسلمانوں بلکہ ان تمام لوگوں کو جن کے اندر انسانیت کی کوئی رمق باقی تھی لرزہ براندام کر کے رکھ دیا ہے، اور پورے ملک سے مسلمان گجرات

کے لئے، پٹے بھائیوں کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں، یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ گجرات کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے والوں میں مسلمانانِ حیدرآباد نے سب پر سبقت حاصل کی ہے، ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ اس وقت ہم گجرات کے مظلوم بھائیوں کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں، وہ احسان نہیں، بلکہ ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے، اور مسلمانانِ گجرات کو یہ سزا اُن کے مسلمان ہونے اور پورے ملک میں اسلامی کاز کی مدد کرنے کی وجہ سے دی گئی ہے۔

مدد کا ایک طریقہ تو ہنگامی ہے، یعنی عارضی طور پر کچھ کھانے، پینے کے سامان دے دیئے، کچھ برتن اور کپڑوں کا نظم کر دیا، یہ تو ضروری ہے ہی، لیکن اصل مسئلہ پائیدار بنیادوں پر ان مشکلات کو حل کرنے کا ہے، یہ زیادہ اہم ہے، اس وقت بہت سے لوگ سر چھپانے کے لئے سایہ سے بھی محروم ہو چکے ہیں، ان کے لئے مکانات کی تعمیر ان کی مصیبت اور پریشانی کو حل کرنا ہے، بہت سے لوگ وہ ہیں کہ جنہیں ان کی آبادیوں سے نکال دیا گیا ہے، اور ایمان سے محرومی کی قیمت پر ہی ان کو واپسی کی اجازت دی جا رہی ہے، جو ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کے لئے زندگی اور جان کی قربانی سے بھی بڑھ کر ہے، ان کے لئے مسلمانوں کے کثیر آبادی والے علاقوں میں زمین خرید کر بستیاں بسانا ضروری ہے، بہت سی خواتین بیوہ ہو چکی ہیں، ان کی زندگی کے لئے گذر اوقات کا مسئلہ ہے، کہ اگر ان کی شادی کر دینا قرینِ مصلحت ہو اور وہ اس پر آمادہ ہوں، تو مسلمان اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہوں، اور بیوہ عورتوں سے نکاح کی جو سنت رسول اللہ ﷺ نے چھوڑی ہے، اس سنت کو تازہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے بیوہ اور مسکین لوگوں کی خدمت کرنے والوں کو، اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے یا دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں تہجد پڑھنے والے کے برابر قرار دیا، **الساعی علی الارملة والمساکین کالمجاھدین فی سبیل اللہ او کالذی یصوم النھار یقوم اللیل** (بخاری عن صفوان، حدیث نمبر: ۶۰۰۶) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس نے کسی مسلمان سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کی مصیبتوں میں مصیبت کو دور فرمائے گا، جس نے کسی تنگ دست پر آسانی پیدا کی، اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اس کے ساتھ آسانی فرمائیں گے، جو کسی مسلمان کی غلطی کو چھپائے اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں اس کی ستاری فرمائیں گے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس بندہ کی مدد کی طرف متوجہ رہتے ہیں، (ابو داؤد: حدیث نمبر: ۴۹۴۶) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت ان مظلوم بھائیوں کی مدد کس قدر اہم اور اجر وثواب کا سامان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حاجت مندوں کی اعانت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمجھایا ہے، جسے سُن کر ہر شخص کا دل پسیج جائے، آپ ﷺ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائیں گے، اے ابنِ آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا، پروردگار! میں کیسے آپ کی عیادت کرسکتا تھا، آپ تو خود سارے جہان کے رب ہیں، ارشاد ہوگا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تم اس کی عیادت کرتے تو تم مجھے اس کے پاس پاتے ___ پھر ارشاد ہوگا، اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے مجھے کھلایا نہیں، بندہ عرض کناں ہوگا: میرے پروردگار! آپ تو تمام عالم کے رب ہیں، آپ کو میں کیوں کر کھانا کھلاتا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرا فلاں بندہ تجھ سے کھانے کا طلب گار ہوا تھا، تم نے اسے نہیں کھلایا، اگر تم اسے کھلاتے تو مجھے وہاں موجود پاتے، پھر اللہ کہیں گے: اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، اور تو نے مجھے نہیں دیا، بندہ ملتجی ہوگا! میرے پروردگار! آپ تو کائنات کے رب ہیں، میں آپ کو کس طرح پلاتا، فرمانِ باری ہوگا، تجھ سے میرے فلاں بندے نے تو پانی مانگا تھا، تو نے اسے پانی نہیں دیا، اگر تو اسے پلاتا تو مجھے وہاں موجود پاتا، (مسلم، حدیث نمبر: ۶۵۵۶) ___

گویا ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی مدد کرنا براہِ راست اُسے اللہ کے حضور پہونچانا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں مخلوق کی خدمت اور

بندوں کی حاجت روائی کی کیا اہمیت ہے؟۔

انسان کو سب سے زیادہ فکر اور خواہش درازی عمر اور خوش معاشی کی ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو چاہتا ہو کہ اس کی رزق میں وسعت اور عمر میں برکت ہو تو اسے صلہ رحمی کرنا چاہئے (بخاری، حدیث نمبر: ۵۹۷۵) ___ جو لوگ آخرت کی زندگی اور اللہ تعالیٰ کے نظامِ غیبی پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ یقیناً مژدہ جانفزا ہے۔

ایک اہم مسئلہ یتیم ہونے والے بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی کفالت کا ہے، اس سلسلہ میں بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ مسلمان حسبِ استطاعت ایک دو بچوں کی کفالت قبول کرلیں، اور اپنے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ان کی پرورش کریں، خاص کر جو لوگ صاحبِ اولاد نہیں ہیں، ان کے لئے یہ نہایت ہی بہتر صورت ہے، یہ ایک دو یتیم لڑکے یا لڑکی کی کفالت ان شاء اللہ ان کے لئے برکت ہی ثابت ہوگی، اور رسول اللہ ﷺ کی وہ سنت بھی ادا ہو سکے گی، جو یتیم کی کفالت کے سلسلہ میں آپ ﷺ نے قائم فرمائی تھی، کئی ازواجِ مطہرات جو آپ ﷺ کی نکاح میں آئیں وہ اپنے ساتھ یتیم بچوں کو بھی لے کر آئیں، اور آپ ﷺ نے انہیں بوجھ نہیں بلکہ خدا کی ایک نعمت سمجھ کر قبول فرمایا، آپ ﷺ نے اپنے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے، (بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۰۵) ___ مومن کے لئے یہ کس قدر مسرور کن خوشخبری ہے! اور جو لوگ دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت سے محروم ہیں، ان کے لئے آخرت میں اس سعادت کو حاصل کرنے کا کتنا آسان نسخہ ہے! ___ یتیموں کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرنے کے علاوہ ایسے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا سے محروم بچوں کے لئے یتیم خانے بھی قائم کرنے ہوں گے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں اجتماعی کفالت کے زیر سایہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں، اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں، اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے سلسلہ میں ایسی بات ارشاد فرمائی ہے کہ جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کو

بھی پگھلا کر رکھ دے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: لوگوں کو یہ سوچ کر ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے بارے میں کیسے کچھ اندیشے ہوتے، اس لئے لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور درست بات کہنا چاہئے (النساء: ۹۰) __ کیسی چونکا دینے والی بات ہے، کسی کو یہ خبر نہیں کہ اس کے بچوں کی پرورش اس کے ہاتھوں ہوگی، یا وہ انہیں چھوڑ کر دنیا سے گزر جائے گا، اور اگر وہ انہیں چھوڑ کر دنیا سے بلا لیا جائے تو اپنے بے سہارا بچوں کے بارے میں اس کے کیا جذبات واحساسات ہوں گے؟۔

(۳۱ رمئی ۲۰۰۲ء)

سب سے بڑی بہادری

انسان مجموعۂ اضداد ہے، طاقت ور ایسا کہ سمندر اور پہاڑ بھی اس کی ٹھوکروں میں ہے، اور کمزور ایسا کہ پانی کا معمولی سا تلاطم اور پہاڑ کا ایک سنگ ریزہ بھی اس کی موت کے لئے کافی ہے، لطیف ایسا کہ غنچۂ وگل بھی اس پر نثار ہو، اور ذوق سے محروم ہو تو کثیف ایسا کہ شاید کوئی اخلاقی اور مادی آلائش اس کا مقابلہ کر سکے، محبت کرے تو شبنم اور بادِ نسیم سے بھی زیادہ خنک، اور نفرت پر اتر جائے تو آتش فشاں بھی اس کی گرمی عداوت پر شرمائے، اسی طرح انسانی فطرت میں ایک اہم عنصر غصہ، غیظ وغضب اور جوش وانتقام کا ہے، یہ ایک آگ ہے جو انسان کے سینہ کو سلگا کر رکھ دیتی ہے، اور اس کا انگ انگ اس کی حرارت سے دہک اٹھتا ہے، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، زبان بے قابو ہو جاتی ہے، اور جب غصہ شدید ہو تو اپنے اعضاء پر بھی انسان کی گرفت باقی نہیں رہتی، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، گویا غصہ کی حالت میں انسان شیطان کا نمائندہ بن جاتا ہے، اور شیطان اس کو اپنے مقصد و منشاء کی تکمیل کے لئے ذریعہ بناتا ہے۔

غصہ کی کیفیت انسان کو دینی اعتبار سے بعض اوقات سخت خسارہ میں ڈال دیتی ہے، زبان سے کفریہ کلمات نکل جاتے ہیں، آدمی ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو سراسر تقاضۂ دین وایمان کے مغائر ہوتی ہیں، یہی جوشِ غضب انسان کو قتل وقتال اور سب وشتم تک پہونچا دیتا ہے، دینی نقصان تو ہے ہی، دنیوی نقطۂ نظر سے بھی انسان کچھ کم نقصان سے دو چار نہیں ہوتا، بہت سے واقعات ہیں کہ بیوی کو طلاق دے دیتے ہیں، بعض مغلوب العقل حضرات خودکشی کر بیٹھتے ہیں، شدّتِ غضب میں اپنا ہی سامان توڑ پھوڑ کرنے سے گریز

نہیں کرتے، غصہ کی وجہ سے انسانی دماغی مریض بھی بن سکتا ہے، اور قلب پر حملہ سے بھی دو چار ہو سکتا ہے ـــــ اگر معاشرہ کے مفاسد کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر برائیاں غصہ ہی کی دین ہیں، خاندانوں کی باہمی نفرت، میاں بیوی کے درمیان ذہنی فاصلے، ایک دوسرے کی عزت ریزی، صلح کے مواقع تلاش کرنے کے بجائے مقدمہ بازی اور جنگ و جدال کا تسلسل، سماج کی یہ مہلک بیماریاں نوے فیصد غصہ ہی کے سبب ہیں، اسی لئے اسلام میں غصہ کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، اور غصہ پر قابو پانے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جیسے ایلواء شہد کو خراب کر دیتا ہے، اسی طرح غصہ ایمان کو، ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص غصہ کرتا ہے وہ جہنم کے قریب ہو جاتا ہے، (احیاء العلوم: ۱۶۵/۳) آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے جس کو غصہ جلد آئے اور ختم ہو دیر سے، شرھم سریع الغضب بطئی الفئی، اور بہترین آدمی وہ ہے جسے غصہ دیر سے آئے اور جلد چلا جائے، خیرھم بطئ الغضب سریع الفئی (ترمذی، حدیث: ۲۱۹۱) ایک بار آپ ﷺ کا گذر کچھ لوگوں پر ہوا، کچھ لوگ پتھر اٹھا رہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: پتھر اٹھا رہے ہیں، لوگ ان کی بہادری بیان کرنا چاہ رہے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو ان سے بھی بہادر آدمی نہ بتلاؤں؟ پھر ارشاد فرمایا: ان سے بھی بہادر وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، ایک اور روایت میں ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس سے آپ ﷺ گذرے، جو منتشر حالت میں تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: فلاں پہلوان ہے کہ جس پہلوان سے بھی کشتی لڑتا ہے اسے زیر کر دیتا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا میں تم کو اس سے بھی زیادہ پہلوان شخص کے بارے میں نہ بتاؤں؟ اس سے بھی بڑا بہادر وہ شخص ہے جس پر کوئی شخص ظلم کرے، اور وہ اپنے غصہ کو پی جائے۔ اس نے اپنے غصہ پر بھی غلبہ پایا اور اپنے شیطان پر بھی، اور اپنے حریف کے شیطان پر بھی، (مجمع الزوائد: ۶۸/۸) ایک اور روایت میں ہے کہ اصل بہادر وہ ہے کہ جسے غصہ آئے خوب غصہ آئے،

چہرہ سرخ ہو جائے اور بال کھڑے ہو جائیں، پھر بھی وہ اپنے غصہ پر قابو پالے۔

(حوالہ سابق: ۶۹/۸)

اسی لئے رسول اللہ ﷺ خاص طور پر غصہ سے بچنے کی نصیحت فرماتے، ایک صاحب نے آپ ﷺ سے نصیحت کی خواہش کی، آپ ﷺ نے فرمایا غصہ نہ کرو، وہ بار بار پوچھتے رہے، اور آپ ﷺ بار بار یہی جواب دیتے رہے، حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ نے عرض کیا: کہ مجھے کوئی مفید مگر مختصر نصیحت فرمایئے! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کرو، وہ بار بار نصیحت کی درخواست کرتے رہے، اور آپ ﷺ ہر بار یہی جواب ارشاد فرماتے: (مجمع الزوائد: ۷۰/۸، بحوالہ طبرانی) حضرت ابو درداءؓ نے درخواست کی کہ ایسا عمل ارشاد فرمایا جائے جو مجھے جنت میں داخل کر دے، فرمایا: غصہ نہ کرو، (حوالۂ سابق) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایسا عمل جاننے کی خواہش کی جو خدا کے غضب سے بچانے والا ہو، اب بھی یہی ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کرو، (حوالۂ سابق: ۶۹/۸، بحوالہ مسند احمد) ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی، آپ ﷺ نے غصہ سے بچنے کو فرمایا، میں نے اس میں غور کیا تو محسوس کیا کہ غصہ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ **الغضب يجمع الشر كله** (حوالہ سابق)

اہلِ علم نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بچوں کو خاص طور پر غصہ کی کثرت سے منع فرمایا، اور کہا: **اياك و كثرة الغضب** (احیاء العلوم: ۱۶۵/۳) امام جعفرؒ کا قول منقول ہے کہ غضب ہر برائی کی کلید ہے، **الغضب مفتاح كل شر**، حضرت عمرؓ اکثر اپنے خطبہ میں ارشاد فرماتے تھے کہ جو شخص حرص، خواہشِ نفس اور غصہ سے بچ گیا وہ کامیاب ہو گیا، مشہور محدث عبد اللہ ابن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا کہ آپ ایک جملہ میں حسنِ اخلاق کو بتایئے، امام صاحبؒ نے فرمایا: غصہ چھوڑ دو، **اترك الغضب**،

(احیاء العلوم: ۱۶۶/۳)

اسی لئے غصہ کو پی جانے پر بڑا اجر ہے، حضرت معاذ بن انسؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص غصہ اتارنے پر قادر ہو، اس کے باوجود وہ غصہ پی جائے، اللہ تعالیٰ

اس کو قیامت کے دن تمام مخلوقات کی موجودگی میں (از راہِ اعزاز) طلب فرمائیں گے، اور اسے اختیار دیں گے کہ جس حور کا چاہے انتخاب کرلے، (ترمذی، حدیث نمبر:۲۰۲۱) اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ غصہ پر قابو پانا اور غصہ کے وقت اپنے آپ کو عدل اور اعتدال پر قائم رکھنا آسان نہیں، اور انسان کے اخلاق ورواداری کا اصل امتحان اسی موقع پر ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے خوب فرمایا کہ آدمی کی بردباری کو اس وقت دیکھو جب وہ غصہ کی حالت میں ہو، اور اس کی امانت ودیانت کا اندازہ اس کی طمع وحرص کے مواقع پر، جس کو تم نے حالتِ غضب میں نہیں دیکھا، تم کو اس کی بردباری کا علم نہیں، اور جس کو تم نے حرص ولالچ کے مواقع پر نہیں دیکھا، تم کو اس کی دیانت کی خبر نہیں، (احیاء العلوم:۱۶۶/۳)

حقیقت یہ ہے کہ غصہ کو پی جانا بہت بڑا عمل ہے، اور جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا، نہایت ہی بہادری کا کام ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کی مختلف تدابیر بتائی ہیں، آپ ﷺ نے اس کی ایک تدبیر یہ بتائی کہ ایسے وقت میں آدمی ''**اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' پڑھے، ایک صاحب اتنا غضب ناک تھے کہ لگتا تھا کہ اب ان کی ناک پھٹ پڑے گی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر یہ کہے تو اس کا غصہ فرو ہوجائے، دریافت کیا گیا: وہ کیا کلمہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**'' (ابوداؤد حدیث:۴۷۸۰، بخاری حدیث:۶۰۴۸) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غصہ ایک شیطانی حرکت ہے، جب انسان اس موقع پر تعوذ پڑھے گا، تو اللہ کی مدد سے اس شیطانی حرکت پر غلبہ پالے گا، نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کلمہ کو پڑھتے ہوئے آدمی کا ذہن اس جانب منتقل ہوتا ہے کہ وہ اس وقت شیطان کا آلۂ کار ہے، اس خیال سے وہ اپنے آپ کو موجودہ کیفیت سے بآسانی نکال سکے گا۔

غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ غصہ کے وقت انسان کچھ نہ بولے اور چپ سادھ لے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو خاموش رہے، **اذا غضب احدکم فلیسکت**، (مسند احمد، حدیث نمبر:۲۱۳۷) کیونکہ غصہ کی حالت میں انسان جتنا زیادہ بولتا ہے، جوشِ غضب بڑھتا جاتا ہے، اور اکثر اوقات ایسی

باتیں کہہ جاتا ہے جو خود اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے ___ غصہ کو روکنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ انسان اپنی موجودہ کیفیت میں تبدیلی لے آئے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو غصہ کے وقت اس تدبیر کے اختیار کرنے کا حکم فرمایا تھا، (ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۷۸۲ عن ابی ذر غفاریؓ)

ابو وائلؒ ایک واعظ تھے، وہ عروہ بن محمد سعدیؒ کے پاس گئے، عروہؒ سے ایک شخص نے ایسی بات کہی کہ ان کو غصہ آ گیا، وہ اٹھ گئے، اور وضوء کر کے واپس آئے، پھر ایک حدیث بیان فرمائی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ شیطان کی طرف سے ہے، شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، اس لئے جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وضوء کر لینا چاہئے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۸۴) ___ معلوم ہوا کہ وضوء بھی غصہ پر قابو پانے میں ایک مؤثر طریقہ ہے، روحانی طور پر تو وضوء میں غصہ فرو کرنے کی تاثیر ہوگی ہی، کیوں کہ یہ ارشادِ نبویؐ ہے اور آپ ﷺ کے ارشاد سے بڑھ کر صحیح و درست بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن علاوہ اس کے نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ پانی کی ٹھنڈک جسم کی حرارت، تکان، اور غیر معتدل کیفیت کو دور کرنے اور معتدل بنانے میں بہت مؤثر ہوتی ہے، امام غزالیؒ نے کچھ اور تدبیریں بھی غصہ پر قابو پانے کی بتائی ہیں، ان میں یہ ہے کہ غصہ پر قابو پانے کے فضائل سے متعلق آیات و احادیث کو اپنی نگاہ میں رکھے، اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے، غصہ سے انجام کار عداوت و انتقام کی جو آگ فریق مخالف کے دلوں میں سلگے گی اس کو اپنے ذہن میں مستحضر کرے، غصہ کے وقت آدمی کی صورت میں جو بگاڑ آتا ہے اس کو ذہن میں لائے، اور سوچے کہ گویا وہ اس کیفیت میں ایک کاٹ کھانے والے کتے اور حملہ کرنے والے درندے کی طرح ہے، وغیرہ (احیاء العلوم: ۳/۱۷۴-۱۷۳)

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تدابیر کا حاصل اور غصہ پر قابو پانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خدا کا خوف ہے، خدا سے بے خوفی انسان کو ظلم پر جری بناتی ہے، اور خدا کا خوف انسان کے بے قابو جذبات کو تھام لیتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جن کو زیادہ

غصہ آتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ احکام خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں بھی ان کی کوئی مثال نہیں تھی، اسی لئے ان کے بارے میں لوگوں نے لکھا ہے: **کان وقافا عند کتاب الله** ایسا بھی ہوا کہ آپؓ نے کسی شخص کو اس کی غلطی کی بناء پر کوڑے لگانے کا حکم دیا، اس نے آیت قرآنی پڑھ دی کہ "عفو درگذر" کو اختیار کرو۔ بھلائی کا حکم دو، اور ناواقف لوگوں سے گریز برتو۔ "**خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاهلين**" (اعراف: ۱۹۹) حضرت عمرؓ نے ایک لمحہ غور فرمایا اور اس کو چھوڑ دیا۔ (احیاء العلوم: ۱۷۳/۳) اگر سینہ میں خوفِ خدا کی آگ موجود ہو، تو وہ غصہ کی آگ کو کھا جائے گی، اور اگر دل خوفِ الٰہی سے خالی ہو تو غصہ کی آگ اسے کھا جائے گی دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ غصہ برائیوں کی جڑ ہے اور غصہ پینا سب سے بڑی بہادری۔

(۱/۱ اکتوبر ۱۹۹۹ء)

گداگری اور اس کا سدِّ باب

آج کل ہماری مسجدوں، مذہبی مقامات اور دینی اجتماعات کی ایک پہچان گداگروں کا ازدحام اور ایک خاص لے اور دھن میں ان کی طرف سے سوالیہ کلمات کی تکرار بھی ہے، ان میں بعض کے اندر الحاح کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اور آپ کے لئے ان کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ جانا دشوار ہوتا ہے، بعض کی جرأت رندانہ بھی قابل دید ہوتی ہے، اگر آپ نے انہیں بھیک نہیں دی یا بھیک کی مطلوبہ مقدار نہیں دی، تو ان کی خشمگیں نگاہ کو سہے بغیر چارہ نہیں، کچھ ایسے فرزانے بھی ہیں جو آپ کو دو چار صلواتیں سنانے سے بھی نہیں چوکتے، وہ اس طرح سوال کرتے ہیں کہ ناواقف آپ کو ان کا مقروض سمجھ بیٹھے، مذہبی مقامات کے علاوہ سیاحتی مقامات، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ٹریفک سگنل کی جگہیں جہاں گاڑیوں کے رکنے کی نوبت آتی رہتی ہے، اس گروہ کے پسندیدہ اور مستجاب مقامات ہیں، اس لئے یہاں ان کی وافر تعداد نہ صرف یہ آموجود ہوتی ہے، بلکہ کمالِ اخلاص اور کمالِ استقامت کے ساتھ صبح کی پَو پھٹنے سے لے کر رات گئے تک اپنے محاذ پر ڈٹی رہتی ہے، پولیس والوں کا محصول اور گاہے ڈنڈوں کے ذریعہ ان کی تنبیہ اور دینے والوں کی ڈانٹ ڈپٹ ان کو نہ ملول خاطر کرتی ہے، اور نہ ان کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل آنے دیتی ہے، اس لحاظ سے ثابت قدمی میں وہ ایک نمونہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

یہ گداگری بھی انواع واقسام کے ہیں، کچھ صحت مند وتوانا، کچھ واقعی مریض اور زیادہ تر مصنوعی مریض، مریض اور معذور عام طور پر بیکار شمار کئے جاتے ہیں، لیکن اس میدان میں وہ نہایت کارآمد اور مفید ہیں، اسی لئے بہت سے صحت مند بھکاری نابینا اور معذور فقیروں کا تعاون حاصل کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کی مدد سے پتھر دلوں کو موم بنانے

کا کام انجام دیتے ہیں، ان میں بچے بھی ہیں، جوان بھی، اور بوڑھے بھی، مرد بھی ہیں اور خواتین بھی، کم سن لڑکیاں بھی جوان لڑکیاں اور سن رسیدہ عورتیں بھی گداگری کے اس پیشہ میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، ایسے گروہ بھی پکڑے گئے ہیں جو دیہاتوں اور دور دراز علاقوں سے بچوں کو پکڑ کر لاتے ہیں، اور انہیں کسی قدر معذور بنا کر ان سے گداگری کراتے ہیں، زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ گداگری کے لئے بھی جدید ذرائع کا استعمال شروع ہوگیا ہے، چنانچہ بعض فقراء انٹرنیٹ کی مدد سے عالمی سطح پر اپنی رسائی کو وسیع کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گداگروں کا یہ گروہ اس کو ایک آسان اور سہولت بخش ذریعہ معاش تصور کرتا ہے، چند ماہ پہلے اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ حیدرآباد میں گداگروں کی آمدنی کا اوسط تین تا چار ہزار روپے ماہانہ ہے، خاص خاص مواقع جیسے رمضان المبارک اور عید وغیرہ میں اس میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اس پیشہ سے دستبردار ہونے کو کسی طور تیار نہیں ہیں، اگر آپ انہیں کام کرنے کو کہیں یا خود اپنے یہاں کام کرنے کی دعوت دیں تو وہ ایسا منہ بنائیں گے کہ گویا آپ نے ان کی بے عزتی کی ہے، غرض وہ اپنے پیشہ پر قانع بھی ہیں اور مطمئن بھی، اور انہیں اس پر نہ کوئی حجاب ہے اور نہ عار، اس بات سے مزید دکھ ہوتا ہے کہ ان میں بہت ہی قابلِ لحاظ تعداد ہمارے مسلمان بھائیوں کی ہے، اور جس امت کو سب سے بڑھ کر غناء اور استغناء کی تعلیم دی گئی ہے، وہی اس اخلاقی بیماری میں پیش پیش ہے۔

اسلام سے پہلے بعض مذاہب میں مذہبی لوگوں کے لئے کسبِ معاش کی اجازت نہیں تھی، اور ان کا گزر اوقات اسی طرح ہوتا تھا، کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کریں اور لوگوں کی نذر و نیاز پر زندگی گزاریں، ہندو بھائیوں کے یہاں برہمن کے حقوق میں یہ بات شامل تھی کہ لوگ اسے دان کیا کریں، بدھشوں کے یہاں مذہبی رہنماؤں اور بھگتوؤں کو کسب معاش کی ممانعت ہے، اور وہ لوگوں کی دچھنا پر زندگی گزارا کرتے تھے، عیسائیوں کے یہاں جب رہبانیت اور ترکِ دنیا کے فلسفہ نے قبول عام حاصل کیا تو نہ

صرف مذہبی رہنما، بلکہ عوام میں بھی زاہد قسم کے لوگوں نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ وہ کسبِ معاش چھوڑ دیں اور لوگوں کے دیئے ہوئے پر اپنی زندگی گزاریں، لیکن اسلام نے اوّل روز سے ہی کسبِ معاش کو ضروری قرار دیا، قرآن نے کہا کہ اللہ کی بندگی سے فارغ ہونے کے بعد کسبِ معاش کی کوشش کرنی چاہئے، اور مال کو فضلِ الٰہی سے تعبیر کیا (الجمعہ: ۱۰/۲۸) رسول اللہ ﷺ نے خود تجارت فرمائی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اکابرِ صحابہؓ نے تجارت کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہؓ نے محنت ومزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کیں اور تلاشِ رزق کی تحسین فرمائی گئی۔

اسلام نے توکل کی تعلیم ضرور دی، لیکن لوگوں نے جو بے عملی اور فرائض سے پہلوتہی کو توکل کا نام دے رکھا تھا، اس کی اصلاح بھی فرمائی، اسلام نے بتایا کہ توکل یہ نہیں ہے کہ اسبابِ دنیا کو ترک کر دیا جائے، بلکہ توکل اسباب کو اختیار کرنے کے بعد نتائج کو اللہ پر چھوڑ دینے کا نام ہے، اس لئے کسبِ معاش توکل کے منافی نہیں، گداگری پیدا ہی اس لئے ہوتی ہے، کہ انسان کسبِ معاش کی تگ ودو سے دل چرانے لگے، اس کے سدِ باب کے لئے آپ ﷺ نے ایک طرف کسبِ معاش کی اہمیت کو واضح فرما کر گداگری کے اصل سبب کو ختم کرنا چاہا۔

اور دوسری طرف گداگری کی مذمت فرمائی، اور اسے سختی سے منع کیا، ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور کچھ سوال کیا، آپ نے ان سے فرمایا کہ تمہارے پاس کیا کچھ سامان ہے؟ اس نے کہا میرے پاس تو محض ٹاٹ اور پیالہ ہے، آپ نے وہ دونوں چیزیں منگوائیں اور ان کی ڈاک لگائی، ایک صاحب نے ایک درھم قیمت لگائی، دوسرے شخص نے دو درھم، آپ نے اسے دو درھم میں فروخت کر دیا، پھر ایک درھم میں کلہاڑی کا پھل منگایا اور کلہاڑی بنا کر اسے حوالہ کر دیا، اور ایک درھم اسے دے کر ارشاد ہوا کہ اس سے اپنی ضرورت پوری کریں، اور کلہاڑی سے لکڑی کاٹ کر لائیں اور فروخت کریں، اور ایک ماہ تک پھر کہیں بھیک مانگتے ہوئے نظر نہیں آئیں، ان صاحب نے اس ہدایت پر عمل کیا، اور ایک ماہ کے بعد اس حال میں تشریف لائے کہ کئی درھم ان کے پاس

موجود تھے، اور وہ گداگری کو چھوڑ چکے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا '' یہ بات کہ تم اپنی پیٹھ پر لکڑی کے گٹھے کاٹ کر لاؤ اور اسے فروخت کرو اس سے بہتر ہے کہ تم لوگوں کے سامنے دستِ سوال پھیلاؤ، وہ چاہیں تو دیدیں، چاہے تو نہیں دیں۔

اس طرح کے بعض اور واقعات بھی منقول ہیں، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ دو شخص خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور کچھ طلب کیا، آپ نے مشورہ دیا کہ جنگل جاؤ لکڑی کاٹو اور اسے فروخت کرو، انہوں نے ایسا ہی کیا، پہلے لکڑیاں بیچ کر کھانے کی اشیاء خریدیں، پھر سونا خریدکیا، پھر سواری کے لئے گدھے خرید کئے، اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کے حکم میں برکت رکھا ہے۔

(مجمع الزوائد: ۹۴/۳)

آپ ﷺ نے سوال کرنے سے صحابہ کو اس درجہ منع فرمایا اور اس کی تعلیم دی کہ وہ معمولی چیزیں مانگنے سے بھی احتراز کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ اگر اونٹنی کا لگام نیچے گر جاتی، تو اونٹنی کو بٹھاتے اور خود لگام لیتے، لگام بھی دوسروں سے مانگنے کے روادار نہیں ہوتے۔ (حوالہ سابق) یہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا نتیجہ تھا، حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ دونوں کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے عہد لیا کہ کسی سے سوال نہ کریں، یہاں تک کہ اگر کوڑا نیچے گر جائے تو وہ بھی دوسرے سے نہ مانگیں۔

(مجمع الزوائد: ۹۳/۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص مستغنی ہونے کے باوجود سوال کرے، وہ اپنے لئے جہنم کی چنگاریوں میں اضافہ کر رہا ہے، دریافت کیا گیا: مستغنی ہونے سے کیا مراد ہے؟ ''وَمَا ظَهرَ غِنِیٌ'' ارشاد ہوا: جس کے پاس رات کا کھانا موجود ہو، (حوالۂ سابق) گویا جس شخص کے پاس ایک وقت کا کھانا موجود ہو اس کے لئے دستِ سوال دراز کرنا روا نہیں، حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سوال قیامت کے دن صاحبِ سوال کے چہرے پر خراش کی صورت میں ظاہر ہوگا، اب جو چاہے اسے اپنے چہرہ پر باقی رکھے، (حوالۂ سابق: ۹۶) اور حضرت حبشی بن جنادہ رضی اللہ عنہ کی روایت

میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس نے فقر ومحتاجی کے بغیر سوال کیا، گویا وہ چنگاری کو کھاتا ہے، (حوالۂ سابق) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ پیسہ رکھنے کے باوجود سوال کرنا قیامت کے دن اس کے چہرے پر عیب کی صورت اختیار کرلے گا، **کانت شینا فی وجهه یوم القیامة** (حوالۂ سابق) غور کیجئے کہ دنیا کی چندروزہ زندگی میں اگر چہرے پر بدنما دھبہ آجائے تو انسان اس کو دور کرنے کے لئے کتنا پریشان ہوتا ہے، آخرت کی دائمی زندگی میں جب اہلِ جنت خوبصورت ترین شباہت میں ہوں گے، انسان کو اپنے عیب دار اور داغ دار چہرے پر کتنی شرمساری ہوگی، خاص کر ایسی صورت میں کہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ رنگ ونور کی اس بستی میں کوئی شخص اتفاقی اور پیدائشی طور پر بدصورت نہیں ہے، بلکہ اس کی بدصورتی اس کی بداعمالیوں کا عکس ہے، کتنا عجیب ہے کہ بننے سنورنے والا انسان اس دائمی بدروئی اور بدصورتی کے بارے میں فکرمند نہ ہو!

گداگری فقر واحتیاج کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کا اصل سبب تن آسانی وسہل انگاری، اور مفت خوری وبطن پروری کی خو ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ انسان نے حیاء اور غیرت کی چادر کو تارتار کردیا ہے، اگر انسان میں قوتِ ارادی اور خودداری ہو اور اپنی عزت وآبرو عزیز ہو، تو وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلا سکتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے آپ کو عفیف وآبرومند رکھنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے عفیف رکھتے ہیں، اور جو مستغنی رہنا چاہے اللہ تعالیٰ اسے استغنا عطا فرماتے ہیں، (مجمع الزوائد: ۹۵/۳، بحوالہ مسند احمد) __ خودداری کے اسی مزاج کو باقی رکھنے کے لئے اسلام نے زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کیا، کہ لوگ بیت المال میں زکوٰۃ جمع کریں، اور بیت المال ضرورت مندوں کا حسبِ ضرورت تعاون کرے، کیوں کہ سرکاری ادارہ سے کوئی مدد حاصل کرنے کی صورت انسان کا جذبۂ خودداری ختم نہیں ہوتا اور حجاب وحیاء کی کیفیت باقی رہتی ہے، جب انسان ایک دوسرے سے سوال کرنے لگتا ہے تو پہلے زبان کھولے نہیں کھلتی، دل پر پتھر رکھ کر اپنا مطلب پھیلاتا ہے، تو نہ آنکھوں میں خجالت کی کیفیت ہوتی ہے، نہ زبان کو اظہارِ مدّعا میں کوئی جھجک باقی رہتی ہے، اور نہ ہاتھ کو لوگوں کے سامنے دراز ہونے میں

کوئی عار۔

کسی بھی قوم کے لئے یہ بات نہایت شرمناک ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے جو قوم کے مستقبل ہوتے ہیں، جوان مرد و عورت جن میں محنت اور تگ و دو کی صلاحیت ہوتی ہے، جو قوم کا اثاثہ اور اس کے ہاتھ پاؤں ہیں، ان میں بے عملی اور بے ضمیری پیدا ہو جائے، اس سے زیادہ قابلِ افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

گداگری کے سدِّ باب کے لئے مثبت اور منفی اقدامات کی ضرورت ہے، مثبت اقدام یہ ہے کہ ایسے بچوں کو تعلیم میں لگایا جائے، بہت سے سرکاری وغیر سرکاری ادارے ہیں جہاں بچوں کی مفت تعلیم کا انتظام ہے، انہیں ایسے اداروں میں پہنچایا جائے، جو خواتین اور مرد کام کرنے کے لائق ہیں انہیں مزدوری پر لگایا جائے، آج کل مزدوروں کی کھپت بہت زیادہ ہے، اصل دشواری تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لئے ہے، اور گداگری کے پیشہ میں زیادہ تر ناخواندہ اور ان پڑھ لوگ ہیں، انہیں محنت مزدوری پر آمادہ کیا جاسکتا ہے، جو لوگ واقعی جسمانی اعتبار سے معذور ہوں ان کے لئے اقامت گاہیں قائم کی جائیں، یا گورنمنٹ کی طرف سے بنے ہوئے رفاہی اداروں تک ان کو پہنچایا جائے۔

منفی اقدام سے مراد یہ ہے کہ گداگری کی حوصلہ شکنی کی جائے، مسجدوں اور درگاہوں کے ذمہ داران انہیں وہاں بیٹھنے اور بھیک مانگنے سے روکیں، مذہبی اجتماعات، جمعہ و عیدین کے مواقع پر بھی انہیں بھیک مانگنے سے منع کیا جائے اور ان کی حوصلہ شکنی کی جائے، ان کو بھیک نہیں دی جائے، یہ بھیک مانگیں تو کام کرنے کی ترغیب دی جائے، اس طرح ان کی حوصلہ شکنی ہوگی، اور یہ باعزت طریقہ پر کمانے کے عادی ہوں گے بہت سے لوگ جمعہ وغیرہ میں کھلے پیسے لے کر آتے ہیں، اور روپیہ دو روپیہ ہر فقیر کو دیتے چلے آتے ہیں، بہ ظاہر یہ کارِ خیر ہے، لیکن بالواسطہ یہ اپنی قوم کے ایک گروہ کو گداگری کا عادی بنانا ہے، اس لئے اس سے اجتناب ہی قوم کے مفاد میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہمارے سامنے موجود ہے، کہ ایک طرف آپ نے بھیک

مانگنے والوں کو دینے سے انکار کر دیا، اور دوسری طرف انہیں محنت ومزدوری کر کے اپنی ضروریات پوری کرنے کی ترغیب بھی دی، اور اس کی تدبیر بھی فرمائی، اگر ہم اپنی قوم کو اس لعنت سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی ان میں یہ مزاج پیدا کرنا ہوگا، کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے بہا کر کمائیں اور آدھے پیٹ کھائیں، لیکن دوسروں کے سامنے سوال کے ہاتھ پھیلا کر بے آبروئی کا راستہ اختیار نہ کریں!!

(۲۳/اگست/۲۰۰۲ء)

فضول خرچی ــــ روز افزوں بیماری

عام طور پر لوگ معاشی قوت کا راز اس بات کو سمجھتے ہیں کہ آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو اور اسے دس ہزار کے پندرہ ہزار ملنے لگیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ معیشت کے استحکام کا تعلق آمدنی سے بھی ہے اور خرچ سے بھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کمانے سے زیادہ مشکل اور اہم خرچ کرنے کا فن ہے، اگر انسان اپنی زندگی کا ایک نظام بنائے اور خرچ میں اپنے آپ کو اس کا پابند رکھے، تو نسبتاً کم آمدنی کے ساتھ بھی وہ اپنے سے زیادہ کمانے والوں کے مقابلہ خوشگوار اور خوش حال زندگی گذار سکتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن اُمور میں پیسے خرچ کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے، اس کے چار حصے کرے: بہت ضروری، ضروری، نہ ضروری اور نہ غیر ضروری، غیر ضروری، غور کیا جائے تو انسان ان چاروں مدات سے گذرتا ہے، ''بہت ضروری مصارف'' کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، جیسے کھانے پینے کی اتنی مقدار جو آدمی کی بقا کے لئے ضروری ہے، سادگی کے ساتھ علاج و معالجہ، بچوں کی کفایت کے ساتھ تعلیم، فضول خرچی سے بچتے ہوئے شادی بیاہ، یہ انتہائی ضروری اخراجات ہیں، ''ضروری مصارف'' میں مناسب اور طبیعت کے لئے موزوں کھانے پینے کا نظم، بہ قدرِ ضرورت سواری، سہولت بخش علاج، سماجی مزاج سے ہم آہنگ بہ قدرِ ضرورت کپڑے وغیرہ داخل ہیں، ان کو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں ''حاجت'' کہتے ہیں، تیسرا درجہ ایسی چیزوں کا ہے جو ضروری نہیں، لیکن انسان مختلف شعبہ ہائے زندگی میں سہولت کے لئے ان کا طالب ہوتا ہے: جیسے آرام دہ سواری، ایک حد تک راحت بخش علاج وغیرہ، یہ ضروریات نہیں ہیں، البتہ ''جائز خواہشات'' ہیں اور فقہ اسلامی کے ماہرین کی زبان میں ''تحسینات'' ہیں، چوتھا درجہ ایسی چیزوں کا ہے، جو بالکل غیر ضروری اور فضول

ہیں، جیسے مکانات میں حد سے زیادہ تزئین و آرائش، کپڑوں میں بہت قیمتی ملبوسات کا انبار، کھانے پینے میں ایسی فضول خرچی کہ دس آدمی کے کھانے کی جگہ بیس آدمی کا کھانا پک جائے، آدھا استعمال ہو اور آدھا ضائع ہو، شادی بیاہ میں ہزاروں روپے کے کارڈ کی طباعت پر خرچ کر دینا، شادی خانہ کی بہت زیادہ آرائش، دعوت میں کئی طرح کے میٹھے، سواریوں میں ضرورت ایک گاڑی سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن کئی کئی گاڑیوں کا رکھنا اور جب کسی نئے ماڈل کی گاڑی آئے تو بلا ضرورت جدید سے جدید تر کا شوق فرمانا، یہ سب فضول خرچی اور اسراف کے دائرہ میں آتا ہے۔

جو چیزیں بہت ضروری ہیں، ان میں کمی نہیں کی جاسکتی، جو چیزیں ضروری ہیں، زندگی میں سادگی اپنا کر اور اپنے آپ کو سادہ زندگی کا عادی بنا کر اس میں بھی کسی قدر کمی کی جاسکتی ہے، تیسرے درجہ میں جو چیزیں ہیں، ان سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، زیادہ تر حرص و ہوس اور خواہشات کا لامتناہی سلسلہ آدمی کو نت نئی آسانیوں کا قیدی بنا لیتا ہے اور یہ آسانیاں انسان کو اسراف اور فضول خرچی کی طرف لے جاتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اپنے لئے سادہ زندگی کو پسند فرمایا اور مسلمانوں کو اسی کی ترغیب بھی دی، آپ ﷺ کا مکان، آپ ﷺ کا لباس، کھانا پینا، بستر، رہن سہن، غرض پوری زندگی سادگی اور کفایت شعاری کا نمونہ تھی، خوب سے خوب تر کی خواہش بھی ایک بیماری ہے، بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، قرض خواہوں سے چھپے پھرتے ہیں، صبح و شام قرض خواہ دروازہ پر دستک دیتا ہے، تقاضہ کرتا ہے، صلواتیں سناتا ہے، سرراہ بے آبرو کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی نئی چیز بازار میں آگئی، تو باوجود اس قرض کے وہ اس کے لئے بے قرار سا ہو جاتا ہے، چاہے اس سے اس کے قرض میں کتنا بھی اضافہ ہو جائے؟ گویا یہ ایک نشہ ہے، جو اپنے مخمور کو ہوش کے ناخن نہیں لینے دیتا۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ دنیا ضروریات پوری کرنے کی جگہ ہے اور آخرت خواہشات کی تکمیل کی جگہ، آخرت اسی لئے بنائی گئی ہے، کہ جنت میں جانے کے بعد جنتی جو چاہے وہ بھرپور طریقہ پر اور فوراً اسے مہیا کر دی جائے "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي

اَنۡفُسُكُمۡ" (حم السجدہ:۳۱) دنیا خواہشات کی تکمیل کی جگہ نہیں ہے، بلکہ ضروریات پر اکتفا کرنے کی جگہ ہے، یہاں انسان کا اپنی خواہشات کا غلام بن جانا منزل کو بھول کر راستہ کو مقصد بنا لینے کے مترادف ہے، لیکن افسوس کہ انسان اسی کیفیت میں مبتلا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے خوب فرمایا کہ قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں جو انسان کے پیٹ کو بھر سکے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنی زندگی کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے اور دیکھے کہ وہ کہاں ضروریات کی حد سے آگے بڑھ کر خواہشات کے دام میں گرفتار ہو چکا ہے اور اپنی زندگی میں سادگی لانے کی کوشش کرے، آپ سادہ زندگی گذار کر اپنے سماج میں زیادہ باعزت رہ سکتے ہیں اور اپنے آپ کو پُرسکون بھی رکھ سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ آپ کے پاس عمدہ سواری نہ رہے، آپ کے گھر میں دیدہ زیب فرنیچر نہ ہو، لیکن آپ کے دراوزہ پر کوئی قرض وصول کرنے والا دستک نہ دے رہا ہو اور نہ کوئی آپ کے نادہندہ ہونے کی شکایت کرنے والا ہو، تو آپ باعزّت طریقہ پر سماج میں زندگی گذار سکیں گے اور آپ ذہنی تناؤ کی کیفیت سے محفوظ رہیں گے، یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

اخراجات کا وہ طریقہ جسے میں نے "غیر ضروری اور فضول" سے تعبیر کیا ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے گناہ اور ناجائز ہے، قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر فضول خرچی کی ممانعت کی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اسراف نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے: "لَا تُسۡرِفُوۡا اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ" (الانعام: ۱۴۱) ایک اور موقع پر فضول خرچی سے روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں "اِنَّ الۡمُبَذِّرِيۡنَ كَانُوۡا اِخۡوَانَ الشَّيَاطِيۡنَ" (الاسراء: ۲۷) فضول خرچی دو طریقوں پر ہوتی ہے، ایک یہ کہ بے جا مصرف میں پیسے خرچ کئے جائیں، جیسے ضرورت سے زیادہ روشنی میں، آتش بازی میں، گانے بجانے میں، دکھاوے کے اظہار اور زیادہ تشہیر میں، حد یہ ہے کہ بعض لوگ حج کے لئے جانے اور آنے کے موقع سے بھی کثیر رقم خرچ کر کے اخبارات میں مصور اشتہار طبع کراتے ہیں، یہ سب

بے محل خرچ ہیں، جو شرعاً جائز نہیں، بے محل خرچ کرنے کو قرآن نے ''تبذیر'' سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ تبذیر ناحق اُمور میں خرچ کرنے کا نام ہے، **الانفاق فی غیر حق** (تفسیر ابن کثیر: ۳۶/۳) فضول خرچی کی دوسری صورت یہ ہے کہ جن چیزوں میں خرچ کرنا چاہئے، انہیں میں خرچ کیا جائے، لیکن ضرورت سے زیادہ کھانا ایک غیر ضروری چیز ہے، لیکن اسی میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے، لباس و پوشاک دین میں مطلوب ہے، لیکن اسی میں تفاخر آمیز کپڑے بنانا اور ایک جوڑے کی جگہ دس جوڑے کا اہتمام کرنا فضول خرچی ہے اور اسی کو قرآن نے ''اسراف'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اسلام فضول خرچی کو نہایت ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس نے ہر باب میں فضول خرچی کو منع کیا ہے، حضرت سلمان فارسیؓ سے مروی ہے کہ دنیا میں جو جتنا زیادہ آسودہ ہو کر کھاتا ہوگا، قیامت کے دن وہ اسی قدر بھوکا ہوگا ''**ان اکثر الناس شبعا فی الدنیا اطولهم جوعا یوم القیامة**'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۳۹۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو کچھ طبیعت چاہے اسے کھا گذرنا اسراف ہی کی ایک صورت ہے، ''**ان من السرف ان تاکل کل ما اشتهیت**'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۳۹۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا کہ کھاتے ہوئے اگر کوئی لقمہ ہاتھوں سے گر جائے، تو اُسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے، معمولِ مبارک تھا کہ اگر کوئی ٹکڑا گر جاتا تو اسے اٹھاتے، پونچھتے، پھر اسے تناول فرماتے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۳۹۶) لباس و پوشاک میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال اور میانہ روی کی تلقین فرمائی، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے شہرت اور دکھاوے کا لباس پہنا، اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ذلت و رسوائی کا لباس پہنائیں گے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر ۳۶۵۳) ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور پہنو، البتہ فضول خرچی نہ ہو اور تکبر نہ ہو، (ان ماجہ، حدیث نمبر ۳۶۵۰) اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسیار خوری کو بھی بہت ناپسند فرمایا ہے۔

نہ صرف کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا، بلکہ دینی امور میں بھی آپ ﷺ نے فضول خرچی کو پسند نہیں فرمایا، ثابت بن قیسؓ نامی ایک صحابی نے ایک دن پانچ سو کھجور کے درختوں کے پھل کاٹے اور اسی دن پورے تقسیم کر دیئے، اہل وعیال کے لئے کچھ نہیں رکھا، تو آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور اسی موقع سے حکمِ ربانی نازل ہوا: و لا تسرفوا، (الجامع لاحکام القرآن: ۷/۱۱۰) یہاں تک کہ آپ وضو اور غسل میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال نہیں فرماتے، غسل ایک ''صاع'' پانی سے کرتے، جو تین لیٹر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور اس کے چوتھائی پانی سے وضو فرماتے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص نہر کے پاس ہو جب بھی وضو میں ضرورت سے زیادہ پانی کے استعمال سے گریز کرے اور ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے نہر کے پاس برتن میں پانی لے کر وضو فرمایا اور جو پانی بچ رہا اسے دوبارہ نہر میں ڈال دیا۔ (مجمع الزوائد: ۱/۲۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسراف اور فضول خرچی نے ہمارے سماج کو ایک ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے جس کی سزا معاشرہ کا ہر شخص بھگت رہا ہے، کیوں کہ جب کسی معاشرہ میں فضول خرچی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، تو لوگ خواہی نہ خواہی اس معیار کو پورا کرنا چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے کتنی بھی مشقت اٹھانی پڑے، فضول خرچی جہاں ایک شخصی مرض ہے، وہیں ایک قومی مرض بھی ہے، غور فرمایئے کہ اس وقت ہندوستان کے ذریعۂ آمدنی میں سب سے بڑا ذریعہ قرض ہے، ملک کی مجموعی آمدنی کا پچیس فیصد قرض سے حاصل ہوتا ہے اور اخراجات کی سب سے بڑی مد بیرونی سود کی ادائیگی ہے، کہ کل بجٹ کا ستائیس فیصد صرف بیرونی سود کی ادائیگی پر خرچ کیا جاتا ہے، عالمی مالیاتی بینک کی رپورٹ کے مطابق اس وقت ہر ہندوستانی بچہ جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، وہ دس ہزار روپے کا مقروض ہوتا ہے، ان بڑھتے ہوئے اخراجات کی سب سے بڑی وجہ سرکاری اخراجات میں بڑھتا ہوا اضافہ ہے، ۱۹۹۸ء ۱۹۹۹ء میں قریب ستائیس لاکھ کروڑ روپے صرف ہندوستانی حکمرانوں کے اخراجات ہیں، ۱۹۹۷ء میں مرکزی انتظامیہ کی تنخواہ اور الاونس کی مد میں تقریباً پینتالیس ہزار کروڑ کا اضافہ ہوا اور ۱۹۹۹ء میں یہ اضافہ کئی چند ہو چکا ہے۔

اسی طرح الیکشن کا معاملہ ہے: تیرہویں لوک سبھا کے انتخاب میں الیکشن کمیشن کا اندازہ ہے کہ ایک ہزار کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور سیاسی پارٹیاں بھی اتنی ہی مقدار میں سفید سرمایہ (White Money) خرچ کریں گی، لیکن مبصرین کا اندازہ ہے کہ امیدواروں کی طرف سے جائز و ناجائز رقم ملا کر پچاس ہزار کروڑ سے کم اخراجات نہ ہوں گے، اس طرح اندازہ کیجئے کہ ہمارے ملک کی مقننہ کے بننے میں اور پھر مقننہ کی شاہ خرچی میں قوم کا کتنا کثیر سرمایہ ضائع ہو رہا ہے؟ یہ قومی فضول خرچی کا ایک کھلا ہوا اور سادہ سا حساب ہے، سرکار تو جو فضول خرچی کرتی ہے، وہ کرتی ہی ہے، نجی کمپنیوں کا حال بھی اس سے کچھ کم بُرا نہیں، مثلاً ورلڈ کپ ۱۹۹۹ء میں ملک کی مختلف کمپنیوں نے اس کرکٹ میچ کے اشتہار اور اس اشتہار کے پسِ پردہ اپنی تشہیر پر نو سو کروڑ روپے خرچ کئے ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صرف شخصی اور انفرادی بلکہ قومی اور اجتماعی سطح پر بھی فضول خرچی کی بیماری کس قدر روز افزوں ہے؟ ایک ایسا ملک جو تعلیم اور صحت جیسی اہم ضروریات پر اپنے بجٹ کا دس فیصد بھی خرچ کرنے کے موقف میں نہ ہو اور ایک ایسا ملک جس میں کروڑوں انسان خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرتے ہوں، ہزاروں افراد کے پاس سر چھپانے کے لئے جگہ نہ ہو، ایک وقت کھانے کے بعد دوسرے وقت کھانے کا انتظام نہ ہو اور جو قوم اپنے ہزاروں کم عمر اور معصوم بچوں کو ہوٹلوں میں برتن دُھونے اور اس طرح اپنی روزی کمانے پر مجبور ہو، کیا اُسے یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پانی بلکہ گندے اور آلودہ پانی کی طرح پیسے بہائیں؟؟

(۲۰ راگست ۱۹۹۹ء)

اپنے روپئے آپ نہ جلائیے!

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اکثر نعمتوں کو متضاد صفتوں کا حامل بنایا ہے، ''ہوا'' انسان کے لئے ہمہ وقتی ضرورت ہے، لیکن اگر یہ آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کرلے، تو پُر رونق آبادیوں کو تاخت و تاراج کر کے چھوڑ دیتی ہے، پانی انسان کے لئے کتنی عظیم الشان نعمت ہے، لیکن یہی پانی جب سیلِ رواں بن کر کھیتوں کو اجاڑتا، درختوں کو اکھاڑ پھینکتا اور مکانوں کو غرقاب کرتے ہوئے زمین بوس کرتا چلا جاتا ہے، تو ایسی آفت بن جاتا ہے کہ کیا انسان اور کیا حیوان، سب جائے پناہ ڈھونڈتے رہتے ہیں، اور کتنے ہی انسان سیلاب کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

اسی طرح آگ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، گو آگ کے نام سے گھبراہٹ ہوتی ہے، اور اس کی جلانے اور خاکستر کر دینے کی صلاحیت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، لیکن غور کیا جائے تو انسان کے بے شمار مفادات آگ سے متعلق ہیں، یہ آگ ہی ہے جو نوع بہ نوع خوش ذائقہ غذائیں ہمارے لئے فراہم کرتی ہیں، آج جتنے کارخانے چل رہے ہیں، اور ایک سے ایک سہولت کی اشیاء ہمیں فراہم کر رہے ہیں، یہ سب آگ ہی کی کرشمہ سازی ہے، آگ سے بھاپ تیار ہوتا ہے، اور بھاپ سے مشینیں چلتی ہیں، لیکن قدرت کی دوسری نعمتوں کی طرح یہ نعمت بھی کبھی رحمت کے بجائے زحمت بن جاتی ہے، اگر کسی آبادی میں آتش فشاں پھوٹ جائے، تو انسان اور حیوان کیا، پہاڑ کی چٹانیں بھی سوکھے ہوئے پتوں کی طرح فضاء میں بکھر جاتی ہیں، اور کسی آبادی میں آگ لگ جائے تو دیکھتے ہی دیکھتے پوری آبادی خاک بلکہ خاکستر کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ تو قدرتی آفات ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنے آپ آگ کو ایک آفت بنالے، تو

اس سے زیادہ بے وقوف اور بدنصیب اور کون ہوگا؟ بعض لوگ تو غصہ یا مایوسی کی وجہ سے خودسوزی کر لیتے ہیں، دنیا میں بھی ان کی موت بڑی کربناک ہوتی ہے، اور آخرت میں خودکشی کا گناہ اس کے علاوہ ہے، جان کی طرح مال بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے، مال نہ صرف دنیا میں انسان کے جینے کا سہارا اور اس کے بقاء کا ناگزیر ذریعہ ہے، بلکہ آخرت میں بھی اجر وثواب اور گناہوں کی تلافی کا باعث ہے، بہت سی عبادتیں جو فرض کی گئی ہیں، خالصاً مالی ہیں، صدقہ صرف عبادت ہی نہیں، بلکہ گناہ کے لئے کفارہ بھی ہے، مال ہی کے ذریعہ بہت سے حقوق وواجبات ادا ہوتے ہیں، جن کا ادا کرنا باعثِ ثواب اور جن سے غفلت برتنا باعثِ گناہ ہے۔

خودسوزی کے تو بہت سے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، لیکن مال سوزی اور اپنا مال آپ جلانے کے واقعات شاذ ونادر ہی پیش آتے ہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اپنا مال آپ جلالے تو لوگ اسے پاگل اور دیوانہ ہی سمجھیں گے، لیکن مال سوزی کی کچھ ایسی صورتیں بھی ہیں جو ہیں، تو پاگل پن ہی، لیکن معاشرہ انہیں پاگل نہیں کہتا، شادیوں میں جو پٹاخہ بازیاں ہوتی ہیں، کیا یہ اپنے پیسوں کو آپ جلانا نہیں ہے؟ شبِ براءت ایک مبارک رات ہے، عبادت اور ذکر وتلاوت کی رات ہے، لیکن کیا مسلمان محلوں میں یہ رات پٹاخوں کی گھن گرج اور آتش بازیوں کی خیرہ کردینے والی روشنیوں سے پہچانی جاتی ہے؟ ہندو بھائیوں کا ایک تیوہار دیپاولی ہے، پہلے اس رات تیل کے دیئے جلائے جاتے تھے، اس سے نہ گھر میں آگ لگتی تھی، نہ کسی کی جان کو خطرہ ہوتا تھا، نہ کمزوردل مریض کو کان پھاڑنے والی آواز سے گھبراہٹ ہوتی تھی، لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ نئی نسلوں نے تہوار منانے کے انداز بھی بدل لئے ہیں، اب مٹی کے دیوں کی جگہ بجلی کے بلب اور قمقموں نے لے لی ہے، اور آتش بازیاں اس جوش وخروش کے ساتھ ہوتی ہیں، کہ گویا آگ کا کھیل ہے، کہ کون کتنے روپے آگ میں جھونک سکتا ہے؟ ہمارے مسلمان بھائیوں کو یہ تو توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے دُکھ درد میں شریک ہوں، بھوکے ہوں تو انہیں کھانا کھلائیں، کپڑے نہ ہوں تو انہیں کپڑے پہنائیں، مریض ہوں تو ان کی عیادت کریں، لیکن دیوالی کے اس

نامعقول جوش وخروش اور آتش بازی میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، یعنی اجرو ثواب کے کام میں تو دوری اختیار کرتے ہیں، اور بارگناہ اٹھانے میں شریک وسہیم ہو جاتے ہیں۔

پٹاخہ اور آتش بازی بہ یک وقت کئی گناہوں کو شامل ہے، سب سے بڑا گناہ تو یہی ہے کہ یہ مال کا ضیاع ہے، آدمی اپنی ہر خواہش پوری کرنے لگے اور اس کے فوائد ونقصانات کو اپنے سامنے نہ رکھے، یہ بھی فضول خرچی میں داخل ہے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی ہر من چاہی چیز کھا ہی کر دم لے، یہ بھی فضول خرچی ہے، **ان من السرف ان تاکل کل ما اشتهيت** (کنز العمال، حدیث: ۷۳۶۶) کھانا پینا اور لباس جو ایک ضرورت ہے، اس میں بھی آپ ﷺ نے اسراف کو پسند نہیں فرمایا، **كلوا واشربوا وتصدقوا والبسوا مالم يخالطه اسراف او مخلية** (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۶۵۰)

اسلام میں فضول خرچی کی ممانعت کے بارے میں احکام اس قدر سخت ہیں کہ وضوء جو ایک عبادت ہے، اور اس پر رسول اللہ ﷺ نے اجر وثواب بتایا ہے، اس میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کو آپ ﷺ نے منع فرمایا، اور اسی بنیاد پر فقہاء نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، آپ ﷺ کا معمول مبارک تھا کہ وضوء ایک مد اور غسل ایک صاع پانی سے کیا کرتے تھے، ایک صاع کا وزن ساڑھے تین کیلو ہوتا ہے اور ''مُد'' اس کا چوتھائی، اس سے آپ ﷺ کی کفایت شعاری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے آتش بازی کی وجہ سے لوگوں کا آرام وسکون غارت ہوتا ہے، راستہ چلنے والوں کو دقت پیش آتی ہے، بلکہ کئی ایسے واقعات پیش آئے ہیں، کہ لوگوں کی جانیں تک چلی گئیں، یا بعض گھروں کو آگ لگ گئی، دوسروں کی ایذاء رسانی حرام اور گناہ شدید ہے، رسول اللہ ﷺ کو جب کسی گھر پر دستک دینا ہوتا تو ہتھیلیوں کے بجائے انگلیوں کے پورے دستک دیتے، تاکہ بے ہنگم اور غیر متوازن آواز نہ ہو، آپ ﷺ نے اس سے بھی منع فرمایا کہ کوئی ہتھیار لہرائے، کہ اس سے لوگوں کی ہراسانی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ آتش بازی اور پٹاخہ بازی میں ایذاء رسانی بھی ہے اور ہراسانی بھی۔

تیسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ دوسری قوموں کی مشابہت اختیار کریں، اور ان کے طور وطریق کو اپنائیں، خاص کر مذہبی معاملات میں دوسری اقوام کی مماثلت اختیار کرنا زیادہ باعثِ گناہ ہے، خوشی کے موقع پر اس طرح کی حرکتیں کرنا ہندو بھائیوں کی مشابہت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی قوم کا تشبہ اختیار کرے وہ اسی میں سے ہے، **من تشبہ بقوم فھو منھم**، مذہبی اُمور میں مشابہت کی ممانعت نسبتاً زیادہ ہے، بلکہ علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

جو فعل خود گناہ ہو، اس میں تعاون بھی گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ گناہ اور ظلم و زیادتی میں تعاون نہیں کرنا چاہیے "**لا تعاونوا علی الاثم و العدوان**" (المائدۃ:۲) اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف خود پٹاخہ بازی کرنا ممنوع ہے، بلکہ دوسروں کو پٹاخہ فراہم کرنا یا اس کی دکانیں لگانا اور اس کو فروخت کرنا بھی اس دائرہ میں آتا ہے، کیونکہ یہ سب گناہ کے تعاون میں شامل ہے۔

پھر مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکر ہے کہ آپ ﷺ کا قبلۂ اول یہودیوں کے غاصبانہ تسلط میں ہے، آپ کی مسجدیں شہید کر دی گئی ہیں، بوسنیا اور چیچنیا کی سرزمین آپ کے بھائیوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے، گجرات کا لہو ابھی خشک بھی نہیں ہو پایا ہے، کیسی کیسی ذلّت ونکبت اور پسپائی وندامت ہماری تقدیر کا حصہ بنی ہوئی ہیں، ان حالات میں بھی اگر آپ خوشی کے شادیانے بجائیں، اور اظہارِ مسرّت کے لئے آتش بازیاں کریں تو کیا ہم سے زیادہ بے حس اور بے شرم انسانیت کا کوئی اور گروہ ہوگا؟؟

(اکتوبر ۲۰۰۲ء)

رشوت —— بڑھتا ہوا ناسور!

آج کل عہدے اور مناصب باعثِ اعزاز اور ذرائع کسب سمجھے جاتے ہیں، لیکن دراصل عہدہ داروں اور ذمہ داروں کی جواب دہی عام لوگوں کے مقابلہ زیادہ ہوتی ہے، وہ اپنے بارے میں بھی جواب دہ ہوتا ہے، اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں بھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته ، یعنی تم میں سے ہر شخص اپنے دائرہ میں ذمہ دار ہے، اور جو لوگ اس کے ماتحت ہیں، وہ ان کے بارے میں جواب دہ بھی ہے، اس لئے جو لوگ کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں، اور کوئی منصب ان سے متعلق ہو، ان کی زندگی کو زیادہ محتاط اور ان کے دامنِ عمل کو زیادہ پاک و صاف ہونا چاہئے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سرکاری محصلین کو دیئے جانے والے ہدیہ کو مالِ حرام قرار دیا، هدايا العمال غلول (مجمع الزوائد: ۴؍۲۰۰)

اسی بناء پر فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جو شخص قاضی بنایا جائے یا کسی اور سرکاری عہدہ پر فائز کیا جائے، تو اسے ایسے لوگوں سے تحفہ قبول کرنا جائز نہیں، جو اس سے پہلے اسے تحائف پیش نہیں کیا کرتے تھے، یا پہلے کم یا معمولی تحفے دیتے تھے، اور اب ان کے تحائف کی مقدار اور معیار میں اضافہ ہوگیا ہو، کیونکہ تحفہ اپنے مقصد و منشا کے اعتبار سے رشوت ہوا کرتا ہے، اور اس طرح خوبصورت ناموں کا غلاف چڑھا کر ایک ناپاک اور خبیث شئی کا لین دین عمل میں آتا ہے، رسول اللہ ﷺ جو بحیثیتِ پیغمبر، انسانی نفسیات سے سب سے زیادہ باخبر اور حقیقت آگاہ تھے، آپ نے نہایت دقت نظر سے اس چھپی ہوئی انسانی بیماری کو شناخت فرمایا، اور اس کے سدِّ باب کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ سرکاری عہدیدار رہتے ہوئے لوگ اسے جو کچھ دیں، وہ اسے بیت المال میں داخل کردے،

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ابن اُمیہ، نامی قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو وصولی زکوٰۃ پر عامل بنایا، جب وہ صاحب واپس آئے، تو عرض کیا کہ میں یہ آپ ﷺ کا ہے، اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ کیا ہے، ھذا لکم و ھذا اھدی لی، آپ کو اس سے بہت ناگواری ہوئی منبر اقدس پر کھڑے ہوئے، اور لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم جب کسی شخص کو عامل بنا کر بھیجتے ہیں، تو یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ آنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے، وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تو بیٹھ کر دیکھے، کہ اسے ھدیہ کیا جاتا ہے یا نہیں؟ (بخاری، حدیث نمبر: ۷۱۷۴) ایک موقع پر خاص اہتمام سے آپ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص میری جانب سے خدمت پر مامور ہو، اور وہ ہم سے ایک دھاگہ بھی چھپائے، تو وہ حرام ہے، جسے وہ قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۵۸۱)

گویا حکمرانوں، ذمہ داروں اور عہدیداروں کو مال کے معاملہ میں زیادہ محتاط کردار ادا کرنا ہے، کیونکہ کسی عہدہ پر فائز کیا جانا اس پر کامل درجہ اعتماد اور اس کی دیانت پر پورے بھروسہ کی دلیل ہے۔ اگر وہی بے راہ روی کی راہ اختیار کرلے، اور خیانت کا ارتکاب کر بیٹھے، تو دوسروں پر کیا اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس احتیاط کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی سرمایہ تک اس کی رسائی ہوتی ہے، وہ نہ صرف اپنا بلکہ پوری قوم کے مفادات کا محافظ اور چوکیدار ہوتا ہے اور اس پر جرم کرنے اور دوسروں کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی ان ہدایات اور اسلام کی ان تعلیمات کی اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ایوان اقتدار میں رشوت ستانی اور حریص سیاست دانوں کی قوم سے غداری کے واقعات منظرِ عام پر آتے ہیں۔

موجودہ بی جے پی حکومت اسی دعوے کے ساتھ بام اقتدار پر چڑھی ہے کہ وہ ایک صاف شفاف اور مالی خیانت سے پاک حکومت فراہم کرے گی، کانگریس کو وہ ہمیشہ صلواتیں سناتی رہی ہے، اور بوفورس جیسی قد آور اور ہنگامہ خیز توپ پر بیٹھ کر اس نے اقتدار کا یہ سفر طے کیا ہے، اور اس توپ سے کانگریس کے قلعہ کو مسمار کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، لیکن افسوس اور صد ہزار بار افسوس! کہ کانگریس تقریباً چالیس سال کے سیاسی سفر کے

بعد اسکینڈ دلوں کے جس غار میں جا گری تھی، بے جے پی کے اقتدار کو تو ابھی چالیس مہینے بھی نہیں ہوئے، لیکن اس نے بدعنوانی اور قوم سے خیانت میں اس پر بھی سبقت حاصل کر لی ہے، گویا اقتدار میں سبقت کے ساتھ اخلاقی انحطاط میں بھی ہماری حکومت مسلسل سبقت حاصل کر رہی ہے، اور یہ خیانت بھی دفاع جیسے اہم معاملے میں کی گئی ہے، جس سے ملک کی سالمیت اور اس کے وقار کا تحفظ متعلق ہوتا ہے، پارٹی صدر جناب بنگارو لکشمن سے لے کر بی۔ جے۔ پی کی سب سے اہم حلیف سمتا پارٹی کے صدر جیا جیٹلی، ملک سے وفاداری کے دعویدار آر ایس۔ ایس کے لیڈر جناب گپتا، کئی فوجی جرنیل، اور کئی صف اوّل کے سیاسی قائدین اور دفاعی عہدیداران رشوت کے اس شرم ناک کیس میں ملوث پائے گئے ہیں، جب اتنی ذمہ دار شخصیتیں اور اتنے اہم معاملہ میں خیانت اور بددیانتی کا ثبوت دے سکتے ہیں، تو اوروں کا کیا شمار؟؟

کہا جاتا ہے کہ حکمرانوں کے مزاج واخلاق کا اثر ان کے زیرِ حکومت رہنے والوں پر پڑتا ہے، الناس علی دین ملوکھم: ہمارے ملک میں اس وقت قدم قدم پر رشوت ستانی کا بازار جس طرح گرم ہے، وہ اس کی ایک روشن مثال ہے، آپ راستہ سے گذر رہے ہیں، تو ٹریفک پولیس کو ''معمول'' دینا ہے، اگر کوئی معاملہ خدانخواستہ پولیس اسٹیشن کا پیش آ گیا، تو ظالم کو سزا سے بچنے کے لئے اور مظلوم کو اپنی فریاد باقی رکھنے کے لئے معمول دینا ضروری ہے، اگر آپ کی تجارت یا صنعت ہو تو ''معمولات'' کی ضرورت پڑے گی، کچھ پولیس والے، کچھ ٹیکس والے، کچھ یہ آفیسر، کچھ وہ آفیسر، زمین و جائداد کا مسئلہ ہے تو رجسٹری آفس کے کلرکوں اور ذمہ داروں کو معمول ادا کیجئے، اگر ٹرین میں آپ کا ریزرویشن کنفرم نہیں، تو وہاں ٹی ٹی آپ سے معمول مانگنے میں کوئی خجالت محسوس نہیں کریں گے، سیاست دانوں کا معاملہ ان سب سے سوا ہے، انہی عوام سے ان کے کاموں کے لئے بھی رشوت چاہئے اور جو سرکاری کام ان کی معرفت ہوتا ہے، ان میں بھی کمیشن چاہئے، ان کو تو اس آمدنی کے بغیر شاید کھانا بھی ہضم نہ ہوتا ہو اور نیند بھی نہ آتی ہو، غرض، رشوت کا ایک زنجیری سلسلہ ہے، جس نے نیچے سے اوپر تک پورے سماج کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا

ہے، چونکہ اس حمام میں سب بے لباس ہیں، اس لئے گو رشوت کا لین دین دو پہر کی دھوپ کی طرح معلوم و معروف ہے، لیکن مشکل ہی سے قانون کا شکنجہ انہیں کس پاتا ہے، کیونکہ یہ آپس میں بانٹ کر کھانے والے چور ہیں، اور وہ ایک دوسرے کو بچانے میں ہی اپنی عافیت محسوس کرتے ہیں، حد یہ ہے کہ انسداد رشوت کے ذمہ داران بھی بعض دفعہ رشوت لینے کے مجرم پائے گئے ہیں، اس لئے رشوت جو کبھی چھپ چھپا کر لی جاتی تھی، لوگ شرماتے اور گھبراتے تھے، کہ کہیں ان کی یہ کمزوری طشت از بام نہ ہو جائے، اب لوگ اسے کوئی قابلِ شرم بات نہیں سمجھتے ہیں، اور اس خلاف معمول کا نام ہی ''معمول'' پڑ گیا ہے، گویا یہ سماجی زندگی کے معمولات میں سے ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان اور رذیل سمجھے جانے والوں کے ساتھ شرفاء قوم بھی بے تکلف اس برائی میں مبتلا ہیں، اب صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں سے ان کی آمدنی دریافت کی جائے تو کہتے ہیں کہ تنخواہ اتنی ہے، اور بالائی آمدنی اتنی، یا باہر کی آمدنی اتنی، یہ بھی بے حیائی اور بے شرمی کی انتہاء ہے، کہ مجرم اپنے جرم کے اظہار میں بھی کوئی حیاء محسوس نہ کریں، اور اپنی حرام خوری پر بھی اس قدر نازاں ہوں کہ اس رذیل اور خبیث آمدنی کو بالائی آمدنی کا نام دیں، رسول اللہ ﷺ نے جن برائیوں پر لعنت فرمائی ہے، ان میں ایک رشوت کا لین دین بھی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، (ابوداؤد: ۳۵۸۰، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۳۲۴) اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رشوت کے معاملہ میں جو بچولیا ہو یعنی جس نے دینے والے اور لینے والے کے درمیان واسطہ کا کام کیا ہے، اس پر بھی لعنت ہو، **لعن رسول اللہ ﷺ علی الراشی والمرتشی والرائش** (مجمع الزوائد: ۴/۱۹۸) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: رشوت لینے والا اور دینے والا جہنمی ہے، **الراشی والمرتشی فی النار** (مجمع الزوائد: ۴/۱۹۹) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ فیصلہ میں رشوت کا لین دین تو کفر ہے۔ اور لوگوں کے درمیان رشوت ستانی ''سحت'' یعنی حرام کا کمانا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہماری تنخواہیں اتنی کم ہوتی ہیں کہ اوپر کی آمدنی کے بغیر زندگی گذر ہی نہیں سکتی، لیکن یہ محض اپنے آپ اور اپنے خدا کے ساتھ دھوکہ ہے، بہت سے لوگوں کی آمدنی آپ سے کہیں معمولی اور حقیر ہے، لیکن انہوں نے اپنا دامن حرام سے بچا رکھا ہے، اگر کوئی اور مثال ملنی دشوار ہو تو ان مولویوں ہی کو دیکھ لیا جائے، جو مساجد اور مدارس میں مصروف خدمت ہیں، اور جن کو بہت سے لوگ نشۂ دولت میں مخمور ہو کر اپنی کم نگاہی کی وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں، ان کی آمدنی کس قدر کم ہے، لیکن اس کے باوجود وہ حلال پر قناعت کے ساتھ خوش پوشی اور بے فکری کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔

دراصل مالِ حلال میں برکت ہوتی ہے، اور مالِ حرام میں بے برکتی، برکت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہزار روپے بارہ سو روپے بن جائیں، اور نہ بے برکتی کا یہ مطلب ہے کہ بارہ سو کے ایک ہزار ہو جائیں، برکت یہ ہے کہ جو کام دوسروں کا زیادہ پیسوں میں ہو، آپ کا وہی کام کم پیسوں میں ہو جائے، اور جن اخراجات طلب مصیبتوں میں دوسرا شخص مبتلا کیا جائے، اللہ آپ کو ان سے محفوظ رکھے، یہ برکت اور بے برکتی محض فلسفہ اور خیالی پلاؤ نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے انسان ہر دن سر کی آنکھوں سے دیکھتا اور عملی زندگی میں اس کا تجربہ کرتا ہے، دو شخص بیمار ہوئے، بیماری ایک ہی ہے، لیکن ایک کا علاج پچاس، سو روپے میں ہو گیا، اور دوسرے کے علاج میں ہزاروں روپے خرچ ہو گئے، ایک نے اپنی لڑکی کی شادی کی، تو لاکھوں خرچ ہو گئے، اور اس کے بھائی یا اس کے پڑوسی نے اپنی لڑکی کے لئے اسی معیار کا رشتہ کیا، اور دس ہزار میں پوری تقریب انجام پا گئی، اسی کا نام برکت ہے، اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کو ہر شخص اپنے ماحول میں دیکھ سکتا ہے، بس، چشم بینا کی ضرورت ہے، اس طرح کے واقعات محض بخت و اتفاق نہیں، بلکہ اللہ کے نظامِ غیبی کے تابع ہیں،

بعض لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ جب سارا زمانہ اس برائی میں ملوث ہے تو ایک ہمارے احتیاط کرنے سے کیا انقلاب آجائے گا؟ یہ محض ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' ہے، اگر کسی انسان کے جسم میں دس زخم ہوں، تو کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ جسم کا جو تھوڑا حصہ باقی

ہے، اسے بھی زخمی کر دیا جائے اگر کوئی خوشحال جھونپڑ پٹی میں تنگ دستوں کے درمیان پہنچ جائے، تو کیا یہ خیال آتا ہے کہ جب اتنے سارے لوگ غریب ہیں، تو میں بھی غریب ہو جاؤں اور اپنی دولت سمندر میں ڈال آؤں، یا لوگوں میں لٹا دوں؟؟___ جو چیزیں مادی اعتبار سے کراہت و ناپسندیدگی کی ہیں، ان کے بارے میں ہماری سوچ یہ نہیں ہوتی، تو روحانی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات و منہیات میں ہم کیسے ایسے خیال خام کو دخل دے سکتے ہیں، اور کیا خدائے سمیع و بصیر جو دلوں کے حال سے واقف ہے۔ ہمارے اس عذر کو قبول کر لے گا؟

رشوت دراصل غریبوں، مظلوموں اور مجبوروں کا خون ہے، جسے رشوت خور پی کر لذت کام و دھن حاصل کرتے ہیں، یہ خون بہ ظاہر لذیذ اور لطف انگیز ہے، لیکن اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے دنیا میں آفتوں اور ابتلاؤں کو دعوت دینا ہے، اور آخرت میں عذاب الیم ہے!

(۱۳/مارچ/۲۰۰۱ء)

رشوت اور ہمارا سماج

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے، انسان یکا و تنہا نہیں رہ سکتا، انسانی آبادی ہی کے ذریعے اس کی ضروریات پایہ تکمیل کو پہونچ سکتی ہیں، اگر انسان کو خوبصورت سے خوبصورت بہشت صفت پارک میں بھی رکھ دیا جائے، اور اس کے گرد و پیش دودھ اور شہد کی نہریں بھی جاری ہو جائیں، لیکن وہ ویران اور غیر آباد ہو تو انسان جلد ہی اس خطۂ عشرت سے اکتا جائے گا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھی حضرت حوا کو حضرت آدم کا رفیق و شریک بنایا اور دنیا میں نسل انسانی کے ہر فرد کو ایک پورے خاندان کی رفاقت عطا کی، جب ایک ہی جنس کے مختلف افراد جمع ہوں، تو ضروری ہے کہ ان کے مفادات میں ٹکراؤ ہو، یہ ٹکراؤ تین طرح کا ردعمل پیدا کرتا ہے، عدل، ایثار اور ظلم۔

عدل یہ ہے کہ ہر شخص قانون واصول کے مطابق اپنے حق پر راضی اور قانع رہے، اگر تمام لوگ طے کرلیں کہ وہ اپنے حق پر ہی اکتفاء کریں گے، تو ظاہر ہے کہ ان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں پیدا ہوگا، جب ایک شخص اپنے حقوق کے دائرہ سے متجاوز ہو تو یا تو دوسرا فریق اپنے بھائی کے حق میں دست بردار ہو جائے گا، یہ نہایت اعلیٰ درجہ کا وصف ہے، اسی کا نام ایثار ہے، قرآن و حدیث میں اس وصف کی بڑی تحسین کی گئی ہے، ایثار تصادم کو ختم کرنے کا بہت ہی شریفانہ طریقہ ہے، لیکن نفس کے لئے اس قدر دشوار اور مشکل بھی ہے، اور بعض معاملات تو ایسے ہیں کہ ان میں ایثار کی گنجائش بھی نہیں ہے، اگر دوسرا فریق ایثار کے لئے تیار نہ ہو، تو جو لوگ خدا ناترس ہوتے ہیں، وہ آمادۂ ظلم ہو جاتے ہیں اور دوسرے کا حق چھین لینے کی سعی نامسعود شروع کر دیتے ہیں، ظلم کے لئے جو اسباب اور وسائل اختیار کئے جاتے ہیں ان میں ایک اہم ذریعہ رشوت بھی ہے۔

کسی کو حق سے محروم کرنے یا کسی ناحق کو اپنے حق میں کرنے کے لئے جو پیسے یا کوئی اور چیزیں دی جائیں، اسی کو رشوت کہتے ہیں، **ما یعطی لابطال حق اولا حقاق باطل** (طحطاوی علی الدر: ۳/۱۷۷) ـــ رشوت کے لئے صرف مال ہی کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات دوسرے مالی یا غیر مالی فوائد پہونچا کر بھی اپنے غلط مقاصد کو حاصل کیا جاتا ہے، یہ بھی رشوت ہی میں داخل ہے، رشوت معاشرہ میں ظلم و ناانصافی کو تقویت پہونچاتی ہے، رشوت کی وجہ سے باصلاحیت لوگ محروم کردیئے جاتے ہیں، اور بے صلاحیت اور نااہل لوگ ذمہ دار بنائے جاتے ہیں، اور اس سے پورے سماج کو نقصان پہونچتا ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک طالب علم نے نااہلی کے باوجود رشوت دے کر ٹسٹ پاس کیا اور شعبۂ طِب میں داخلہ لے لیا، پھر اسی طرح میڈیکل تعلیم مکمل کی، اس کے بعد اسی سہارے ملازمت حاصل کی، اور ترقی کی منزلیں طے کی، اب یہ نااہلی کتنے مریضوں کو صحت کے بجائے موت سے ہم کنار کرے گی، اس نقصان کا اصل سِرا رشوت ہی سے ملتا ہے، آج کل تو دفاع جیسے حساس اور اہم شعبہ میں بھی رشوت کا بازار گرم ہوگیا ہے، جس کے نقصان کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، دفاع سے ملک کی سلامتی اور اس کا تحفظ متعلق ہے، اگر رشوت کی بنیاد پر غیر مفید ہتھیار خریدے گئے، تو خطرات کے مواقع پر کیسے ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کرسکیں گے، اس لئے رشوت افراد و اشخاص، معاشرہ و سماج اور قوم و ملک ہر ایک کے لئے نہایت ہی نقصان دہ اور خطرناک عمل ہے۔

شاید ہی کوئی شخص ہو، جو رشوت کی برائی کا معترف نہ ہو، لیکن دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج ہماری زندگی کا کوئی شعبہ رشوت ستانی سے خالی نہیں، اس نے باصلاحیت لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ وہ یہاں تعلیم حاصل کریں، ہنر سیکھیں اور اپنی قوم کو چھوڑ دوسرے ملکوں میں جاکر لوگوں کی خدمت کریں، اور کسی بھی شعبہ میں بے صلاحیت اور کم صلاحیت عہدہ داران اور کارکنان کی بھرمار ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ سرکاری اسکولوں اور ہسپتالوں وغیرہ سے مایوس ہوگئے ہیں، اور کارکنوں کی نااہلی اور فرض ناشناسی کی وجہ سے دنوں میں ہونے والے کام مہینوں میں بھی انجام نہیں پاتے۔

رشوت کو کسی بھی مذہب میں پسند نہیں کیا گیا ہے، اسلام کی نگاہ میں رشوت نہایت ہی قابلِ نفرت عمل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

اپنے مال آپس میں باطل طریقہ پر نہ کھاؤ اور مال حکام کے پاس نہ لے جاؤ کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ حالانکہ تم اس سے واقف ہو (البقرۃ: ۱۸۸)

اس آیت میں خاص طور پر عدالت کی رشوت ستانی کی مذمت فرمائی گئی ہے، کیوں کہ عدالت کا کام ہی انصاف قائم کرنا اور ظلم کو روکنا ہے، اگر یہ ادارۂ انصاف خود رشوت کی بنیاد پر ظلم و ناانصافی پر عمل پیرا ہو جائے، تو اس سے زیادہ بدبختی کی بات اور کیا ہو گی، نمک اس لئے ہے کہ کھانے کے ذائقہ کو درست کرے، لیکن اگر نمک ہی خراب ہو جائے تو اس کا مداوا کیوں کر ہو سکے گا؟ شکر اس لئے ہے کہ بے مزہ چیزوں کو حلاوت بخشے، لیکن اگر شکر ہی میں حلاوت باقی نہ رہے، تو کہاں سے مٹھاس حاصل ہو گی؟ یہی حال عدالت اور انصاف کے اداروں کا ہے، اس لئے سب سے زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ترین صورت محکمۂ انصاف کا رشوت میں مبتلا ہونا، یا اس کو رشوت میں مبتلا رکرنا ہے، ایک شخص وقتی طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن مآل کار یہی چیز خود اس کے لئے بھی موجب نقصان ہو سکتی ہے، کیوں کہ جو شخص آج اس سے رشوت لے کر اپنے عہدہ کو بے آبرو کر سکتا ہے، وہ کل ہو کر اس کے خلاف دوسروں سے بھی رشوتیں وصول کر سکتا ہے۔

قرآن مجید نے رشوت کی دوسری جس بدترین صورت کا ذکر کیا ہے وہ ہے، دین و ایمان کے معاملہ میں رشوت، بہت سے یہودی اور نصرانی علماء اپنے خوش عقیدہ عوام سے نذر و نیاز وصول کیا کرتے تھے، اور دین کے بارے میں انہیں دھوکہ میں رکھتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ ہوئی، تو یہی لوگ اپنی عوام کو دامن اسلام میں آنے سے رکاوٹ بنے ہوئے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ وہ مسلمان نہ ہونے پائیں، تاکہ ان کی اس حرام خوری میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بدنیتی سے پردہ اٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو! بہت سے یہودی اور عیسائی علماء ناحق طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، آپ انہیں دردناک عذاب کی ''خوشخبری'' سنایئے (التوبہ:۳۴)

مذہب کی راہ سے جو رشوت آتی ہے، وہ تقدس کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہوتی ہے، لوگوں کو اس کے رشوت ہونے کا خیال بھی نہیں ہوتا، اس مذہبی رشوت کی حقیقت جاننے کے لئے کلیساؤں کی تاریخ پڑھئے، جہاں مغفرت نامے فروخت کئے جاتے تھے، اور پادری حضرات ورثاء کے داد و دہش کے اعتبار سے میت کا درجہ و مقام متعین کر کے دستاویز بھی لکھ دیتے تھے، اسی کیفیت نے یورپ میں کلیسا کے خلاف بغاوت پیدا کی اور بالآخر یہ عیسائیت کے بجائے نفسِ مذہب سے نفرت کا باعث ہوا، مدینہ میں علماء یہود حلال وحرام کے احکام متعین کرنے میں بھی رشوت لیا کرتے تھے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ مفتی پر حسب خواہ فتویٰ لکھنے کے لئے پیسے قبول کرنا بھی حرام ہے، اور یہ بھی رشوت میں داخل ہے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ مستفتی سے کسی قسم کا تحفہ قبول ہی نہ کیا جائے، بعض فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

مذہبی رشوت کی روایت آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے، قادیانی حضرات کے یہاں آج بھی بہشتی مقبرہ، قادیان میں اصل اور دوسرے مقامات پر اس کی نقل کی شکل میں موجود ہیں، جس میں کثیر رقم لے کر تدفین کی اجازت دی جاتی ہے، اور لوگ اس تصور کے ساتھ اس میں دفن ہوتے ہیں کہ یہاں دفن ہوتے ہی اب وہ داخل بہشت ہوں گے، اسی تصور کے تحت دور دراز مرنے والے اپنی جائیداد کا ایک بڑا حصہ دے کر اس قبرستان میں جگہ حاصل کرتے ہیں، یہ مغفرت نامے تقسیم کرنے کی جدید اور مہذب شکل ہے، افسوس کہ اب مسلمانوں میں بھی یہ بیماری در آ رہی ہے، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر فلاں بزرگ کی قبر کے قریب دفن ہونے کا موقع مل جائے تو ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا، حالاں کہ انسان کا مسئلہ عقیدہ و عمل اور تعلق مع اللہ سے حل ہوگا، نہ کہ کسی مخصوص جگہ میں دفن ہونے سے، عوام

کی اس خوش عقیدگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ، بہت سی دفعہ متولیان خطیر رقم حاصل کر کے قبر کی جگہ دیتے ہیں، یہ بالکل خلاف شرع بات ہے، کیوں کہ قبرستان وقف ہے، وقف کی زمین کا کوئی شخص مالک نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اُسے خرید وفروخت کیا جاسکتا ہے، یہ غیر شرعی عمل بھی رشوت ہی کے دائرہ میں آتا ہے۔

رشوت کی ان دوصورتوں کو تو قرآن نے صراحتاً ذکر کیا ہے، لیکن رشوت جس شعبہ میں بھی ہو اس کا محرک کچھ بھی ہو اور کسی نام سے بھی لین دین ہو یہ بہر حال حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

(ترمذی بروایت عبداللہ بن عمرو، حدیث نمبر: ۱۳۳۷)

رشوت لینا تو جرم ہے ہی ، لیکن رشوت دینا بھی کچھ کم جرم نہیں ، کیوں کہ جب معاشرہ میں رشوت دینے والے لوگ پیدا ہوتے ہیں تبھی رشوت خوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے مرض کو تقویت پہونچتی ہے، حضرت ثوبان ﷺ کی ایک روایت میں ''رائش'' کے لفظ کا اضافہ ہے، (مجمع الزوائد: ۱۹۸/۴) رائش ''بچولئے'' کو کہتے ہیں، یعنی جو شخص رشوت خور اور رشوت دہندہ کے درمیان واسطہ کا کردار ادا کرے۔

بحیثیت عہدہ جو فریضہ آپ سے متعلق ہے، اگر اس کے ادا کرنے پر آپ نے پیسے حاصل کئے، خواہ منھ کھول کر مانگا ہو، یا زبان حال کو سمجھتے ہوئے دیا گیا ہو، بہر صورت یہ رشوت میں داخل ہے، رشوت نام بدل کر بھی دی جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عہدہ داروں کو دیا جانے والا تحفہ بھی مال حرام ہے، **ھدایا العمال غلول** (مجمع الزوائد: ۲۰۰/۴) __ بعض لوگ رشوت کے لئے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ سارا ماحول ہی بگڑا ہوا ہے، اور تمام ہی لوگ رشوت خوری کرتے ہیں، یہ نفس کو فریب دینے کا ایک بہانہ ہے، نہ کہ دلیل ، اگر کوئی بُرائی اس لئے جائز ٹھہرے کہ بہت سے لوگ اس کا ارتکاب کرتے ہیں تو پھر تو کوئی برائی ایسی نہ ہوگی کہ اس کو سندِ جواز حاصل نہ ہو جائے ، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں اب بھی بہت سے ایسے ایماندار لوگ موجود ہیں، جو رشوت سے اپنا دامن بچاتے ہیں، وہ خوبصورت کوٹھیوں اور فلک بوس در و بام کے مالک

نہیں ہوتے، لیکن لوگوں کے دِلوں میں ان کی عظمت کے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اب اس بُرائی کے بُرائی ہونے کا احساس بھی ذہنوں سے نکلتا جارہا ہے، لوگ بے تکلف اپنی تنخواہ اور اوپر کی آمدنی کا ذکر کرتے ہیں، اگر کسی لڑکے کے بارے میں یہ بتایا جائے کہ یہ چور اور ڈاکو ہے تو شاید ہی کوئی شخص اس سے رشتہ کرنے کو تیار ہو، لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں شخص کی اوپر کی آمدنی اتنی ہے، ماں باپ اس کی ہوش مندی کے ثناء خواں ہوتے ہیں، اور لوگ اپنی لڑکی کے لئے اس مہذب چور بلکہ سینہ زور کا انتخاب کرتے ہیں، دنیا کے لوگ خواہ بُرائی کے دلدل میں گردن تک ڈوب جائیں، مسلمانوں کے لئے بہر حال یہ بات روانہیں ہے، کہ وہ ''چلوتم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' کے فلسفہ کو اپنی زندگی کا اصول بنالیں، ان کا کام ہوا کے رُخ پر چلنا نہیں ہے، بلکہ ہوا کے رُخ کو بدلنا اور اس کو صحیح سمت دینا ہے!۔

(۲۹/مارچ ۲۰۰۲ء)

سود اور ہمارا معاشرہ

اسلام کے نظامِ معیشت کا ایک بنیادی ستون ''سود'' کی ممانعت ہے، یوں تو اسلام سے پہلے بھی اکثر مذاہب میں سود کو منع کیا گیا تھا، بائبل کا عہدِ عتیق جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مستند ہے کے ''خروج'' نامی صحیفہ میں اسرائیلیوں سے سود لینے کو منع کیا گیا ہے، اور عہدِ جدید جو صرف عیسائیوں کے نزدیک معتبر ہے، کے صحیفہ ''لوقا'' کی انجیل میں بھی قرض پر نفع نہ لینے کی تلقین کی گئی ہے، بلکہ عیسائیت میں اصلاحی تحریک کے بانی لوتھر نے تو اس بات کو بھی شد و مد سے منع کیا اور حرام قرار دیا کہ نقد قیمت کے مقابلہ اُدھار قیمت زیادہ رکھی جائے، فلاسفۂ یونان افلاطون اور ارسطو وغیرہ نے بھی سود کو ایک نامعقول اور ایک ناواجبی فعل قرار دیا ہے، کیوں کہ خود روپیہ میں روپیہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں۔

لیکن اسلام نے جس شدت اور تاکید کے ساتھ اس سے منع کیا ہے کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی، قرآن مجید میں کم از کم پانچ آیات میں صراحتاً سود کو منع کیا گیا ہے، اور یہاں تک فرمایا گیا کہ اگر تم سود سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے خبردار ہو جاؤ، (البقرۃ: ۲۷۸) احادیث میں بھی بکثرت سود کی مذمت کی گئی ہے، آپ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، سودی معاملہ کو لکھنے والے، اور ایسے معاملہ پر گواہ بننے والے، سبھوں پر اللہ کی لعنت بھیجی ہے، (مسلم، عن جابر بن عبد اللہ) کی ایک روایت میں ہے کہ سود کا وبال تہتر قسم کا ہے، جن میں سے کمتر درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے (مستدرک حاکم، عن عبد اللہ ابن مسعود) حضرت عبد اللہ بن سلام نے فرمایا کہ سود کا ایک درہم تینتیس بار زنا کرنے سے بڑھ کر ہے، (طبرانی) آپ ﷺ کے ارشادات

سے معلوم ہوتا ہے کہ سود ان بُرائیوں میں سے ہے جس کی وجہ سے دنیا میں بھی عذاب آتا ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب کسی آبادی میں زنا اور سود کی کثرت ہو جائے تو گویا اس آبادی والوں نے اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو اُتار لیا (مستدرک حاکم) اور ایک روایت میں ہے کہ جب کسی قوم میں سود عام ہو جاتا ہے تو وہ قوم قحط سالی میں مبتلا کردی جاتی ہے (مسند احمد، عن عمرو بن عاصؓ)

بہ ظاہر یوں لگتا ہے کہ سود سے مال بڑھ رہا ہے، لیکن در حقیقت سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں'' (البقرۃ: ۲۷۶) نیز حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جس نے سود سے بہت سارا مال کمایا، انجام کار اس میں کمی ہی ہوگی، (ابن ماجہ) اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سود سے بھی بچو اور شبہہ سود سے بھی بچو، ''دعوا الربوٰ والریبہ'' (ابن ماجہ) — ایک طرف سود کی اس درجہ ممانعت ہے کہ شاید شرک کے علاوہ کسی اور برائی کو اس درجہ مذمت کی گئی ہو، اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی بھی ہے کہ قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب نوشی عام ہو جائے گی، (طبرانی، عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) نیز ایک روایت میں ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی شخص سود خوری سے بچ بھی جائے تو اس کے غبار سے نہیں بچ سکے گا (ابوداؤد، عن ابی ہریرۃ) اور غالباً یہ زمانہ آچکا ہے!

سود کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی چیزوں کا تبادلہ ہو، جیسے روپیہ کا روپیہ سے، سونا کا سونا سے، چاول کا چاول سے، اور ایک طرف سے زیادہ مقدار ہو اور دوسری طرف سے کم، جیسے ایک سو روپیہ دیا جائے اور ایک سو دس وصول کیا جائے، یا ایک سو کیلو چاول دیا جائے اور ایک سو دس کیلو چاول وصول کیا جائے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول مقرر فرما دیا کہ قرض پر قرض دہندہ کا کسی بھی طرح کا نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے: ''کل قرض جر منفعة فهو ربو'' (الجامع الصغیر، عن علی) صحابہؓ اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ مقروض کا تحفہ بھی قبول کرنے میں احتیاط کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کو دس ہزار درہم بہ طورِ قرض دیئے تھے، حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ

نے اپنے باغ کا کچھ پھل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تحفۃً پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واپس کر دیا، (بخاری و مسلم) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر تم کسی کو قرض دو اور وہ تم کو کھانے کا طبق پیش کرے، یا اپنی سواری پر چڑھائے، اور پہلے سے اس طرح کے تحفے تحائف دینے کا اس کا معمول نہ رہا ہو، تو ایسے تحائف قبول نہ کرنا چاہئے، (ابن ماجہ) حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے ایک شخص کو قرض دیا اور اس نے مجھے کچھ تحفہ دیا، تو حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا تو اس تحفہ کے بدلہ میں تحفہ دے دو یا اس کو اپنے قرض میں شمار کر لو، (مصنف عبد الرزاق) اس لئے قرض دینے والوں کو اس سلسلہ میں خوب احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

افسوس کہ آج کل سود کی حرمت اور شناعت لوگوں کے ذہن سے نکلتی جا رہی ہے، بہت سے لوگ بات تو جائز اور حلال منافع کی کرتے ہیں، لیکن نقصان کا خطرہ قبول کرنے کو بالکل تیار نہیں ہوتے اور چاہتے ہیں کہ ان کا نفع بہر حال متعین رہے۔ اور سرمایہ کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ یہ فکر سود خوارانہ ذہنیت کی عکاس ہے۔ جہاں یہ بات ضروری ہے کہ اپنا سرمایہ خوب سوچ سمجھ کر کسی کمپنی میں مشغول کیا جائے اور کمپنی کے کاروبار کی پہلے تحقیق کر لی جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مسلمان اپنے ذہن کو اس بات کے لئے تیار رکھے کہ اگر اللہ کی طرف سے اس کے لئے نقصان ہی مقدر ہے تو اسے بھی وہ ہنسی خوشی برداشت کرے گا۔

سود کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں، جس میں ناواقفیت کی وجہ سے بعض دیندار لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں، ان میں ایک صورت تو بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کی ہے، یعنی: آپ ایک مخصوص مدت کے لئے بینک میں اپنی رقم رکھتے ہیں، اور اس مدت کے پوری ہونے پر بینک دوگونہ تین گونہ صورت میں یہ رقم آپ کو واپس کرتا ہے، ظاہر ہے یہ صورت صریحاً سود کے دائرہ میں آتی ہے اللہ تعالیٰ نے مطلقاً سود کو حرام قرار دیا ہے، کسی خاص خطہ اور علاقہ کی قید نہیں لگائی، اس لئے جیسے شراب، زنا، چوری اور ڈکیتی، مسلم ممالک میں بھی حرام ہیں اور غیر مسلم ممالک میں بھی، اسی طرح سود کی ممانعت بھی ہر علاقہ اور مقام کے لئے ہے اور

اس سے بچنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

آج کل شہروں میں یہ صورت مروج ہے کہ لوگ اپنا مکان ایک مخصوص مدت کے لئے فروخت کر دیتے ہیں، کہ جب بھی ہم یہ رقم واپس کر دیں، پھر مکان واپس مل جائے، مثلاً ''الف'' نے ''ب'' کے ہاتھ پچاس ہزار میں مکان فروخت کیا کہ جب بھی الف ب کو پچاس ہزار روپیہ ادا کر دے گا ب اس کو اس کا مکان واپس کر دے گا، اس معاملہ میں الفاظ تو خرید وفروخت کے استعمال کئے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے اور مکان بہ طورِ رھن کے قرض دینے والے کے پاس ہے، رہن کے سامان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، کیوں کہ یہ قرض پر نفع اٹھانا ہے اور قرض پر نفع اٹھانا سود میں داخل ہے، فقہاء کے نزدیک یہی صحیح رائے ہے، اسی طرح دیہاتوں میں مقروض اپنی زراعتی اراضی قرض دھندہ کو حوالہ کرتا ہے کہ جب تک وہ قرض ادا نہ کر دے قرض دھندہ اس کی پیداوار لیتا رہے، یہ صورت بھی سود میں داخل ہے، کیوں کہ یہ قرض پر نفع اٹھانا ہے اور اسی کا نام سود ہے۔

بعض ادارے جن کا مقصود غیر سودی قرضوں کی فراہمی ہے وہ دفتری اخراجات اور ادارہ کے انتظامات کے لئے قرض لینے والوں سے کچھ رقم وصول کرتے ہیں، اگر ہر ماہ حساب ہو جائے اور واقعی جتنی رقم قرض کے لین دین کو لکھنے والے عملہ اور قرض وصول کرنے والے عاملین پر خرچ ہوئی ہے، اس کو ان مقروضوں پر ان کے قرض کی نسبت سے تقسیم کر دیا جائے اور ٹھیک اتنا ہی پیسہ وصول کیا جائے تو اس کی گنجائش ہے، لیکن مقروضوں پر ان کی رقم کے تناسب سے ماہانہ فیس رکنیت باندھ دینا مثلاً ہزار روپے پر دس روپے ماہانہ یا بیس ہزار پر بیس روپے ماہانہ، تو یہ صورت جائز نہیں ہے اور یہ بھی سود ہی میں داخل ہے، اسی طرح قرض کے تناسب سے قرض فارم فروخت کرنا، مثلاً دس ہزار روپیہ قرض لینے والوں کو سو روپے کا قرض فارم اور بیس ہزار روپیہ قرض لینے والوں کو دو سو روپے کا قرض فارم خریدنے پر مجبور کرنا جائز نہیں، یہ صورت بھی سود میں داخل ہے، جو ادارے قائم ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ لوگوں کو غیر سودی قرضے فراہم کریں ان کے لئے ایسے طریقے

اختیار کرنا قطعاً مناسب نہیں، جو خود بالواسطہ سود کے زمرہ میں آتے ہیں۔

چِٹھی فنڈ کی یہ صورت کہ ماہ بہ ماہ ایک شخص پوری رقم اٹھالے، اور تمام شرکاء کو باری باری برابر رقم ادا کرنی پڑے، جائز ہے، لیکن یہ صورت کہ بعض شرکاء نقصان کے ساتھ چِٹھی اٹھالیں، جائز نہیں، اور سود میں داخل ہے؛ کیوں کہ یہ رقم کا رقم سے تبادلہ ہے اور بعض شرکاء کو زیادہ رقم حاصل ہوتی ہے اور بعض کو کم ___ اسی طرح تاجروں کے حلقہ میں چیک، ڈرافٹ اور کسی کے ذمہ واجب الاداء قرض کم قیمت میں فروخت کیا جاتا ہے تا کہ کم سہی، نقد رقم حاصل ہو جائے، مثلاً دس ہزار کا چیک نو ہزار میں فروخت کر دیا جاتا ہے، یہ صورت بھی سود ہی کی ہے، اور قطعاً جائز نہیں۔

اسی طرح کے بعض اور معاملات بھی ہیں جو سود سے خالی نہیں، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ دنیا حلال و حرام کی پرواہ کئے بغیر جس راستہ پر جارہی ہے ہم بھی وہی راستہ اختیار نہ کرلیں، بلکہ اپنے آپ کو سود جیسے گناہ سے بچائیں، کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جس کا گوشت مال حرام سے پیدا ہوا ہو، جہنم اس کی زیادہ مستحق ہے۔ (مشکوۃ: ۲۴۲)

(۹/اپریل/۱۹۹۹ء)

منشیات بڑھتا ہوا سماجی ناسور

انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے، ان میں ایک عقل ودانائی بھی ہے، یہی عقل ہے جس نے اس کے کمزور ہاتھوں میں پوری کائنات کو مسخر کر رکھا ہے اور اسی صلاحیت کی وجہ سے اللہ نے اس کو دنیا میں خلافت کی ذمہ داری سونپی ہے، اسی لئے اسلام میں عقل کو بڑی اہمیت حاصل ہے، قرآن مجید نے بے شمار مواقع پر مسلمانوں کو تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، تدبر اور تفکر کی حقیقت کیا ہے؟ یہی کہ انسان جن چیزوں کا مشاہدہ کرے اور جو کچھ سنے اور جانے عقل کو استعمال کر کے اس میں غور وفکر کرے، اور انجانی حقیقتوں اور ان دیکھی سچائیوں کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کرے، اسی لئے قانونِ اسلامی کے ماہرین اور فلاسفہ نے لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام بنیادی طور پر پانچ مقاصد پر مبنی ہیں، دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت، مال کی حفاظت اور عقل کی حفاظت، گویا عقل اور فکر ونظر کی قوت کو برقرار رکھنا اور اسے خلل اور نقصان سے محفوظ رکھنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے۔

چنانچہ اسلام میں جن کاموں کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور جن سے منع فرمایا گیا ہے ان میں ایک نشہ کا استعمال بھی ہے، قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ اس کو حرام بلکہ ناپاک قرار دیا ہے، کیونکہ انسان کا سب سے اصل جوہر اس کے اخلاق وکردار ہیں نشہ انسان کو اخلاقی پاکیزگی سے محروم کر کے گندے افعال اور ناپاک حرکتوں کا مرتکب کرتی ہے، اور انسان کی روحانی اور باطنی ناپاکی ظاہری ناپاکی سے بھی زیادہ انسان کے لئے مضرت رساں ہے، احادیث میں بھی اس کی بڑی سخت وعید آئی ہے، اور بار بار آپ ﷺ نے پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ اس کے

حرام اور گناہ ہونے کو بتایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے، (بخاری عن عائشہ، حدیث نمبر: ۵۵۸۵) حضرت جابر بن عبد اللہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جس شئی کی زیادہ مقدار نشہ کا باعث ہو اس کی کم مقدار بھی حرام ہے (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۸۶۵) یہ نہایت اہم بات ہے، کیونکہ عام طور پر نشہ کی عادت اسی طرح ہوتی ہے کہ معمولی مقدار سے انسان شروع کرتا ہے اور آگے بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ زہر آمیز انجکشن کے بغیر اس کی تسکین نہیں ہوتی۔

نشہ کے جو نقصانات ہیں وہ ظاہر ہیں، اس کا سب سے بڑا نقصان تو خود اس شخص کی صحت کو پہنچتا ہے، اطباء اس بات پر متفق ہیں کہ شراب اور منشیات ایک سست رفتار زہر ہے، جو آہستہ آہستہ انسان کے جسم کو کھوکھلا اور عمر کو کم کرتا جاتا ہے، انسان کی زندگی اس کے لئے ایک امانت ہے، انسان کے وجود سے نہ صرف اس کے بلکہ سماج کے بہت سے اور لوگوں کے حقوق بھی متعلق ہیں، نشہ کا استعمال اس امانت میں خیانت کرنے کے مترادف ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نشہ آور اشیاء کے ساتھ ساتھ ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا جو جسم کے لئے ''فتور'' کا باعث بنتی ہوں یعنی ان سے صحت میں خلل واقع ہوتا ہو، چنانچہ حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے: **نهى رسول الله عن كل مسكر و مفتر**

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۶۸۶)

منشیات کے نقصانات کا دوسرا پہلو مالی ہے، سیال منشیات ہوں یا جامد، قابلِ لحاظ قیمت کی حامل ہوتی ہیں، شراب کی ایک بوتل اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ خط غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کا ایک کنبہ اس سے اپنی ایک وقت کی روٹی روزی کا سامان کر لیتا ہے، یہ تو معمولی نشہ آور اشیاء کا حال ہے، بعض منشیات تو اتنی قیمتی ہیں کہ ایک کیلو کی قیمت ایک کروڑ روپے ہوتی ہے، ہماری حکومت ایک مہلوک کے لئے ایک لاکھ روپے ایکس گریشیا دیتی ہے، اس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کیلو ہیروئن کی قیمت ایک سو انسانوں کے برابر ہے، اس سے ہمارے عہد میں انسانی وجود کی ناقدری اور صحت و

اخلاق کے لئے مخرب اشیاء کی ''قدر و قیمت'' کا تقابل کر سکتے ہیں!

— پھر منشیات کا استعمال تو آدمی اپنے اختیار سے شروع کرتا ہے، لیکن جب وہ گرفتار بلا ہو جاتا ہے تو آپ اپنے قابو میں نہیں رہتا، وہ اضطراراً منشیات کے خریدنے اور استعمال کرنے پر گویا مجبور ہوتا ہے، چاہے کھانے کو دو روٹی میسر نہ ہو، گھر کے لوگ بھوک اور فاقہ سے گذار رہے ہوں، علاج کے لئے پیسے میسر نہ ہوں لیکن جو اس عادت کا اسیر ہو گا، وہ انسانی ضروریات کو پس پشت ڈال کر پہلے اپنی اس خوئے بد کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا، اس لئے اسراف اور فضول خرچی کا یہ بہت بڑا محرک ہے، نشہ خواری نے خاندان کے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، بڑی بڑی جائدادیں اور پر شکوہ حویلیاں اس خود خرید زہر کے عوض کوڑی کی قیمت بک چکیں۔

منشیات کی مضرتوں کا سماجی پہلو یہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے جس سے مختلف لوگوں کے حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہیں، ایک شخص باپ ہے تو اسے اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت کرنی ہے، نہ صرف اس کے روز مرہ کی کھانے پینے کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، بلکہ اس کی تعلیم کی بھی فکر کرنی ہے، وہ بیٹا ہے تو اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اگر خاندان کے دوسرے بزرگ موجود ہوں تو ان کی پرورش کا بار بھی اٹھانا ہے، شوہر ہے تو یقیناً بیوی کے حقوق اس سے متعلق ہیں، بھائی ہے تو چھوٹے بھائی بہنوں کی پرورش اور شادی بیاہ کا فریضہ اسی کے کاندھوں پر ہے، نشہ انسان کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر اور غافل بنا دیتا ہے، اور اس بدمستی میں نہ اس کو لوگوں کے حقوق یاد رہتے ہیں، نہ اپنے فرائض و واجبات، بعض اوقات تو وہ ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کی زندگی بھی تباہ و برباد کر دے، جیسے طلاق کے واقعات ہیں، طلاق کے بہت سے واقعات بالخصوص دیہی علاقوں میں اسی نوعیت کے ہوتے ہیں، جس کا خمیازہ اسے بھی بھگتنا پڑتا ہے اور اس سے زیادہ اس کی بیوی اور بچوں کو۔

شراب کے نقصانات کا سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، نشہ کی بدمستی انسان سے ناکردنی کرالیتی ہے، اور ناگفتی کہوا دیتی ہے، قتل، عصمت ریزی، ظلم و زیادتی سب و شتم

اور ہذیان گوئی باعزت لوگوں کی بے توقیری، کون سی بات ہے جو انسان نشہ کی حالت میں نہ کرتا ہو؟ ہوش کی کیفیت میں جس سے آنکھ ملانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی، نشہ کی حالت میں اس پر ہاتھ اٹھا دینا بھی قابلِ تعجب نہیں، اور معتدل حالت میں تنہائی میں بھی زبان پر جن باتوں کا لانا گراں خاطر ہو، نشہ کی حالت میں اس سے زیادہ فحش اور خباثت آمیز گفتگو انسان بے تکلف کرتا ہے، اسی لئے نشہ صرف برائی ہی نہیں، بلکہ برائیوں کی جڑ ہے، اور محض ایک گناہ ہی نہیں بلکہ سینکڑوں گناہوں کا سرچشمہ ہے۔

اسی لئے پیغمبرِ اسلام ﷺ نے شراب کو ''ام الخبائث'' یعنی برائیوں کی جڑ (نسائی: ۵۶۶۶) اور ''ام الفواحش'' یعنی بے حیائیوں کی جڑ قرار دیا ہے، (ابن ماجہ: ۳۳۷۲) شراب کی اخلاقی قباحتوں کی اس سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی، ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جیسے درخت سے شاخیں پھوٹتی ہیں، اسی طرح شراب سے برائیاں۔

آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی بیان فرمایا کہ ایک خوبصورت عورت نے اپنے پاس شراب رکھی اور ایک بچہ کو رکھا اور ایک شخص کو مجبور کیا کہ وہ تین میں سے ایک برائی کم سے کم ضرور کرے، یا تو وہ اس عورت کے ساتھ بدکاری کرے، یا اس بچہ کو قتل کر دے، یا شراب پئے، اس شخص نے سوچا کہ شراب پینا ان تینوں میں کمتر ہے، چنانچہ اس نے شراب پی لی، لیکن اس شراب نے بالآخر یہ دونوں گناہ بھی اس سے کرا لئے۔ (نسائی: ۵۶۶۶)

غرض نشہ جسمانی، مالی، سماجی اور اخلاقی ہر پہلو سے انتہائی مضرت رساں چیز ہے، اس وقت نوع بنوع منشیات کی کثرت اور اس کے استعمال میں جو عموم پیدا ہو رہا ہے وہ حد درجہ تشویش ناک بات ہے، لوگوں نے منشیات کو نئے نئے خوبصورت نام دے دئے ہیں، گٹکے، چاکلیٹ اور مختلف دوسری اشیاء کے ساتھ نشہ کا نام لئے بغیر تھوڑا تھوڑا نشہ آور اجزاء کا طلبہ اور نوجوانوں کو عادی بنایا جاتا ہے، اور یہی چیز اس کو آئندہ منشیات کا باضابطہ خوگر بنا دیتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا کہ میری امت میں بعض لوگ

شراب پئیں گے لیکن اس کو شراب کا نام نہیں دیں گے، **یسمونها بغیر اسمها** (نسائی: ۵۶۵۸) نیز حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس نے کسی کم عمر لڑکے کو شراب پلائی، جس کو حلال وحرام کا شعور نہیں، تو اللہ پر ضروری ہے کہ قیامت کے دن اسے لکھنا ہے۔ (جمع الفوائد: ۲/۳۷۹)

مغربی ملکوں میں شراب کی کثرت کی ایک اہم وجہ خاندانی نظام کا بکھراؤ بھی ہے، خاندانی روابط کے کمزور پڑ جانے اور رشتوں کے بکھر جانے کے باعث لوگ اپنی نجی زندگی میں ذہنی اور قلبی سکون سے محروم ہیں، اس لئے چند ساعت کے سکون کے لئے نشہ کرتے ہیں کہ کچھ تو قلب کا بوجھ ہلکا ہو، مشرقی معاشرہ میں زیادہ تر یہ چیز بغیر سمجھے بوجھے مغرب کی نقل اور فیشن کی دین ہے، اب جرائم پیشہ اور مافیا گروہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نشہ کا عادی بنا کر ان کا استحصال کرتا ہے، ان کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے آلۂ کار بناتا ہے اور ان سے نشہ کی تھوڑی مقدار کے عوض قتل وراہزنی، چوری اور عصمت فروشی کے کام لیتا ہے، تعلیم گاہوں میں منشیات کا بڑھتا ہوا رجحان ستم بالائے ستم، اور نقصان بالائے نقصان کا مصداق ہے۔

اس برائی سے سماج کو بچانے کی تدبیر یہی ہے کہ ایک طرف لوگوں کو نشہ کے نقصانات کے بارے میں باشعور کیا جائے اور اس کے نقصانات سے ہر سطح پر آگاہ کیا جائے، دوسری طرف ان اسباب پر روک لگائی جائے جو منشیات کے پھیلنے میں ممدو معاون ہیں، اگر شراب بیچنے کے پرمٹ بھی جاری کئے جائیں اور دوسری طرف شراب سے منع بھی کیا جائے تو یہ تو ایک مذاق ہوگا جہاں قدم قدم پر شراب کی دکانیں کھلی ہوں، ہوٹلوں میں شراب بیچی، خریدی جاتی ہو، سرکاری تقریبات میں جام وسبو پیش کئے جاتے ہوں، وہاں شراب کی برائی کیوں کر لوگوں کے ذہن میں راسخ ہو سکے گی، اور کیسے سماج کو اس لعنت سے نجات حاصل ہوگی؟ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلہ میں دس آدمیوں پر لعنت بھیجی ہے، نچوڑنے والے پر، نچوڑوانے والے پر، پینے والے پر، اٹھا کر لے جانے والے پر، اس پر جس کی طرف اٹھا کر لے جائی جائے،

ساقی پر، بیچنے والے پر، اس کی قیمت کھانے والے پر، خریدنے والے پر اور اس شخص پر جس کے لئے خرید کی جائے (ترمذی، حدیث: ۱۲۹۵)___ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ ملک کے حکمراں اور اربابِ اقتدار سرتاپا اس کی مضرتوں سے واقف ہیں، پھر بھی اس لئے اس پر پابندی لگانے کے حق میں نہیں کہ اس تجارت سے حکومت کو اپنی شاہ خرچیوں اور اربابِ اقتدار کو اپنی عشرت کوشیوں کے لئے ڈھیر سارا ٹیکس وصول ہوسکتا ہے؟؟

(۲۳؍جولائی ۱۹۹۹ء)

کردار کُشی

الیکشن کا طوفان تھم چکا ہے، اور ہندوستان کے اکثر علاقوں میں الیکشن کا عمل پورا ہو چکا ہے، الیکشن کے نتائج بیلٹ بکس میں بند ہیں، اور ہزاروں امیدواروں کی قسمتیں ان بند ڈبوں سے متعلق ہیں، یہ الیکشن صرف سیاسی زور آزمائی اور عوامی مقبولیت ہی کی آزمائش نہیں، بلکہ ہمارے اخلاق و کردار، زبان و بیان اور شرافت کا بھی امتحان ہیں، ہندوستان ایک ایسی سرزمین ہے، جو شروع سے مذہبی وابستگی میں ممتاز رہی ہے، بودھ مذہب ہو یا جین مت، ایران سے آیا ہوا پارسی مذہب ہو، یا خود ہندوستان میں پیدا ہونے والا سکھ دھرم، ہندو مذہب ہو یا حق و سچائی کا آخری اور مکمل ترجمان مذہب اسلام، ان سب کے نقوش اس ملک کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں، اور یہاں کی تہذیب و ثقافت ان کے گہرے اثرات سے خالی نہیں ہے، مذہب خواہ کوئی بھی ہو، اور عقیدہ و عمل میں خواہ کسی قدر بھی اختلاف ہو، شرافت، اخلاق اور انسانیت کا پیغامبر ہوتا ہے، اس لئے رواداری، مروت اور بردباری ہندوستان کی اصل فطرت ہے، اگر اس ملک کی فطرت میں یہ عنصر نہ ہوتا تو مختلف قوموں کو یہاں پناہ نہ ملی ہوتی، اور یہ تہذیبوں اور قوموں کا گلدستہ نہ بنا ہوتا۔

لیکن کیا ہم نے اپنی اس قومی روایت کو باقی رکھا ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں چاہئے کہ آپ اپنا امتحان لیں، اور خود اپنا احتساب کریں، جب حالات معتدل ہوں، اس وقت انسان کے اخلاق اور سلوک کی آزمائش نہیں ہوتی، انسان غیر معمولی حالات میں ہی پہچانا جاتا ہے، الیکشن بھی آزمائش کی کسوٹی ہے، یہ موقع، مفادات کے ٹکراؤ ،نظریات کے تصادم اور ہندوستان کی سیاست میں مختلف خاندانوں کے ہوس اقتدار کا ہوتا ہے، اس موقعہ سے ہمارے اخلاق کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، اور اندرونی جذبات ابل

پڑتے ہیں، اخلاق وانسانیت کے مصنوعی نقاب جو ہم نے پہن رکھے ہیں، تار تار ہو جاتے ہیں، اور اس کے اندر جو مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے وہ سامنے آجاتا ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے سیاسی قائدین نے کیا کچھ نہیں کہا، اور نہیں کہلایا؟ بی جے پی لیڈروں نے محترمہ سونیا گاندھی کے خلاف کیسے اوچھے ریمارک کئے، اور پھر کانگریس کے جنرل سکریٹری نے اٹل بہاری واجپئی وزیر اعظم پر کیسے ناشائستہ جوابی حملے کئے؟ ملک کی بعض دوسری خواتین امیدواروں پر بھی اخبار کی دنیا میں ایسی پھبتیاں کسی گئیں کہ شریف آدمی تنہائی میں بھی ان کو کہنے سے شرمائے، خود ہمارے مسلمان قائدین نے ایک دوسرے کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہا؟ تقریروں میں ایک دوسرے کے نجی حالات بلکہ اس کی کئی پشتوں کے حالات بیان نہیں کئے گئے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک دوسرے کی عزت وآبرو کو بھی نشانہ بنایا گیا؟ یہ ہماری اخلاقی پستی اور فکری رفاءت کا مظہر ہے، اپنے نظریات کو پیش کرنا اور مخالف نظریہ پر تنقید کرنا بری بات نہیں، بلکہ جمہوریت کا ضروری حصہ ہے، معیاری تنقید سے بڑھ کر جمہوریت کے لئے کوئی قیمتی تحفہ نہیں ہوسکتا، لیکن ضروری ہے کہ تنقید ہو نہ کہ تنقیص، اور تنقید ادب وشائستگی کے دائرہ میں ہو۔

جب نفس پر چوٹ پڑے اور اپنے کردار کو ٹھوکر لگے، وہی وقت انسان کے اخلاقی معیار کو پرکھنے کا ہوتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہادر وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو زیر کردے بلکہ حقیقی بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، **انما الشديد الذي يملك نفسه عند الغضب** (بخاری، حدیث نمبر: ۶۱۱۴، مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۰۹)

ایک بار ایک صاحب نے آپ ﷺ سے نصیحت کرنے کی خواہش کی، آپ نے ارشاد فرمایا: **لا تغضب** یعنی غصہ نہ کرو، وہ بار بار آپ ﷺ نصیحت کی خواہش کرتے رہے اور آپ ہر بار یہی ارشاد فرماتے کہ غصہ نہ کرو، (بخاری، حدیث نمبر: ۶۱۱۶، ترمذی حدیث نمبر: ۲۰۲۰)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے عصر کے بعد صحابہؓ سے خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے اس خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ مزاج کے اعتبار سے انسان مختلف نوع کے ہوتے ہیں، ان میں سب سے بہتر وہ ہے جس کو غصہ دیر سے آئے اور جلد

چلا جائے، خیرھم مبطی الغضب و سریع الفئی اور سب سے خراب شخص وہ ہے جس کو غصہ آئے جلدی اور جائے دیر سے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۹۱) اس لئے انفرادی معاملات میں بھی اور اجتماعی مسائل میں اس سے بھی بڑھ کر غیظ وغضب کو قابو میں رکھنا چاہئے، کہ حد اعتدال سے بڑھتا ہوا غصہ، نفرت اور حسد کا جذبہ ہی انسان کو بے قابو کرتا ہے اور غیر معتدل بنا دیتا ہے۔

نرم خوئی اور نرم کلامی سے وہ کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، جو تند مزاجی یا دہ گوئی اور کردار کشی سے حاصل نہیں کیا جا سکتا، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نرم خو ہیں، نرم خوئی کو پسند فرماتے ہیں اور نرم خوئی پر وہ کچھ عنایت کرتے ہیں جو تندخوئی پر نہیں دیتے، **ان اللہ رفیق یحب الرفق، و یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف** (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۹۳) آپ ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا کہ نرمی جس چیز میں بھی ہو اسے آراستہ اور خوبصورت بنا دے گی، **ان الرفق لا یکون فی شئی الا زانه** اور جو چیز نرمی سے محروم ہوگی، وہ بدنمائی سے خالی نہ ہوگی، **ولا ینزع من شئی الاشانه** (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۹۴) اس لئے تنقید اگر صالح اور تعمیری ہو، شریفانہ ہو اور حدود ادب میں ہو، تو ایک بہتر چیز ہے، لیکن اگر تنقید کا منشا کردار کشی اور ذاتیات پر حملہ کرنا ہو، تو یہ نہایت قبیح، غیر اسلامی اور غیر شریفانہ فعل ہے۔

آپ ﷺ کے مخالفین اور کفار و مشرکین آپ کو ''محمد'' کی بجائے ''مذمم'' کہا کرتے تھے، ''محمد'' (ﷺ) کے معنی قابلِ تعریف کے ہیں، ''مذمم'' کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کی برائی بیان کی جاتی ہو، یہ کتنی بے ہودہ اور ناشائستہ حرکت تھی، وہ ظاہر ہے، لیکن آپ ﷺ مجسم رحمت تھے، اس لئے کبھی اس پر مشتعل نہیں ہوئے، اور نہ اپنے مخالفین کو کبھی قبیح ناموں سے یاد کیا، بلکہ صحابہؓ کو کفار کی اس حرکت پر غصہ آتا تو تسلی دیتے، اور فرماتے: اللہ نے ان کی لعنت و ملامت کو میری طرف سے پھیر دیا ہے، کہ وہ ''مذمم'' کو برا بھلا کہتے ہیں، اور میں ''محمد'' ہوں، (بخاری، حدیث نمبر: ۳۵۳۳) حدیث میں کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ آپ ﷺ نے اپنے بدترین مخالفین کے لئے بھی ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہوں، یا ان کی

ذاتی زندگی کے مفاسد کو طشت از بام کرنے کی کوشش کی ہو۔

آپ ﷺ غیر مہذب کا جواب بھی مہذب طریقہ پر دیا کرتے تھے، یہود ہمیشہ آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے رہتے تھے، اور ایسے الفاظ کی تلاش میں رہتے تھے جس کے خراب معنی ہوں، اور وہ لفظی اور صوتی اعتبار سے کسی اچھے لفظ کے قریب ہو، تاکہ دھوکہ دیا جا سکے، چنانچہ سلام سے قریبی لفظ عربی میں ''سام'' ہے، جس کے معنی موت کے ہیں، جب آپ کو سلام کرتے تو ''السلام علیکم'' کی بجائے ''السام علیکم'' کہہ دیتے، جس کے معنی ہیں: ''آپ ﷺ پر موت آئے'' آپ ﷺ اس کے جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہنے پر اکتفا کرتے، ایک بار کچھ یہود ملاقات کو آئے اور انہوں نے اسی طرح کے الفاظ کہے، حضرت عائشہؓ موجود تھیں، ان سے رہا نہیں گیا، اور جواب دیا، ''بل علیکم السام و اللعنة'' یعنی تم پر موت آئے اور لعنت ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ! تم بدزبان نہ بنو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر معاملہ میں نرمی پسند ہے۔ ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ۔ (بخاری، باب النہی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام الخ)

قرآن مجید نے حضرت موسیٰ کی دعوتی زندگی کا بہت تفصیلی نقشہ کھینچا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون کی طرف دعوت اسلام دینے کے لئے مامور فرماتے ہیں، فرعون کی سنگ دلی، اس کا ظلم و جور، کفر پر اس کا اصرار، بلکہ اپنی خدائی کا دعویٰ محتاج اظہار نہیں، لیکن اس کے باوجود حکم ہوا کہ ان کو نرمی کے ساتھ دعوت دینا شاید اسے عبرت ہو اور اس میں خدا کا خوف پیدا ہو، ''فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی'' مقامِ فکر ہے! کہ فرعون جیسے ظالم و جابر اور متکبر کافر کے ساتھ بھی نرم گفتاری کی تلقین کی جا رہی ہے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی چال ڈھال بھی تواضع اور فروتنی کا مظہر ہوتی ہے، اور جب اوچھے قسم کے لوگ ان سے ناشائستہ باتیں کہتے ہیں تو وہ ان سے بھی کلمۂ خیر کہہ کر ہٹ جاتے ہیں: ''و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما''۔ (الفرقان:۶۳)

رسول اللہ ﷺ کے یہاں عزتِ نفس کا اس درجہ خیال تھا کہ غیر مسلموں میں بھی جو اصحاب وجاہت ہوتے، آپ ﷺ ان کا لحاظ فرماتے، آپ ﷺ نے بادشاہ روم ہرقل کو خط لکھا تو ''عظیم الروم'' کے لفظ سے خطاب فرمایا، یعنی روم کا عظیم شخص، بعض صحابہؓ کو اس تعبیر پر تامل تھا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو اسی طرح کہتے ہیں، بعض سرداران قبائل کو از راہِ احترام آپ ﷺ نے اپنا تکیہ پیش فرمایا، ابوسفیان اہلِ مکہ کے سردار تھے، فتحِ مکہ کے موقع سے آپ ﷺ نے ان کا اعزاز کرتے ہوئے فرمایا: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امن ہے، ''من دخل دار ابی سفیان فهو آمن'' یہ آپ ﷺ کا سلوک و برتاؤ غیر مسلموں اور اعداءِ اسلام کے ساتھ تھا، اور ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس پر انسانیت شرمائے، اور جس سے شرم و حیا کو عار آئے۔

یہ کردار کشی جو اسٹیج پر ہوتی ہے اور پوسٹر اور اخباری اشتہار کو بھی اس کے لئے ذریعہ و وسیلہ بنایا جاتا ہے اور سوال و جواب، پھر جواب الجواب اور اس کے بعد اس جواب کا جواب جو کیا جاتا ہے اور لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلنے میں جس چوکسی اور مہارت کا ثبوت دیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کے لئے سراسر باعثِ شرم و عار ہے، باہمی کردار کشی اور آبروریزی کے بغیر بھی ہم اپنا مدعی لوگوں کے سامنے رکھ سکتے ہیں، اور ہم اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں، ہماری یہ اخلاقی پستی اور دناءت عام مسلمانوں کو غلط اشارے دیتی ہے، جب مسلمانوں کے قائدین اور محترم شخصیتیں ہی اس سطح پر اتر آئیں تو عوام سے کیوں کر توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے دور رکھ سکیں گے؟ جس سفینہ کا ناخدا ہی آدابِ سفر سے بے بہرہ ہو، کون ہے جو اسے ساحل سے ہمکنار کرے؟ ___ کاش! ہمارے سیاسی قائدین اور ان قائدین کے معاونین و انصار جو بہر حال ظہراس ''خیرات'' ہی کا ایک حصہ ہیں، اس حقیقت پر غور کریں!

(۱۷ ستمبر ۱۹۹۹ء)

پانی جس نے آگ لگادی

پانی کا کام آگ بجھانا اور ٹھنڈک بخشنا ہے، لیکن اس وقت ''پانی'' نے پورے ملک میں آگ لگا رکھی ہے، قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون سا آتش خیز اور حرارت ریز پانی ہے؟ میری مراد ''Water'' نامی فلم سے ہے! جسے دیپا مہتا نامی ہدایت کار بنا رہی ہیں، اس سے پہلے ان ہی خاتون نے ''آگ'' لگائی تھی، اور ''آگ'' نامی فلم تیار کی تھی، شیوسینا کے کارکن اس فلم پر اتنے برہم ہوئے کہ حقیقی معنوں میں کرتے پاجامے سے باہر آگئے، اور اب وہ ایسا پانی پیش کر رہی ہیں جو آگ سے بھی بڑھ کر گرم ہے، ''فائر'' نامی فلم ہم جنسی کے موضوع پر تھی، ظاہر ہے کہ یہ بے حیائی اور بے شرمی پر مبنی فلم ہے، ہندوستان جیسے ملک میں جو بڑی حد تک ایسی اخلاقی بیماریوں سے پاک اور محفوظ ہے، وہاں ہم جنسی کے موضوع پر کسی فلم کا آنا ایک بے معنیٰ بات ہے، اور اس کا نتیجہ برائی کی تشہیر و ترغیب کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

دیپا مہتا کی نئی فلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندو مذہبی طبقہ میں پھیلی ہوئی اخلاقی اناء کی اور ہندو معاشرہ میں خواتین بالخصوص بیوہ خواتین کے ساتھ ناروا سلوک اور ان کی حالتِ زار کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: اول یہ کہ جو باتیں اس کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہیں کیا وہ حقائق پر مبنی ہیں؟ دوسرے اگر حقائق پر مبنی ہیں تو کیا ہر حقیقت کا اظہار مناسب ہوتا ہے، اس سے قطعِ نظر کہ اس سچائی کا اظہار سماج کے لئے مفید ہے یا مضر، اور فائدہ مند ہے یا نقصان دہ؟؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مذہبی مصادر میں اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض باتیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں، رام جی ہندوؤں کے یہاں نہایت ہی مقدس شخصیت سمجھی

جاتی ہے، اور اس وقت تو ''رام'' کا نام ہندو فکر و تہذیب کا عنوان بن چکا ہے، لیکن رامائن رام کی زبان میں سیتا کے حسن کی جو تصویر کھینچتا ہے وہ کھلی ہوئی بے حیائی پر مبنی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی لکشمن کے سامنے سیتا کے ساتھ اپنے جنسی تعلقات کو بھی تفصیل سے بیان کرتے ہیں، لنگ اور یونی مردانہ اور زنانہ اعضاء مخصوصہ کو کہا جاتا ہے، ہندو مذہب میں لنگ اور یونی کی بھی پرستش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ان فحش الفاظ سے بچوں کے نام بھی رکھے جاتے ہیں، جیسے شیولنگم، رام لنگم وغیرہ، کرناٹک میں بعض مندر ایسے ہیں جہاں مرد و عورت کو بے لباس ہو کر پوجا کرنی پڑتی ہے، حکومت اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہے، لیکن اکثر حکومت کی ممانعت پر مذہبی جذبات غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

اسی لئے ہندو مذہبی حلقہ میں مرد و عورت کے جنسی تعلق کے طریقے اور کیفیات تحقیق و تالیف کا خاص موضوع ہے، اور اس موضوع پر ''کام سوتر'' کے نام سے کئی مذہبی کتابیں اوباش قسم کے لوگوں کے لئے لذّتِ کام و دہن کا سامان ہیں، بے حیائی اور بد اخلاقی کو مذہبی رنگ دینے کے لئے برہمنوں نے ''دیوداسی نظام'' شروع کیا، اس رسم کے تحت عام ہندو اور خاص کر نچلی ذات کے لوگ اپنی لڑکیوں کو مندروں پر مذہبی جذبہ سے وقف کیا کرتے تھے، اور لوگوں کو دھوکہ دے کر مذہبی شخصیتیں ان سے اپنی شبستانِ ہوس سجایا کرتے تھے، مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اس نامعقول رسم کو ختم کرنے کی بہت کچھ کوششیں کی گئیں، لیکن بدقسمتی سے اب تک مہاراشٹر، کرناٹک اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں یہ رسم باقی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''دیوداسی نظام'' کو اگر مذہبی قحبہ گری کا عنوان دیا جائے تو غلط نہ ہوگا!

چنانچہ اس مذہبی فکر نے ہندو تمدن پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے، ''کھجوراہو'' کا مندر اور ''اجنتا'' کے غار اس کی کھلی ہوئی مثالیں ہیں، جیسا کہ کہنے والے کہتے اور نقل کرنے والے نقل کرتے ہیں کہ کوئی شریف اور حیادار انسان اپنے بزرگوں یا عزیزوں کے ساتھ ان مناظر کو دیکھ نہیں سکتا، ہندو تحریکات پر بھی وقفہ وقفہ سے بے حیائی کی چھاپ نمایاں رہی ہے، اس کی واضح مثال اچاریہ رجنیش اور ''ہرے راما ہرے کرشنا تحریک'' ہے، اس

لئے یہ ایک تلخ حقیت اور کڑوی سچائی ہے کہ ہندو مذہب کی جو تصویر اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ اخلاقی نقطہ نظر سے کسی مذہب کے شایان شان نہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ یہ مذہب کی حقیقی تعلیمات میں آمیزشوں اور ملاوٹوں کا نتیجہ ہے، ورنہ کسی مذہب کے بارے میں ایسی حیاباختہ فکر کا تصو رنہیں کیا جا سکتا۔

ہندو سماج میں عورتوں کی مظلومیت بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، منوسمرتی عورتوں کے بارے میں صاف کہتی ہے کہ کسی عورت پر کبھی بھروسہ مت کرو، کسی بھی عورت کے ساتھ تنہا مت بیٹھو خواہ وہ تمہاری ماں ہو، یا بیٹی یا بہن، وہ آپ کو غلط ترغیب دے سکتی ہے، اسے شوہر سے علاحدگی کا حق نہیں، نہ ہندو مذہب میں اس کے لئے میراث ہے، نہ وہ اپنے لئے رشتہ منتخب کر سکتی ہے، بیوہ عورتیں منحوس سمجھی جاتی ہیں، وہ دوسری شادی نہیں کرسکتیں، ان کو زندگی بھر بناؤ سنگار سے دور رہنا ہے، اور سب سے بڑا ظلم ستی کی رسم ہے، ہندو عقیدہ کے مطابق ایک عورت کے ستی ہونے کی وجہ سے تین خاندان کے گناہ معاف ہوتے ہیں، اس کے والد کا خاندان، اس کی والدہ کا خاندان، اور اس کے شوہر کا خاندان، اس ترقی یافتہ دور میں بھی ستی کی وکالت کرنے والے لوگ موجود ہیں، پوری کے شنکر اچاریہ نے علی الاعلان کہا ہے کہ بیوہ عورت کے لئے ستی ہونے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں، اور حکومت کے ذریعہ اس رسم پر پابندی لگائے جانے کی وہ پوری قوت سے مخالفت کریں گے، خواہ انہیں پھانسی پر کیوں نہ چڑھا دیا جائے، جب ان سے پوچھا گیا کہ ایسی خواتین کے بچوں کا کیا ہوگا؟ تو بے تکلف جواب دیا کہ یہ تقدیر کا لکھا ہے، بچے خواہ تکلیف اٹھائیں یا مر جائیں، ستی بہر حال ہندو مذہب میں جاری رکھی جائے گی، جب ہندو مذہب کے سب سے بڑے پیشوا ستی کے وکیل ونقیب ہوں تو اگر روپ کنور یا ان جیسی دوسری بھولی بھالی خواتین کے ستی ہونے کا واقعہ پیش آئے تو تعجب نہ ہونا چاہئے!

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اخلاقی بے راہ روی اور عورتوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی ہندو سماج میں موجود ہے، اور سب سے بدبختانہ بات یہ ہے کہ اس کو

مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے، یہ کہنا تو بہر حال صحیح نہ ہوگا کہ ہندوستان کے تمام مذہبی شخصیتوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی جائے کہ وہ سب ایسی باتوں میں برابر کے شریک ہیں، یقیناً ان میں شریف، سمجھ دار، تقاضۂ حیا سے آگاہ اور انسانی نجابت کی ترجمان شخصیتیں بھی ہوں گی، اوران سب کے بارے میں ایک ہی طرح کا خیال قائم کر لینا شاید قرین انصاف نہ ہو، ___ لیکن سوال یہ ہے کہ کہاں پر سچائی کا اعلان واظہار کیا جانا چاہئے؟ غالباً اس کا جواب نفی میں ہے۔

ایسی سچائی جو سماج کو فائدہ کی بجائے نقصان پہونچائے، جو خیر کی اشاعت کی بجائے بدی کی تشہیر کا باعث ہو، جو لوگوں کو شرافت وصالحیت کی بجائے بدخوئی کی طرف لے جاتی ہو، اس سچائی کو ظاہر کرنے سے چھپانا بہتر ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے، کیوں کہ یہاں جھوٹ بہ مقابلہ سچ کے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے، اگر ایک مظلوم اور کمزور شخص نے آپ کے یہاں پناہ لے رکھی ہے، ایک بے بس عورت اپنی عصمت وعزت کی حفاظت کے لئے چھپی ہوئی ہے، اور ایک ظالم اس مظلوم کے قتل اور ایک اوباش اس عورت کی عصمت ریزی کے درپے ہو اور آپ کے جھوٹ سے اس شخص کی جان اور اس عورت کی عزت بچ سکتی ہو، اور آپ کے سچ سے جان جاسکتی ہو اور ایک عورت کی چادر عفت تار تار ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ضرورت ہے کہ ان حالات میں آپ کے لئے جھوٹ بولنا ہی واجب ہے، اور سچ بولنا اس جرم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔

فلم خواہ کوئی بھی ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے وہ گناہ ہی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فلم بنیادی طور پر بُرائی کی ترویج اور سفلی جذبات کی تحریک ہی کا ذریعہ ہے، اس سے کسی خیر کی توقع نہیں، لیکن ایسی فلمیں جن کا مقصد شروع سے اخیر تک نفسانی جذبات کی تسکین ہی ہو، جس کا منشا بُرائی کی خاص طور پر تشہیر ہو اور جو مذہبی جذبات کے احترام اور تقدیس کی حدوں کو بھی مجروح کرتی ہو یقیناً شر بالائے شر اور گناہ برتر از گناہ ہے، ممکن ہے کہ سنگھ پریوار کے لوگ اس لئے اس فلم کی مخالفت کر رہے ہوں کہ اس سے برہمنی افکار وتصورات پر زد

پڑتی ہے، اور ہندو تمدن کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے، لیکن اس سے قطعِ نظر تمام ہی سنجیدہ لوگوں کے لئے یہ اور اس طرح کی فلمیں قابلِ مذمت ہیں کہ ایک تو اس سے بُرائی کی تشہیر ہوتی ہے، دوسرے اس سے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانے کی نہایت ہی ناشائستہ اور غلط روایت قائم ہورہی ہے، جو بڑے فساد اور انتشار کا موجب بن سکتا ہے، قرآن مجید نے تو اس پہلو کو اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ شرک سے بڑھ کر اسلام میں کوئی شئ قابلِ مذمت نہیں لیکن مشرکین جن دیویوں، دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہوں، ان کو برا بھلا کہنے سے بھی منع کیا گیا، کہ ہر انسان کے لئے اپنے مذہب پر رہتے ہوئے دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء)

افواہیں اور ہمارا رویہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کی صلاحیتوں کو محدود رکھا ہے، اس کی قوتیں ایک خاص دائرہ میں کام کرتی ہیں، مثلاً انسان کو ایک بہت بڑی نعمت دیکھنے کی دی گئی ہے، پتھر اور لوہے کس قدر مضبوط ہیں، سمندر کا دامن کس قدر وسیع اور بے پناہ ہے، لیکن وہ دیکھ نہیں سکتے، انہوں نے آج تک خود اپنے حسن و جمال کو بھی دیکھا نہیں ہوگا، لیکن ایک خاص حد تک چیزوں ہی کو انسان دیکھ سکتا ہے، اگر کوئی رکاوٹ نہ بھی ہو تو انسان کو آدھے ایک کیلومیٹر سے آگے کی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں، اگر بیچ میں دیوار حائل ہو تو بالکل قریب کی چیزوں کو بھی وہ نہیں دیکھ سکتا، انسان میں سننے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، لیکن اس کا بھی یہی حال ہے، اس کی سماعت کا دائرہ چند فرلانگ تک ہوتا ہے، یہ بھی اس وقت ہے کہ جب کہ کوئی چیز حائل نہ ہو، ورنہ دو کمروں کے بیچ چند انچ کی دیوار ہوتی ہے اور ایک طرف کی آواز دوسری طرف بالکل سنائی نہیں پڑتی، انسان کے دیکھنے اور سننے کے دائرہ کو جو محدود رکھا گیا ہے بظاہر یہ ایک محرومی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، ہر انسان اپنے لئے ایسی تنہائی (Privacy) چاہتا ہے جو دوسرے کی مداخلت سے آزاد ہو، انسان کی بہت سی ضروریات ایسی ہیں، جن میں دوسروں کی آنکھ اور کان کے تعاقب سے باہر ہونا، اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، فرض کیجئے کہ کسی مکان میں بہت سے کمرے ہوں، ہر کمرے میں الگ الگ لوگ رہتے ہوں، وہ سب ہمہ وقت ایک دوسرے کی نظر میں ہوں اور ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی بات کانوں سے ٹکراتی رہتی ہو، تو اس کے لئے زندگی گزارنا کتنا دوبھر ہو جائے گا، اسے اپنے مکان میں رہتے ہوئے بھی ایسا محسوس ہوگا کہ وہ ریلوے کے کسی مصروف پلیٹ فارم

پر مقیم ہے، اس لئے انسان کی صلاحیتوں کا محدود ہونا بظاہر ایک محرومی معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انسان کے لئے سامان راحت بلکہ ایک ضرورت ہے۔

انسان اپنی محدود دیکھنے اور سننے کی صلاحیت کی وجہ سے بہت سی باتیں جاننے میں دوسروں کی اطلاع کا محتاج ہوتا ہے، اس کے سوا چارہ نہیں، کہ اپنے چشم سر سے دیکھے اور گوش سر سے سنے بغیر بعض امور کو تسلیم کرے، اس لئے دنیا کا سارا کاروبار دوسروں کی دی ہوئی خبر پر اعتماد و یقین سے متعلق ہے، اور اسی طرح نظام زندگی جاری وساری ہے، خبریں صحیح بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی، سچی بھی ہوتی ہیں اور جھوٹی بھی، خبر دینے والے جھوٹے بھی ہوتے ہیں، بعض لوگ طبعاً برے نہیں ہوتے لیکن ان کی طبیعت میں مبالغہ ہوتا ہے، وہ لفظوں کے ایسے بازیگر ہوتے ہیں، کہ سننے والوں کو رائی پہاڑ محسوس ہوتا ہے، کچھ لوگ شریف اور نیک خو ہوتے ہیں، لیکن سادہ لوح اور بھولے بھالے ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی باتوں کا یقین کر لیتے ہیں، کسی خبر پر جرح نہیں کرتے، اور اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھے بغیر مان لیتے ہیں، بعض حضرات سے کسی بات کو سننے یا سمجھنے میں غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے، یہ مختلف اسباب ہیں، جن کی وجہ سے دانستہ یا نادانستہ اور بالا رادہ یا بلا ارادہ خلاف واقعہ باتیں لوگوں میں چل پڑتی ہیں، ایسے ہی بے سروپا باتوں کو ''ہواء'' کہتے ہیں۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے کچھ لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، یہ دوڑ بھاگ کسی اور سبب سے تھی، لیکن شہر کی فضاء کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کو خیال ہو گیا کہ شاید دو گروہوں کے درمیان تصادم ہو گیا ہے، اب اس خوف سے انہوں نے خود بھاگنا شروع کیا، آتے ہوئے راستہ میں جو لوگ ملے ہمدردی و بہی خواہی میں انہیں بھی واپس ہونے کی صلاح دیدی، پھر خبر ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ میں پہونچی، اور ایک فرقہ کے ناسمجھ لوگوں نے دوسرے فرقہ کے لوگوں پر وار کر دیا یہاں تک کہ پورا شہر فساد کی آگ میں بھڑکنے لگا، اور اس بے تحقیق خبر کی چنگاری نے پورے علاقہ کے امن و امان کو نذر آتش

کر دیا، اس طرح کے واقعات ہمارے سماج میں پیش آتے رہتے ہیں، افواہوں کی بنا پر گروہی لڑائیاں ٹھن جاتی ہیں، ادارے اور جماعتیں تقسیم ہو جاتے ہیں، اجتماعی کاموں میں رخنہ پڑتا ہے، خاندانوں میں نفرت کی آگ سلگ جاتی ہے، بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، یہاں تک کہ میاں بیوی میں طلاق کے واقعات پیش آجاتے ہیں، والدین، اولاد اور قریب ترین اقارب کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے، افواہوں کے گرم بازاری نے بہت سے مخلص، محبِ قوم، برگزیدہ شخصیتوں کو بے آبرو کیا ہے، اور خودغرضی و بدخواہ افراد کی طالع آزمائی کو کامیابی سے ہم کنار کر کے قوم و ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا ہے۔

افواہوں کو جنم دینا انہیں پھیلانا اور ان کو تقویت پہونچانا نہایت ہی ناشائستہ و نامناسب عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اخبار و واقعات کے بارے میں یہ اصولی رہنمائی فرمائی ہے کہ جب کوئی ناقابلِ بھروسہ آدمی کوئی خبر لائے تو جب تک اس کی اچھی طرح تحقیق نہ ہو جائے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوْا أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَافَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ."

(الحجرات:٦)

اے ایمان والو! اگر کوئی ناقابل بھروسہ (فاسق) شخص کوئی اہم خبر دے تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہ کہیں کسی قوم پر تم ناواقفیت میں حملہ نہ کر دو کہ پھر تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بے تحقیقی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہئے، اور اگر اس پر یقین کیا گیا تو یہ نقصان اور مضرت کا باعث ہوگا، یہ آیت ایک خاص واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنو مصطلق کی طرف ____ جو مسلمان ہو چکے تھے ____ اپنے نمائندہ ولید بن عقبہ کو بھیجا، بنو مصطلق نے جب نمائندہ نبوی کو دیکھا تو ان کے احترام و توقیر کے لئے آبادی سے باہر نکل آئے، ولید نے سمجھا کہ یہ لوگ ان کے

قتل کے در پے ہیں اور پچھلے پاؤں واپس آ گئے، آ کر حضور کو اطلاع دی کہ یہ لوگ مرتد ہو گئے ہیں، یہ زکوٰۃ ادا کرنے کے منکر ہیں، اور وہ ان کے قتل کے در پے ہو گئے تھے، آپ ﷺ نے ان سے جہاد کا ارادہ فرمالیا، ابھی تیاری کے مرحلہ میں تھے کہ بنو مصطلق کا وفد آپہونچا، انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے قاصد آرہے تھے، ہم اس لئے نکلے کہ ان کا استقبال کریں اور اپنی زکوٰۃ ان کی خدمت میں پیش کریں، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم لوگ ان سے جنگ کے لئے نکلے تھے، سو یہ غلط ہے، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی، (قرطبی: ۱۶/۳۱۱) ___ غور کیجئے کہ یہ عہد نبوی کا واقعہ ہے، اور یہ اطلاع ایک صحابی رسول کی تھی، انہوں نے دانستہ غلط بیانی سے یقیناً کام نہیں لیا تھا کہ یہ مقام صحابیت سے فروتر بات ہے، بلکہ یہ محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے، یہ نا دانستہ غلط فہمی بھی کتنے بڑے انتشار کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، تو جہاں افواہیں بالقصد پیدا کی جاتی ہوں، ان سے کس قدر نقصان ہوگا؟

افواہوں کے پھیلنے کے چند خاص اسباب ہیں، ان میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ لوگ ہر سنی سنائی ہوئی بات کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں، خواہ وہ بات کس قدر بھی بے بنیاد ہو، بعض لوگوں نے اس کے لئے دروغ برگردن راوی کی ایک خود ساختہ بیساکھی تیار کر رکھی ہے، اور اس کے ساتھ ہر گفتنی و نا گفتنی کو نقل کر دینے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے، یہ بھی خدا سے بے خوفی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس بیماری کی تشخیص کرتے ہوئے فرمایا: آدمی کے گناہ گار ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو نقل کر دے: **كفى بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع** (مسلم، حدیث نمبر (۷) مقدمۃ الکتاب) ___ ہر سنی سنائی بات کو نقل کرنے سے معاشرہ میں کس طرح بگاڑ پیدا ہوتا اور فساد پھیلتا ہے، اس کی مثال رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آنے والا واقعہ افک ہے، کچھ بیمار ذہن منافقین نے امت کی ماں سیدنا حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت لگادی، اور اس افواہ کو پھیلانے کی خوب کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض سادہ لوح، مخلص مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے اور مدینہ میں ایسے انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی کہ

حیاتِ نبوی میں شاید ہی کسی اور واقعہ سے آپ کو اس درجہ تکلیف پہونچی ہو، یہ اسی بات کا نتیجہ تھا کہ ایک سنی سنائی بات کو کچھ لوگ بلاتحقیق کہتے چلے گئے۔

ان افواہوں میں اضافہ ان لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو بری باتوں کے متلاشی رہتے ہیں، لوگوں کی برائیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں تجسس سے جن کو لذت ملتی ہے، اور کسی واقعہ میں اگر چند احتمالات ہوں، تو منفی پہلو کی طرف ان کا ذہن زیادہ چلتا ہے، اس طرزِ عمل کو حضور نے پسند نہیں کیا، اسی لئے تجسس کو منع کیا گیا، اور ان لوگوں کو کج فکر قرار دیا گیا جو کسی بات کی غلط تاویل وتوجیہہ کے درپے ہوتے ہیں،

"فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاوِیْلِهٖ" (آل عمران:۷)

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ برپا کرنے اور (من چاہی) تاویلیں کرنے کے لئے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

افواہیں عام طور پر اعلانیہ نہیں پھیلائی جاتیں، ریڈیو اور اخبارات کو ان کا ذریعہ نہیں بنایا جاتا، (ویسے آج کل حکومتوں کے غیر ذمہ دارانہ اور ذرائع ابلاغ کے جانب دارانہ رویہ کی وجہ سے ایسا بھی ہورہا ہے)، بلکہ زیادہ تر سینہ بسینہ افواہیں پھیلائی جاتی ہیں، اور سرگوشیوں کے ذریعہ گشت کرتی رہتی ہیں، اسی لئے زیادہ تر سرگوشیوں کو قرآن مجید نے پسند نہیں کیا: "لا خیر من کثیر فی نجواهم" (النساء:۱۱۴)

کسی بھی خبر کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یا تو انسان خود اس کی تحقیق کرلے، یا کم سے کم ایسے سمجھدار، معاملہ فہم، اور زمانہ آگاہ لوگوں کی طرف رجوع کرے، جن کے بارے میں توقع ہو کہ وہ مناسب طریقہ پر اس کی تحقیق کرنے کے بعد کوئی صحیح قدم اٹھائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

جب ان کو امن یا خوف کی کوئی بات پہونچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں، اگر وہ اس کو رسول اور اپنے میں سے ذمہ داروں تک پہونچادیتے تو اسے وہ لوگ جان لیتے جو ان میں سے بات کی تہہ تک

پہونچ کر صحیح نتیجہ اُخذ کر سکتے ہیں، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم تو شیطان کی پیروی کرنے والے ہو جاتے۔ (النساء:۸۳)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بنیادی مرض کا علاج بتایا ہے جو افواہوں کا باعث ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ جو باتیں اہم ہوں ان کے بارے میں اگر انسان خود تحقیق کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کی صلاحیت رکھنے والوں سے رجوع کرلے اور کسی بھی بات کو بلاتحقیق بیان کرنے، بلکہ خود بھی اس پر یقین کرنے سے گریز کرے، کیوں کہ انسان اپنے کانوں، اپنی آنکھوں اور اپنے دلوں کا مالک نہیں بلکہ امین ہے، اس کے بارے میں وہ عنداللہ جوابدہ ہے، ''ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنه مسئولا'' (الاسراء:۳۶)

(۲۲/مارچ/۲۰۰۲ء)

وعدہ خلافی —— ہمارے سماج میں!

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لئے آخرت کا نظام یہ رکھا ہے کہ چیزوں کا مہیا ہونا انسان کی خواہشات کے تابع ہوگا، انسان جو چاہے گا فوراً اس کے لئے وہ چیز فراہم ہو جائے گی، ''وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ'' (حم السجدہ: ۳۱) لیکن دنیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہاں انسان ایک چیز کی خواہش کرتا ہے، لیکن وہ اسے بروقت پورا نہیں کرسکتا، وہ ایک چیز کا ضرورت مند ہوتا ہے، لیکن وہ چیز اسے بروقت مہیا نہیں ہوتی، اسی لئے انسان ایک دوسرے سے لین دین کا محتاج ہوتا ہے، اس لین دین میں اکثر عہد و پیمان کی نوبت آتی ہے، اس لئے شاید ہی کوئی انسان ہو جس کو زندگی کے مختلف مراحل میں خود وعدہ کرنے یا دوسروں کے وعدہ پر بھروسہ کرنے کی نوبت نہ آتی ہو، وعدہ کرنے والے پر دوسرا شخص بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے، اور بعض دفعہ اس اعتماد پر خود بہت سے معاملات طے کرگذرتا ہے، اس لئے وعدہ کی بڑی اہمیت ہے۔

اسی لئے اسلام میں بڑی تاکید کے ساتھ عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور عہد شکنی کی مذمت کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عہد کو پورا کرو، کیونکہ قیامت کے دن عہد کے بارے میں انسان جواب دہ ہوگا، ''وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ، إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا'' (بنی اسرائیل: ۳۴) قرآن نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو وعدہ کو پورا کیا کرتے ہوں، (البقرہ: ۲۲) ایک اور موقع پر بھی ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اپنے وعدہ کا پاس ولحاظ رکھتے ہوں، ''وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ'' (مومنون: ۸) خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کا بار بار ذکر فرمایا ہے، کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے، ''وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ'' (الحج: ۶)، اللہ کے نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کرتے ہوئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا

کہ وہ وعدہ کے سچ تھے، ''اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ''(مریم:۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعہ بھی ایفاءِ عہد کی اہمیت اور وعدہ خلافی کی بُرائی کو بیان فرمایا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس میں تین باتیں پائی جاتی ہوں وہ منافق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، اگر امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، (بخاری، حدیث نمبر:۳۳) نفاق کفر کی ایک قسم ہے، اور وعدہ خلافی کو آپ ﷺ نے نفاق قرار دیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وعدہ خلافی کس قدر مذموم بات ہے، آپ ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعہ ایفاءِ عہد کی ایسی مثال قائم کی ہے کہ اس کی نظیر ملنی دشوار ہے، عبداللہ بن ابی الحمساء سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ ﷺ سے خرید وفروخت کی، آپ کی کچھ چیز باقی رہ گئی، میں نے وعدہ کیا کہ میں یہ چیزیں یہاں لے کر آتا ہوں، میں بھول گیا، یہاں تک کہ آج اور آئندہ کل کا دن گذر گیا، تیسرے دن میں حاضر ہوا تو آپ اسی جگہ پر تھے، آپ ﷺ نے صرف اس قدر فرمایا: تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں یہاں تین دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر:۴۹۹۶)

وعدہ کی پابندی اور ایفاءِ عہد کا یہی سبق آپ ﷺ سے آپ کے رفقاء نے پڑھا، اور اپنی عملی زندگی میں اسے برت کر دکھایا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا، تو فرمایا کہ قریش کے ایک شخص نے میری بیٹی کے لئے نکاح کا پیغام دیا تھا اور میں نے اس سے کچھ ایسی بات کہی تھی جو وعدہ سے ملتی جلتی ہے، تو میں ایک تہائی نفاق یعنی نفاق کی تین میں سے ایک علامت کے ساتھ اللہ سے ملنا نہیں چاہتا، اس لئے میں تم لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا (احیاء العلوم:۳/۱۳۲) ____ ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی نگاہ میں وعدہ کو پورا کرنے کی کس قدر اہمیت تھی دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا بیگانہ، اور مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر ایک کے ساتھ عہد کی پابندی ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ سے جوں ہی فارغ ہوئے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ خون میں لہولہان اور پاؤں میں بیڑیاں لگی ہوئی تشریف لے آئے،

اور مسلمانوں سے عرض کناں ہوئے کہ انہیں مدینہ لے جایا جائے، آپ ﷺ نے اہلِ مکہ کو راضی کرنے کی کوشش کی، کہ اس دفعہ سے جو مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ جانے والوں کو واپس کرنے کے سلسلہ میں ہے، حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ رکھا جائے، لیکن اہلِ مکہ نے نہیں مانا، چنانچہ بالآخر آپ نے انہیں واپس فرمادیا، اسی طرح جن غیر مسلم قبائل سے آپ کے معاہدات ہوئے، آپ نے ان معاہدات کا پورا خیال رکھا، بلکہ بعض دفعہ مخالفین کی عہد شکنی کو برداشت کرتے ہوئے بھی آپ اپنے عہد پر قائم رہے۔

افسوس کہ اخلاقی انحطاط اور پستی کی وجہ سے آج سماج میں وعدہ خلافی کی نوع بہ نوع صورتیں مروج ہوگئی ہیں، اور لوگوں کے ذہن میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے، عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ قرض وغیرہ کے لین دین ہی سے وعدہ کا تعلق ہے، حالانکہ ہم زندگی کے تمام مراحل میں عہد و پیماں سے گذرتے ہیں، معاملات جتنے بھی ہیں، نکاح، خرید وفروخت، شرکت اور پاٹنر شپ، دوطرفہ وعدہ ہی سے عبارت ہے، اسی لئے معاملات کو عقد کہا جاتا ہے، عقد کے معنی دوطرفہ وعدہ اور معاہدہ کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ مواقع پر ایفاء عقود کی طرف متوجہ فرمایا ہے، ''وَاَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدہ:۱) نکاح کے ذریعہ مرد عورت کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کے اخراجات کی ادائیگی کا عہد کرتا ہے، اور عورت جائز باتوں میں شوہر کی فرماں برداری کا وعدہ کرتی ہے، لہٰذا اگر شوہر بیوی کے ساتھ حق تلفی کرے یا بیوی شوہر کے ساتھ حکم عدولی تو نہ صرف حق تلفی اور عدول حکمی کا گناہ ہوگا بلکہ وہ وعدہ خلافی کے بھی گناہ گار ہوں گے، بیچنے والا گاہک سے مال کے صحیح ہونے اور قیمت کے مناسب ہونے کا وعدہ کرتا ہے، اگر وہ گاہک سے عیب چھپا کر سامان بیچے یا قیمت میں معمول سے زیادہ نفع وصول کرلے، اور گاہک کو جتائے کہ اس نے معمولی نفع پر سامان فروخت کیا ہے، تو یہ عقد تجارت کے ذریعہ فریقین ایک دوسرے کے ساتھ جو عہد کرتے ہیں، اس کی خلاف ورزی ہے۔

جب آپ کہیں ملازمت کرتے ہیں تو سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں جو اوقات کار متعین ہوں، آپ ان اوقات میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنے کا عہد کرتے ہیں، اگر آپ

ان اوقات کا پابندی نہ کریں، دیر سے دفتر پہونچیں، پہلے دفتر سے نکل جائیں، یا درمیان میں دفتر چھوڑ دیں، یا دفتر کے اوقات میں مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے بجائے اپنے ذاتی کام کرنے لگیں، تو یہ بھی وعدہ کی خلاف ورزی میں شامل ہے، بعض شعبوں میں ملازمین کو خصوصی الاونس دیا جاتا ہے، کہ وہ پرائیوٹ طور پر کوئی اور کام نہ کریں، خاص کر میڈیکل شعبہ میں گورنمنٹ چاہتی ہے کہ ڈاکٹر کی پوری صلاحیت سرکاری دواخانے میں آنے والے مریضوں پر خرچ ہو، کیوں کہ انسان کی قوت کار محدود ہے، اور جو شخص ہسپتال میں آنے سے پہلے اپنی قوت ڈھیر سارے مریضوں کو دیکھنے پر صرف کر چکا ہو، یقیناً اب جو مریض اس کے سامنے آئیں گے، وہ کما حقہ، اس کی تشخیص نہیں کر سکے گا، اب اگر کوئی شخص گورنمنٹ سے الاؤنس بھی حاصل کرے، اور نجی کلینک اور نرسنگ ہوم بھی چلائے تو یہ وعدہ خلافی ہی کے زمرے میں آئے گا، اور یہ بات تو ستم بالائے ستم ہوگی کہ جب کوئی مریض سرکاری دواخانہ میں آئے، تو معالج اس سے ایسی بے اعتنائی برتے، کہ وہ اس کے پرائیوٹ دواخانہ سے رجوع ہونے پر مجبور ہو جائے، یہ وعدہ خلافی کے ساتھ ساتھ عوام پر کھلا ہوا ظلم بھی ہے۔

آج کل بعض سواریوں کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے میٹر لگے ہوئے ہیں، اس میٹر میں فریقین کی رعایت ملحوظ ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ پسنجر کی مجبوری اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے میٹر سے زیادہ پیسے طلب کئے جاتے ہیں، یہ بھی وعدہ خلافی کے زمرہ میں داخل ہے، کیوں کہ گورنمنٹ کا ٹیکس لائسنس ٹیکس کے قواعد وضوابط کے ساتھ مربوط ہے، گویا لائسنس لینے والا اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کی ہدایت کے مطابق ہی پیسے وصول کرے گا، لوگوں کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے زائد پیسوں کا طلب گار ہونا اس عہد کی خلاف ورزی ہے۔

وعدہ کا تعلق ہماری تقریبات، جلسوں، اور دعوتوں سے بھی ہے، مثلاً دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ نکاح عصر کے بعد ہوگا، لیکن جب تقریب میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ نوشہ صاحب اپنی شانِ خاص کے ساتھ عشاء کے بعد تشریف لائے، دعوت نامہ میں لکھا گیا کہ

طعام ولیمہ ۸ ر بجے شب میں ہے، لیکن حقیقت معنوں میں دعوت کی ابتداء دس بجے شب سے ہوئی کیا یہ عدہ کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ غور کیجئے کہ لوگ ایسی تقریبات میں شرکت اپنے تعلقات کی پاسداری میں کرتے ہیں، کسی کے یہاں بیماری ہے، کوئی خود بیمار ہے، کسی نے تقریب کے وقت کے لحاظ سے آئندہ پروگرام بنا رکھا ہے، ایسے مواقع پر یہ تاخیر اس کے لئے کس قدر گراں گذرتی ہے آکر واپس ہونے میں میزبان کی ناگواری کا اندیشہ، اور انتظار کرنے میں دوسرے پروگرام متاثر!

افسوس کہ دینی جلسوں اور پروگراموں میں بھی ہم اس کی رعایت ملحوظ نہیں رکھتے، اعلان ہوا کہ نمازِ عشاء کے فوراً بعد جلسہ شروع ہوگا، لیکن عملاً مزید دو گھنٹہ تاخیر سے جلسہ کا آغاز ہوا، دعوت نامے میں صبح ۹ ر بجے سے جلسہ کا اعلان کیا گیا، لیکن جلسہ کا آغاز ہی ۱۱ ر بجے کے بعد ہوا، یہ وعدہ خلافی بھی ہے، اور وقت کی ناقدری بھی، کچھ یہی حال بعض مقررین کا ہوتا ہے، مقرر صاحب کو وقت ۲۰ ر منٹ کا دیا گیا، لیکن جب مائک ان کے ہاتھ میں آیا تو انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس پروگرام میں ان کے سوا کسی اور کو تقریر کا حق نہیں، اور اس طرح دوسرے مقررین کے لئے یا تو وقت نہیں بچا، یا سامعین کے صبر کا امتحان ہوتا رہا، حالانکہ اسلام نے تمام عبادتوں کو وقت کے ساتھ مربوط رکھا ہے، نماز کے لئے اوقات مقرر ہیں، وقت گذر جائے تو نماز قضاء ہو جائے گی، وقت سے پہلے پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی، روزہ بھی وقت سے متعلق ہے، دو منٹ پہلے افطار کر لے تو روزہ درست نہیں ہوگا، دو منٹ بعد سحری کھائیں تب بھی روزہ فاسد ہو جائے گا، حج بھی پانچ مقررہ ایام میں کیا جاتا ہے، اور حج کے تمام افعال کے لئے ایام واوقات مقرر ہیں، زکوٰۃ کا تعلق بھی مال پر سال گذرنے سے ہے، عجیب بات ہے کہ جس دین میں وقت کا اتنا پاس ولحاظ ہو، اسی دین کے ماننے والوں میں وقت کی اس درجہ ناقدری اور ناحق شناسی یہ سب باتیں وعدہ خلافی میں داخل ہیں!

ہم جب کسی ملک کی شہریت اختیار کریں تو یہ اس ملک کے قوانین پر عمل کرنے کا عہد کرنا ہے، لہٰذا جب تک وہ قوانین اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں یا صریحاً ظلم پر مبنی

نہ ہو ان قوانین کا پابند رہنا ہم پر واجب ہے، اور اس کی رعایت نہ کرنا ملک کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی ہے، اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے ـــ غرض، سماجی زندگی میں ہم ہر جگہ ایک عہد کے پابند ہیں، بعض عہد ہم اپنی زبان سے کرتے ہیں، بعض عہد ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے ازخود ہم سے متعلق ہو جاتا ہے، بعض عہد کسی معاملہ کی وجہ سے شرعاً ہمارے ذمہ ہوتا ہے، اور بعض سماج کے عرف و رواج کی بنیاد پر بھی ہمارے لئے واجب العمل ہوتا ہے، ہم پر ان سب کی پاسداری ضروری ہے، مگر زندگی کے کتنے ہی مراحل میں ہم اپنے عہد و پیمان توڑتے ہیں، اور وعدے وفا نہیں کرتے، اس پر وقت نظر کے ساتھ غور کرنے اور وعدہ خلافی و بدعہدی کے گناہ سے بچنے کی ضرورت ہے۔

(۲۴؍اگست ۲۰۰۱ء)

ایک مہلک بیماری جو خرید کی جاتی ہے

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اصل میں انسان ہی کے نفع کے لئے ہے، بشرطیکہ انسان اس کا صحیح استعمال کرے، دنیا میں یقیناً ایسی چیزیں بھی ہیں کہ غلط طریقہ پر ان کا استعمال طرح طرح کی بیماریوں کا سبب اور ہلاکت کا باعث بھی ہوسکتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے اور تجربات سے فائدہ اٹھانے کا شعور بخشا ہے، اس سے بڑھ کر ناسمجھی کی کوئی اور بات نہیں ہوسکتی کہ انسان ایک شئی کے نقصان کو جانتے اور سمجھتے ہوئے پھر اسی کو استعمال کرتا جائے، اور اپنی گاڑھی کمائی ایک ایسی چیز پر خرچ کرے جو خود اس کو نقصان پہونچانے والی ہو۔

لیکن عجیب بات ہے کہ عملاً صورتِ حال یہی ہے کہ محنت ومشقت سے حاصل کی ہوئی دولت کا اچھا خاصا حصہ ہماری سوسائٹی میں بہت سے لوگ اسی طرح ضائع کرتے ہیں اور قیمتاً مہلک بیماریاں خرید کرتے ہیں، تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ صرف جاہل و ناخواندہ عوام ہی اس میں مبتلا نہیں ہیں، بلکہ پڑھے لکھے اصحابِ ذوق وادب اور اربابِ فکر ودانش بھی اس نادانشمندانہ عمل میں برابر کے شریک ہیں ___ آپ کے لئے یقیناً یہ بات باعثِ حیرت ہوگی کہ آخر وہ کیا بیماری ہے جو مہلک اور تکلیف دہ بھی ہے، لیکن پیسے دے کر خرید کی جاتی ہے اور پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بھی اسے خرید کرتے ہیں، لیکن آپ حیرت زدہ نہ ہوں، یہ ایک واقعہ ہے اور آپ کو اپنے گردوپیش، دوست احباب میں ہی اس کی کتنی ہی مثالیں مل جائیں گے!

یہ بیماری ہے ''تمباکو کا استعمال''، خواہ آپ پان کے ساتھ زردہ کے نام سے استعمال کریں، یا بیڑی اور سگریٹ کی صورت میں، آپ اپنے سینہ کو بھٹی بنالیں یا آپ

نسوار کی شکل میں ناک میں اس کا استعمال کریں یا دانت میں مل کر تسکین خاطر کا سامان کریں، یہ تمام صورتیں دراصل بیماریاں ہیں، اور ایسی بیماریوں کا پیش خیمہ ہیں جو انسان کو شدید قسم کے آلام میں مبتلا کرتی ہیں اور بالآخر زندگی کی نعمت سے محروم کر دیتی ہیں۔

یہ بلا مشرقی ممالک میں غالباً مغربی ممالک ہی سے درآمد ہوئی ہے، علامہ طحطاوی نے شیخ نجم غزی شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ دمشق میں پہلی دفعہ ۱۰۱۵ھ میں اس کا ظہور ہوا، (طحطاوی علی المراقی: ۳۶۴) اسی کے آگے پیچھے ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں تمباکو کی آمد ہوئی، ہندوستان میں گو تمباکو بہت پہلے سے موجود رہا ہے، لیکن مسلم عہدِ حکومت میں اکبر کے دور میں حقوں کی صورت تمباکو نوشی کے رواج میں اضافہ ہوا، بعض محققین کا خیال ہے کہ تمباکو کا ورود اولاً جنوبی ہند ہی کے علاقہ میں ہوا ہے چنانچہ حکیم محمد عبداللہ رقمطراز ہیں:

> تمباکو ابتداء میں جنوبی ہند کی طرف سے آیا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اہلِ فرنگ ہند میں اسی جانب سے وارد ہوئے تھے، امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی ممبئی ہڑاونکور اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، مآثر رحیمی میں مرقوم ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمال مشرقی ہند میں پہنچا۔ (خواص تمباکو: ۱۴،۱۳)

تمباکو اور سگریٹ کے نقصانات اب کوئی ایسی چیز نہیں رہی جو محتاجِ بیان ہو، اب اس کے نقصانات مسلّمات میں سے ہیں، یوں تو یہ انسان کے پورے وجود کے لئے مضرت رساں ہیں، لیکن خاص کر پھیپھڑے کے لئے سم قاتل ہے، برطانیہ میں ۱۹۵۷ء میں ایک طبی بورڈ مقرر کیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اکثر اموات کا سبب پھیپھڑے کا کینسر ہے۔ اور یہ تمباکو کے استعمال سے پیدا ہوتا ہے ۱۹۶۲ء رپورٹ کے بموجب برطانیہ میں ایک سال میں ۲۳؍ ہزار انسان کی موت صرف پھیپھڑے کے کینسر سے ہوئی جس کا سبب سگریٹ کا استعمال تھا اس کے علاوہ منہ اور حلق کا کینسر اور دل کی بیماریاں تمباکو کے استعمال کی رہین منت ہیں، تازہ امریکی تحقیق کے مطابق تمباکو میں

شامل جزء ''پائرین'' تمباکونوشی کے ''جین'' کو کمزور کر کے کینسر کے جراثیم سے لڑنے کی جسمانی صلاحیت کو کمزور کر دیتا ہے، انسانی جسم میں اگر ''جین، پی، 53'' صحت مند ہو تو وہ کینسر کے مقابلہ قوت مدافعت فراہم کرتا ہے اور یہی جین تمباکونوشی سے اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے، حالیہ تحقیق کے مطابق امریکہ میں کینسر سے جو افراد موت کا شکار ہوتے ہیں، ان میں سے دوتہائی افراد کی تمباکونوشی، موٹاپا، بسیار خوری اور کاہلی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

(روز نامہ منصف ۱۴ر جولائی، سائنس ٹکنالوجی ایڈیشن)

سگریٹ میں جو نکوٹین پائی جاتی ہے، خون پر اس کے سخت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں تمباکو کا اثر انسان کی قوتِ ہضم پر بھی پڑتا ہے، آج کل تمباکوخوری کی جونئی صورتیں وجود میں آئی ہیں جس میں سب سے کثیر الاستعمال ''گٹکا'' ہے، یہ تو اور بھی زیادہ مضرت رساں ہے، اس سے مسوڑھوں اور منھ کے باہری حصہ کا کینسر ہوتا ہے اور گٹکا خوری کی وجہ سے کینسر پیدا ہونے کا تناسب تشویش ناک حد تک بہت زیادہ ہے، اسی لئے ہمارے ملک اور دنیا کے متعدد ملکوں میں سگریٹ کے پیکٹ پر قانوناً اس جملہ کے لکھنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ''سگریٹ پینا صحت کے لئے نقصان دہ ہے،'' اور اب ہمارے ملک میں تمباکوخوری اور تمباکونوشی کو روکنے کے لئے بعض اور تدابیر کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو تمباکونوشی کو عام طور پر ناپسند کیا گیا ہے، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بھی تمباکونوشی کی ممانعت وارد ہوئی ہے، ''براہماپُران'' ہندو پرانوں میں سے ایک ہے، اس میں یہاں تک مذکور ہے کہ تمباکونوشی کرنے والا گو براہمن کو ''دان'' (عطیہ) دیتا ہو پھر بھی وہ نرک (جہنم) ہی میں جائے گا، ''اسکند پران'' میں ہے کہ ''براہمن، چھتری اور دویش جو تمباکو پیتے ہیں وہ چنڈال کی طرح ہیں''، یاگیہ ولکیہ سمرتی میں آٹھ قسم کی منشیات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ایک تمباکو بھی ہے، سکھوں کے دسویں گرو گوند سنگھ جی نے اپنے پیروؤں پر تمباکو کے استعمال کو ممنوع قرار دیا تھا، (ہدایت، شمارہ: ۷، ۸۔ جے پور: ۳۲) اسی لئے گردواروں میں تمباکو رکھنے کو بھی سخت

خلاف احترام سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو عرب میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تمباکو غالباً نہیں پایا جاتا تھا، گو بعض روایات میں تمباکو کی مذمّت وارد ہوئی ہے، لیکن یہ روایات حد درجہ ضعیف اور نامعتبر ہیں، مگر اسلام کی اصولی تعلیمات سے تمباکو کا حکم جانا جاسکتا ہے، اسلام نے بنیادی طور پر تمام نباتات کو حلال رکھا ہے، سوائے ان نباتات کے جو نشہ آور ہوں، مہلک ہوں یا صحت جسمانی کے لئے ضرر رساں ہوں اور ظاہر ہے کہ تمباکو کا جسم انسانی کے لئے مضر ہونا ایک مسلمہ اور متفقہ حقیقت ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے ہر ''مسکر'' اور ''مفتر'' شئی سے منع فرمایا ہے۔ نھی عن کل مسکر ومفتر (ابوداؤد، باب ماجاء فی السکر) مسکر سے مراد نشہ آور اشیاء ہے اور مفتر کا لفظ ''فتور'' سے ماخوذ ہے، فتور کے معنی کمزوری اور گراوٹ کے ہیں، علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: ضعف و انکسار (نہایہ: ۴۰۸/۳) پس ''مفتر'' کا لفظ ہر ایسی چیز کو شامل ہے جو انسانی جسم اور صحت کو کمزوری سے دوچار کرتا ہو، اسی لئے علامہ محمد عبدالرؤف مناوی نے ''حشیش'' کو بھی مفتر اشیاء میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ زین الدین عراقی نے بھی اسی حدیث سے ''حشیش'' کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے، (دیکھئے: فیض القدیر: ۳۳۸/۶) اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مفتر اشیاء میں تمباکو بھی شامل ہے۔

تمباکو کے احکام کی بابت فقہاء اسلام کے درمیان اختلاف رائے ہے، بعض حضرات نے اس کی مضرتوں کی وجہ سے اسے بالکل ہی حرام قرار دیا ہے، بعض حضرات نے بالکل ہی جائز اور مباح، کیونکہ چیزوں میں اصل مباح ہونا ہے اور بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ مکروہ ہے، فقہاء شوافع میں علامہ نجم غزی اس کو حرام قرار دیتے ہیں، (طحطاوی: ۳۶۴) اور طحطاوی ہی نے بعض فقہاء حنفیہ سے اس کی کراہت نقل کی ہے، ہندوستان میں ماضی قریب کے اہلِ علم زیادہ تر اس کے جواز کے قائل ہیں، البتہ اس کو خلاف اولیٰ سمجھتے ہیں اور مسجد جاتے وقت منھ صاف کر کے جانے کی تلقین کرتے ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہی، (فتاویٰ رشیدیہ: ۴۸۱) مولانا اشرف علی تھانوی (امداد الفتاویٰ: ۱۱۴/۴) اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(فتاویٰ رضویہ: ۱۱/۴۵) اور ان سے پہلے کے اہلِ علم میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی (مجموعہ الفتاویٰ: ۱/۲۲۹) کے فتاویٰ ملاحظ کئے جاسکتے ہیں، لیکن عرب علماء کا عام رجحان اس کے ناجائز ہونے کی طرف ہے، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد ابراہیم آل شیخ کے فتاویٰ اس سلسلہ میں بار بار سعودی عرب سے طبع ہوچکے ہیں، شیخ محمد ابراہیم کا فتویٰ بہت تفصیلی ہے، اور انہوں نے حنفیہ، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ چاروں دبستانِ فقہ کے اہلِ افتاء کے فتاویٰ اس کی حرمت وممانعت پر نقل کئے ہیں، یہی رائے علماء ہند میں مولانا عبدالرحمان مبارکپوری کی ہے، (تحفۃ الاحوذی: ۳/۴۴) فقہی نقطۂ نظر سے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ تمباکو کا استعمال مکروہ ہے اور طبّی اعتبار سے تمباکو کے استعمال کی جو صورت جتنی زیادہ مضرت رساں ہو، اس میں اسی قدر شدت کے ساتھ کراہت پائی جائے گی، ایسا لگتا ہے کہ ہمارے علماء ہند تک اس کے نقصانات اور مضرتوں کی تفصیلات پہنچ نہیں پائی تھیں، انہوں نے تمباکو کے صرف ظاہری اور وقتی اثرات پر نگاہ رکھی اور اس کے اندرونی اور مستقل مضرتوں اور ہلاکت خیزیوں کے بارے میں ان کو کماحقہ علم نہیں ہو پایا، آج کل جو طبی تحقیقات سامنے آرہی ہیں، اگر یہ ان کے سامنے موجود ہوتیں تو یقیناً ان کا رجحان اس بارے میں زیادہ شدید ہوتا۔

تمباکو نوشی کے نقصانات عالمِ اسلام میں جب کبھی بھی سامنے آئیں اس کو رو کنے کی بھرپور تدابیر کی گئیں، ۱۰۳۲ھ میں سلطان احمد اوّل نے تمباکو کی تمام دکانیں بند کرنے کا حکم دیا، سلطان مراد چہارم کے بارے میں تو منقول ہے کہ وہ تمباکو نوشی کرنے والوں کے دونوں ہونٹ اور نسوار استعمال کرنے والے کی ناک کٹوادیتا تھا، شریف مکہ سعود بن سعود نے ۱۱۴۶ھ میں برسرِ عام قہوہ خانوں اور بازاروں میں تمباکو نوشی کی ممانعت کا فرمان جاری کردیا تھا، سوڈان میں مہدی تمباکو کو استعمال کرنے والوں کو اسی ۸۰ کوڑے اور ایک ہفتہ قید کی سزا دیتا، مغل بادشاہ جہانگیر نے اپنی قلمرو میں تمباکو نوشی پر سخت پابندی عائد کردی تھی، کم وبیش دوسری قوموں میں بھی ملک وقوم کے بہی خواہ حکمرانوں نے تمباکو نوشی کا سدِ باب کرنے کی بھی کوشش کی، انگلینڈ میں شاہ جاک اوّل نے سر والٹر رالی کو

جس نے انگلینڈ میں تمباکو کو فروغ دیا، گرفتار کر کے سزائے موت دی، سترہویں صدی کے اواخر تک روسی حکام تمباکو نوشوں کو سخت سزا دیا کرتے، پہلی دفعہ کوڑے لگاتے، دوسری بار پینے پر ناک کاٹ دیتے اور تیسری دفعہ میں سزائے موت دے دیتے۔

(ماہنامہ ہدایت: شمارہ: ۷: ۷صفحہ ۳۰)

گو تمباکو نوشی فطرتِ سلیمہ کے لئے متفقہ طور پر نہایت مذموم، ناپسندیدہ، قابلِ ترک اور لائق اجتناب شئی ہے، اس سے بچنا اور اگلی نسلوں کو اس سے بچانا ہم سب کا فریضہ ہے، بدقسمتی سے نوجوانوں کے لئے اب یہ ایک فیشن بنتا جا رہا ہے، اگر ہم نے اپنی نسلوں کو اس بلاء بے درماں سے بچانے کی کوشش نہیں کی تو یہ ان کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہوگا۔

(۳۰/جولائی......۱۹)

خودکشی ـــــ تشویش ناک سماجی مسئلہ

زندگی بہت بڑی نعمت ہے، ایسی نعمت جس کا کوئی بدل نہیں، جو جانے کے بعد واپس نہیں آتی، انسان یہ نعمت اپنی محنت اور کدوکاوش سے حاصل نہیں کرتا بلکہ کائنات کے رب کا عطیہ ہے، ایسا عطیہ جو علم و تحقیق کی اتنی ترقی کے باوجود ایک سربستہ راز ہے، علم وسائنس کی ترقی اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ انسان اپنے ایک ایک عضو کے بارے میں جاننے لگا ہے کہ وہ اس کا حجم کتنا ہے؟ سر کے بال سے پاؤں کے ناخن تک اس نے بدن کے ایک ایک انگ اور رگ وریشہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے، لیکن آج بھی عقل اس گرہ کو کھولنے سے عاجز ہے اور قدرت کے رازِ سربستہ سے پردہ اٹھانے میں ناکام ہے کہ آخر روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ جسم میں کیوں کر آتی ہے اور کہاں سے آتی ہے؟ پھر کس طرح چپ چاپ جسم کو داغِ فراق دے کر چلی جاتی ہے کہ نہ کوئی ہاتھ ہے جو اسے تھام سکے، نہ کوئی حساس سے حساس مشینی آلات ہیں، جو اس کو گرفتار کرسکیں یا کم سے کم اس کی حقیقت کا ادراک ہی کرلیں، انسان کی یہ مجبوری اور علمی بے بسی خدا کا یقین دلاتی ہے اور ایمان میں تازگی پیدا کرتی ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگ آپ ﷺ سے روح (زندگی) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ ﷺ فرمادیں کہ یہ میرے رب کے حکم اور فرمان سے عبارت ہے۔ ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی''۔ (بنی اسرائیل:۸۵)

پس انسان اپنی ''زندگی'' کا خود مالک نہیں ہے بلکہ امین ہے، زندگی اس نے حاصل نہیں کی ہے، بلکہ اسے عطا فرمائی گئی ہے، یہ اس کے پاس خالق کائنات کی امانت ہے اور ممکن حد تک اس کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بیماری کا علاج کرنے کی تاکید فرمائی، خود آپ ﷺ نے اپنا علاج کرایا اور اسی لئے علماء نے

لکھا ہے کہ علاج کرانا توکل کے خلاف نہیں، کیوں کہ توکل اور قناعت کے اعلیٰ درجہ پر حضراتِ انبیاء کرام فائز تھے اور وہ علاج بھی کراتے تھے اور حفظانِ صحت کے اُصول کی رعایت بھی کرتے تھے۔

کوئی بھی ایسا عمل جو انسانی صحت یا زندگی کے لئے مضرت رساں ہو اور انسانی زندگی کو خطرہ میں ڈال سکتا ہو، جائز نہیں، آپ ﷺ نے ہر ایسی چیز کے کھانے سے منع فرمایا، جو نشہ آور یا جسم کو نقصان پہنچانے والی (مفتر) ہو۔ ''مفتر'' یعنی جسم کے لئے مضرت رساں چیزوں کے کھانے کی ممانعت تو ظاہر ہے کہ صحت اور زندگی کے تحفظ کے لئے ہے، لیکن نشہ آور چیزوں سے منع کرنے کی وجہ جہاں یہ ہے کہ اس سے انسان کی عقل وفہم پر زد پڑتی ہے اور بہت سے اخلاقی مفاسد اس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہیں یہ بھی ہے کہ یہ ایک میٹھا زہر ہے جو موت کی طرف زندگی کے سفر کی رفتار کو بڑھا دیتا ہے۔

اسی لئے فقہاء نے نباتات میں ایسی چیزوں کے کھانے کو ناجائز قرار دیا ہے، جو زہر کے قبیل سے ہو اور انسانی زندگی کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتی ہو۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵۰۶/۳)

اسلام تو اللہ کی عبادت اور بندگی میں بھی ایسے غلو کو پسند نہیں کرتا کہ انسان اپنی صحت کو برباد کر لے اور جان جوکھم میں ڈالے، عہد نبوی ﷺ میں بعض حضرات نے یہ معمول بنالیا تھا کہ رات بھر عبادت میں مشغول رہتے اور دن میں روزہ رہتے، ایک دوسرے صحابی حضرت سلمان فارسیؓ نے ان کو اس سے منع کیا اور فرمایا: تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہارے اپنے وجود کا بھی حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، اس لئے کبھی روزہ رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سونے کا بھی اہتمام کرو، حضور ﷺ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے حضرت سلمانؓ کے نقطۂ نظر کو درست قرار دیا اور تصویب فرمائی، (بخاری: ۲۶۴/۱) آپ ﷺ نے جان بچانے کے لئے دوا کے طور پر ایسی چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دی جو اصلاً ناجائز اور حرام ہیں۔ (بخاری: ۴۶/۱)

یہ اور اس طرح کی اسلامی تعلیمات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جیسے اسلام نے دوسروں کی جان بچانے کا حکم دیا ہے، اسی طرح انسان پر یہ بات بھی واجب ہے کہ وہ

بہ حد امکان اپنی جان کی حفاظت کرے، کیوں کہ زندگی اس کے پاس خدا کی امانت ہے اور امانت کی حفاظت اسلامی، اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے، اسی لئے اسلام کی نگاہ میں ''خود کشی'' بہت بڑا گناہ اور سنگین جرم ہے، ایسا گناہ جو اس کو دنیا سے بھی محروم کرتا ہے اور آخرت سے بھی، خود قرآن مجید نے خودکشی سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ''لا تقتلوا انفسکم'' (النساء:۲۹) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات ہیں جن میں نہایت سختی اور تاکید کے ساتھ خودکشی کو منع فرمایا گیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے آپ کو پہاڑ سے گرا کر خودکشی کی وہ جہنم کی آگ میں بھی اسی طرح ہمیشہ گرتا رہے گا اور جس شخص نے لوہے کی ہتھیار سے خود کو ہلاک کیا وہ دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے پیٹ میں ہتھیار گھونپتا رہے گا، (بخاری) ایک اور روایت میں ہے کہ گلا گھونٹ کر خودکشی کرنے والا جہنم میں ہمیشہ گلا گھونٹتا رہے گا اور اپنے آپ کو نیزہ مار کر ہلاک کرنے والا دوزخ میں بھی ہمیشہ اپنے آپ کو نیزہ مارتا رہے گا۔ (بخاری)

حضرت طفیل بن عمر دوسیؓ کے ساتھ ایک اور صاحب نے مدینہ ہجرت کی، وہ دوسرے صاحب بیمار پڑ گئے، تکلیف کی شدت کے باعث ان سے صبر نہ ہو سکا اور ایک ہتھیار سے اپنی اُنگلیوں کے جوڑ کاٹ لئے، رگیں کٹ گئیں اور خون اتنا بہہ گیا کہ انتقال ہو گیا، حضرت طفیلؓ نے ان کو خواب میں دیکھا کہ وہ بہتر حالت میں ہیں، لیکن ان کے ہاتھ ڈھکے ہوئے ہیں، حضرت طفیلؓ نے دریافت کیا کہ آپؓ کے رب نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ ان صاحب نے کہا: اللہ نے ہجرت کی وجہ سے مجھے معاف کر دیا، لیکن میرے ہاتھوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جس چیز کو تم نے خود بگاڑ لیا ہے، میں اسے درست نہیں کرسکتا، حضرت طفیل نے یہ خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی کہ بارالٰہا! ان کے ہاتھوں کو بھی معاف فرمادے! (مسلم عن جابرؓ)

صحابیٔ رسول حضرت جندبؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے کی قوموں میں ایک شخص کو زخم تھا، وہ تکلیف برداشت نہ کر سکا، چھری لی اور اس سے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا، خون تھم نہ سکا اور موت واقع ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بندہ نے اپنی

ذات کے معاملہ میں مجھ پر سبقت کرنے کی کوشش کی، اس لئے میں نے اس پر جنت حرام کر دی، (بخاری و مسلم) رسول اللہ ﷺ رحمت مجسم تھے، لیکن اس کے باوجود حضرت جابر بن سمرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے خودکشی کر لی، تو آپ ﷺ نے اس پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، (ترمذی) اسی لئے ایک جلیل القدر فقیہ اور محدث امام احمدؒ کا خیال ہے کہ خودکشی کرنے والے شخص پر عام لوگ تو نمازِ جنازہ پڑھیں گے، لیکن امام المسلمین نماز جنازہ نہیں پڑھے گا۔ (ترمذی)

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خودکشی اسلام کی نگاہ میں کتنا سنگین جرم ہے؟ یہ دراصل زندگی کے مسائل اور مشکلات سے راہِ فرار اختیار کرنا ہے اور آزمائشوں اور اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ نکلنے کی ایک غیر قانونی اور ایک غیر انسانی تدبیر ہے، بدقسمتی سے ایمان سے محرومی یا کمزوری اور اپنی ذمہ داریوں سے بے اعتنائی کے باعث اس وقت پوری دنیا میں خودکشی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں سماجی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے عرصہ سے خودکشی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، مغربی ممالک میں سماجی نظام کے بکھراؤ کی وجہ سے عرصہ سے خودکشی کو انسان کا نجی حق تسلیم کیا جاتا ہے، جو لوگ طویل عرصہ سے بیمار ہوں، ان کو بعض مغربی ملکوں میں مہلک انجکشن لگوا کر مر جانے کی قانونی اجازت حاصل ہوگئی ہے، بلکہ ان کے ورثاء اور رشتہ داروں کو بھی اس کی اجازت دے دی گئی ہے اور اس کو ''قتل بہ جذبۂ رحم'' کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔

چند سالوں سے ہمارے ملک ہندوستان میں بھی خودکشی کے واقعات میں بڑا اضافہ ہوا ہے اور اس سال معاشی حالات کی ناموافقت کی وجہ سے آندھرا پردیش میں تقریباً پانچ سو کاشت کاروں کی خودکشی نے اخبارات و رسائل میں جلی عنوان کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور ریاستی اسمبلی سے لے کر پالیمنٹ تک اس کی گونج سنی جا رہی ہے، پڑوس کی ریاست اڑیسہ میں بھی کسانوں کی خودکشی کے واقعات بکثرت پیش آئے ہیں، ہفتہ میں چار پانچ دن میں اخبارات میں ایسی خبریں مل ہی جاتی ہیں، جن میں خواتین کی خودسوزی اور خودکشی کا ذکر ہوتا ہے، یہ واقعات عام طور پر سسرال والوں کی زیادتی اور پیسوں کے نہ ختم ہونے والے مطالبات کی وجہ سے پیش آتے ہیں، ایسے ماں باپ کی خودکشی بھی انوکھی

بات نہ رہی جو اپنے افلاس وغربت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے سے قاصر ہیں اور ظالم سماج نے ان کو سخت ذہنی تناؤ میں مبتلا کیا ہوا ہے، کچھ واقعات ایسے مقروضوں کے بھی پیش آتے ہیں کہ قرض، سود اور سود در سود نے ان کی ہمت توڑ رکھی ہے۔

مقامِ افسوس بھی ہے اور لائق حیرت بھی کہ بہت سے مسلمان بھی اب اس کا شکار ہو رہے ہیں، لائق حیرت اس لئے کہ خودکشی بنیادی طور پر ایمان کی کمزوری یا اس سے محرومی کی وجہ سے کی جاتی ہے، جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو، یقین کرتا ہو کہ خدا دشواریوں کی سیاہ رات سے آسانی اور امید کی صبح نو پیدا کر سکتا ہے، جو شخص تقدیر پر ایمان رکھتا ہو کہ خوش حالی اور تنگ دستی اور آرام و تکلیف اللہ ہی کی طرف سے ہے، صبر و قناعت انسان کا فرض ہے اور جو آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ زندگی کے مصائب سے تھکے ہوئے مسافروں کے لئے وہاں راحت و آرام ہے اور زندگی کی آزمائشوں سے راہِ فرار اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ کی پکڑ اور عذاب، وہ کیسے مشکل وقتوں میں خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھنے یا بارگاہِ ربانی میں دست سوال پھیلانے اور خدا کی رحمت سے اُمید رکھنے کے بجائے مایوس ہو کر اپنے آپ کو ہلاک کر لے گا؟؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ خودکشی کے اخلاقی اور سماجی نقصانات لوگوں کو بتائے جائیں، سماج میں لوگوں کی تربیت کی جائے کہ وہ تنگدستوں اور مقروضوں کے ساتھ نرمی اور تعاون کا سلوک کریں، گھر اور خاندان میں محبت اور پیار کی فضا قائم کریں اور باہر سے آنے والی بہو کو محبت کا تحفہ دیں، رسم ورواج کی جن زنجیروں نے سماج کو زخمی کیا ہوا ہے، ان کو کاٹنے کی کوشش کریں، شادی، بیاہ کے مرحلوں کو آسان بنائیں اور جو لوگ ذہنی تناؤ سے دو چار ہوں اور مشکلات میں گھرے ہوئے ہوں، ان میں جینے اور مسائل و مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کریں، کہ بقولِ حضرت کلیم:

سلگنا اور شئی ہے جل کر مر جانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے وہ پروانوں سے کیا ہوگا

(۲۴؍جولائی ۱۹۹۸ء)

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

۱۲؍ مارچ ۱۹۹۸ء کے روزنامہ ''منصف'' میں شہ سرخی کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ حیدرآباد شہر میں ''سیمن بینک'' قائم ہو چکا ہے، جہاں مردوں سے مادۂ تولید حاصل کیا جاتا ہے اور اولاد کی خواہش مند بانجھ خواتین کو فروخت کیا جاتا ہے اور ان کے رحم میں اس کو پہنچایا جاتا ہے، ڈاکٹر مادۂ تولید حاصل کرنے میں طبی نقطۂ نظر سے ہر طرح کی احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں، جو ہر حیات فروخت کرنے والوں کو ایک بار ۱۲۰؍ روپے قیمت ادا کی جاتی ہے، خبر کے مطابق اب تک اس بینک کو پچاس مستقل عطیہ دہندگان حاصل ہو چکے ہیں اور تیس خواتین اس سے حاملہ ہونے کی آرزو پوری کر چکی ہیں۔

حیدرآباد کے لئے تو یہ خبر غالباً ایک انکشاف کا درجہ رکھتی ہے، لیکن ہندوستان میں مغربی تہذیب کے باب الداخلہ ممبئی میں عرصہ پہلے سے ایسے بینک قائم ہیں اور ممکن ہے کہ ملک کے دیگر شہروں میں بھی اس طرح کے ادارے کام کر رہے ہوں، عرصہ پہلے جانوروں کے لئے اس کا تجربہ کیا گیا تھا اور اب جانوروں پر حمل و تولید کا یہ طریقہ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، بلکہ اب مختلف جانوروں کے اختلاط اور ان کے ذریعہ ایسی نسل کے حصول کا بھی کامیاب تجربہ کیا جا رہا ہے، جس میں دونوں صنف کے جانوروں کی خصوصیات جمع ہوں۔

حیوانات میں نر کا مادۂ تولید مادہ کے رحم تک پہنچایا جائے، اس میں اخلاقی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں، یہ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی جائز ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں میں نسب کی پہچان اور والدین اور اولاد کی شناخت نہیں رکھی، اس لئے اگر ان کا نسب مجہول ہو اور شناخت باقی نہ رہے تو کوئی حرج نہیں، اگر دو الگ الگ جنس کے نر و مادہ کا اختلاط ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نظر نہیں آتا کہ اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خچر

موجود تھے، جو گدھے اور گھوڑی کے اختلاط سے پیدا ہوتے تھے، ان کی سواری کی جاتی تھی اور خود آپ ﷺ نے بھی خچر کی سواری فرمائی، یہ شرعی اعتبار سے اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

اگر نر و مادہ حلال ہوں تو ان سے پیدا ہونے والا بچہ بھی حلال ہوگا اور اس کا کھانا جائز و درست ہوگا، کیوں کہ حیوانات کی شناخت ان کی ماں ہی سے ہے۔ اگر ایک حلال اور ایک حرام ہو تو فقہاء کے ایک گروہ کا خیال ہے "مادہ" حلال ہو تو حلال اور مادہ حرام ہو تو حرام تصور کیا جائے، دوسرا خیال ہے کہ اس کی عادات و خصائل پر فیصلہ ہوگا، کیوں کہ ظاہری طور پر یہی ایک ذریعہ ہے، جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس جانور کی زیادہ مماثلت کس سے ہے؟ مثلاً کتے اور بکری کے اختلاط سے بچہ پیدا ہو، یہ سامنے کے دانت سے کھائے اور کتے کی طرح بھونکے تو اسے کتا شمار کیا جائے گا اور اگر کنارے کے دانتوں سے کھائے اور اس کی آواز بکری سے مماثلت رکھتی ہو، تو حلال ہوگا، تیسری رائے ہے کہ ایسے جانور کو حرام تصور کیا جائے گا، کیوں کہ اسلامی قانون میں اس بات کو بطورِ اُصول مانا گیا ہے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں حلال و حرام کے پہلو جمع ہوں تو حرام ہونے کی ترجیح دی جائے گی، **اذا اجتمع الحلال و الحرام غلب الحرام** (الاشباہ والنظائر: ۱۰۹) حقیقت یہ ہے کہ یہی تیسری رائے ان میں سے قوی، شریعت کے مزاج سے قریب اور شریعت کے اُصول وقواعد سے ہم آہنگ ہے۔

عقل و شعور کی خصوصی صلاحیت کے سوا اگر انسان اور دوسرے جانوروں کے ان اوصاف کا تقابل کیا جائے جو بحیثیت حیوان انسان میں پائے جاتے ہیں، تو بڑی مماثلت نظر آتی ہے، دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھو کر محسوس کرنے کی صلاحیت انسان میں بھی ہے اور دوسرے جانوروں میں بھی، خورد و نوش کی ضرورت اور ہضم کا نظام بھی دونوں کے ساتھ ہے، توالد و تناسل کے لئے نر و مادہ کا اختلاط اور تولیدی نظام میں بھی بڑی حد تک یکسانیت ہے، لیکن جو چیز انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، وہ عفت و عصمت اور نسب کی شناخت ہے، یہی چیز انسانی معاشرہ میں خاندان کو وجود میں لاتی ہے، نکاح کے ذریعہ مرد و عورت میں قانونی ارتباط بہم پہنچتا ہے، پھر اسی سے رشتے بنتے ہیں اور قرابت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔

ہر شریف سماج میں عفت و عصمت اور نسب کی پہچان کو باقی رکھنے کو نہایت ضرورت اور اہم تسلیم کیا گیا ہے اور اسی نسبت سے بے عفتی اور بے نسبی کو نفرت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، عیسائیت میں حضرت مریم کی اور ہندو مذہب میں سیتا کی عفت و عصمت کو اخلاقی نمونہ مانا گیا ہے، اسلام ___ جو سب سے محفوظ مذہب ہے اور جس کی تعلیمات قیامت تک کے لئے مشعل ہدایت ہیں ___ نے شرک کے بعد سب سے زیادہ جس گناہ کی مذمت کی ہے، وہ زنا ہے اور اس جرم کی اتنی سخت سزا مقرر کی ہے کہ ارتداد کی سزا بھی اس درجہ شدید نہیں، پھر غور کرو تو اسلام کا پورا قانونِ معاشرت دو باتوں پر مبنی ہے: عفت و عصمت کی حفاظت اور زوجین میں محبت و مودت کی برقراری، طلاق و خلع اور شوہر کے ظلم سے نجات پانے کے لئے فسخ و تفریق کی گنجائش، قانونِ عدت، پردہ و حجاب کے احکام اور غیر محرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط کی ممانعت، ان سب کا مدعا اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان حیوانات کی طرح بے نسب نہ ہو جائے اور جانوروں کی طرح شہوت رانی پر کمربستہ نہ ہو۔

انسانی تاریخ میں متعدد ایسے ادوار گزرے ہیں جن میں انسان نے اپنے آپ کو حیوان کی سطح سے بھی پست کر لیا ہے اور شاید شیطان بھی ان کی اخلاقی پستی دیکھ کر عرق آلود ہوا ہوگا، ایران میں ۴۸۷ء میں ''مزدک'' پیدا ہوا، جس نے عورتوں کو آگ، پانی اور چارہ کی طرح مشترک اور تمام انسانوں کے لئے حلال قرار دیا اور ماں بہن کی تمیز بھی اٹھا دی، (الملل والنحل للشہرستانی: ۲۴۴/۱ط: بیروت) طبری کا بیان ہے کہ اس مفسدانہ فلسفہ نے ایسا زور پکڑا کہ جو چاہتا اور جس کے گھر میں چاہتا گھس جاتا، نہ باپ اپنی اولاد کو پہچان سکتا تھا اور نہ اولاد اپنے باپ کو۔

(تاریخ طبری: ۸۸/۲)

یونان حالاں کہ تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے، لیکن یونان کے زوال میں اخلاقی پستی نے بڑا کردار ادا کیا ہے، اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ پروفیسر لیکی کے بقول ''بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ طوائف سے غیر مخفی راہ و رسم رکھتے اور ان کے گرد ہر وقت مشاہیر شعراء، ماہرین فنونِ لطیفہ، مؤرخین اور فلاسفہ کا مجمع لگا رہتا تھا اور اکثر ان کا مکان علمی صحبت کا مرکز ہوتا تھا''، (تاریخ اخلاق یورپ: ۲۵۲،۵۳) یہاں تک کہ اس زمانہ میں سقراط جیسا فلسفی و حکیم

اپنے زمانہ کی مشہور طوائف تھوڈ ونا کو اس کی پیشہ عصمت فروشی کی متعلق رونق و ترقی کا مشورہ دیتا نظر آیا ہے۔ (حوالۂ سابق: ۲۴۱)

موجودہ مغربی تہذیب دراصل اسی مزدکی فلسفہ کی نقیب اور وارث ہے، چنانچہ عرصہ پہلے کے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ہر سال اوسطاً ۱۰ / لاکھ حرامی بچے اسقاط کے ذریعہ ضائع کر دیئے جاتے ہیں، پچاس فی صد کنواری لڑکیاں اور ۲۶ / فیصد شادی شدہ عورتیں زنا میں ملوث ہیں اور کم از کم ہر پانچ میں ایک بچہ صحیح النسب نہیں ہوتا، (ضبط ولادت: ۴۲ ـ ۴۰) اور یہ تو بہت پرانے اعداد و شمار ہیں، اب تو کہا جاتا ہے کہ دفاتر فارموں میں صرف ماں کے نام کا خانہ ہوتا ہے، باپ کے نام کا خانہ نہیں ہوتا، انسانیت کی ایسی تذلیل و رسوائی شاید ہی اس سے پہلے کبھی ہوئی ہو۔ **فیا اسفاہ و یا عجباہ !**

ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ اجنبی مرد و عورت کے مادۂ تولید کو بار آور کرنا یا اجنبی اور غیر معروف مردوں کے مادۂ تولید کو عورت کے رحم میں منتقل کر کے اس کو ماں بنانا کھلی ہوئی بدکاری اور انسانوں کو حیوان کی سطح پر اُتارنا ہے، انسان کو نسب اور اپنی شناخت سے محروم کر دینا اخلاق و شرافت کے بالکل مغائر ہے اور شاید ہی کوئی مذہب ہو جو اس کو جائز رکھتا ہو، اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خدا و آخرت پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کے لئے یہ قطعاً حلال نہیں کہ وہ اپنے پانی یعنی مادۂ تولید سے دوسرے کی کھیتی یعنی بیوی کے علاوہ کسی اور خاتون کے رحم کو سیراب کرے۔ **لایحل لامرء یومن باللہ و الیوم الآخر ان یسقی ماء ہ زرع غیرہ** . (ترمذی)

ماں بننے کی خواہش ہر چند کہ عورتوں کی ایک فطری خواہش ہے، لیکن یہ خود اس جوڑے کے لئے یا انسانی سماج کے لئے ایسی ضرورت نہیں کہ جس کے لئے ایسے فعل کی اجازت دی جائے، جو نہ مذہب کی بارگاہ میں قابل قبول ہو اور نہ شرافت و تہذیب کے ایوان میں قابل تسلیم، یہ دراصل مشرق کی مذہبی روایات پر شب خوں مارنے کی کوشش ہے اور اس سے بڑھ کر بدنصیبی کی بات کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ توالد و تناسل کے اس غیر انسانی طریقہ پر ایک بھی صدائے احتجاج بلند نہ ہو۔ (۱۷ / اپریل: ۱۹۹۸ء)

ستی کا واقعہ۔ ملک وقوم کے لئے داغِ ندامت!

یوں تو آج کل ہمارے ملک میں اکیسویں صدی کا بہت چرچا ہے، راجیو گاندھی نے ملک کو عصری تقاضوں کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل کرنے کا نعرہ دیا تھا، لیکن آج تمام ہی قومی قائدین نے اس کو اپنا نعرہ بنالیا ہے، بعض توہم پرست لوگ تو ایسا سمجھنے لگے ہیں کہ گویا اکیسویں صدی شروع ہونے کے بعد شاید کچھ غیر معمولی اور عجوبہ واقعات ظہور میں آئیں گے، بعض لوگوں کے یہاں یہ بحث جاری ہے کہ ۲۰۰۰ء سے اس صدی کا آغاز ہوگا یا ایک سال بعد، اس صدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ یہ سائنس اور ٹکنالوجی، علم وتحقیق اور علم وتحقیق کے وسیلہ سے خوشحالی اور اقتصادی ترقی کی صدی ہوگی، لیکن کیا واقعی ہم نے فکری اور عملی اعتبار سے ترقی کا سفر جاری رکھا ہے یا ہم فکر ونظر کی تاریکی اور تہذیب وتمدن کی پستی کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں، یہ ایک اہم سوال ہے؟

ہم نے یقیناً نیوکلیر بم بنالئے ہیں، دور دراز تک مار کرنے والے میزائیل کو وجود بخشا ہے، سمندر کی تہوں میں اتر کر جنگ وجدال کی صلاحیت حاصل کی ہے، سائنس اور تحقیق کے دوسرے شعبوں میں بھی ہم نے اپنے قدم آگے بڑھائے ہیں، لیکن ایک محدود طبقہ تک ہی ہماری کامیابیاں محدود ہیں، ملک کے عام باشندے اور دیہات وقریہ جات میں رہنے والے ہم وطنوں تک ہم علم کی روشنی پہنچانے اور تہذیب و تمدن کی شمع جلانے میں ناکام رہے ہیں، اس کی ایک مثال اکیسویں صدی کی دہلیز پر بھی ''ستی'' کے واقعات کا پیش آنا ہے، ۱۱ر نومبر کو اتر پردیش میں موضع ست پر دان جو ''مہوا'' کے قریب واقع ہے، میں ''ستی'' کا واقعہ پیش آیا ہے، ذرائع ابلاغ کی

رپورٹ کے مطابق چرن شاہ کے شوہر کا انتقال ہوگیا، اور مذکورہ تاریخ کو آخری رسومات انجام دی گئیں، چرن شاہ نے دلہن کا لباس زیب تن کیا، بن سنور اور سج دھج کر آئی اور اپنے شوہر کی شعلہ بار چتا پر کود گئی، لوگ اس تماشا کو دیکھتے رہے لیکن اسے بچانے اور روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، چرن شاہ کی لاش اس قدر جل بھن کر راکھ بن گئی کہ پوسٹ مارٹم بھی نہیں کیا جا سکا۔

حالانکہ پولس نے اسی واقعہ کے بعد اس علاقہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تاکہ یہ ستی کی ترغیب کا باعث نہ بنے، لیکن لوگوں نے ایک نہیں سنی اور ۱۴ر نومبر کی اخباری اطلاع کے مطابق اس وقت تک ۳۰ر ہزار ہندو انتہائی عقیدت کے ساتھ اس مقام کا درشن کر چکے ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے، لوگ اس جگہ ایک مندر بنانا چاہتے ہیں، ہندو عورتیں انتہائی عقیدت کے ساتھ ''ستی استھل'' پر پھول اور سیندور چڑھانے کے لئے آرہی ہیں، دیہاتیوں کے بیان کے مطابق یہ علاقہ ''ستی'' کی رسم کے لئے مشہور ہے اور گذشتہ پچاس برسوں میں یہ چوتھا واقعہ ہے، ستی کے مقام پر پوجا کی جاتی ہے اور ہر جمعرات کو میلے لگائے جاتے ہیں۔

سائنس و ٹکنالوجی اور علم و تحقیق کے اس عہد میں بھی اس طرح کے واقعات کا پیش آنا نہایت شرمناک بات ہے، مسلمانوں کے اس ملک میں آنے سے پہلے ہندوستان میں ''ستی'' کا رواج برہمنوں کو چھوڑ کر دوسری ذات کے افراد میں عام تھا، مسلمانوں نے اس بدبختانہ رسم کو مٹانے کی بڑی کوششیں کیں، پھر انگریزوں کے عہد میں ستی کو ممنوع قرار دینے کے لئے مستقل قانون بنا، لیکن اس کے باوجود ملک کے بعض علاقوں خاص کر راجستھان وغیرہ میں ستی کے شدہ شدہ واقعات پیش آتے رہے ہیں، اور بار بار کے روک تھام کے باوجود ابھی بھی اکا دکا ایسے انسانیت سوز واقعات پیش آجاتے ہیں، ''ستی'' محض ایک رسم نہیں بلکہ ہندو فکر اور قانون معاشرت سے اس کا رشتہ جڑا ہوا ہے، عورتوں کے بارے میں ہندو تصور یہ ہے کہ اس کا اپنا مستقل وجود نہیں بلکہ وہ مرد ہی کے وجود کا ایک حصہ ہے اور اس کی حیثیت ملکیت اور جائیداد کی ہے، بیوی گویا شوہر کی جائیداد ہے، اسی

لئے ہندو سماج میں عورتوں کو کوئی میراث نہیں دی جاتی تھی، لڑکیوں کو اپنے نکاح کے بارے میں کوئی اختیار نہیں تھا اور ان کی مرضی کو دخل دیئے بغیر اولیاء ان کی شادی کر دیا کرتے تھے، نکاح کے بعد طلاق اور علاحدگی کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اور شوہر کے گذر جانے کے بعد بھی ان کے لئے دوسرے نکاح کی گنجائش نہیں تھی، نکاح بیوگاں ہندو سماج میں ایسی ناجائز بات تھی کہ ایک ساتھ بود وباش اختیار کرنے کی وجہ سے مسلمان بھی اسے معیوب سمجھنے لگے، ستی کی رسم بھی غالباً اسی فکر سے جڑی ہوئی ہے کہ چونکہ وہ اپنے شوہر ہی کے وجود کا ایک حصہ ہے اس لئے اسے اپنے شوہر ہی کے ساتھ نذرِ آتش ہو جانا چاہئے، ستی ہونے کو ہندو سماج میں شوہر کے ساتھ کمالِ وفاداری تصور کیا جاتا تھا، اور اسی لئے اس عمل کو تقدیس واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اس طرح کے واقعات ہمیں اسلامی تعلیمات کی پاکیزگی، ان کی عقل وفطرت سے ہم آہنگی اور تمام طبقوں کے ساتھ عادلانہ اور منصفانہ رویہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اسلام نے مردوں اور عورتوں کے وجود کو ''مستقل'' تسلیم کیا ہے، (نساء: ۱۲۴، الغافر: ۴۰) عورتوں کو میراث میں حقدار بنایا ہے، بیوی، بیٹیاں، ماں ان قرابت داروں میں ہیں جو بہر صورت میراث کی مستحق ہیں، (النساء: ۱۲-۱۱) اگر زوجین میں نباہ نہ ہو سکے تو طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے، (البقرۃ: ۲۳۶) بیوہ عورتوں کے لئے نہ صرف نکاح کو جائز قرار دیا گیا، بلکہ اس کی ترغیب دی گئی، (النور: ۳۲) خود رسول اللہ ﷺ نے جن خواتین سے نکاح فرمایا ان میں اکثر بیوہ عورتیں تھیں، عورت کو اپنی جائیداد میں تصرف کا کامل حق دیا گیا، (النساء: ۱۹) عورتوں کی مستقل حیثیت کو تسلیم کرنا اور نکاح کو ایک باعزت معاہدہ قرار دینا جس میں شوہر و بیوی معاملہ کے دو فریق ہیں نہ کہ ایک مالک اور دوسرا مملوک یا ایک صاحبِ سامان اور دوسرا سامان و جائیداد، یہ مرد و عورت کے تعلق کا ایسا صاف ستھرا اور واضح تصور ہے جس میں ستی کی کوئی گنجائش نہیں اور شوہر کے ساتھ اپنے آپ کو نذر آتش کر دینے کا کوئی محرک نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو بھائیوں کو اسلام کا احسان شناس ہونا چاہئے کہ آج عورتوں

کے بارے میں ہندوستان میں جو کچھ قانونی اصلاحات ہوئی ہیں، وہ اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہیں چاہے عورتوں کے لئے حقِ میراث کا مسئلہ ہو یا ناخوشگوار تعلقات کی وجہ سے طلاق کی اجازت کا یا بیوہ عورتوں کے لئے نکاح کی اجازت کا اور نکاح میں لڑکی کی رضامندی و خوشنودی کا، یہ سب اسلام کے متوازن اور عادلانہ قانونِ معاشرت کا نتیجہ ہے، اسی لئے تعلیمی پسماندگی اور اس کی وجہ سے در آنے والی معاشی گراوٹ کے باوجود مسلمانوں میں آج بھی اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے، اگر ہمیں سائنس وٹکنالوجی اور علم وتحقیق کے ساتھ ساتھ فکر ونظر کی بلندی اور تہذیب وتمدن کی درخشانی کے ساتھ اکیسویں صدی میں قدم رکھنا ہے اور ایک صالح اور باضمیر سماج کی تعمیر کرنی ہے تو ضرورت ہے کہ ہم ایک سماجی نظام کی حیثیت سے اسلام کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں کہ جب تک فکر کی اصلاح نہ ہوگی اور قلب وذہن کی دنیا میں انقلاب نہ آئے گا اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے، جو یقیناً قوم اور ملک کے لئے داغِ ندامت اور نشانِ عار ہوں گے!

(۱۶ر نومبر ۱۹۹۹ء)

دختر کشی ـــــ عہد جدید میں

ایک صاحب خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم کفر و جاہلیت میں مبتلا اور بتوں کے پرستار تھے، خود اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے، میری ایک لڑکی تھی، وہ میرے پکارنے سے بہت خوش ہوتی تھی، جب بھی بلاتا دوڑ کر آتی، ایک دن میں نے اسے بلایا، وہ میرے پیچھے پیچھے آئی، میں اسے ساتھ لے کر چلتا رہا، یہاں کہ میں ایک محلّہ کے کنویں کے پاس آیا، جو کچھ زیادہ دور نہیں تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں پھینک دیا اور آخری بات جو میں نے اس کی زبان سے سنی وہ یہ تھی میرے ابو! میرے ابو! ۔ یہ سن کر آپ ﷺ پر گریہ طاری ہوا، اتنا روئے کہ ریش مبارک بھی آنسو سے تر ہوگئی، پھر آپ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمانۂ کفر کے گناہوں کو معاف کر دیا ہے، اب نئے سرے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کرو، (سنن دارمی: ۱۳۱) اسلام سے پہلے عرب میں اس طرح کے ظالمانہ عمل کا ارتکاب کوئی شاذ و نادر بات نہ تھی، بلکہ کثرت سے ایسے واقعات پیش آیا کرتے تھے۔

اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اولاد کشی اور خاص کر دختر کشی کی مذمت کی ہے، (الانعام: ۱۶) لوگ فقر و افلاس کے اندیشے سے قتل اولاد کے مرتکب ہوا کرتے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کم سے کم دو جگہ بھوک اور فاقہ کشی کے خوف سے اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب سے منع فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی روزی ہمارے ذمہ ہے نہ کہ تمہارے ذمہ، (الاسرا: ۴، الانعام: ۱۹) ایک بار آپ ﷺ نے اس سوال پر کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ اول نمبر پر شرک کا نام لیا، پھر والدین کی نافرمانی کا اور اس کے بعد اس خوف سے اولاد کو مار ڈالنے کا کہ اس کے کھانے کا کیا نظم ہوگا۔ (بخاری)

کچھ لوگ وہ تھے جو قتل اولاد کو قربانی تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس عمل کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکیں گے، عربوں میں بھی یہ تصور عام تھا۔ چنانچہ قرآن مجید نے اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس کی مذمت بھی کی ہے، (الانعام:۱۶) خود آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے کی قربانی کی نذر مانی تھی، جب نذر پوری کرنے کی نوبت آئی، تو اپنے دس بیٹوں کو لے کر کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور فال نکالا کہ قربانی کے لئے کس کا نام نکلتا ہے؟ اتفاق کہ سب سے چھوٹے بیٹے عبداللہ کا نام نکلا، یہ وہی عبداللہ تھے جن کے صلب میں نبوت کا ماہِ تمام چھپا ہوا تھا، عبدالمطلب اس قربانی کے لئے پوری طرح تیار تھے، لیکن قریش نے بڑی خوشامدیں کیں کہ اگر بیٹے کی قربانی کا رواج عام ہوگیا تو اس سے ہم کمزور ہو جائیں گے، چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ کے مطابق پانسے نکالے گئے اور بالآخر عبد اللہ کے بدلہ سو اونٹ ذبح کئے، (السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:۱۵۴۱) بچے کی قربانی کے نذر کے بعض اور واقعات بھی حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک خاتون نے اس قسم کی نذر کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ اس کا کفارہ ادا کردو، (موطا امام مالک، باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ) اس سے ظاہر ہے کہ عربوں کے یہاں ایسی قربانی کوئی نادر واقعہ نہ تھی اور یہ کچھ عربوں ہی پر موقوف نہ تھا بلکہ دوسری قوموں میں بھی انسانی قربانی کا رواج رہا ہے، ہندوستان میں بھی دیویوں و دیوتاؤں پر انسانی چڑھاوے کا رواج تھا اور اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایسی خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کہ باپ نے اپنی ہی اولاد کو بلّی چڑھادی۔

تاہم فقر و افلاس کی وجہ سے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے قتل اولاد کے واقعات تو اکا دکا ہوتے تھے، لیکن ''دختر کشی'' کا رواج عربوں میں بہت ہی زیادہ تھا اور اس کے لئے ایسا شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا کہ سن کر اور پڑھ کر آج بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ حضرت قیس بن عاصمؓ نے بارگاہ نبوی ﷺ میں اعتراف کیا کہ وہ اسلام سے پہلے اپنی آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کر چکے ہیں، بلکہ ایک روایت میں بارہ تیرہ لڑکیوں کا ذکر ہے۔ (مجمع الزوائد:۱۳۴۷)

دراصل عرب اپنے گھر میں داماد لانے کو شرم و عار کی بات سمجھتے تھے، اسی لئے بیٹی کی پیدائش کا نام سنتے ہی مارے غصہ کے اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا تھا، اس کے سامنے دو ہی راستے ہوتے تھے، یا تو وہ اس متاعِ رسوائی کو اپنے پاس رکھے یا اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دے، (النحل: ۷) ہندوستان میں بھی راجپوتوں اور بعض دوسری طاقتور قوموں میں لڑکیوں کے دفن کر دینے کا رواج تھا اور شوہروں کے ساتھ بیوی کا ستی ہو جانا بھی غالباً اسی تصور کا ایک حصہ تھا۔

گو اسلام سے پہلے بھی اور خود عرب سماج میں بھی بعض ایسے شریف النفس اور نیک طبیعت لوگ موجود تھے جو بے گناہ نومولود بچیوں کو حاصل کر لیتے اور پرورش کر کے ان کو جوان کرتے تھے، پھر اگر ان کے والدین چاہتے تو بچیاں ان کو واپس کر دیتے، ورنہ خود ہی ان کی پرورش کرتے رہتے، بخاری میں اس سلسلہ میں خاص طور پر زید بن عمرو بن نفیل کا ذکر آیا ہے، (بخاری: ۵۴۰۱) لیکن اس کی حیثیت محض شخصی کوششوں کی تھی اور ایسی کوششیں انفرادی طور پر محض دو چار دس جانوں کے تحفظ کا باعث بن سکتی تھیں، یہ کوششیں اس مقصد میں ذرا بھی بار آور نہیں ہو پائیں کہ عربوں کے ذہن سے شرم و عار کے اس احساس کو مٹا سکیں اور ان کو سمجھا سکیں کہ جو شخص اپنی بیٹی کسی کے حوالہ کرتا ہے وہ ذلیل و حقیر نہیں بلکہ وہ اپنے داماد کا محسن ہے، اور ہر مرد کو اپنی بیوی کے والدین کا منت شناس اور احسان مند ہونا چاہئے۔

لیکن جب پیغمبر اسلام ﷺ رحمت مجسم بن کر تشریف لائے اور کفر و جاہلیت اور اوہام و خرافات کی تہہ در تہہ تاریکی میں ان پر ہدایت کا چراغ روشن کیا، تو آپ ﷺ نے عربوں کے ذہن سے اس تصور ہی کو مٹا دینے میں کامیابی حاصل کی، آپ ﷺ نے لڑکیوں کو ''زحمت'' کے بجائے ''رحمت'' قرار دیا، ان کی پرورش کو آخرت کی نجات کا ذریعہ بتایا، سماج میں قریب قریب مردوں کے مساوی حقوق ان کو عطا فرمائے اور ہر طرح کے اعزاز و احترام سے اس مظلوم طبقہ کو سرفراز کیا، خواتین سے تو آپ ﷺ باضابطہ اس بات کی بیعت ہی لیا کرتے تھے کہ وہ قتل اولاد کا ارتکاب نہیں کریں گی۔

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ یا تو وہ وقت تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ رکھنا اور ان کی

پرورش کرنا بھی باعث عار تصور کرتے تھے، یا پھر وہ وقت آیا کہ حضرت امامہ بنت حمزہؓ کی پرورش کے لئے تین تین صحابہ حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ مدعی تھے، مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں آیا اور آپ ﷺ کو اس سلسلہ میں فیصلہ کرنا پڑا، پھر مسلمان جہاں کہیں گئے وہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگوں کے لئے ایک پیام رحمت ثابت ہوئے، ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے ہی ستی کی رسم ختم کی اور بیوہ عورتوں کے لئے تحفظ کا سروسامان کیا۔

ہمارا یہ دور علم و تحقیق اور اکتشاف کا دور ہے، سائنسی ترقیوں نے بہت سی ایسی باتوں کو ''واقعہ'' بنا کر دکھادیا ہے، جن کو نصف صدی پہلے ناممکن تصور کیا جاتا تھا، علم و تحقیق سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ اکثر دو دھاری تلوار کا درجہ رکھتی ہے، اگر اس کا صحیح استعمال ہو تو بہت نافع، اور غلط استعمال ہو تو اسی درجہ مضرت رساں، ایسی ہی سائنسی تحقیقات میں ایک جنین کے بارے میں قبل از وقت حاصل ہونے والی معلومات ہیں، ایسی معلومات پر مبنی ٹسٹ کے لئے ''سونو گرافی مشین'' ایجاد پذیر ہوئی ہے، اس مشین کے ذریعہ جنین کی جنبش معلوم کرنا ممکن ہے، چنانچہ چند سو روپے خرچ کر کے (Sex Dermination Test) کرایا جاسکتا ہے اور معلوم کیا جاسکتا ہے کہ رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟

ایک معمولی اندازہ کے مطابق اس ٹسٹ پر مبنی اطلاعات کی روشنی میں روزانہ پانچ تا چھ سو لڑکیاں اس عالم رنگ و بو میں آنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اُتاردی جاتی ہیں، یہ قتل دشمنوں اور غیر سماجی عناصر یا غنڈوں کے ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ شفیق باپ اور ''ممتا سے معمور ماں'' کے ہاتھوں ہوتا ہے اور خاندان کے بزرگوں اور خیر خواہوں کا مشورہ بھی اس میں پوری طرح شریک رہتا ہے، گو انسانی حقوق اور خواتین کی مختلف تنظیموں کے احتجاج اور مطالبہ پر قانوناً ایسے ٹسٹ کو منع کردیا گیا ہے، لیکن جب تک اندازِ فکر میں تبدیلی نہ آئے، قانون شکنی کو کب روکا جاسکے گا؟

اصل میں لوگوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ عورت کا وجود سماج کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر مرد کا، اگر عورتوں کی شرحِ پیدائش گھٹتی چلی جائے اور مردوں کا تناسب بڑھتا چلا جائے تو اس سے ایسے سماجی مفاسد پیدا ہوں گے کہ جن کا تصور بھی دشوار ہے، خواتین پر مجرمانہ دست درازی میں اضافہ ہوگا، زنا اور اغواء کے واقعات بڑھیں گے، گھروں کا ماحول

خراب ہوگا، اخلاقی انارکی پیدا ہوگی اور چوں کہ اصل میں افزائش نسل کا مدار عورت ہی کا وجود ہے اس لئے مطلق شرح پیدائش کم ہوتی جائے گی اور اس کے نتیجے میں افرادی وسائل کی قلت کا سامنا ہوگا، انسان کو خاندانی نظام کے سکون سے محرومی کو گوارا کرنا پڑے گا اور اس سے ایسی بے حیائی اور بے شرمی کو راہ ملے گی، جو تصور سے بھی ماوراء ہے، خود ہندوستان میں بعض قبائلی اقوام میں عورتوں کی شرح پیدائش میں کمی کی وجہ سے کئی کئی مردوں کی ''مشترک بیوی'' کا شرم ناک رواج موجود ہے، اسی سے دختر کشی کے اس جرم کی سنگینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم صرف والدین کو دختر کشی کی اس ''جاہلیت جدیدہ'' کا مجرم قرار دیں، تو شاید انصاف نہ ہو، پورا سماج اس کا مجرم ہے، وہ ظالم سماج جو اپنے لڑکوں کو بازار کے سامان کی طرح اُونچی قیمتوں پر فروخت کرتا ہے، جو چاہتا ہے کہ لڑکیوں کے والدین سے ان کی رگ گلو کا آخری قطرۂ خون بھی وصول کرلے، جس کو حرص وطمع نے سیم وزر کا ایسا پیاسا بنا دیا ہے کہ جیسے کوئی سگ گزیدہ مریض، اور جس کی بے رحمی وشقاوت اور سنگدلی پر شاید درندے بھی شرماتے ہوں، جب تک ہم اس اصل مرض کا علاج کرنے میں کامیاب نہ ہوں، دختر کشی کی اس نئی لہر کو روک نہیں سکتے۔

قرآن مجید نے زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کی بابت عجیب نقشہ کھینچا ہے کہ خدا کا دربارِ انصاف لگا ہوگا، خدا پوری شان قہاری کے ساتھ جلوہ افروز ہوگا، ناحق قتل کر دی جانے والی پھولوں کی طرح معصوم بے گناہ لڑکیاں لائی جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرمائیں گے کہ آخر یہ کس جرم میں قتل کی گئی ہیں؟ بای ذنب قتلت ؟ (التکویر:۹) شاید اس وقت ان لڑکیوں کے قاتل ماں باپ بھی کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، وہ ڈاکٹر اور معالج بھی جن کا فریضہ بہ حد امکان زندگی کی حفاظت ہے نہ کہ زندگی کا خاتمہ، اور شاید وہ پورا سماج بھی جو بالواسطہ ان بے گناہوں کے قتل میں شریک وسہیم ہے ____

(۲۷؍اگست ۱۹۹۸ء)

ایک اہم سماجی مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن چیزوں کا ضرورت مند بنایا ہے، ان میں سے ایک نکاح بھی ہے، نکاح نسلِ انسانی کی افزائش کا ذریعہ، انسان کی پاکبازی اور عفت وعصمت کی حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ نکاح ہی ہے، اور یہ نوع انسانی کے فطری تقاضوں میں سے ہے، دین حق کا منشا یہی ہے کہ انسان کی فطری ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے دائرہ میں رہ کر پورا کیا جائے، اسی لئے انبیاء کے ذریعہ آنے والی ہر شریعت میں نکاح کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی، انبیاء جو سب سے برگزیدہ گروہ انسانی ہیں، اور جن کا ایک ایک عمل انسانیت کے لئے اسوہ ہے، انہوں نے نہ صرف نکاح کیا، بلکہ بہتوں نے ایک سے زائد نکاح کئے، حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت حواءؑ کے جوڑے کا ذکر بائبل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام وغیرہ کی ازواجِ مطہرات کا قرآن اور قرآن سے پہلے کی مذہبی کتابوں میں واضح تذکرہ ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہ صرف متعدد نکاح کئے، بلکہ نکاح کو اپنی سنت قرار دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من سنتی النکاح نکاح میرے طریقوں میں سے ہے، (مجمع الزوائد: ۲۵۲/۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پانچ چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کی مشترکہ سنتیں قرار دیا، ان میں ایک نکاح ہے، (حوالۂ سابق: ۲۵۳/۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نکاح کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، پھر بھی نکاح نہ کرے، وہ مجھ میں سے نہیں ہے، من کان موسرا لأن ینکح ثم لم ینکح فلیس منی (مجمع الزوائد: ۲۵۱/۴) جو لوگ بلا عذر تجرد کی زندگی گذارتے ہوں،

آپ ﷺ نے ان کو بدترین لوگ قرار دیا، شرارکم عزابکم (مجمع الزوائد: ۴/۲۵۰)
خود قرآن مجید میں بھی نکاح کی تلقین کی گئی، ارشاد ہے:

"وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم، ان یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله، والله واسع علیم" (النور : ......)

اور تم اپنے میں سے غیر شادی شدہ لوگوں کا نکاح کر دو، اور اپنے غلاموں اور باندیوں میں سے بھی نیک لوگوں کا، اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے اور جاننے والے ہیں۔

اس آیت میں نکاح کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ اس ذہنی گرہ کو بھی کھولنے کی کوشش کی گئی ہے جو عام طور پر نکاح کے بارے میں پائی جاتی ہے، کہ اگر نکاح کر دیا جائے تو اس نکاح سے جو خاندان وجود میں آئے گا، اس کی ضروریات کیسے پوری کی جائیں گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکاح کی وجہ سے انہیں "غنی" سے سرفراز فرمائے گا، اور ان کی رزق میں وسعت پیدا کرے گا، چنانچہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین اشخاص کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر حق ہے، ان میں ایک وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو پاک دامن رکھنے کی غرض سے نکاح کرے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۸۷)

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے نام پر کچھ مذہبی گروہوں نے نکاح سے بے نیازی برتی، جسے "رہبانیت" کہتے ہیں، تو قرآن مجید نے اسے پسند نہیں کیا، بلکہ اسے ایک من گھڑت فعل قرار دیا، رهبانية ابتدعوها (الحدید: ۲۷) جب اللہ کی بندگی کے لئے یکسوئی کی نیت سے بھی تجرد کی زندگی کو پسند نہیں فرمایا گیا، تو اس لئے تجرد اختیار کرنا اور نکاح میں تاخیر کرنا کیسے روا ہو سکتا ہے کہ اس کے معاشی حالات اور بہتر ہو جائیں؟ مگر افسوس کہ مادیت کی پرستش اور خوب سے خوب تر معاشی معیار کی طلب کے نتیجہ میں اس وقت نکاح میں تاخیر کا رجحان عام ہو گیا ہے، بعض نوجوان اصل شباب کو گذارنے کے بعد

جب عمر میں ڈھلاؤ شروع ہوتا ہے تو نکاح کرتے ہیں، یہ نہایت ہی غلط رجحان ہے، اور اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں، یہ نہ صرف اخلاقی اعتبار سے بلکہ طبی اعتبار سے بھی مضرت سے خالی نہیں، جب وقت بچوں کی تربیت کا آتا ہے تو والدین پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو جاتے ہیں، یوں تو موت کا کوئی وقت متعین نہیں، لیکن عمر طبعی پر بھی موت آئے تو وہ پرورش کے محتاج بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے رخت سفر باندھ لیتا ہے، اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دیر سے نکاح کرنے کے واقعات زیادہ تر تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال خاندان میں پیش آتے ہیں، اس لئے اس کو معاشی مفلوک الحالی کا نتیجہ قرار دینا قرین انصاف نہیں۔

اس سے زیادہ اہم مسئلہ بیوہ اور مطلقہ عورتوں اور نکاح کے بعد تجرد سے دو چار ہونے والے مردوں کے نکاح کا مسئلہ ہے، ہندو تہذیب میں عورتوں کے مطلقہ ہونے کا تو تصور ہی نہیں تھا، کیونکہ عورت جب ایک دفعہ کسی مرد سے نکاح کے بندھن میں منسلک ہو جاتی تو پھر اسے بہر قیمت اسی کی زوجیت میں رہنا پڑتا، خواہ یہ رشتہ محبت وسکون کی شبنم کی بجائے نفرت کی آگ میں کیوں نہ تبدیل ہو گیا ہو، لیکن جو عورتیں بیوہ ہو جاتیں اور اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ نذر آتش کئے جانے سے بچ رہتیں، ان کا بھی حال کچھ بہتر نہیں تھا، انہیں دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی، عربوں میں گو ایسا رواج نہیں تھا، لیکن بعض واقعات ایسے پیش آتے تھے، کہ شوہر یا اس کے ورثہ غیرت کی وجہ سے یا مال کی حرص میں مطلقہ اور بیوہ عورتوں کو نکاح نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام نے اس رویہ کو پسند نہیں کیا، اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، بن بیوی مردوں اور بن شوہر عورتوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا، ایک موقع پر مطلقہ عورتوں کے اولیاء سے فرمایا گیا کہ اگر وہ باہمی رضامندی سے اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہیں تو رکاوٹ نہ بنو، "فلا تعضلوا هن ان ينكحن ازواجهن اذا تراضوا بينهم بالمعروف" (البقرہ: ۲۳۲) پھر آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمہارے لئے پاک وصاف زندگی گذارنے کا نسخہ ہے، "ذالكم ازكى لكم واطهر" (البقرہ: ۲۳۲) اس میں اس بات کی طرف اشارہ

ہے کہ مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا نکاح سماج کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے، جو لوگ ازدواجی زندگی کے تجربہ سے گذر چکے ہوں، ان کا مجرد رہنا سماج کے لئے زیادہ نقصان دہ اور بگاڑ کا سبب ثابت ہوسکتا ہے، اس نصیحتِ ربانی میں غالباً اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

یہ ایک حقیت ہے کہ ہمارے سماج میں مطلقہ اور بیوہ خواتین کے نکاح کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے، بلکہ بچوں کی پرورش کے نام پر اس کو نظرانداز کیا جاتا ہے. یہ صحیح سوچ نہیں ہے، عورت ہر مرحلہ میں مرد کی رفاقت ونگہداشت کی محتاج ہوتی ہے، شادی سے پہلے باپ اس کا محافظ ہوتا ہے، شادی کے بعد اس کا شوہر، اور اخیر عمر میں اس کی اولاد، اس لئے شوہر ایک عورت کے لئے سکون اور نگہداشت کا ذریعہ ہے، وہ جس طاقت کے ساتھ اپنی ضروریات کا مطالبہ شوہر سے کرسکتی ہے، نہ بال بچوں سے کرسکتی ہے، نہ بھائی بہنوں سے، اور نہ شادی کے بعد اپنے والدین سے، اسے ادھوری زندگی گذارنی پڑتی ہے، اس لئے یہ قطعاً نامنصفانہ بات ہے، کہ اس کی بیوگی اور تجرد کے دائمی غم کو اس کا رفیق حیات بنادیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے جن ازواجِ مطہرات سے نکاح فرمایا، ان میں صرف حضرت عائشہؓ کنواری تھیں، حضرت زینبؓ مطلقہ تھیں، اور باقی امہات المومنین بیوہ تھیں، خود رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما ابولہب کے بیٹے عتبہ اور عتیبہ سے منسوب تھیں، ابولہب کے کہنے پر ان بدبختوں نے طلاق دے دی، آپ ﷺ نے ان دونوں کو یکے بعد دیگرے حضرت عثمان غنیؓ کے عقد میں دیا، ہندوستان میں بہت پہلے سے بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے نکاح نہ کرنے کی رسم چلی آتی تھی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس خراب رسم پر بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے، اور اپنے اہلِ خاندان کو اس بُری رسم کے ختم کرنے کی وصیت کی ہے، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس کے خلاف مہم چلائی اور خود اپنے خاندان سے اس کی ابتداء کی، اس طرح مطلقہ اور بیوہ عورتوں کے نکاح کے معیوب ہونے کا جو ذہن سماج میں پیدا ہوگیا تھا، بحمد اللہ وہ کیفیت تو باقی نہیں رہی، لیکن عملاً اب بھی لوگ اس

سے اجتناب ہی برتتے ہیں، اور بعض عورتیں تو بیس پچیس سال کی عمر میں بیوہ ہو کر پوری زندگی اسی حال میں گذار دیتی ہیں، یہ نہایت ہی قبیح بات اور ظالمانہ رسم ہے، اور پوری قوت سے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

جن مردوں کی بیویوں کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے دوبارہ نکاح کرنے کو بھی پسند نہیں کیا جاتا، بعض لوگ تو سن رسیدہ لوگوں کے بیوی کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح کرنے کو حرص و ہوس سمجھتے ہیں، اور خود بال بچے والد کے نکاح کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، یہ بھی ناروا سوچ ہے، مرد جس قدر جوانی میں بیوی کا محتاج ہوتا ہے، بڑھاپے میں اس سے کچھ کم ضرورت مند نہیں ہوتا، کیونکہ بعض خدمت ایسی ہے جسے بیٹے، بیٹیاں، بہو انجام نہیں دے سکتے، بیوی ہی کر سکتی ہے، اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ بوقت ضرورت باپ کا نکاح بھی اولاد پر اس کا ایک حق ہے، کیوں کہ یہ اس کی خدمت میں شامل ہے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ نکاح میں عمر کے لحاظ سے توازن ہونا چاہئے۔

یہ ایک اہم سماجی مسئلہ ہے اور ضرورت ہے کہ خطباء منبروں سے اور سماجی اصلاح کی تنظیمیں اپنے پلیٹ فارم سے ان قبیح رسموں کے ازالہ کی فکر کریں، کہ یہ بے سہارا خواتین کو سہارا فراہم کرنے کی نیک کوشش ہوگی!!

(۲۵؍جنوری ۲۰۰۲ء)

جہیز کی ظالمانہ رسم اور ہماری ذمہ داریاں

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی اس دنیا میں بعثت کا مقصد جہاں مخلوق کو اس کے خالق سے جوڑنا تھا، وہیں یہ بھی تھا کہ انسان نے اپنے آپ پر خود ساختہ رسم و رواج کا جو بوجھ رکھ لیا ہے، اس کو اس سے آزاد کیا جائے "وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ" (الاعراف:۱۵۷) چنانچہ اسلام سے پہلے لوگوں نے بہ طور خود جو مشکل قوانین اپنے آپ پر مسلط کر لئے تھے، قرآن نے ان کو دور فرمایا، اور ایسے احکام دیئے جو انسانی مصلحت سے ہم آہنگ بھی ہیں اور ان کے لئے قابلِ برداشت بھی، اسی لئے قرآن نے بہ طور اصول یہ بات کہہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کو اس کی قوت اور گنجائش کے لحاظ سے ہی احکام کا مکلف بناتے ہیں "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (البقرۃ:۲۸۶) نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ خدا یہ نہیں چاہتا کہ اپنے بندوں کو حرج اور تنگی میں مبتلا کرے، بلکہ وہ تو سہولت و آسانی اور گشائش و فراخی چاہتا ہے "يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (البقرۃ:۱۸۵)۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے عبادات کو آسان رکھا ہے، اور اللہ کی بندگی کے سیدھے سادھے بے خرچ کے اور کم خرچ کے طریقے رکھے ہیں، معاملات کو اللہ نے اس سے بھی زیادہ آسان رکھا ہے، اور جیسے اللہ نے اپنے تکوینی نظام میں ایسی چیزوں کو جو مخلوق کے لئے ناگزیر ہیں، وافر مقدار میں رکھا ہے، اور بے قیمت و محنت فراہم کی ہیں، جیسے پانی اور ہوا، اسی طرح نظامِ شریعت میں بھی انسانی زندگی کی فطری ضروریات کو آسان رکھا گیا ہے، ان ہی ضروریات میں ایک نکاح ہے، نکاح انسان کی فطری ضرورت ہے، جس سے

ایک طرف نسل انسانی کی افزائش متعلق ہے، اور دوسری طرف اخلاق و کردار اور قلب ونگاہ کی حفاظت، اسی لئے اسلام میں نکاح کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ہے، آپ ﷺ نے نوجوانوں کو تلقین فرمائی کہ بہ شرطِ قدرت وہ جلد نکاح کر لیا کریں، لڑکیوں کے اولیاء سے فرمایا کہ مناسب رشتے ہاتھ آجائے تو شادی میں تاخیر نہ کی جائے، آپ ﷺ نے نکاح کو اپنی اور انبیاء سابقین کی سنت قرار دیا، اور تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا۔

نکاح کو آسان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حلال کو آسان کیا جائے تو حرام سے بچنا بھی آسان ہوگا، اور اگر حلال کو دشوار کر دیا جائے تو حرام سے بچنا بھی دشوار ہوگا، چنانچہ جن ممالک میں نکاح کی شرح کم ہے، اور تجرد کی زندگی گذارنے والوں کا اوسط زیادہ ہے، وہاں زنا اور فواحش کی کثرت ہے، وقتی سکون حاصل کرنے کے لئے منشیات کا استعمال عام ہے، خاندانی نظام بکھر چکا ہے، اور برائیاں ایک سیلابِ بلا بن کر سماج کے رگ وریشہ میں سماگئی ہیں، اس لئے کوئی بھی ایسی بات جو نکاح کا راستہ روکنے والی ہو اور لڑکوں یا لڑکیوں کو تجرد کی زندگی پر مجبور کرتی ہو سماج کے لئے سمِ قاتل ہے۔

آج جو چیزیں شادی بیاہ کے معاملہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، ان میں سرفہرست جہیز اور گھوڑے جوڑے کا مسئلہ ہے، اس رواج نے سماج کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا ہے، اس کا سب سے شرمناک پہلو محض جہیز کے لئے شادی شدہ عورتوں کو جلانے اور ہلاک کرنے کے واقعات ہیں، یکم اگست ۱۹۹۱ء کی بی، بی، سی کے ایک نشریہ کے مطابق ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۹ء میں گیارہ ہزار سے زیادہ ہندوستان میں جہیزی اموات کے واقعات ہوئے ہیں، ۱۹۹۴ء میں سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ہر دن جہیز کے مسئلہ کی وجہ سے سترہ اموات واقع ہوئی ہیں، ۱۹۹۷ء میں چھ ہزار سے زیادہ جہیزی اموات کے واقعات ہوئے، ۱۹۴۷ء سے چالیس سال کے عرصہ میں بہتر ہزار نوجوان عورتیں ہندوستان میں جہیز کی نزاع کی وجہ سے مارڈالی گئیں۔ (دیکھئے: ماہنامہ ہدایت، جے پور، جلد:۸، شمارہ،۹) صفحہ:۲۵-۲۶)

جہیز کے اس ناروا رسم ورواج نے جسم فروشی کو بھی بڑھاوا دیا ہے، ایک سروے کے مطابق ملک میں گیارہ سو ایسے علاقے ہیں جو جسم فروش کے لئے بدنام ہیں، تئیس لاکھ

عورتیں پیشہ ورانہ طور پر اس برائی میں مبتلا ہیں، اور ان کے بچوں کی تعداد اکیاون لاکھ ہے، سروے کے مطابق ہر سال پچیس ہزار لڑکیاں اس حیا سوز پیشہ میں داخل ہو رہی ہیں، (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی ۱۶ / اپریل ۱۹۹۹ء) ____ اسی طرح لڑکیوں کی قبل از پیدائش قتل کا سلسلہ بھی روز افزوں ہے، اسی لئے جنوری ۱۹۹۶ء میں دورانِ حمل جنس کی شناخت کی غرض سے الٹرا سونو گرافی پر پابندی عائد کی گئی، لیکن کتنے ہی جوڑے ہیں، جو اس پابندی کو خاطر میں نہیں لاتے، چنانچہ ہندوستان میں ہر سال ایک کروڑ بارہ لاکھ اسقاطِ حمل کے واقعات ہوتے ہیں، اور ان واقعات میں ہر سال بیس ہزار عورتیں موت کا شکار ہو جاتی ہیں، (اسلامی نظام معاشرت اور جہیز کی رسم، عمر حیات غوری، صفحہ ۵۲) یہ اسقاطِ حمل کے واقعات زیادہ تر ناجائز حمل اور قبل از وقت لڑکیوں کی شناخت سے متعلق ہیں۔

راجستھان کے اضلاع باڑمیر، جسلمیر نیز ملک کے بعض دوسرے علاقوں میں پیدائش کے بعد بھی ہفتہ دس روز کے اندر لڑکیوں کو زہر کھلا کر یا کسی اور طرح مار ڈالنے کا رواج ہے، چنانچہ راجستھان کے ضلع باڑمیر کے دیوارا گاؤں میں ایک عجیب واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۹۹۹ء میں وہاں ایک سو دس برسوں کے بعد ایک بارات آئی، (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۴ / اکتوبر ۱۹۹۹ء) ____ کیا اس جدید جاہلیت نے قدیم جاہلیت کو بھی شرمسار نہیں کر دیا ہے،؟

یہ فحاشی، تجرد کا رجحان، اور لڑکیوں کے قتل وغیرہ کے واقعات کے لئے ایک اہم محرک یہی جہیز اور گھوڑے جوڑے کی بلا ہے، ایک طرف ملک میں غریبوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، اور دوسری طرف ایک طبقہ دادِ عیش دینے اور اس عیش کے اظہار و نمائش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشاں ہے، بمبئی کے وان کھیڑے اسٹیڈیم میں ۱۹۹۰ء میں ایک تقریبِ شادی منعقد ہوئی، جس میں تیس ہزار لوگوں نے شرکت کی، اور بتایا جاتا ہے کہ ہیرے جواہرات کے ایک تاجر نے اسی بمبئی میں اپنی بیٹی کی شادی پر تیس کروڑ روپے خرچ کئے، (سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۱۶ / اکتوبر ۱۹۹۸ء) ممتاز قائد جے للیتا کے منہ بولے بیٹے کی شادی کی مدہوش کر دینے والی تقریبات اور روشنی اور آواز کا سیلاب شاید ابھی تک لوگوں کو یاد ہو، بعض ایسی شادیاں

بھی اخبارات کے صفحات پر آچکی ہیں جن میں پورا ہوائی جہاز شادی کے لئے ریزرو کیا گیا ـــــ ایک ایسا ملک جس میں لاکھوں انسان بھوکوں پیٹ سو جاتے ہوں، اور ہر روز ہزاروں مریض اپنی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس لئے جان دے دیتے ہوں کہ ان کے پاس دوا وعلاج کے لئے کوئی پیسہ نہیں، ایسے سماج میں ایک طبقہ کا اس طرح دادِ عیش دینا انسانیت کے ساتھ کیسا مذاق ہے؟؟؟

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے، اسلام نے نکاح میں تمام مالی ذمہ داریاں مردوں پر رکھی ہیں، مہر اس کے ذمہ ہے، ولیمہ اسے کرنا ہے، بیوی کے نفقہ کی ذمہ داری اس پر ہے، بچوں کی پرورش کا بوجھ اسے برداشت کرنا ہے، خود کمانا ہے، اور پورے گھر کی ضروریات پوری کرنا ہے، اسی باعث تو اللہ تعالیٰ نے مرد کو "قوام" یعنی سربراہِ خاندان بنایا ہے، اس لئے مرد کا عورت سے نکاح کے موقع پر یا نکاح کے بعد کچھ لینا درحقیقت ننگ و عار کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود ایک سے زیادہ نکاح فرمائے، اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کیا، اور آپ کے جاں نثار رفقاء کے بہت سے نکاح آپ کے سامنے ہوئے، لیکن نہ جہیز، اور نہ مردوں کی طرف سے کوئی مطالبہ، حضرت خدیجہؓ کا حضرت زینبؓ کو سونے کا ہار دینے کا ذکر ملتا ہے، لیکن ایک تو یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے، دوسرے اس کی صراحت نہیں کہ نکاح کے وقت ہی ہار دیا ہو، رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کے لئے کچھ گھریلو اشیاء بستر، تکیے، مشکیزہ وغیرہ بنوائے، لیکن حدیث وسیرت کی کتابوں میں یہ صراحت موجود ہے، کہ یہ سب کچھ خود حضرت علیؓ کی زرہ فروخت کر کے اسی سے مہیا کیا گیا تھا، (دیکھئے: شرح مواہب: ۲/۴-۳) مشہور ہے کہ اردو زبان میں سیرت کی پہلی کتاب مفتی عنایت احمد کاکوری کی "تواریخ حبیب اللہ" ہے، انہوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کے زرہ کی قیمت میں سے کچھ آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو دیا کہ خوشبو خرید کر لائیں، اور باقی حضرت ام سلمہؓ کو کہ حضرت فاطمہؓ کے لئے گھر کی ضروریات خرید کی جائیں، (تواریخ حبیب اللہ: ۴۴) فقہاء کے یہاں قریب قریب صراحت ملتی ہے کہ نکاح کے موقع پر عورت سے کوئی مال حاصل کرنا "رشوت" کے حکم میں

ہے، اور رشوت کا گناہ اور حکم ظاہر ہے کہ اس کا لینا بھی حرام ہے، اور ضرورت شدیدہ کے بغیر اس کا دینا بھی، اور لے لیا ہو تو واپس کرنا واجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے، تو کس قدر محرومی کی بات ہے کہ ایک سنت نبوی کو انجام دیتے ہوئے انسان اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی لعنت کا طوق بھی اپنے گلے میں ڈال لے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہیز اور گھوڑے جوڑے کا مسئلہ نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے بھی نہایت سنگین مسئلہ ہے، اور سنگین تر بنتا جا رہا ہے، کم سے کم مسلمانوں کو دین عدل اور شریعت عادلہ کے حامل ہونے کی حیثیت سے اس کے مقابلہ کے لئے آگے بڑھنا چاہئے، اور سماج کو اس سے نجات دلانے کی کوشش کرنی چاہئے، نہ یہ کہ وہ خود ظلم و جور کے اس سمندر میں کود پڑیں اور دوسری قوموں کی اس ظالمانہ رسم کو اپنے سماج میں لے آئیں، جیسے ایک زمانہ میں بعض بزرگوں نے نکاح بیوگان کی تحریک چلائی تھی، کیونکہ مسلمان ہندو سماج سے متاثر ہو کر بیوہ عورتوں کے نکاح سے گریز کرنے لگے تھے، اسی طرح آج بھی ایک ایسی مہم کی ضرورت ہے، جو رسم جہیز کو مٹانے کے لئے برپا کی جائے، اور نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ انسانی بنیادوں پر تمام اقوام میں اس پیغام کو لے کر پہونچا جائے۔

اس سلسلہ میں دو طبقہ کی ذمہ داریاں سب سے زیادہ ہیں، ایک تو علماء اور مشائخ کی، کہ وہ ایسی تقریبات میں شرکت سے گریز کریں، جن میں لین دین کی بنیاد پر نکاح کیا گیا ہو، اور غالباً ان کا یہ فعل منشا شریعت کے بھی مطابق ہوگا، دوسرے قوم کا متمول اور صاحب ثروت طبقہ جو اسراف اور فضول خرچی پر قادر ہے، اس کے باوجود وہ شادی بیاہ کی تقریب کو سادگی سے انجام دے، تو فضول خرچی کی یہ دوڑ کم ہوگی، اور متوسط اور غریب گھرانوں کے لئے اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا سال ڈیڑھ سال پہلے شہر کے ایک بڑے مسلم صنعت کار نے سادہ طریقہ پر اپنی لڑکی کی شادی کی رسم انجام دی، اخبارات نے بھی اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا، اور مختلف حلقوں پر اس کا اچھا اثر پڑا ___ کاش! ہم سماج کی اس مجبوری کو محسوس کریں اور حقائق کی کڑاہٹوں کو نہ صرف گوارا کریں، بلکہ ان کو سامنے رکھ کر اپنے حالات میں کچھ انقلابی تبدیلیاں لائیں۔ (۲۷/ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

لڑکوں کی تجارت

دنیا میں کتنی ہی چیزوں کی تجارت ہوا کرتی ہے، معمولی سے معمولی اور قیمتی سے قیمتی ہیرے موتی سے لے کر ریت اور مٹی کے ڈھیر بلکہ غلاظتوں تک کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری ہے، کسی زمانہ میں انسان کی بھی تجارت ہوا کرتی تھی، اب بھی سنا ہے کہ افریقہ کے بعض غریب ممالک میں انسان خریدے اور بیچے جاتے ہیں، گاہے گاہے ہندوستان میں بھی ایسی خبریں منظر عام پر آجاتی ہیں، کہ فلاں مقام پر غریب اور فاقہ کش ماں باپ نے اپنے جگر کے ٹکروں کو کچھ پیسوں کی عوض فروخت کر دیا، یقیناً خون جگر پلا کر اپنے بچوں کی پرورش کرنے والے ماں باپ ایسے موقعوں پر خون کے آنسو روتے ،اور اشکِ حسرت ان بچوں کے قدموں پر نچھاور کرتے ہوئے رخصت کرتے ہوں گے۔

لیکن انسانی تجارت کی ایک اور صورت ہے، جو اس وقت سماج کے مہذب لوگوں کے درمیان رائج ہے، جس میں انسان اپنے لڑکوں کو آپ فروخت کرتا ہے، اور فروخت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں حسرت وافسوس کے آنسو نہیں بلکہ خوشی کے آنسو ہوتے ہیں، دل حسرت ویاس کی تپش سے ابلتا نہیں بلکہ حسین آرزؤں کے تصور سے اچھلتا اور کودتا ہے، یہ عجب منڈی ہے جہاں پڑھے لکھے، اہلِ دانش، اصحابِ ثروت، اعلیٰ عہدوں پر فائز خوشی خوشی اپنے لڑکوں کا سودا لے کر آتے ہیں، اور اس کی تعلیم ، معاشی امکانات، خاندانی پس منظر، یہاں تک کہ شکل وصورت اور آباء واجداد کی شرافت کی دہائی دے کر ڈاک لگاتے اور زیادہ سے زیادہ قیمت کے خواستگار ہوتے ہیں، انہیں اپنے لڑکوں کو فروخت کرنے اور ان کی جوانی کی قیمت لگانے میں نہ کوئی شرم ہوتی ہے، نہ کوئی عار۔

آپ سوچیں گے یہ کون سی منڈی ہے؟ کیا کوئی ماں باپ اپنے لڑکوں کو بیچ بھی سکتا ہے، کہیں انسانوں کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، کیا عہد غلامی پھر واپس آ گیا ہے؟؟ ___ لیکن آپ کو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے، ہمارا پورا سماج انسانی تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے، ہر گھر میں ایک دوکان ہے، اور ہر خاندان میں کچھ تاجر اور کچھ گاہک ہیں، ___ کیا لڑکی والوں سے گھوڑے، جوڑے کے نام پر رقم وصول کرنا، ان سے جہیز کا مطالبہ کرنا، اپنے مدعوین کو ان کے سر تھوپ دینا اور ان سے منھ مانگا کھانا طلب کرنا، تجارت اور اپنے لڑکے کی قیمت لگانا نہیں ہے؟ قیمت روپیوں میں بھی ادا کی جاتی ہے، سامان واسباب کے ذریعہ بھی، اور ہوٹلوں میں شکم پروری کے ذریعہ بھی، یہ سب قیمت کے مختلف عنوان اور الگ الگ انداز ہیں، لڑکا اور اس کے والدین ان تمام طریقوں سے لڑکے کی قیمت وصول کرتے ہیں، اور اس کی جوانی کا منھ مانگا دام پاتے ہیں، اس کے تجارت ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک ہی ماں باپ سے مرد وعورت دونوں کو پیدا کیا ہے، جیسے مردوں کے حقوق ہیں، ویسے ہی عورتوں کے، بلکہ قرآن نے کہا ہے کہ اصولی طور پر مرد وعورت دونوں حقوق میں برابر ہیں ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ'' (البقرۃ:۲۲۸) ___ البتہ صلاحیتوں کے تفاوت کے اعتبار سے تقسیم کار ہے، اور بعض ذمہ داریوں میں مرد وعورت کے درمیان فرق رکھا گیا ہے، مرد کو سربراہِ خاندان قرار دیا گیا ''اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ'' (النساء:۳۴) ___ اور مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فوقیت دی گئی، لیکن یہ فوقیت محض مرد ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مردانہ فرائض اور بحیثیت سربراہ خاندان خرچ کرنے کی وجہ سے ہے، ''وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ'' (البقرۃ:۲۲۸)

غرض مرد کو جو فضیلت و برتری دی گئی ہے وہ اس وجہ سے کہ وہی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے، اسی لئے کسبِ معاش کی ذمہ داری مرد سے متعلق کی گئی ''وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ'' (الجمعۃ:۱۰) اور امور خانہ داری کو عورتوں سے متعلق کیا گیا، اور ان سے کہا گیا کہ وہ گھر میں رہا کریں ''وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ'' (الاحزاب:۳۳) کہ ان کی عزت

شمع خانہ بن کر رہنے میں ہے، نہ کہ شمع محفل بننے میں، اسی لئے ساری مالی ذمہ داریاں مردوں ہی سے متعلق رکھی گئی ہیں، مہر اسے ادا کرنا ہے، دعوت ولیمہ اس کی ذمہ داری ہے، پھر نکاح کے بابت لڑکی کی تمام ضروریات اس سے متعلق ہیں۔

اگر کوئی شخص اپنی ان مالی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرتا ہے اور الٹے لڑکی اور اس کے اولیا سے اپنی قیمت وصول کرتا ہے، تو یہ نہایت ہی شرمناک بات ہے، جوانی کی قیمت تو جانوروں کی لگائی جاتی تھی، اور اعلیٰ نسل کے جانور حاصل کئے جاتے تھے، کیا شادی کے موقع سے لڑکے والوں کی جانب سے مطالبہ اس حیوانی کردار کی پیروی نہیں ہے، اور جو لوگ پیسے لے کر شادی کرتے ہیں، کیا وہ مردانہ تعظیم و وقار اور بحیثیت شوہر تکریم وتوقیر کے مستحق ہیں؟ جب کہ قرآن نے مردوں کو بلند رتبہ اس بنیاد پر قرار دیا تھا کہ وہ خرچ کرتے ہیں، اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اونچا یعنی دینے والا ہاتھ نچلے یعنی لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، الید العلیا خیر من الید السفلی (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۲۹) تو جو شوہر اپنا ہاتھ نیچے رکھتا ہو اور اپنی بیوی اور اس کے اولیاء کو اپنا ہاتھ اونچا رکھنے پر مجبور کرتا ہو، وہ کیسے اپنی بیوی سے بلند رتبہ ہو سکتا ہے، اگر دولت مند خود فقیر کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے اور بادشاہ درویش کے سامنے اپنی کشکول رکھ دے، تو وہ فقیر و درویش بلند مرتبہ ہوگا، یا بادشاہ و غنی؟

یہ ایک چبھتا ہوا ناگوار خاطر، لیکن برحقیقت سوال ہے، اور جن لوگوں نے اپنی اور اپنے بچوں کی قیمت لگا رکھی ہے، انہیں کبھی تنہائی میں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہئے، حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں، لیکن دانا وہی ہوتا ہے جو حقیقت کے تلخ گھونٹ کو اپنے حلق سے اتار لے۔

افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض لوگ لڑکیوں کی شادی کے وقت تو شریعت کی دہائی دیتے ہیں، لیکن لڑکوں کی شادی کے وقت شریعت کو بھول جاتے ہیں، بلکہ شریعت کا ذکر بھی گراں خاطر ہوتا ہے، گویا شریعت پر عمل کرنا مقصود نہیں ہے، اصل مقصود نفس کے عفریت کا پیٹ بھرنا ہے، اس لئے کبھی پیسے بٹورنے کے غرض سے شریعت کے نام سے گریز کیا جاتا ہے، اور کبھی پیسہ بچانے کے لئے شریعت کا نام استعمال کیا جاتا ہے، مقصود

دونوں صورتوں میں اپنے مالی مفادات کو حاصل کرنا ہے، ابھی چند دنوں پہلے حیدر آباد میں خواتین کی تنظیم تحفظ شریعت کمیٹی نے اپنے ۸ شعبہ ''و ومن ہیلپ لائن'' کے تحت نفیس گارڈن میں ایک پروگرام رکھا تھا، جس میں شریعت اور سنت کے مطابق نکاح کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں اور ان کے اولیاء کو جو رشتہ کے خواہشمند ہوں، دعوت دی گئی تھی، تاکہ ایسے لوگ اس عزم کے ساتھ باہم رشتہ طئے کریں کہ وہ مسنون طریقہ پر بغیر لین دین کے تقریب نکاح کو انجام دیں گے، اس کیمپ کے افتتاح کی ذمہ داری اس حقیر پر رکھی گئی تھی، میں جب پہونچا تو اس وقت تک دو سو سے کچھ اوپر رشتہ کے خواہشمند حضرات اپنے نام رجسٹرڈ کرا چکے تھے، لیکن ان میں بیس رشتے لڑکے والوں کی طرف سے تھے، اور باقی سب لڑکی والوں کی طرف سے، گویا نوے فیصد رشتوں کی پیش کش لڑکی والوں کی طرف سے تھی، اور دس فیصد لڑکے والوں کی طرف سے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے سماج کے مزاج میں کتنا بگاڑ آچکا ہے، اور شریعت اور دین کو کس قدر پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کے موقع پر مہر کے علاوہ جو مطالبات کئے جاتے ہیں، وہ رشوت کے حکم میں ہیں، رشوت کا لینا تو حرام ہے ہی، شدید ضرورت کے بغیر رشوت کا دینا بھی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں جہنمی ہیں، اس طرح نکاح کے موقع سے مطالبہ کرنے والے تو اپنے لئے جہنم خریدتے ہی ہیں، اور اللہ کی لعنت کا طوق اپنے گلے میں لٹکاتے ہی ہیں، جو لوگ دینے پر مجبور نہ ہوں وہ بھی اپنے لئے جہنم اور خدا کی لعنت خرید رہے ہیں، مجھے تو سب سے زیادہ افسوس لڑکے کے بوڑھے والدین اور دوسرے اعزہ کی کم بختی پر ہوتا ہے، کہ زیادہ تر وہی مطالبات کی فہرست بتاتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں، حالانکہ جب یہ سامان گھر میں آتا ہے، یا رقم لڑکوں کے ہاتھوں ملتی ہے، تو خود ان کو بہت کم اس سے استفادہ کا موقع بہم پہونچتا ہے، زیادہ تر گھر میں آنے والی بہو اور اس کا شوہر ہی نفع اندوز ہوتا ہے، لیکن ناحق قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے والدین اپنے عمر

کے آخری لمحات میں جس کو توبہ واستغفار کے لئے وقف ہونا چاہئے تھا، دوزخ اور لعنت خداوندی بصد مسرت اور بہ ہزار شوق خرید کرتے ہیں، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی کم نصیبی بلکہ بدنصیبی ہوسکتی ہے؟

اگر کسی شخص نے رشوت لے لیا ہو تو اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ وہ اسے واپس کردے، اس لئے جن لوگوں نے مطالبہ کے ذریعہ کوئی رقم یا سامان حاصل کیا ہے، تو اس کا یا اس کی قیمت کا واپس کردینا شرعاً واجب ہے، مانگنا چاہے صراحتاً ہو یا اشارۃً، براہِ راست ہو یا بالواسطہ سب کا ایک ہی حکم ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطالبہ تو نہیں کیا اور سامان کی فہرست تو پیش نہیں کی لیکن کسی دولت مند گھرانہ میں یہ سمجھ کر رشتہ طئے کیا کہ اگر دو نہیں تو ایک لاکھ تو کہیں نہیں جائیں گے، اتنا تو وہ بغیر مانگے ہی دے دے گا، یہ بھی رشوت کے ہی حکم میں ہے، کیوں کہ فقہاء نے ایک اصول مقرر کیا ہے کہ جو چیز بطورِ شرط کے طئے نہ کی جائے، لیکن عرف ورواج کے تحت لی جائے، تو وہ بھی شرط لگانے کے ہی درجہ میں ہوگا، **المعروف عرفا کالمشروط شرعا**، ہاں! اگر انکار ونفی کے باوجود لڑکی والے اپنی طرف سے دیدیں تو یہ یقیناً اس دائرہ میں نہیں آئے گا۔

اگر نکاح کی تقریب مسجدوں، دینی جلسوں اور مذہبی اجتماعات میں رکھی جائیں، علماء اور اہلِ دین سے نکاح کے خطبات پڑھوائے جائیں، مجلس نکاح میں ایمان افروز اور روح پرور بیان رکھے جائیں، لیکن اندرونی طور پر سودہ بازی بھی کی جائے اور چھپے ہاتھوں لین دین کا معاملہ بھی طئے کیا جائے، تو یہ تو نفاق اور گناہ پر ظاہری نیکی کا دبیز غلاف چڑھانا اور دین کے پردہ میں بے دینی کو چھپانا ہے، جو یقیناً کھلی ہوئی بے دینی سے بھی زیادہ مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔

لین دین کا ایک نفسیاتی اثر یہ پڑتا ہے کہ اگر کوئی لڑکی مسنون طریقۂ عقد کے ذریعہ نکاح میں لائی جائے، تو لڑکی اور اس کے والدین کے اندر احسان مندی اور احسان شناسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنے سسرال کو اپنا محسن تصور کرتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک ماں باپ سے جدا ہوکر دوسرے ماں باپ کے گھر پہونچی ہے، اس میں اپنے

شوہر، ساس سسر اور سسرال کے بزرگوں کے تئیں محبت اور خدمت کے جذبات ہوتے ہیں، اور جب لڑکے اور اس کے والدین لڑکی والوں کا خون جگر اور آخری قطرۂ لہو نچوڑ کر اسے اپنے گھر لاتے ہیں، اس بہو میں احسان مندی اور جاں نثاری کے بجائے نفرت اور خود غرضی کے جذبات پنہاں ہوتے ہیں، اور یہ ایک فطری بات ہے، اگر کوئی شخص آپ کو پانچ روپیہ ہی کی کوئی چیز تحفۃً پیش کرے، تو آپ یقیناً اس کے شکر گذار ہوں گے، اور آپ کے دل میں قدر دانی کا جذبہ پیدا ہوگا، اور اگر آپ کسی سے پانچ روپے میں کوئی چیز خرید کریں تو آپ اسے محسن تصور کرنے کے بجائے اپنے آپ کو محسن سمجھیں گے، اس لئے کہ تاجر خریدار کا احسان مند ہوتا ہے نہ کہ خریدار تاجر کا، اس لئے جس لڑکی اور اس کے سرپرست نے دلہا کی قیمت ادا کی ہے، آخر وہ اس مرد یا مرد کے اہلِ خانہ کے احسان مند کیوں کر ہو، جس کی قیمت ان لوگوں نے اپنا خون جگر بیچ کر ادا کی ہوں، اسی لئے آج کل یہ شکایت عام ہے کہ جب بہو گھر میں آتی ہے وہ خدمت و اطاعت کے جذبہ سے خالی و عاری ہوتی ہے، اور گھر سے متعلق فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کوتاہ۔

(۱۶؍ اگست ۲۰۰۲ء)

عورتوں کا حق میراث

اسلام کا معاشی اور مالی نظام اس اصول پر مبنی ہے کہ ایک ہی شخص کے پاس دولت کا ارتکاز نہ ہو، دولت زیادہ سے زیادہ تقسیم ہوتی رہے تاکہ غریبوں اور دولت مندوں کے درمیان معاشی فاصلہ کم ہو، اور حد سے زیادہ دولت کی وجہ سے انسان کے اندر جو اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی شخص کے پاس دولت کے ارتکاز کی وجہ سے سماج کے ایک طبقہ میں احساسِ محرومی کی تشدد اور دہشت گردی کا جو رجحان نشو نما پاتا ہے، اس کا سدِ باب ہو سکے، تقسیم دولت کا جو نظام اسلام نے بنایا ہے اس میں ترکہ و میراث کے قانون کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس میں خود اس شخص کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے، اگر مرنے والا شخص اپنی دولت کو کسی ایک ہی وارث کے حق میں مرتکز کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔

اسلام سے پہلے دنیا کے مختلف مذاہب اور نظام ہائے قانون میں قانون میراث بہت ہی غیر متوازن تھا، بعض مذاہب میں صرف لڑکوں کو حصہ ملتا تھا، لڑکیاں میراث سے مرحوم تھیں، بعض مذاہب میں صرف پہلوٹھا بیٹا پورے متروکہ کا حق دار سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اس ناانصافی اور بے اعتدالی کو ختم کر کے ایک نہایت متوازن اور عادلانہ نظام میراث عطا کیا ہے، جس میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی ترکہ کا حق دار بنایا گیا ہے، البتہ چونکہ دونوں کی مالی ذمہ داریوں میں تفاوت ہے، اس لئے دونوں کے حق میراث میں بھی فرق رکھا گیا ہے، اسی طرح ایک ہی درجہ کے قرابت داروں کے حقوق مساوی رکھے گئے ہیں، چنانچہ لڑکا بڑا ہو یا چھوٹا، دونوں کا موروثی حق برابر ہوگا۔

قانون میراث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ فقہ اسلامی کے بنیادی مأخذ چار ہیں، قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، ان میں پہلے تینوں مأخذ اصل ہیں، اور جن مسائل میں ان کی رہنمائی موجود نہ ہو، وہاں قیاس واجتہاد سے مدد لی جائے گی، میراث کا قانون وہ اہم قانون ہے کہ یہ براہِ راست قرآن وحدیث کی صراحتوں اور امت کے اجماع واتفاق سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء (آیت:۱۱، ۱۲، ۱۷۶) میں تفصیل سے میراث کے احکام کا ذکر فرمایا ہے، نیز احکامِ میراث کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر متنبہ کیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے، اور اللہ تعالیٰ باخبر ہیں اور حکمتوں سے واقف بھی "فريضة من الله، إن الله كان عليماً حكيما" (النساء:۱۱) یعنی میراث کے احکام سراسر علم وحکمت پر مبنی ہیں، اس لئے چاہے تمہاری عقل اس کو مانے یا نہ مانے، اس پر عمل کرو، اور جان رکھو کہ یہی حکمت ومصلحت کے عین مطابق ہے!

آیت میراث جس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی، وہ بھی نہایت اہم ہے، حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ باہر نکلے، "اسواف" نامی مقام پر ہمارا گذر ایک انصاری خاتون کے پاس سے ہوا، وہ اپنی دو لڑکیوں کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اور عرض کیا کہ ان کے والد غزوۂ اُحد میں آپ کے ساتھ شہید ہو چکے ہیں، اور اُن کے چچا نے شہید کا کل مال ومتروکہ لے لیا ہے، ان کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، اور صورتِ حال یہ ہے کہ جب ان کے پاس کچھ مال ہی نہ ہوگا تو کوئی شخص ان سے نکاح کو بھی تیار نہ ہوگا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں فیصلہ فرما دیں گے، چنانچہ سورۂ نساء کی آیت نمبر گیارہ نازل ہوئی، آپ ﷺ نے ان خاتون کو اور ان یتیم لڑکیوں کے چچا کو طلب فرمایا اور ان سے کہا کہ شہید کے ترکہ کا دو تہائی ان دونوں لڑکیوں اور آٹھواں حصہ شہید کی بیوہ یعنی ان دونوں بچیوں کی ماں کو دے دو، اس کے بعد جو بچ جائے، وہ تمہارا ہے۔ (ابوداؤد: کتاب الفرائض)

آیت میراث میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے میراث کے حق داروں کا ذکر فرمایا ہے، اور مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ اگر متوفی

کے بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہوں تو بیٹوں کا حصہ بیٹے کے مقابلہ نصف ہوگا، اگر صرف ایک بیٹی ہی وارث ہوتو پورے ترکہ کے نصف کی حقدار ہوگی، اگر صرف دو بیٹیاں ہوں، بیٹے نہ ہوں، تو فی لڑکی ترکہ کا ایک تہائی پائے گی، اسی طرح باپ کے ساتھ ساتھ ماں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا، کہ اگر متوفی صاحبِ اولاد رہا ہوتو ماں اور باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر اس کی اولاد اور بھائی بہن نہ ہوں تو ترکہ کا دو تہائی باپ کا حق ہوگا اور ایک تہائی ماں کا، اور اگر متوفی کے کئی بھائی ہوں تو پھر ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی باپ کو، اگر شوہر لاولد ہوتو بیوی شوہر کے ترکہ میں چوتھائی کی حق دار ہوگی، اور شوہر صاحب اولاد ہے تو آٹھواں حصہ بیوی کا حق ہوگا، اگر کسی شخص کی وفات ہوئی، نہ اس کے والدین ہیں اور نہ اولاد صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو اسے ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا، اور ایک سے زیادہ ہیں جیسے ایک بھائی ایک بہن یا دو بھائی دو بہنیں، تو ایک تہائی ترکہ بھائی بہن میں برابر تقسیم ہوگا، سورۂ نساء کی آیت نمبر گیارہ بارہ میں ان احکام کا ذکر فرمایا گیا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ کا حکم ''وصية من الله'' (آیت نمبر۱۲) قرار دیا گیا ہے، پھر ان احکام کی تاکید اور تقویت کے لئے ارشاد ہے:

> یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، تو جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلے گا، اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ یہیں رہیں گے، اور یہی ہے بڑی کامیابی! اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی قائم کی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے، اللہ اس کو دوزخ میں داخل کریں گے، وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا، اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ (النساء:۱۳،۱۴)

عورتوں میں بیوی، بیٹی، ماں اور بہن کے علاوہ پوتی، دادی، اور نانی بھی بعض اوقات میراث کی حق دار قرار پاتی ہیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، غرض اسلام میں عورتیں بھی میراث کی حق دار ہیں، بدقسمتی سے ہندوستان میں مسلمانوں نے برادرانِ وطن سے جن غیر اسلامی طریقوں کو سیکھا اور ان کو گلے لگایا، ان میں سے ایک عورتوں

کو میراث کے حق سے محروم رکھنا بھی ہے، شوہر کے انتقال کے بعد نہ بیوی کو میراث دی جاتی ہے اور نہ اس بات کی فکر کی جاتی ہے کہ اگر بیوی کا حق مہر شوہر کے ذمہ واجب الاداء ہو تو پہلے مہر ادا کیا جائے پھر ترکہ کی تقسیم عمل میں آئے، حالانکہ مہر بھی دوسرے دین اور قرضوں کی طرح ایک قرض ہے، اور قرضوں کے ادائیگی کے بعد ہی بچی ہوئی جائداد سے وارثوں کا حق متعلق ہوتا ہے، قرآن نے احکامِ میراث میں بار بار اس کا ذکر کیا ہے، پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس کو اس کے حقِ میراث سے بھی محروم کر دیا جائے، ایسی ہی زیادتی لڑکیوں کے حق میں بھی روا رکھی جاتی ہے، کہ پورے متروکہ پر لڑکے قبضہ کر لیتے ہیں، اور لڑکیوں کو ان کا حق ہی نہیں دیتے، بعض لڑکیاں تو نابالغ بھی ہوتی ہیں، ایسی صورت میں ان کو ترکہ سے محروم کر دینا دوہرے گناہ کا باعث ہے، ایک تو ناجائز طریقہ پر دوسرے کے مال پر قبضہ، یعنی غصب، اور دوسرے یتیم کا مال کھانا، اور یتیم کے ساتھ ظلم جیسا شدید گناہ ہے وہ ظاہر ہے۔

لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنے کا رواج اس قدر جڑ پکڑ گیا ہے کہ بعض خواتین اپنا حصۂ میراث طلب کرنے میں حیا اور حجاب محسوس کرتی ہیں، اور اگر کوئی لڑکی اپنا حق مانگے تو دوسرے اقرباء اور رشتہ دار بھی اسے عار دلاتے ہیں، اور اس کو دناءت اور خساست تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ محض دین سے ناواقفیت اور ناسمجھی کی بات ہے، حصۂ میراث ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں دیتا، بلکہ یہ عطیہ خداوندی اور قرآن کی زبان میں ''فریضة من الله'' ہے۔ اور اہلِ علم نے لکھا ہے کہ انسان کے لئے مال حاصل ہونے کے جتنے ذرائع ہیں، ان میں سب سے زیادہ حلال اور پاکیزہ ذریعہ یہی میراث ہے، اس لئے نہ میراث کے طلب کرنے میں تکلف کرنا چاہئے، نہ اس عمل کو باعثِ شرم خیال کرنا چاہئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ شریعت نے جس بات کو منع کیا ہے، اس کا ارتکاب کیا جاتا ہے، نکاح کو آسان رکھا گیا ہے اور نکاح میں لڑکی اور اس کے اولیاء پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں رکھی گئی ہے، لیکن ''گھوڑے جوڑے'' اور ''جہیز'' کے مطالبہ نے سماج کی کمر توڑ رکھی

ہے، اور لڑکی ماں باپ کے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے، اور جس چیز کا شریعت نے حکم دیا ہے یعنی حقِ میراث، اس سے ان کو محروم کیا جاتا ہے۔

پس، عورتوں کو حق میراث سے محروم کرنا اور بیٹیوں کو ترکہ میں سے حصہ نہ دینا سخت گناہ اور ظلم شدید ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عدول حکمی بھی ہے، قرابت داروں کے ساتھ حق تلفی اور ناانصافی بھی، اور نہایت قبیح قسم کی حرام خوری بھی، حرام خوری ایسا گناہ ہے کہ یہ انسان کی عبادت کو ضائع کر دیتی ہے، اس کی وجہ سے دعائیں قبول نہیں ہوتیں، انسان طرح طرح کی آفتوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے، اس لئے کسی بھی طرح یہ مناسب نہیں کہ انسان دنیا کی متاع حقیر کے لئے دنیا اور آخرت کا اتنا بڑا خسارہ مول لے، اور جانتے بوجھتے نقصان کی تجارت کرے!!

(۲۶ر فروری ۱۹۹۹ء)

نام —— قومی شناخت کا ایک اہم ذریعہ!

ہمارے ملک میں ایک تنظیم ''راشٹریہ سیوک سنگھ'' ہے، جس کا مخفف ''آر، ایس، ایس'' ہے، معنی کے اعتبار سے یہ لفظ بہت پُرکشش ہے، گویا یہ قومی خدمت گاروں کا ایک گروہ ہے، لیکن اس کے عزائم اتنے ہی خطرناک اور انسانیت دشمن ہیں، یعنی اس تنظیم کا بنیادی مقصد ملک کی اقلیتوں پر جبر و دباؤ قائم رکھنا، اور ان میں عدم تحفظ کے احساس کو برقرار رکھنا ہے، گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے وہ اپنے ان مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہیں، اور امن کے نامۂ اعمال کے حرف حرف سے مظلوموں کے خون ولہو کی سرخی نمایاں ہے، کچھ عرصہ قبل جناب کے، سدرشن آر، ایس، ایس کے ذمہ دار منتخب ہوئے ہیں، وہ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد ہی سے ایسے گرم بیانات دے رہے ہیں جو اقلیتوں کو اشتعال میں لے آئیں، اور اس طرح فرقہ پرست عناصر کو اپنے مذموم عزائم کے روبہ عمل لانے کا بہانہ ہاتھ آجائے، انہوں نے عیسائیوں اور سکھوں کے خلاف بھی ہرزہ سرائی کی ہے، لیکن مسلمان ان کا زیادہ نشانہ ہیں۔

ہفتہ عشرہ پہلے انہوں نے اپنے ایک بیان میں مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اپنے نام میں اسلام کے ساتھ ہندو ناموں کو بھی جوڑا کریں، جیسے نعوذ باللہ ''محمد رام'' وغیرہ نام رکھا کریں، انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ مسلمانوں نے اس ملک پر آٹھ سو سال حکومت کی، ان میں بہت سے مسلم حکمراں وہ تھے، جو اپنے سیاسی مسائل میں مسلمانوں کے مقابلہ ہندو بھائیوں کو قریب رکھتے تھے، اور جن مسلمان فرمان رواؤں کو آج یہ متعصب اور تنگ نظر کہتے ہیں، جیسے حضرت اورنگ زیب عالمگیر، بابر وغیرہ، ان کا بھی حال یہ تھا کہ

بڑے بڑے سیاسی اور فوجی عہدوں پر انہوں نے ہندو بھائیوں کو رکھا تھا، اگر اتنا طویل عرصہ میں مسلمان دوسری قوموں کو بالجبر مسلمان بنانے کی کوشش کرتے، یا کم سے کم مسلمانوں کے سے نام رکھنے کی ان سے خواہش کی جاتی، اور انہیں مجبور نہیں کرتے، صرف ان کو اس کی ترغیب ہی دئیے ہوتے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ اس ملک میں غالب ترین اکثریت مسلمانوں کی ہوتی، ایک ایسی قوم جسے درختوں اور پتھروں یہاں تک کہ کیڑے مکوڑوں کو بھی پوجنے میں عار نہیں، اور بے جان مظاہر قدرت کے سامنے سر ٹیکنے میں بھی کوئی حجاب نہیں، اس کے لئے انسانوں کا مطیع وفرماں بردار ہو جانا اور فرماں رواؤں کے سامنے سر جھکانا کیا دشوار ہوتا؟ لیکن مسلمانوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اور اپنے پیغمبر کی تعلیم کے مطابق مذہب کے معاملہ میں جبر و دباؤ کی راہ اختیار کرنے سے ہمیشہ اجتناب برتا، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو جناب سدرشن آج عبداللہ یا عبدالرحمان ہوتے ___ یہ ہے مسلمانوں کی رواداری! اور دوسری طرف ہمارے یہ کوتاہ ذہن، تنگ نظر اور شدت پسند قائدین ہیں کہ جو صرف نصف صدی میں دوسری قوموں کو اپنے وجود میں جذب کرنے کے درپے ہیں، وہ بدھشتوں، سکھوں، اور جینوں کو ہندو کہتے ہیں، عیسائی مبلغین کو زندہ نذر آتش کرتے ہیں، اور مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ ان کی رگوں میں رام اور کرشن کا خون ہے، اور تلقین کرتے ہیں کہ انہیں اپنے نام ہندوؤں کے سے رکھنے چاہئیں، کیا اس سے بھی بڑھ کر شدت پسندی اور مذہبی دہشت گردی کی اور مثال ہو سکتی ہے؟؟

اللہ کا شکر ہے کہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا شعور پیدا کیا ہے، اور وہ اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ ایسے بیانات کا مقصد ان کو مشتعل کرنا اور بھڑکانا ہے، اگر وہ مشتعل ہو جائیں تو یہ بالواسطہ ان فرقہ پرستوں کو تقویت پہنچانے کے مترادف ہوگا، چنانچہ مسلمانوں نے سدرشن صاحب کے ان بیانات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، اور سنی ان سنی کر دی، کسی بات کو اہمیت نہ دینا اور اس پر ردِ عمل ظاہر کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا بھی معاندین کا ایک جواب ہے، اور بعض اوقات یہ جواب زیادہ مؤثر اور کم نقصان دہ ہوا کرتا ہے، اور حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ مسلمان بہت سے مسائل میں

وہ طریقہ اختیار کریں جسے قرآن میں ''اعراض'' کہا گیا ہے۔

تاہم مسلمانوں میں یہ شعور ہونا چاہئے کہ وہ کسی بات کے دائرہ اثر کو سمجھیں اور محسوس کریں کہ اس بات کو قبول کرنے یا نہ کرنے میں ہمیں کیا نقصان اور فائدہ ہوسکتا ہے؟ تاکہ وہ جو بھی قدم اٹھائیں، وہ بصیرت سے بھرپور اور فراستِ ایمانی سے معمور ہو، ان کا بولنا بصیرت کے ساتھ بولنا ہو اور ان کا چپ رہنا بصیرت کے ساتھ چپ رہنا ہو، ـــــــ نام اور قومی انتساب کی بڑی اہمیت ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسی لئے مسلمانوں کو نام کے بارے میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں، اور سماجی مسائل میں اس بابت حدیث میں جتنی وضاحت ملتی ہے، شاید ہی کسی اور امر کی بابت اس قدر تفصیل و وضاحت ہو، آپ ﷺ اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ بہتر نام رکھے جائیں، حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپ کے نام سے پکارے جاؤ گے، اس لئے اچھے نام رکھا کرو، (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۹۴۸) حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی روایت میں مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں، **احب الاسماء الی اللہ تعالیٰ عبد اللہ و عبد الرحمن** (ابوداؤد: ۴۹۴۹) یعنی ایسا نام جس سے اللہ تعالیٰ سے بندگی اور عبدیت کا رشتہ ظاہر ہو، کیونکہ یہ نام نہ صرف اس کی شخصیت بلکہ اس کے فکر و عقیدہ کا بھی ترجمان ہوتا ہے، اگر کسی شخص کا نام مشرکانہ ہوتا، تو آپ ﷺ اس کا نام بدل کر ایسا نام رکھتے، جس سے بجائے شرک کے توحید کا اظہار ہوتا، ایک صاحب آئے، آپ ﷺ نے ان کا نام دریافت کیا، انہوں نے کہا: عبد العزیٰ، عزیٰ ایک بت کا نام تھا، زمانۂ جاہلیت میں لوگ اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے اپنا نام رکھتے تھے، آپ نے ان کا نام عبد الرحمان رکھا، (مجمع الزوائد: ۸/۵۰) مشرکین چونکہ جانوروں کی بھی پوجا کرتے رہے ہیں، اس لئے بعض لوگ اپنا نام جانوروں کی نسبت سے بھی رکھا کرتے تھے، چونکہ عبد الرحمان بن سمرہ کا نام ''عبد کلاب'' تھا، کلاب ''کلب'' کی جمع ہے، اور ''کلب'' کے معنی کتے کے ہیں، آپ ﷺ نے ان کا نام بھی عبد الرحمان رکھا۔

(مجمع الزوائد: ۸/۵۵)

اور صرف مشرکانہ نام ہی پر منحصر نہیں، کوئی بھی ایسا نام جس سے غلط معنی پیدا ہوتا ہو، آپ اسے پسند نہیں کرتے تھے، ایک خاتون کا نام ''عاصیہ'' تھا، جس کے معنی نافرمان کے ہیں، آپ ﷺ نے ان کا نام بدل کر ''جمیلہ'' رکھا، (ابوداؤد: ۴۹۵۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسنؓ حسینؓ کا نام حرب رکھنا چاہا، حرب کے معنی جنگ اور لڑائی کے ہیں، آپ ﷺ نے بجائے اس کے حسنؓ اور حسینؓ نام رکھے، (مجمع الزوائد: ۵۲/۸) ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو ''مسلم'' سے موسوم فرمایا، (مجمع الزوائد: ۵۲/۸) اس طرح کی بہت سی مثالیں حدیثوں میں موجود ہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے انبیاء کے نام پر نام رکھنے کی ترغیب دی، تسموا باسماء الانبیاء، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۵) اور خود اپنے صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا، کیونکہ نام سے انسان کے ذہن میں خود اپنی شناخت اور پہچان پیدا ہوتی ہے، جس شخص کا نام انبیاءؑ، صحابہؓ اور اولیاء صالحینؒ کے نام پر ہو، اس کے ذہن میں ایک سوچ یہ ضرور پیدا ہوتی ہے کہ اس کا فکری نسب ان بزرگوں سے ملتا ہے، اور وہ اپنے عقیدہ و ایمان میں ان اہل اللہ کا وارث ہے۔

اسلام میں ایک خاص قانون ''موالات'' کا ہے، اس قانون کے تحت اگر کوئی عجمی شخص کسی عرب مسلمان قبیلہ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تو وہ اسی قبیلہ کی طرف منسوب کیا جاتا، امام بخاریؒ ایرانی النسل تھے، لیکن اسی نسبت سے جعفی یمانی کہلائے، غور کیا جائے تو فقہاء کے استنباط کئے ہوئے اس قانون میں بہت ہی عمیق اور دوررس فکر کارفرما ہے، اور وہ فکر یہ ہے کہ انسان طبعی طور پر اپنے آباء واجداد سے محبت رکھتا ہے، اور ان کی نسبت کو باعثِ افتخار جانتا ہے، اس لئے اگر مسلمان ہونے کے بعد بھی زمانۂ کفر کی خاندانی نسبت اس کے ساتھ لگی رہے، تو اس سماج سے وہ پوری طرح اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکے گا، اور اگر کر بھی لے تو یہ اندیشہ باقی رہے گا کہ کل ہو کر جب حالات بدل جائیں، تو اس کی اگلی پشتیں پھر اپنے ماضی سے فکری رشتہ استوار کرنے کی کوشش کریں، لیکن جب وہ ایک مسلمان خاندان سے منسوب ہو جائے گا، تو اس کا سرمایۂ افتخار ایک ایسی خاندانی نسبت ہوگی، جو شروع سے مسلمان ہے، اور اس کا اندیشہ باقی نہیں رہے گا کہ وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ جائے،

چنانچہ ایران، عراق، مصر وشام وغیرہ کا بہت بڑا علاقہ جو اسلام کے زیرِ نگیں آیا، وہ اس طرح اسلام سے وابستہ ہوگیا کہ ان کی تہذیب وثقافت پر کفر کی کوئی چھاپ باقی نہ رہ سکی، یہاں تک کہ ان کی زبان تک بدل گئی، برِصغیر کے بہت سے علاقوں میں راجپوتوں نے اسلام قبول کیا، چونکہ یہ ایک بہادر قوم ہے، اور مسلمانوں میں پٹھان اپنی بہادری میں مشہور تھے، اس لئے انہوں نے مسلمان ہونے کے بعد پٹھان کہلانا پسند کیا، اور آج ہند وپاک میں پٹھان خاندان کی بعض شاخیں وہ ہیں، جو اصل میں راجپوت تھے، لیکن اب ان میں اپنے راجپوت ہونے کا ذرہ برابر بھی احساس باقی نہ رہا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک طویل عرصہ تک ان سے اسلام کی اور مسلمانوں کی حفاظت کی خدمت لی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب عربوں کے سامنے اسلام پیش کیا، تو یہ وہ دینِ حق تھا، جو حضرت آدم علیہ السلام سے آپ تک ہر دَور میں آتا رہا، لیکن آپ ﷺ نے اس دین کے دینِ ابراہیمی اور اس ملّت کے ملّتِ ابراہیمی ہونے کی حیثیت کو زیادہ اُبھارا، اور اس پہلو کو اپنی تعلیمات میں اور اسلام کے نمائندہ تہواروں میں نمایاں فرمایا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف مشرکین عرب بھی آسمانی کتاب سے محروم ہونے کے باوجود اپنی نسبت کیا کرتے تھے، اور یہود ونصاریٰ بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وارث سمجھتے تھے، گویا جو تین قومیں آپ ﷺ کی دعوت کی اولین مخاطب تھیں، وہ سبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت کو اپنے لئے باعثِ صد اعزاز سمجھتی تھیں، اور آپ ﷺ کی تعلیمات تو اصل میں اسوۂ ابراہیمی ہی پر مبنی تھیں، اس لئے اس نسبت کی وجہ سے ان کو اسلام قبول کرنے میں کوئی عار نہیں تھی۔

ہندوستان کے بعض علاقوں خاص کر راجستھان اور گجرات کے کچھ حصوں میں بہت سے ہندو خاندان صوفیاء کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے، لیکن انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنی سابقہ خاندانی نسبتوں کو بھی قائم رکھا، اور ٹھاکر، چودھری، ڈیسائی وغیرہ کہلائے، نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کی اگلی نسلیں دین سے دُور اور علمِ دین سے محروم ہوئیں، اور لوگوں نے تحریص اور ترہیب کے ہتھیار استعمال کئے اور ان کو ان کی آبائی نسبت یاد دلائی تو بعض علاقوں میں ارتداد کا فتنہ پھوٹ پڑا اور ان نسبتوں نے اس مذموم مہم

کو تقویت پہونچائی، انڈونیشیا اور اس علاقے کے بعض ممالک میں ایسے نام رکھے جاتے ہیں جن میں ہندوانہ اور عیسائی ناموں کی آمیزش ہوتی ہے، جس کا اثر وہاں ارتداد کی شکل میں ظاہر ہوا، ہندوستان میں بودھسٹ، جین اور بہت سے سکھ بھی ہندو ثقافت میں جذب ہوتے جارہے ہیں، کیونکہ ان کے نام برادرانِ وطن کے سے ہیں، اس لئے خود ان کے ذہن میں ان کی شناخت باقی نہیں رہی، اس لئے نام کے مسئلہ کو کم اہم نہ سمجھنا چاہئے، اس سے اعتقادی، فکری، تہذیبی و ثقافتی اور لسانی شناخت متعلق ہے، جو قوم اپنے نام کی بھی حفاظت نہ کرسکے، اس کے لئے اپنی فکر اور اپنی تہذیب کی حفاظت تو اور بھی دشوار ہے، اور جس قوم کی اپنی کوئی فکر اور تہذیب نہیں ہوتی، اس کو دوسری قوم کے ساتھ جذب ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، اس لئے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ محض نام رکھنے کی دعوت نہیں ہے، بلکہ اپنے دوررس اثرات کے اعتبار سے فکری و تہذیبی ارتداد اور اپنے وجود کو گم کردینے کی دعوت ہے!

(۱۰؍ مارچ ۲۰۰۱ء)

راہِ عمل ۵

دینی وعصری تعلیم اور درسگاہیں

مسائل اور حل

یعنی دینی وعصری تعلیم کی اہمیت، تعلیم کے نصاب ونظام کے لئے لائحہ عمل، مدارس کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ اور دینی وعصری درسگاہوں کے مسائل پر چشم کشا تجزیے اور تبصرے۔

تالیف

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد، اُردو بازار، کراچی

کتاب کا نام ——— راہِ عمل ؒ دینی وعصری تعلیم اور درسگاہیں مسائل اور حل

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دارالھدیٰ اردو بازار کراچی۔فون: 2726509
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
Bl1 3NE U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

تعلیم ہی وہ چیز ہے جو انسان کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ مال وزر، پرشکوہ بلڈنگوں اور جنت نشان عیش کدوں کے ذریعہ جسمانی سکون تو حاصل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن کسی قوم کے لئے ایک باعزت قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے، علم سے عقل وشعور کی سطح اونچی ہوتی ہے، اخلاقی معیار بلند ہوتا ہے، دلوں کو فتح کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اور دنیا میں وہ قوم قیادت کے منصب سے بہرہ ور ہوتی ہے؛ اسی لئے تعلیم کا کوئی بدل نہیں۔

اس حقیر کو ادھر کئی سال سے اردو کے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' میں لکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے، اس میں میں نے کوشش کی ہے کہ تعلیم کی دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچائی جائے؛ چنانچہ تعلیمی نظام کے لحاظ سے شوال کے مہینہ میں دینی تعلیم کی اہمیت اور اس کے نصاب ونظام پر، شعبان کے مہینہ میں فضلاء مدارس کی ذمہ داریوں پر اور مئی اور جون میں ...... جو حیدرآباد میں عصری مدارس کے تعلیم کے آغاز کا زمانہ ہوتا ہے ...... عصری تعلیم کی اہمیت پر لکھنے اور ان کو ترجیحی بنیاد پر موضوع تحریر بنانے کا معمول ہے، یہ مجموعہ انہیں تحریروں کا ہے۔

اس مجموعہ میں تین طرح کے مضامین شامل ہیں، دینی تعلیم اور دینی مدارس سے متعلق، عصری تعلیم اور عصری درسگاہوں سے متعلق اور دونوں طرح کی درسگاہوں کے مشترک مسائل، افسوس کہ نصاب تعلیم پر اس حقیر کا ایک تفصیلی تجزیاتی مقالہ تھا، جو ایک ملک گیر سیمنار کے لیے لکھا گیا تھا، اس کا زیادہ تر حصہ اس مجموعہ کی ترتیب کے وقت نہیں مل سکا؛ اس لئے وہ مضمون اس میں شامل نہیں ہو پایا۔ **ولعل اللہ یحدث بعد ذلك أمرا** — اس مجموعہ میں وہ

مضامین بھی شامل ہیں جو دینی مدارس پر دہشت گردی کے الزام اور اس سلسلے میں پروپیگنڈہ سے متعلق ہیں، جو آر ایس ایس اور وی ایچ پی کی جانب سے مختلف موقعوں پر اٹھائے جاتے رہے ہیں، اس عنوان پر کئی مضامین شامل اشاعت ہیں، جو مختلف الگ الگ موقعوں پر ان الزام تراشیوں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں، ان میں کہیں کہیں تکرار بھی محسوس ہوگی، لیکن یہ تکرار الگ الگ سیاق میں ہے؛ اس لئے انشاء اللہ وہ نفع سے خالی نہیں۔ ''منصف'' کے مضامین کے علاوہ اس مجموعہ میں بعض وہ مضامین بھی شریک اشاعت ہیں، جو کسی سمینار یا سمپوزیم کے لئے لکھے گئے ہیں؛ لیکن ان کی افادیت ان پروگراموں تک محدود نہیں تھی۔

آج کل ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ علماء عصری تعلیم کے مخالف ہیں؛ حالانکہ علماء نے کبھی بھی ایسی بات نہیں کہی، علماء کو اس تہذیب و ثقافت سے اختلاف تھا اور ہے، جس کو ماڈرن ایجوکیشن کا جزو بنا دیا گیا ہے، اس پس منظر میں راقم الحروف نے بعض مضامین لکھے ہیں، جن میں عصری تعلیم کی اہمیت اور اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے، اور یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ اسلامی ماحول میں اور اخلاقی اقدار کے ساتھ عصری تعلیم ہونی چاہئے، اور خود علماء کو اس نظام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے، اس ذیل میں مسلمانوں کی سائنسی خدمات سے متعلق بعض مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں؛ تا کہ نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہو سکے، اور احساس کمتری سے نجات پا سکے۔

اللہ تعالیٰ علم نافع اور عمل صالح سے حظ وافر عطا فرمائے میرے لڑکے عزیزی عمر عابدین سلمہ اللہ تعالیٰ کو، کہ انہوں نے بڑی محنت سے ان منتشر مضامین کو جمع کیا ہے، اور پھر انہیں ترتیب دیا ہے...... دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی حیات میں برکت عطاء فرمائے، ان سے دین اور علم دین کی خوب خوب خدمت لے، اور یہ مجموعہ عنداللہ اور عندالناس مقبول ہو۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم.

۱۵ر شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

یکم اکتوبر ۲۰۰۴ء

عرض مرتب

دینی مدارس برصغیر میں تقریباً ڈیڑھ سو سالوں سے حفاظت دین اور اشاعت دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اور موجودہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے جو جلوے ہمیں نظر آتے ہیں، وہ انہی مدارس کی دین ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ دینی مدارس نے اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کے لئے ایسی ٹیم تیار کی ہے، جو اپنے زمانہ کے چیلنجوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنے کی مکمل صلاحیت، ہر طرح کی قربانی دے کر امت کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا حوصلہ رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر ہم ماضی قریب کی تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جب بھی اسلام کے خلاف کوئی آندھی اٹھی تو ان مدارس کے فضلاء نے ہی اس بادسموم کا مقابلہ کیا اور امت محمدیہ کو راہ حق کی رہنمائی کی۔

یہ بات ظاہر ہے کہ مدارس کا اصل مقصد اسلام کی حفاظت اور اس کی اشاعت ہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے لئے ابتدائی دور میں ایسے قدم اٹھائے گئے، جو اس دور کے چیلنجز کے مقابلہ کے لئے کارآمد ہوسکیں اور قرآن وسنت کی بنیادی تعلیم کے علاوہ نصاب تعلیم میں ایسے مضامین شامل کئے گئے جو اس دور میں حفاظت اسلام اور اشاعت اسلام کے لئے موزوں تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اس وقت سنسکرت زبان کی باقاعدہ تعلیم کا نظم کیا گیا، آج جب کہ دینی مدارس کی تاریخ پر ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے سلسلہ میں غور وفکر کی ضرورت ہے؛ تاکہ موجودہ عہد میں اسلام کے خلاف جو آوازیں اٹھ رہی ہیں، فضلاء ان کا جواب دینے کے لائق ہوسکیں، نیز مسلم معاشرہ میں علماء کے کردار اور ان کے خدمات کا دائرہ وسیع ہو اور ان کا دائرہ کار مساجد یا مدارس ہی تک محدود نہ رہے، قارئین ان مضامین میں ان مسائل پر بہت ہی متوازن اور

حقیقت پسندانہ گفتگو سے استفادہ کرسکیں گے۔

آج کل مدارس سے متعلق جو سوالات مدارس کے مخالفین یا اس کے ہمدردان اور بہی خواہوں کے ذہن میں آتے ہیں، آپ ان سوالوں کا بھی صحیح جواب، معتدل اور متوازن انداز میں آئندہ صفحات میں پڑھیں گے اور ان مسائل سے متعلق واضح تجزیہ، دوٹوک تبصرہ اور مخلصانہ مشورہ آپ کو ملے گا، ان مضامین کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہر بات کو دلائل اور تاریخی حقائق کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، مثلاً موجودہ حالات میں فضلاء دینی مدارس کی ذمہ داریاں کے تحت آپ نے علماء اور مشائخ کو مدرسہ اور خانقاہ سے باہر آکر امت کے دوسرے اہم مسائل کی طرف بھی توجہ دینے کی بات لکھی ہے، اور اس کو مدلل کرنے کے لئے اسلاف کے مختلف الجہات کارناموں کو نہایت ہی متاثر کن لب ولہجہ میں پیش کیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ والد ماجد حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے آبگینۂ قلم سے نکلے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے جو روزنامہ "منصف" کے شمع فروزاں کالم کے تحت ہر ہفتہ لکھا جاتا ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں، ان مضامین میں جہاں دینی مدارس کی اہمیت وضرورت، ان کی اطمینان بخش کارکردگی اور امت کے مسائل کو حل کرنے والے افراد کی تیاری جیسے پہلوؤں پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے، وہیں دینی مدارس کے نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور فضلاء مدارس کی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں اہم مشورے بھی دیئے گئے ہیں، جو یقیناً اس لائق ہیں کہ انہیں قبول کیا جائے، اور اگر انہیں روبہ عمل لایا جائے تو اس سے انشاء اللہ دوررس تبدیلیاں آئیں گی۔

اس مجموعہ کا دوسرا حصہ عصری درسگاہ اور اس سے متعلق مسائل کا ہے، اس ضمن میں حضرت الاستاذ نے مختلف اہم عناوین پر قلم اٹھایا ہے، دینی مدارس سے متعلق ہونے کے باوجود عصری درسگاہوں کے مسائل اور ان کے حل پر آپ کی جو نظر ہے وہ یقیناً باعث حیرت ہے، آپ نے فلکیات اور مسلم سائنس داں، میڈیکل سائنس اور مسلمانوں کی خدمات، موجودہ زمانہ میں تعلیم کو پیشۂ تجارت بنالینے جیسے اہم عناوین پر قلم اٹھایا ہے، مضمون کی ندرت، انداز بیان کی شگفتگی اور حالات سے ہم آہنگی کی وجہ سے ان مضامین کو ملک کے مختلف رسائل و

جرائد نے شائع کیا ہے۔

تیسرے قسم کے مضامین وہ جو دونوں نوع کی درسگاہوں کو پیش آنے والے مشترک مسائل کے تجزیہ پر مشتمل ہیں۔راقم الحروف نے ان مضامین کو مختلف جگہوں سے جمع کیا اور اب یہ مجموعہ کتابی شکل میں ایک ساتھ شائع کیا جارہا ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالی اسے بھی قبولیت سے نوازے۔

۱۷/شعبان ۱۴۲۵ھ

محمد عمر عابدین قاسمی

۲/اکتوبر ۲۰۰۴ء

(ریسرچ اسکالر المعہد العالی الاسلامی حیدر آباد)

راہِ عمل ۵

دینی تعلیم اور دینی درسگاہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صفہ ـــــ پہلی اسلامی درس گاہ

پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کا آفتاب جس قوم میں طلوع ہوا وہ ایک ''اُمی'' قوم تھی۔ ''اُمی'' اسے کہتے ہیں جو لکھنا اور لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا نہ جانتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربوں میں شعر وسخن اور زبان وادب کا ایک خداداد مذاق تھا اور وہ اپنے کلام کے ذریعے بربطِ دل کو چھیڑنے، لہو کو گرمانے اور محبوب کے لب و عارض کا نقشہ کھینچنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے؛ لیکن یہ اشعار اور ادبی سرمایہ زیادہ تر سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا تھا، وہ اپنے حافظہ سے تحریر کا کام لیتے اور صفحۂ قرطاس کے بجائے صفحۂ دل پر نقش کرنے کا اہتمام کرتے تھے، عربوں میں بعض لکھنے پڑھنے والے بھی تھے، رسول اللہ ﷺ اور بنو ہاشم کے شعب ابی طالب میں بائیکاٹ کا واقعہ حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہے، جس میں بائیکاٹ کا تحریری اعلان غلاف کعبہ کے ساتھ آویزاں کرنے کا ذکر ہے۔ قرآن مجید نے بھی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک مکی تاجر پر جب سفر کی حالت میں موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے سامان کی ایک فہرست بنا کر اپنے سامان میں چھپا دی اور سامان رفقاء سفر کے حوالہ کر دیا، اسی فہرست نے چوری اور بددیانتی کے راز کو افشاء کیا۔ (المائدہ: ۱۰۸-۱۰۶) یہ اور اس طرح کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ عربوں میں تحریر وکتابت کا ذوق موجود تھا؛ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، بعض اہل علم نے تو لکھا ہے کہ مکہ میں صرف سترہ افراد کو لکھنا آتا تھا، ''دخل الإسلام و فی قریش سبعة عشر رجلا کلھم یکتب'' (فتوح البلدان: ۶۱-۶۶۰) مدینہ

کا معاملہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا تھا۔ واقدی نے ان لوگوں کے نام ذکر کئے ہیں، جو مدینہ میں لکھنے سے واقف تھے۔ جن کی تعداد گیارہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ (فتوح البلدان: ۶۶۳-۶۶۴)
گو ان اعداد وشمار پر اعتماد دشوار ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عرب کا بڑا حصہ جہالت اور ناخواندگی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں تھا اور نہ صرف علم کی دولت سے محروم تھا؛ بلکہ علم کی اہمیت، اس کی عظمت اور اس کی ضرورت وافادیت سے بھی نابلد تھا۔

یہ حالات تھے جب آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی، اس وحی میں شرک کی تردید اور خدا پر ایمان لانے کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں، جو قرآن کی دعوت کا عطر اور خلاصہ ہے۔ اس وحی میں '' آخرت '' کا تذکرہ نہیں، جو ایمان وعمل کا اصل محرک ہے، اس وحی میں آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کا اعلان نہیں جس پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس ظلم وجور اور نا اتفاقی کی مذمت نہیں جو عرب سماج کے مزاج میں داخل ہو گیا تھا اور اس وحی میں ان اخلاقی برائیوں اور پستیوں پر بھی کوئی تنقید نہیں جن کی اصلاح کو آپ ﷺ نے اپنی زندگی کا مشن بنایا، یہ پہلی وحی انسانیت کو '' تعلیم '' کی طرف متوجہ کرتی ہے، اس میں پہلا لفظ ہی '' اقراء '' کا ہے جس کے معنی ہیں: '' پڑھ '' پھر ان پانچ آیتوں میں دو جگہ تعلیم وتعلم کا ذکر ہے، ایک میں '' قلم '' کے '' ذریعۂ تعلیم '' ہونے کی طرف اشارہ فرمایا گیا: ﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ یہ گویا کتابی تعلیم کی دعوت ہے، دوسری جگہ ان علوم کی تحصیل پر متوجہ کیا گیا جو ابھی انسان کی گرفت میں نہیں ہیں اور انسان کی محنت اور اللہ کی مدد سے ہی ان کو حاصل کیا جا سکتا ہے: ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ﴾ گویا اس میں قیامت تک آنے والے سائنسی علوم اور ایجادات وانکشافات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا؛ کیوں کہ '' علم '' ہی تمام اعتقادی اور عملی واخلاقی بیماریوں کا علاج ہے۔

غرض آپ ﷺ دنیا میں علم کا چراغ بن کر آئے اور اس جہالت کو اپنا نشانہ بنایا جس کے سایہ میں برائیاں پنپتی ہیں؛ اس لئے قرآن مجید نے آپ ﷺ کی جس حیثیت کو زیادہ نمایاں کیا ہے وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ '' معلم '' ہیں اور انسانیت متعلم، ﴿یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں یہ پہلو اتنا نمایاں نظر آتا ہے کہ مکی زندگی میں بھی باوجود ہر طرح کی مشکلات اور دشواریوں کے آپ ﷺ نے اس کو نظر انداز

نہیں فرمایا اور اپنے ایک جاں نثار کے مکان ''دار ارقم'' کو ــــ جو صفا کی چوٹی پر واقع تھا۔ تعلیمی وتربیتی مرکز بنایا، مکی زندگی کی ابتداء ہی میں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، اس کی واضح دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہن اور بہنوئی کے قرآن پڑھنے کا ذکر ہے، قرآن کی کچھ سورتیں ان کے پاس لکھی ہوئی صورت میں موجود تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ پڑھنا صرف زبانی ہی نہ تھا، بلکہ کتاب کے ذریعہ تھا، ــــ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایسی تربیت فرماتے کہ وہ علم کے زیور سے آراستہ ہو کر دوسروں تک بھی علم کی روشنی پہنچاتے، انصار مدینہ کی خواہش پر آپ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ بھیجا جو لوگوں کو قرآن پڑھاتے اور علم سے آراستہ کرتے، ''فکان یقرأھم القرآن و یعلمھم''، (طبقات ابن سعد: ۱۱۸/۴، ط بیروت) جو لوگ آپ ﷺ پر ایمان لاتے ان میں بھی علم کی طلب پیدا ہو جاتی، مدینہ میں ابھی کچھ ہی لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ابھی مدینہ تشریف بھی نہ لائے تھے کہ مدینہ سے حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ انصاری آستانۂ نبوت پر حاضر ہوتے ہیں اور قرآن کی تعلیم حاصل کر کے واپس ہوتے ہیں تاکہ اہل مدینہ تک علم کی یہ امانت پہنچا سکیں۔

(التراتیب الاداریہ: ۴۴/۱)

مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد آپ ﷺ نے اولین کام یہی کیا کہ مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی اور اسی مسجد سے متصل ایک ''چبوترہ''، تعلیمی مقصد کے لیے بنایا، جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا، یہ گویا اسلامی تاریخ کا پہلا مدرسہ تھا، اس مدرسہ میں غیر مقیم طلبہ بھی تعلیم حاصل کرتے تھے اور دارالاقامہ کا بھی نظم تھا، اس درس گاہ میں حالات ومواقع اور واردین کی بڑھتی گھٹتی تعداد کے لحاظ سے طلبہ کی تعداد کم وبیش ہوتی رہتی تھی، بعض حضرات کا خیال ہے کہ چار سو طلبہ نے بحیثیت مجموعی اس درس گاہ سے استفادہ کیا تھا اور قتادہ کی رائے ہے کہ مدرسہ صفہ سے مستفیدین کی تعداد نو سو تک پہنچتی ہے۔ (التراتیب الاداریہ: ۳۴۰/۱)

اس درس گاہ کے نصابِ تعلیم کا موضوع قرآن مجید اور احکام کی تعلیم تھی؛ لیکن اس کے علاوہ تحریر وکتابت پر بھی پوری توجہ دی جاتی تھی، جس کی عرب کے اس معاشرہ میں بڑی اہمیت

تھی، حضرت عبداللہ بن سعید بن عاص انصاری ﷛ جو غزوۂ بدر میں شہید ہوگئے تھے، اچھے کاتب تھے، آپ ﷺ نے ان کو کتابت سکھانے پر مامور فرمایا تھا، (الاصابہ: ۱۷۷۷) علم وحکمت کے حصول میں آپ ﷺ نے دین ومذہب کے اختلاف کو بھی رکاوٹ نہیں بننے دیا، چنانچہ غزوۂ بدر میں جو مشرکین قید ہوکر آئے، ان میں جو لوگ کتابت سے واقف تھے، آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہی مقرر فرمایا کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ جو صحابہ علم وفضل میں معروف تھے اور جن کے علم ومعرفت پر خود آپ ﷺ کو اتنا اعتماد تھا، کہ آپ ﷺ ان سے قرآن سیکھنے کی تلقین فرماتے تھے، یا کسی خاص فن جیسے علم الفرائض یا قضاء وغیرہ میں ان کی خصوصی مناسبت کا ذکر کرتے تھے، وہ ضرور اس درس گاہ میں فریضۂ تدریس انجام دیتے رہے ہوں گے اور چوں کہ دین سکھانا اور قرآن کی تعلیم دینا افضل ترین عبادت ہے؛ اس لئے ہر صحابی نے اپنی صلاحیت اور فراغِ وقت کے اعتبار سے اس میں حصہ لینے کی کوشش کی ہوگی؛ لیکن بعض صحابہ کا اس سلسلہ میں خاص طور پر ذکر ملتا ہے، حضرت عبداللہ بن سعید ﷛ کا ذکر اوپر آچکا ہے، حضرت عبادہ بن صامت ﷛ بھی اہل صفہ کو قرآن اور کتابت سکھانے پر مامور تھے، (مسند احمد: ۳۱۵/۵) اور حضرت ابی بن کعب ﷛ ''جن کو بارگاہ نبوی ﷺ سے سب سے بڑے قاری ہونے کی سند عطا فرمائی گئی'' کے ذمہ خاص طور پر قرآن پاک کی تعلیم تھی۔ (بیہقی: ۱۲۶/۶)

رسول اللہ ﷺ نے ''علم'' کو یہ عظمت عطا فرمائی کہ اسے خرید وفروخت کی جانے والی شئی قرار نہیں دیا؛ بلکہ اسے عبادت کا درجہ دیا، جسے خالصۃً اللہ کی خوشنودی اور خلق اللہ کی خدمت کے جذبے سے دوسروں تک پہنچایا جائے اور اسے سامان تجارت نہ بنایا جائے، حضرت ابی کے ایک شاگرد نے ایک کمان تحفۃً پیش کی، انھوں نے آپ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم نے یہ کمان لی تو گویا آگ کی کمان حاصل کی، ''إن أخذتها فخذبها قوساً من النار'' (بیہقی: ۱۲۶/۶) اس لئے جو اساتذہ اس درس گاہ میں خدمت پر مامور تھے، وہ فی سبیل اللہ خدمت کرتے تھے۔

جو طلبہ ''صفہ'' میں مقیم تھے، اہل مدینہ ان کے کھانے کا نظم کرتے تھے اور ان کو اپنا اور

اپنے رسول ﷺ کا مہمان سمجھ کر ان کے ساتھ خوب اکرام کا معاملہ فرماتے تھے، ان کے طعام کا نظم دو طریقوں پر ہوتا، اول یہ کہ خود صفہ میں کھانے کی چیز پہنچادی جاتی، چوں کہ عربوں کی عام غذا کھجور تھی؛ اس لئے کھجور کے خوشے صفہ کے ستونوں سے لٹکا دئے جاتے، حضرت معاذ بن جبل ؓ کے بارے میں مروی ہے کہ دو ستونوں کے درمیان رسی باندھ کر اسی رسی سے کھجور کے خوشے لٹکا دیتے، (التراتیب الاداریہ: ۱/۴۷۵) --- دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ کچھ طلبہ کو اپنے گھر لے جاتے اور ان کو کھانا کھلاتے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جس کے پاس دو اشخاص کے کھانے ہوں، وہ اپنے ساتھ تیسرے مہمان کو لے جائے، خود رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ دس طلبہ کو لے گئے، (مسند احمد: ۱/ ۱۹۷) حضرت سعد بن عبادہ ؓ کا مکان اہل صفہ کے لئے گویا سب سے بڑا مہمان خانہ تھا، ابن سیرین کی روایت ہے کہ سعد بن عبادہ ہر شب اسّی طلبہ کو اپنے یہاں شب کا کھانا کھلاتے تھے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱/۲۰۰) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر دارالاقامہ میں طلبہ کی تعداد اسّی سے کم نہ ہوتی تھی۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان طلبہ کے قیام وطعام کے مسائل سے آپ ﷺ غافل نہ رہتے تھے اور کھانے کے معیار پر بھی نظر رکھتے تھے، ایک بار آپ ﷺ تشریف لائے، دست مبارک میں عصا تھا اور کھجور کا ایک خوشہ لٹکا ہوا تھا، یہ کھجور اچھی نہ تھی، آپ ﷺ نے لاٹھی سے اس خوشہ کو مارا اور فرمایا کہ اگر یہ شخص چاہتا تو اس سے بہتر کھجور بھی دے سکتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: قیامت کے دن یہ بھی ایسا ہی معمولی کھجور کھائے گا۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۶۰۸)

گو تعلیم کا اصل مرکز یہی ''صفہ'' تھا؛ لیکن یہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی، آج بھی مسجد نبوی میں دیکھا جا سکتا ہے؛ اس لئے اگر واردین کی کثرت ہوتی اور طالبان علم کا اژدہام ہو جاتا، تو عارضی طور پر ان کو مختلف اہل علم پر تقسیم کر دیا جاتا کہ وہ ان کے طعام وقیام کا بھی نظم کریں اور تعلیم وتربیت کا بھی، اس سلسلہ میں وفد عبدالقیس کا واقعہ سیرت کا ایک مشہور واقعہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو صحابہ پر تقسیم فرمادیا، پھر آپ ﷺ نے استفسار حال بھی فرمایا کہ میزبان بھائیوں کا کیسا سلوک رہا؟ وفد نے بڑی تعریف کی اور کہا کہ انھوں نے رہائش کا بہتر انتظام

کیا، اچھے کھانے کھلائے اور شب و روز ہمیں کتاب و سنت کی تعلیم دیتے رہے: ''باتوا وأصبحوا یعلموننا کتاب ربنا و سنة نبینا''، چنانچہ آپ ﷺ بہت خوش ہوئے اور وفد کے ایک ایک رکن سے ان کی تعلیم وتربیت کے بارے میں الگ الگ گفتگو کی۔

(مسند احمد: ۲۰۶/۴)

اس درس گاہ سے نہ صرف واردین استفادہ کرتے؛ بلکہ دور دراز کے علاقوں میں تعلیمی اغراض کے تحت درس گاہ کے فضلاء اور تربیت یافتگان بھیجے بھی جاتے، اسے ''گشتی نظام تعلیم'' سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، چنانچہ حضرت انس ﷺ سے مروی ہے کہ کچھ لوگوں نے قرآن و سنت کی تعلیم کے لئے کچھ لوگوں کو بھیجنے کی درخواست کی، آپ ﷺ نے ستر انصار کو اس خدمت کے لئے روانہ فرمایا، یہ لوگ ''قراء'' کہلاتے تھے، انھیں میں میرے ماموں حرام ﷺ بھی تھے، یہ حضرات رات میں تعلیم حاصل کرتے اور اس کا مذاکرہ کرتے تھے اور دن میں مسجد میں پانی لا کر رکھتے اور لکڑی کاٹ کر لاتے، جسے فروخت کر کے اہل صفہ کے لئے کھانے کا نظم کیا جاتا، رسول اللہ ﷺ نے ان حضرات کو بھیجا، یہ مشہور واقعہ ہے، جو ''بئر معونہ'' کے نام سے معروف ہے اور جن میں ان حضرات کو دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا، (دیکھئے: طبقات ابن سعد: ۷۱/۳) ـــــ اسی طرح کے بعض اور وفود کو بھی آپ ﷺ نے دور دراز علاقوں میں بھیجے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''صفہ'' میں ''شبینہ تعلیم'' کا نظم تھا، تاکہ مشغول اور متاہل افراد بھی استفادہ کر سکیں، نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ جیسے آج کل ''عالم'' اور ''فاضل'' وغیرہ سے سندیں موسوم ہیں، اس زمانہ میں جو لوگ تعلیم حاصل کر لیتے تھے ''قاری'' کہلاتے تھے؛ کیوں کہ ان کی تعلیم کا بنیادی حصہ قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا ہوتا تھا۔

مدینہ میں صفہ کی اس ''درس گاہ'' کے علاوہ بعض اور مکاتب اور چھوٹی درس گاہیں بھی تھیں، حضرت مخرمہ بن نوفل ﷺ کا مکان تو ''دار القراء'' ہی سے معروف تھا اور یہاں بھی درس کا ایک نظام قائم تھا، حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ﷺ کے بارے مروی ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے کچھ ہی بعد تشریف لائے تو اسی ''دار القراء'' میں مقیم ہوئے، (طبقات بن سعد: ۱۵۰/۴) اس سے ظاہر ہے کہ یہاں محدود پیمانہ ہی پر سہی، طلبہ کے قیام کا نظم بھی تھا؛ لیکن بہر حال مرکزی حیثیت

''اسی درس گاہ صفہ'' کو حاصل تھی۔

یہی اولین درس گاہ ہے کہ دنیا میں جتنی دینی درس گاہیں آج تعلیم وتعلم کا فریضہ انجام دے رہی ہیں، یہ ان کا اصل سرچشمہ ہے، بلکہ ایک دینی تعلیم ہی پر منحصر نہیں؛ بلکہ یہی ہر علم نافع کا منبع ہے۔ جس کی بنیاد ایک نبی اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں پڑی تھی اور جس کی ضوء سے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب غرض دنیا کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک تمام دانش گاہیں روشنی حاصل کر رہی ہیں اور اس کی عالم تاب کرنوں سے ذرہ ذرہ منور ہے، —— صد لاکھ سلام ہو اس درس گاہ کے معلم اول پر اور ان کے رفقاء عالی مقام پر !!

میں اس ذلت کو فراموش نہیں کرسکتا!

عطاء بن ابی رباح بڑے عالم تھے، حدیث کے بھی اور فقہ کے بھی۔ ۲۴ھ میں وفات ہوئی، یہ مکہ کی ایک خاتون کے غلام تھے، کالے بھی تھے، کانے بھی، ناک چپٹی، ہاتھ لنجے، پاؤں میں لنگ بھی تھا اور اخیر عمر میں مکمل ہی نابینا ہو گئے تھے، بال بہت گھنگھریالے تھے اور بہ قول ان کے تذکرہ نگاروں کے ناک چقندر کی سی تھی، بادشاہ وقت سلیمان بن عبد الملک ایک بار اپنے دو فرزندوں کے ساتھ ان کے پاس آیا، وہ نماز میں مشغول تھے، یہ منتظر رہے، شدہ شدہ عطاء کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک حلقہ سا بن چکا تھا، لوگ احکامِ حج سے متعلق سوالات کرتے اور وہ جواب دیتے جاتے، یہاں تک کہ عطاء کی پشت بادشاہ اور شہزادوں کی طرف ہوگئی اور رُخ دوسرے حاضرین کی طرف، ظاہر ہے یہ بات کسی بھی طرح آدابِ شاہی سے میل نہ کھاتی تھی، سلیمان نے شہزادوں سے کہا کہ کھڑے ہو جاؤ، یہ کھڑے ہوگئے، پھر کہا کہ علم (دین) کے حاصل کرنے میں کوتاہی سے کام نہ لینا! خدا کی قسم! میں اس سیاہ غلام کے سامنے اپنی ذلت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

(من اخلاق العلماء: ص: ۱۳۱)

اللہ تعالیٰ نے جیسے اپنے دین کو باعزت بنایا ہے، اسی طرح اپنے دین کے علم سے بھی عزت واحترام کو متعلق رکھا ہے، اس لیے کہ دوسرے علوم کا مفاد اکثر انسان کی اپنی ذات ہوتی ہے اور دین کو سیکھنا اس کے لیے بھی نافع ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی، مسلمان خواہ کتنے ہی بڑے عہدہ پر پہنچ جائے، اگر اس میں ''مسلمانیت'' باقی ہے تو وہ ان لوگوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جو دین کے بارے میں واقف ہوں اور جنہوں نے دین کو اس کے اصل سرچشموں قرآن وحدیث سے پڑھا ہے اور اگر بے نیاز ہے تو یہ دین سے بے اعتنائی کی علامت ہے، خدا کی خوشنودی کے لیے جو علم حاصل کیا جائے، وہ انسان کو

رعب و وقار سے ہمکنار کرتا ہے، لوگوں میں اس کی عظمت پیدا ہوتی ہے اور سلاطینِ وقت کی بھی جبین احترام اس کے سامنے خم ہو جاتی ہے!

حماد بن سلمہؒ بھی اپنے عہد کے بڑے علماء و محدثین میں تھے، اکثر محدثین نے ان سے براہِ راست یا بالواسطہ کسبِ فیض کیا ہے، مقاتل خراسانیؒ ناقل ہیں کہ میں ان کے یہاں گیا تو دیکھا کہ ان کے کمرہ میں ایک چٹائی ہے جس پر وہ بیٹھتے ہیں، تلاوت کے لیے قرآن مجید ہے، ایک تھیلی میں ان کے مسودات ہیں اور ایک وضو کرنے کا برتن ہے اور بس، میں وہیں تھا کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، آپ نے ایک کم سن بچی سے کہا کہ دیکھو کون ہے؟ لڑکی نے واپس آکر بتایا کہ گورنرِ بصرہ محمد بن سلیمان کا قاصد باریابی چاہتا ہے، آپ نے کہا کہ اسے کہو کہ تنہا آئے، قاصد آیا، سلام کیا اور گورنر کا خط پیش کیا۔ خط میں حماد سے خواہش کی گئی تھی کہ ایک مسئلہ پیش آگیا، وہ اس کے حل کے لیے تشریف لے آئیں، لیکن حماد بن سلمہؒ نے قلم و دوات لیا اور جواب لکھا کہ ہم نے اہل علم کو دیکھا ہے کہ وہ کسی کے پاس نہیں جاتے، اس لیے اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ خود آیا کریں اور دریافت کریں اور میرے پاس آنا ہو تو اس بات کا خیال رکھیں کہ تنہا آئیں، جاہ و حشم اور گھوڑے اور پیادہ فوجوں کے ساتھ آنے کی زحمت نہ کریں، ورنہ، نہ میں آپ کے ساتھ خیر خواہی کرسکوں گا اور نہ اپنے آپ ہی کے ساتھ۔

تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ پھر دستک ہوئی اور خود گورنرِ بصرہ حماد کے دروازے پر منتظر باریابی تھے، آپ نے فرمایا کہ کہہ دیا جائے کہ تنہا داخل ہوں، چنانچہ محمد بن سلیمان تنہا داخل ہوئے، سلام کیا اور سامنے بیٹھ گئے، پھر گورنر نے دریافت کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر آپ کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے؟ حماد نے ثابت بنانیؒ کے واسطہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ "عالم جب اپنے علم سے اللہ کی رضا چاہتا ہے تو ہر چیز اس سے مرعوب ہوتی ہے اور جب خزانہ جمع کرنے کے لیے علم حاصل کرتا ہے تو خود وہ ہر چیز سے ڈرنے لگتا ہے"۔ محمد بن سلیمان نے اپنا مطلوبہ مسئلہ دریافت کیا، پھر آپؒ سے خواہش کی آپ کی کوئی حاجت ہو تو بیان فرمائیں۔ آپ نے کہا ایسی چیز دو جس سے دین میں کمی نہ ہو، گورنر نے پچاس ہزار دراہم کی پیشکش کی کہ اس کو اپنی ضرورت میں خرچ

کریں۔ شیخ نے کہا: یہ ان ہی کو دے دو جن پر تم نے ظلم کیا ہے، گورنر بصرہ نے کہا کہ یہ وہ مال ہے جو مجھے میراث میں حاصل ہوا ہے، شیخ نے کہا: مجھے اس کی حاجت نہیں، گورنر نے دریافت کیا کہ اس کے علاوہ کوئی اور ضرورت؟ شیخ نے پھر وہی جواب دیا کہ ایسی چیز جس سے دین میں نقص نہ ہو، گورنر نے عرض کیا کہ اسے قبول کریں اور تقسیم کردیں، شیخ نے فرمایا: اگر میں تقسیم کروں تو عدل سے کام لوں جب بھی جس کو نہ ملے گا وہ میرے بارے میں کہے گا کہ اس نے عدل نہیں کیا اور اس طرح گنہگار ہوگا، اس لیے تم مجھے اس سے بچاؤ، اللہ تم سے تمہارے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرے گا۔ (امام نووی، بستان العارفین: ص: ۹۲)

''علم'' سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی اعزاز نہیں اور جہل سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی وجہ رسوائی نہیں، سدا زندہ، انسان کے لیے نافع اور فکر ونظر کے لیے خضر راہ، وہ علم ہے جس کا رشتہ خدا سے جڑا ہوا ہو، جو انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہو اور قلب ونظر کو تسکین وطمانینت عطا کرتا ہو، جو دنیا میں حقیقی انسان کو جنم دیتا ہو، ایسے انسانِ کو نہیں جس کی منزل معدہ اور صرف معدہ ہے، جو فانی دنیا سے آگے نہ دیکھتا ہو نہ سوچتا ہو، یہ علم کتاب وسنت سے حاصل ہوتا ہے، یہ علم اپنے لیے وجہِ سکون، دوسروں کے لیے سامانِ ہدایت، آخرت میں باعثِ نجات اور قلب وروح کی بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا ہے، مگر آج کتنے اہل نظر ہیں جن کی نظر حقیقت شناس نے اس حقیقت کو سمجھا ہے اور طلبِ علم کی اس راہ میں آبلہ پائی کی لذت اٹھائی ہے؟؟

۱۳/ مارچ ۱۹۹۸ء

☆☆☆

دینی تعلیم کا نظام

وقت کی اہم ضرورت

کسی بھی مذہب اور فکر وعقیدہ کے لئے تعلیم کی حیثیت شہ رگ کی ہے، اگر کسی قوم کو اس کے دین سے محروم کرنا ہو تو اس کے دینی تصورات سے اس قوم کا علمی رشتہ کاٹ دیجئے، یہ چیز خود بخود اس قوم کو اپنے مذہب سے بے گانہ بنادے گی، اس کے لئے پنجہ آزمائی کی ضرورت پڑے گی اور نہ معرکہ آرائی کی، یہ کسی قوم کو فکری اور مذہبی اعتبار سے قتل کرنے کا ایسا کامیاب اور بے ضرر نسخہ ہے کہ بقول شاعر :

دامن پہ کوئی چھینٹ ، نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو !

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، انگریز جب ہندوستان میں آئے، تو انھوں نے بھی یہ ناکام کوشش کی، چنانچہ لارڈ میکالے جب فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کے بعد برطانیہ واپس گئے، تو انھوں نے برطانوی دارالعوام میں اپنے اس منصوبہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا: ”میں ہندوستان میں ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈال کر آیا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے والے رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی رہیں گے، لیکن اپنی فکر اور ذہن ودماغ کے اعتبار سے انگریز بن جائیں گے“ چنانچہ اس ملک کے دردمند علماء نے اس حقیقت کو محسوس کرلیا اور انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دینی مدارس اور مکاتب قائم کرکے اس بات کا انتظام فرمایا کہ اس ملک میں بسنے والے مسلمان گو رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں، لیکن وہ دل ونگاہ کے

اعتبار سے ''حجازی'' بنے رہیں اور پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کا دامنِ نبوت ان کے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ پائے۔

جب ملک آزاد ہوا تو مسلمانوں نے اس جذبہ کے ساتھ جنگ آزادی میں شرکت کی کہ وہ اس ملک کے مالکوں میں ہوں گے، اس ملک میں ان کا مذہب، ان کی تہذیب اور ان کی زبان محفوظ رہے گی، لیکن بدقسمتی سے انگریزوں نے اس ملک میں فرقہ پرستی کی بیج بوئی اور اس شجر خبیث کو اتنا تناور کر دیا کہ آزادی کے بعد بھی اس کی جڑیں پھیلتی رہیں اور آج تو فرقہ پرست طاقتیں بامِ اقتدار تک پہنچ چکی ہیں، جہاں انہیں اس ملک میں معاشی طور پر پس ماندہ، سیاسی اعتبار سے مفلوج و بے اثر اور جان و مال کے اعتبار سے غیر محفوظ و غیر مامون کرنے کی کوششیں کی گئیں، وہیں مسلمانوں کی تہذیب پر بھی یلغار کی گئی اور کوشش کی گئی کہ تہذیبی اعتبار سے ان کا ہندوکرن کر دیا جائے، اور اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب اور عقیدہ سے دور کر دیا جائے، تا کہ ایک دو نسل کے بعد وہ مذہبی شعور سے پوری طرح محروم ہو جائیں۔

مسلمانوں پر یہ سب سے بڑا حملہ اور ضربِ کاری ہے اور اس سے معمولی سا تغافل بھی ان کے ملی وجود اور بقا کے لئے زبردست خطرہ ہے ——— فرقہ پرست طاقتیں اس مقصد کے لئے دو طرفہ حملہ کر رہی ہیں، ایک طرف سرکاری درس گاہوں کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں جو ایک سیکولر ملک کے بجائے خالص ہندو تصورات پر مبنی ملک کی نمائندگی کرتی ہو، ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کے حالات، ہندو فکر و عقیدہ کی وکالت اور ہندو تاریخ کی عظمت اور تفوق کا اظہار، مسلم حکمرانوں کے مفروضہ ظلم و جور کا بیان، یہاں تک کہ بعض اوقات خود پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر حرف گیری اس ''بھگوا نصابِ تعلیم'' کی فکری بنیادیں ہیں، ''وندے ماترم'' اور ''سرسوتی وندنا'' اقلیتوں کو مشرکانہ تصورات سے مانوس کرنے کی ناپاک کوشش ہے اور بعض ریاستی حکومتیں یہ منصوبہ بھی بنا رہی ہیں کہ پانچویں جماعت سے اوپر کوئی نجی سرکاری درس گاہ قائم نہیں کی جاسکتی، گو یہ ایسا خواب ہے جو ملک کے موجودہ معاشی حالات کے تحت ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا، لیکن اس سے فرقہ پرست عناصر کے ناپاک منصوبوں کا

اندازہ تو کیا ہی جا سکتا ہے۔

دوسری طرف دینی مدارس کے نظام میں دخیل ہونے اور ان اداروں کو بدنام کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں، بہار میں مدتوں پہلے گورنمنٹ نے دینی مدارس کو نصابِ تعلیم میں معمولی ترمیم کی شرط پر اعانت دینے کی پیش کش کی تھی اور اس کے لئے ''بہار مدارس اکزامنیشن بورڈ'' کی بنیاد رکھی تھی، ریاست کے وہ مخلص بزرگ علماء جو حالات کی نبض پہ انگلی رکھتے تھے، نے مدارس کو اس سرکاری بورڈ میں شریک ہونے سے روکنے کی بڑی کوششیں کیں، لیکن سرکاری اعانتوں کی پیش کش نے اکثر ارباب مدارس کے قدم ڈگمگا دیئے اور انھوں نے اس کو ایک ''نعمت غیر مترقبہ'' سمجھ کر بے تحاشہ الحاق کرانا شروع کیا، گورنمنٹ نے بتدریج ان مدارس کے نصاب اور نظام میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ اب ان کو دینی درس گاہ کہنا ایک تہمت سے کم نہیں اور افسوس کہ ان کو ایک معیاری عصری درس گاہ بھی نہیں کہا جا سکتا، اسی قسم کی کوشش مشرقی اتر پردیش میں شروع ہوئی اور کسی قدر تاخیر سے سہی، لیکن اب وہاں بھی اس کا اثر محسوس کیا جا رہا ہے —— جو دینی مدارس حکومت کے زیر اثر نہیں ہیں اور اس کے عمل ودخل سے آزاد ہیں، ان کو بدنام کرنے اور ان کی تصویر مسخ کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے، کبھی اس کو ''آئی، ایس، آئی'' کا مرکز قرار دیا جاتا ہے، کبھی ان مدارس کی طرف دہشت گردی کو منسوب کیا جاتا ہے، کبھی ان کے مالی وسائل کے بارے میں شکوک وشبہات ظاہر کئے جاتے ہیں، تاکہ خاص طور پر غیر مسلم بھائیوں کا ذہن ان اداروں کے بارے میں مسموم ہو جائے۔

ان حالات میں دینی تعلیم کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، دینی تعلیم حاصل کرنے کے دو درجے ہیں: ایک تو اتنی تعلیم جو ہر شخص کے لئے ضروری ہے، یہ دین کے بارے میں بنیادی واقفیت ہے، توحید اور شرک کی حقیقت، نبوت ووحی کا اسلامی تصور، انبیاء اور بالخصوص پیغمبر اسلام ﷺ کے ضروری حالات، پاکی وناپاکی، نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ اور قربانی کے بنیادی احکام، نکاح وطلاق، خرید وفروخت، ملازمت اور نوکری، کسبِ معاش کے حلال وحرام طریقے، شریعت کی حرام کی ہوئی چیزوں وغیرہ سے متعلق ضروری مسائل، صحابہ اور صحابیات کی مبارک زندگیوں سے متعلق بنیادی معلومات، والدین، اولاد، میاں بیوی اور اعزہ واقرباء سے

متعلق حقوق۔ شب وروز کئے جانے والے افعال کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور مسنون و ماثور اوراد واذکار، یہ وہ امور ہیں کہ جن کے بارے میں جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے، مرد ہو یا عورت اور جوان ہوں یا بوڑھے، اس مقصد کے لئے جگہ جگہ دینی مکاتب اور بالغوں کے لئے دینی تعلیم کے مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے، کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی محلّہ اور کوئی مسجد ایسے مکاتب اور مراکز سے خالی نہ ہو، بلکہ بچوں اور بچیوں کے اسکول کے اوقات کے لحاظ سے صباحی اور مسائی دونوں طرح کے مکاتب ہوں اور کوشش کی جائے کہ محلّہ کا کوئی بچہ اور دین سے ناواقف کوئی نوجوان ایسا نہ رہے جو اس نظام سے فائدہ نہ اُٹھائے۔

لیکن دوسری ضرورت ایسی درس گاہوں کی ہے، جہاں قرآن وحدیث، کلام وعقیدہ اور سیرت نبوی سے متعلق اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو اور اسلام کو اصل مآخذ سے سمجھنے اور سمجھانے کی غرض سے عربی زبان وادب میں بصیرت کا سامان فراہم کیا جاتا ہو، بحمد اللہ ہندوستان کے چپہ چپہ میں ایسے مدارس موجود ہیں، یہ اسلام کی فکری سرحدوں کے محافظ ہیں، ان ہی درس گاہوں سے نکلنے والے فضلاء نے ہر عہد میں اسلام کے خلاف اٹھنے والی فکری شورشوں کا مقابلہ کیا ہے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسیحی پادریوں اور مبلغوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ آیا، دیہات دیہات یہ مبلغین پہنچتے، بھولے بھالے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے اور مناظرہ کا چیلنج دیتے، یہ حضرات علماء ہی ہیں جنھوں نے ان سے پنجہ آزمائی کی اور اسی دور میں ایک ہندوستانی عالم مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے عیسائیت کی رد میں ''اظہار الحق'' کے نام سے ایک ایسی کتاب تالیف کی کہ اس موضوع پر کسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی اور ہندوستان سے مصر وترکی تک مشہور عیسائی مناظر پادری فنڈر کا تعاقب کر کے اس کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا، پھر جب آریہ سماجی تحریک اُٹھی اور اس نے شدھی یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوششیں شروع کیں، تو یہ علماء ہی تھے جو اس کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے اور فتنہ کا ایسا علمی اور تبلیغی تعاقب کیا کہ ان کی ناپاک کوششیں ذرا بھی بار آور نہ ہو پائیں۔

اسی طرح جب انگریزوں کی شہ پر پنجاب کے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ کیا اور جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچایا، تو یہی علماء تھے جنھوں نے اُمت کو اس

عظیم فتنہ سے بچانے کی سعی کی اور پورے برصغیر میں اپنی مجاہدانہ کوششوں سے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت فرمائی، اسی طرح انکارِ حدیث کا فتنہ اُٹھا، مستشرقین نے اسلام کے بارے میں تشکیکی کی مہم چلائی، تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل کے قلوب میں ان کے مذہب کے تئیں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھودیئے جائیں، ان ہی مدارس کے فضلاء نے ان سازشوں کے مقابلہ کے لئے لوح وقلم کی امانت سنبھالی اور وقت کے اُسلوب میں ان کا رد فرمایا، پھر جب ماضی قریب میں شریعت اسلامی کو فکری اور عقلی حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی کوشش کی گئی، تو پورے ملک میں ان مدارس کے تعلیم یافتہ اور پرداختہ فضلاء نے ایک تحریک کی شکل میں ''مسلم پرسنل لاء'' کے تحفظ کا بیڑہ اُٹھایا اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر شعور پیدا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کی حفاظت وصیانت میں دینی مدارس کا اتنا نمایاں اور اہم کردار ہے کہ کسی حقیقت پسند کے لئے اس سے انکار ممکن نہیں، اسی لئے اُمت میں ایک ایسے طبقہ کا وجود ضروری ہے جو اسلام کا تحقیقی اور کتاب وسنت کا تفصیلی علم رکھتا ہو، اپنے عہد کے فکری اور فقہی مسائل کو حل کرنے کا اہل ہو، نیز اسلام کے خلاف اُٹھنے والے علمی وفکری فتنوں کا مقابلہ کرسکتا ہو اور ہر دور میں اس دور کی زبان اور طریقۂ استدلال کی رعایت کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کی صلاحیت رکھتا ہو، ہونا تو یہ چاہئے کہ ہر خاندان میں ایسا ایک عالم موجود ہو، لیکن جب مدینہ میں ۸۰/اشخاص نے اسلام قبول کیا تو آپ ﷺ نے ان کی تربیت کے لئے حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اس سے معلوم ہوا کہ کم سے کم ہر اسّی مسلمان پر ایک عالم ہونا چاہئے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کی تعداد ایک فیصد بھی نہیں، بیس کروڑ کی مسلمان آبادی میں اگر ایک فیصد بھی عالم ہو، تو ان کی تعداد بیس لاکھ ہونی چاہئے، لیکن پورے ملک میں علماء کی تعداد شاید دو لاکھ بھی نہ ہو، گویا مسلم آبادی میں ان کا تناسب ایک فی ہزار بھی نہیں، اس لئے یہ سمجھنا کہ دینی مدارس ضرورت سے زیادہ ہیں محض ناواقفیت کی بات ہے!

علامہ اقبالؒ ان لوگوں میں تھے، جن کو مشرق دیدہ اور مغرب رسیدہ کہا جاسکتا ہے، حکیم احمد شجاع نے اپنی کتاب ''خون بہا'' (۴۳۹/۱) میں اقبالؒ سے اپنی ایک دل چسپ گفتگو نقل کی

ہے، جوان لوگوں کے لئے یقیناً چشم کشا ہے، جوان دینی مدارس کے نظام کوفرسودہ اور Out of date) تصور کرتے ہیں، حکیم صاحب کا بیان ہے:

''لاہور میں آکر میں نے پاک پٹن شریف کے مسلمانوں کی نفسیاتی کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روداد ڈاکٹر محمد اقبال کو سنائی، وہ پہلے تو حسبِ عادت میری بات غور سے سنتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے، پھر آنکھیں بند کرکے سوچنے لگے، جب میں اپنی کہانی سنا چکا تو فرمایا: ''جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی، میں بھی وہی کچھ سوچتا تھا جوتم چاہتے ہو، انقلاب ایک ایسا انقلاب ہو جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذیب ومتمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کردے۔'' پھر علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمان کے بچوں کو انھیں مدرسوں میں پڑھنے دو'' اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ اب جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے، تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرا اور الحمراء اور باب الاخوتین کے نشانات کے سوا اسلام کے پیرؤوں اور اسلامی تہذیب کے اثر کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔''

اسلام کی حفاظت واشاعت

اور ملک وقوم کی تعمیر میں دینی مدارس کا حصہ☆

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید
المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ! امابعد

حضرات! اس ملک میں دینی مدارس کی ایک روشن تاریخ رہی ہے، ایک زمانہ وہ تھا جب اس ملک پر مسلمانوں کے اقتدار کا سورج چمک رہا تھا، ہر صبح جب آفتاب نکلتا تھا تو اس کی کرنیں اس امت کی خوش بختی اور سعادت نصیبی کے نغمے گاتی تھیں، مسلمان صرف اس ملک کی زمین اور اثاثہ واسباب کے ہی مالک نہیں تھے بلکہ انھوں نے لوگوں کے دل ودماغ کو بھی فتح کیا تھا، وہ اس ملک میں محبت کی بادنسیم، رحمت کی گھٹائے گھنگھور اور انسانیت کے علمبردار بن کر آئے، انھوں نے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کیا، انسانی مساوات وبرابری کا سبق دیا اور لوگوں کے دلوں پر اپنی محبت اور انسانیت نوازی کے نقوش جاوداں ثبت کردیئے، پھر اس ملک پر انگریز قابض ہوئے اور انھوں نے اپنے ہاتھ میں عنان اقتدار ہی لینے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اس بات کی بھی کوشش کی کہ ہندوستان پر مغربی تہذیب وثقافت کو مسلط کردیا جائے اور ایک ایسی نسل کو وجود بخشا جائے، جو رنگ وروپ میں تو ہندوستانی ہو، لیکن اس کا دل ودماغ اس سے چھین لیا گیا ہو۔

ان حالات میں کچھ زمانہ شناس اور دردمند علماء ومشائخ کو فکر ہوئی کہ اقتدار کا عروج

☆ یہ افتتاحی خطبہ ہے جو دینی مدارس بورڈ کے زیر اہتمام منعقد دینی مدارس کانفرس آندھرا پردیش، منعقدہ ۱۵ اپریل ۲۰۰۳ء، جامعہ انوار الھدیٰ حیدرآباد میں پڑھا گیا۔

وزوال ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی قوم کو مفر نہیں، لیکن ایسا نہ ہو کہ زر وزمین کے ساتھ دل و دماغ کا سودا ہو جائے اور مسلمان دین وایمان کی دولت سے بھی محروم ہو جائیں، اس لئے انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر تحریک مدارس کی بنیاد رکھی، سید الطائفہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ جو اپنے عہد کے متفق علیہ بزرگ تھے اور ہر حلقہ میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے اپنے خلفاء کو اس کی تحریک فرمائی، چنانچہ دیوبند میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے دارالعلوم دیوبند کی، دکن میں معروف صاحب علم اور روشن ضمیر بزرگ فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ فاروقیؒ نے جامعہ نظامیہ کی، ویلور میں ایک اور بزرگ نے مدرسہ باقیات الصالحات کی، بہار میں حضرت حاجی صاحب کے ہی ایک خلیفہ حضرت حاجی منور حسین صاحبؒ نے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کی بنیاد رکھی اور ایک ایسی تاریخی اور انقلاب انگیز تحریک وجود میں آئی، جو اسلام کی احیاء اور تجدید کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط اور مسلم حکومت کے خاتمہ (جس کا مکمل ظہور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ہوا) کے بعد اس تحریک کی بنیاد پڑی اور اس وقت سے آج تک اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے ملی تشخص کی حفاظت اور اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنہ کا مقابلہ کا سہرا اسی تحریک کے سر ہے، دینی مدارس کے اسی اہم کردار کی وضاحت کے لئے یہاں نمبروار چند نکات کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱- ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کیا کہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے لئے اگر پادری وہاں جانا چاہیں تو انھیں اجازت ہے، اس کے بعد ہی سے ہندوستان میں بڑی تعداد میں عیسائی پادری اور تبلیغی وفود کا آنا شروع ہوا، ۱۹۰۰ء تک ہندوستان میں عیسائیوں کے ۴۲ مشن اپنا قدم جما چکے تھے، ''پادری ای اینڈ مینڈ نے برسرعام دعوت دی تھی کہ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہئے، اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ'' (سیرت مولانا محمد علی مونگیری: ۴۱) انگریزوں کی کوشش تھی کہ ایسا نظام تعلیم مروج ہو، جو پادریوں کے لئے ان کی تبلیغی کوششوں میں معاون و

مددگار ثابت ہو، تا کہ ہندوستان میں بڑے پیمانہ پر لوگ عیسائیت کو قبول کریں، سر چارلس ٹریو یلین آئی سی ایس جو برطانوی کونسل کے ممبر تھے، ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا:

"میرا یقین ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے، اسی طرح یہاں بھی سب ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے، ملک میں مذہب عیسوی کی تعلیم بلاواسطہ کتابوں، اخباروں اور یورپینیوں سے بات چیت وغیرہ کے ذریعہ نفوذ کرے گی، حتیٰ کہ عیسوی علوم تمام سوسائٹی میں اثر کر جائیں گے، تب ہزاروں کی تعداد میں عیسائی ہوا کریں گے"۔ (تاریخ التعلیم از سید محمود، ص: ۶۹)

نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ عیسائی پادری اور مناد مسلمانوں اور ہندوؤں کو دعوت ارتداد و تبدیلی مذہب دیتے تھے، سر سید احمد خان مرحوم سے اپنی رواداری اور حکومت برطانیہ کے حق میں نرم روی کے باوجود یہ کیفیت برداشت نہ ہوسکی، انھوں نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں اس کیفیت پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ ان حالات میں اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے وہی لوگ اُٹھے، جو دینی مدارس سے متعلق یا ان کے پروردہ تھے، انھوں نے شہر سے دیہات تک گلی کوچوں میں جا کر مسلمانوں کو اس فتنہ سے باخبر کیا، عیسائی مشنریز سے مناظرے کئے اور مسلمانوں کو ان کے دام ہم رنگ زمین سے بچایا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا محمد علی مونگیری، حضرت نانوتوی اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

۲- ۱۸۳۵ء میں صوبہ پنجاب کے ایک قریہ قادیان میں مرزا غلام احمد نامی شخص پیدا ہوا یہ خاندان شروع سے انگریزوں کا لقمہ خوار تھا، ان کے بڑے بھائی غلام قادر کو جنرل نیکلسن نے ایک سند دی تھی۔ جس میں لکھا تھا کہ:

"۱۸۵۷ء میں خاندان قادیان ضلع گورداس پور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا"۔

یہ بات خود مرزا صاحب کے لڑکے مرزا محمود نے لکھی ہے۔ (سیرت حضرت مسیح موعود، ص:۶)

——انگریز چاہتے تھے کہ اس اُمت کی وحدت ٹوٹ کر رہ جائے اور مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ سرد پڑ جائے، اس کے لئے ان کو ایک ایسے شخص کی تلاش تھی، جو کسی عہدۂ غیبی کا مدعی ہو اور جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان کر سکے، چنانچہ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو اس کے لے کھڑا کیا، جس نے مختلف دعوے کرتے ہوئے ۱۹۰۱ء میں کھل کر نبوت کا دعویٰ کر دیا، وہ اپنے مسیح موعود ہونے کا بھی مدعی تھا اور اس نے جہاد کو منسوخ قرار دیا تھا، حکومت برطانیہ اس فتنہ کے پشت پر تھی، چنانچہ خود مرزا صاحب نے اپنے آپ کو انگریزوں کا خود کاشتہ پودا قرار دیا ہے۔

قادیانیت دراصل پیغمبر اسلام ﷺ کے خاتم نبوت ہونے کے خلاف بغاوت اور متوازی نبوت کا اعلان تھا، اگر یہ کہا جائے کہ عہد صدیقی کے مدعیان نبوت کے فتنے کے بعد مسلمانوں کے درمیان ایسا سخت کوئی اور مذہبی فتنہ پیدا نہیں ہوا تھا، تو بے جا نہیں ہوگا، اس کو ایک طرف انگریزوں کی طرف سے تائید وتقویت حاصل تھی، تو دوسری طرف بہت سے ہندو بھی اس کی پشت پر تھے، یہاں تک کہ جواہر لال نہرو نے بھی مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس ہندوستانی نبی پر ایمان لے آئیں، تا کہ ان کے اندر حب الوطنی پیدا ہو، مسلمان چوں کہ اس وقت مایوسی اور نا اُمیدی کے شکار تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی مدد کے لئے کسی غیبی طاقت کا ظہور ہو، اس لئے اچھے خاصے لوگ یا تو اس فتنہ سے متاثر ہو رہے تھے یا اس فتنہ کی سنگینی سے بے خبر تھے، یہاں تک کہ ابتداء میں علامہ اقبال جیسے بالغ نظر اور مخلص مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، تا آں کہ اس موضوع پر علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند سے ان کی گفتگو ہوئی اور پھر انھوں نے نہ صرف اس فتنہ کی سنگینی کو محسوس کیا بلکہ نہایت ہی قوت کے ساتھ اس کا تعاقب بھی کیا۔

اس فتنہ کی سنگینی اور اس کے مضر اثرات کو جن لوگوں نے پہلی نظر میں تاڑ لیا وہ علماء ہی تھے اور پھر علماء ہی نے نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا میں اس فتنہ کا پیچھا کیا، اس سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا انوار اللہ صاحب حیدر آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا محمد حسین بٹالویؒ، پیر کرم علی شاہ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مفتی محمد شفیع

صاحبؒ، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ختم نبوت کا یہ معرکہ ہمیشہ ان ہی دینی مدارس کے فرزندوں یا ان کے تربیت یافتہ افراد نے سر کیا اور آج بھی جہاں کہیں اس شجر خبیث کا سایہ پہنچتا ہے، یہی بوریہ نشین علماء ہیں، جو ان کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر ہوتے ہیں۔

۳ - برطانوی حکومت کو اصل عداوت مسلمانوں سے تھی، کیوں کہ انھوں نے مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے اقتدار کی زمام حاصل کی تھی اور اسی لئے فطری طور پر مسلمان جنگ آزادی میں زیادہ سرگرم عمل تھے، ہندو برادران وطن کے ساتھ ان کا رویہ نرم رہتا تھا، چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل میں آریہ سماجی تحریک نے بہت قوت حاصل کرلی، پنڈت دیانند سرسوتی نے ستیارتھ پرکاش، آریہ سماجی ہندو فکر کی تائید وتقویت کے لئے لکھی اور یوں تو اس میں سناتن دھرمی، عیسائی اور مسلمان سبھوں کو نشانہ بنایا، لیکن ان کا سب سے زیادہ ہدف مسلمان تھے، آریہ سماجیوں نے گاؤں شدھی تحریک یعنی مسلمانوں کو بقول ان کے سابقہ مذہب ہندو دھرم میں واپس لانے کی نہایت ہی گرم جوش کوششیں شروع کردیں، یہ مسلمانوں کو علانیہ مناظر اور مباحثہ کی دعوت دیا کرتے تھے۔ اس وقت ارتداد کی ایک لہر سی چل پڑی تھی اور بہت سے پسماندہ اور تعلیم سے محروم علاقے اس آگ کی لپیٹ میں آرہے تھے۔

اس وقت بھی دینی مدارس کے علماء اس فتنہ کے استیصال کے لئے کھڑے ہوئے، اسی نسبت سے میلۂ خداشناسی میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تقریروں اور مناظروں نے بڑی شہرت حاصل کی، جو لوگ اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے ان میں مولانا نوتوی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالصمد رحمانی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، آج یہ تاریخ کا ایک فراموش کردہ باب ہے، لیکن راجستھان کے حالات اس کی ایک معمولی سی جھلک ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس وقت علماء نے اس کے سد باب کی کوششیں نہیں کی ہوتیں، تو آج حالات کتنے خراب ہوتے۔

۴ - فتنۂ ارتداد کو روکنے کی ایک کوشش فقہی جہت سے بھی ہوئی ہے، مسلمان عورتیں قاضی شرع کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواری محسوس کرتی تھیں اور وہ مرد کے ظلم و

زیادتی کو روکنے اور دوسرا نکاح کرنے کے لئے کوئی حل نہیں پاتی تھیں، چنانچہ بعض عورتیں مرتد ہو جاتی تھیں، تاکہ ارتداد کی وجہ سے خود بخود ان کا نکاح ختم ہو جائے، اس صورت حال سے اس عہد کے علماء تڑپ اُٹھے اور انفساخ نکاح مسلم ایکٹ مرتب کیا اور اسے گورنمنٹ سے پاس کرایا، کہ عورتوں کے لئے فسخ نکاح کا جائز طریقہ کھلا رہے اور وہ ناجائز راستہ اختیار نہ کریں، یہی قانون اب تک عدالتوں میں مروج ہے۔ اس ایکٹ کے پیچھے جن لوگوں کا دماغ کام کر رہا تھا ان میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۵- آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی کثرت، ملازمت وتجارت کے مواقع سے محرومی نے مایوسی وناامیدی کی کیفیت کے ساتھ ایک صورت حال یہ پیدا کر دی ہے کہ پڑھے لکھے اور صاحب ثروت مسلمانوں نے دیہاتوں کو چھوڑ کر شہر کی پناہ لی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں دیہاتوں میں مسلمانوں میں مرعوبیت اور دین پر بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ حیدرآباد جیسے علمی، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے نمایاں شہر سے صرف پچاس اور سو کیلومیٹر پر جو دیہات واقع ہیں وہاں بھی بہت سے لوگ وہ ہیں جو کلمہ طیبہ پڑھنے سے بھی قاصر ہیں اور جن کی وضع قطع اور رہن سہن کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ یہ مسلمان ہیں۔

ایسے دور دراز علاقوں میں دینی مدارس کے فضلاء پہنچ کر دعوتی کام کر رہے ہیں اور ان کے لئے مکاتب قائم کر رہے ہیں، جو ان کی حفاظت کا واحد ذریعہ ہیں، اگر یہ کوششیں نہ ہوتیں تو لاکھوں مسلمان دولت ایمان سے محروم ہو چکے ہوتے اور اب بھی یہ کوششیں روک دی جائیں تو جہالت وناواقفیت کی وجہ سے دیہاتوں میں خدانخواستہ ارتداد کا سیلاب سا آجائے گا۔

۶- مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں ان کے لئے صرف دین کو مان لینا کافی نہیں، بلکہ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، اسی لئے مسلمانوں پر (خواہ وہ کسی ملک میں ہوں) اپنی عائلی اور سماجی زندگی میں شریعت اسلامی پر عمل کرنا ضروری ہے، مدارس نے ہمیشہ تحفظ شریعت کی جدوجہد میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، آزادی سے پہلے ۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور دوسرے اہل علم کی کوششوں سے شریعت

اپلی کیشن ایکٹ بنا، بدقسمتی سے آزادی کے بعد رہنما اُصول کی ایک دفعہ کے تحت یکساں سیول کوڈ کی گنجائش پیدا کی گئی اور آہستہ آہستہ مسلم پرسنل لاء کی تنسیخ کا مطالبہ کیا جانے لگا۔۱۹۷۲ء میں لے پالک کے مسئلہ کو لے کر اس مسئلہ نے شدت اختیار کر لی، اس وقت علماء ہی تھے جو تحفظ شریعت کی تحریک کو لے کر اُٹھے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔اس سلسلہ میں امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا مفتی برہان الحق صاحب، خلیفہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلویؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور مولانا ابواللیث اصلاحیؒ وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آج نہ صرف اُمتِ مسلمہ بلکہ حکومت کی نظر میں بھی اس بورڈ کا جو وزن محسوس کیا جاتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

۷- آزادی کے بعد اور آزادی سے پہلے ہندوستان میں جو اسلامی تحریکات اُٹھی ہیں اور جنھوں نے نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں، وہ یا تو ان ہی مدارس سے نکلنے والے علماء کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں اور نہیں تو کم سے کم مدارس سے ان کو خون جگر ضرور ملا ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مذہبی اور سماجی تحریک ایسی نہیں جو اس سے مستثنیٰ ہو، اس سلسلہ میں خاص طور پر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک دعوت وتبلیغ کا ذکر کروں گا، جو آج ایک عالمی تحریک بن چکی ہے، جو دور دراز علاقوں تک اسلام کی بنیادی تعلیمات کو پہنچانے کا نہایت اثر انگیز ذریعہ ہے اور جس سے لاکھوں لوگ توبہ و اصلاح کی دولت سے سرفراز ہو رہے ہیں، ایک بڑے صاحب نظر کے بقول مدارس کی حیثیت دراصل پاور ہاؤس کی ہے، جس سے ملت کے تمام کاموں کو غذا اور قوت حاصل ہوتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بلکہ عالمی سطح پر اسلامی ثقافت کو ختم کرنے اور مسلمانوں کو مغربی اور برہمنی تہذیب میں جذب کرنے کی کوششوں میں یہ دینی مدارس پوری قوت کے ساتھ حارج ہیں، اسی لئے مدارس کا وجود ان کے لئے بہت ہی گراں خاطر ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہندوستان میں مدارس کی تحریک قائم نہ ہوتی اور ترقی نہیں کرتی تو شاید ہندوستان ایشیاء کا اسپین بن جاتا، جہاں بلند و بالا، حسین وجمیل اور پرشکوہ عمارتوں کی صورت

میں مسلمانوں کے تہذیبی نقوش تو باقی رہتے لیکن اسلام کا نام ونشان باقی نہیں رہتا۔

یہ تو اسلام کی حفاظت وصیانت کا پہلو ہے، اب اس ملک کی تعمیر وترقی میں مدارس کا جو رول ہے، ایک نظر اس پر بھی ڈالنا چاہئے :

۱- بیسویں صدی کے آغاز سے جنگِ آزادی کی جو معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں، ان میں پیش پیش علماء رہے ہیں ۔ خلافت تحریک تو شروع ہی ہوئی علماء کی کوششوں سے، ترک موالات تحریک کے تن مردہ میں جان اس وقت پڑی جب حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اس پر ایک تفصیلی فتویٰ دیا اور اس تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کیا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا فضل حق خیر آبادیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد سجادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ وغیرہ یہ سب حضرات مدارس ہی سے تعلق رکھنے والے علماء تھے، جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے اس ملک کی آزادی کی تاریخ رقم کی ہے۔

۲- ملک کے آزاد ہونے کے بعد مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان کے حق میں ہموار کرنا اور ان کو ترکِ وطن اور نقل مکان سے روکنا بھی علماء کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

۳- مدارس نے ملک کی تعمیر میں جو نہایت اہم رول ادا کیا ہے، ان میں تعلیم کو عام کرنا، غریبوں اور دیہات کے پسماندہ لوگوں کو فری ایجوکیشن فراہم کرنا اور ایسے لوگوں تک علم کی روشنی پہنچانا جن کے لئے تمام درس گاہوں کے دروازے بند ہیں، نہایت اہم ہیں۔ انٹلی جینس بیورو کے مطابق اس وقت درج ذیل شعبوں میں مدارس اور طلباء کی تعداد اس طرح ہے :

صوبہ	مدارس	طلباء
آندھرا پردیش	۷۲۱	۷۲۵۲۸
آسام	۲۰۰۲	۲۰۰۰۰
دہلی	۱۱۶۱	۳۷۲۲
گجرات	۱۸۲۵	۲۰۰۰۰
جموں وکشمیر	۱۲۲	۱۰۵۱۵

کرناٹک	۹۶۱	۸۴۸۶۴
کیرالا	۹۹۷۵	۷۳۸۰۰۰
راجستھان	۱۷۸۰	۲۵۰۴
مدھیہ پردیش	۶۰۰۰	۴۰۰۰۰۰
مہاراشٹر	۲۴۳۵	۲۰۳۹۷
مغربی بنگال	۲۱۱۶	۹۰۰۰۰
مجموعہ	۲۹۰۹۸	۱۴۸۴۹۹۶

اس میں یوپی اور بہار کے مدارس اور طلباء کا ذکر نہیں ہے، جن کی تعداد یقینی طور پر دوسری ریاستوں سے زیادہ ہوگی، اس کے علاوہ ۲۱/ ریاستوں کے اعداد وشمار بھی نہیں ہے یہ تعداد بظاہر کافی مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے، شاید اس میں مکاتب اور صباحی ومسائی تعلیمی نظام کو بھی شامل کرلیا گیا ہے لیکن اس سے قطع نظر ان اعداد وشمار اور ان پر قیاس کرتے ہوئے جن صوبوں کے اعداد وشمار مذکور نہیں ہے، ان کے اعداد وشمار کو سامنے رکھا جائے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنی بڑی تعداد میں بچے اس نظام تعلیم سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور تعلیم اور خواندگی کو عام کرنے میں ان کا کتنا اہم حصہ ہے۔ ہندوستان میں خواندگی کی قومی شرح ۱۹۵۱ء میں ۱۸/۳۳ فیصد تھی۔ ۱۹۹۱ء میں یہ بڑھ کر ۵۲/۲۱ فیصد ہوگئی اور ۲۰۰۱ء کی مردم شماری میں قومی خواندگی کی شرح ۶۲ فیصد سے زیادہ ہو چکی ہے، حکومت کی جانب سے غالباً مسلمانوں کی علیحدہ شرح خواندگی دستیاب نہیں ہے لیکن بعض پرائیوٹ اداروں نے جو سروے کیا ہے ان کے مطابق مسلمانوں میں خواندگی کی شرح ۳۰ فیصد سے بھی کم ہے اور مسلم خواتین میں تو شرح خواندگی ۱۰ فیصد بھی نہیں، گویا اب بھی مجموعی اعتبار سے ۷۰ فیصد مسلمان اور ۹۰ فیصد مسلمان خواتین ناخواندہ ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں شرح خواندگی کا کیا حال ہے؟ ان حالات میں ان مدارس کے تعمیری رول کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

۴- معاشی پہلو سے بھی دیکھا جائے تو مدارس کا کردار نہایت اہم ہے، صورت حال یہ ہے کہ ملک میں بیروزگاری عام ہے، لاکھوں ڈاکٹرس اور انجینئرس بیروزگار ہیں، مسلمانوں

میں بیروزگاری تو ظاہر ہے اس سے بھی زیادہ ہے، مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کا موجودہ تناسب حسب ذیل ہے:

درجہ اول کی ملازمت :	۱/۶۱ فیصد
درجہ دوم کی ملازمت :	۳ فیصد
درجہ سوم کی ملازمت :	۴/۴۱ فیصد
درجہ چہارم کی ملازمت :	۵/۱۲ فیصد

ریاستوں میں بھی اس سے بہتر صورت حال نہیں ہے، بلکہ بعض صوبوں میں مرکز سے بھی زیادہ خراب حالات ہیں، اب اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ صرف گیارہ صوبوں میں حکومت کی رپورٹ کے مطابق ۲۹,۰۹۸/ مدارس ہیں، اگر ہر مدرسہ میں اوسطاً دس افراد کا اسٹاف مانا جائے تو ان کی تعداد ۲۹,۰۹۸۰/ ہوتی ہے، پھر اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں کم از کم پانچ لاکھ مسجدیں ہیں، ہر مسجد میں ایک امام اور ایک موذن کی ضرورت پیش آتی ہے، گویا مسجدیں دس لاکھ افراد کے لئے روزگار کا ذریعہ بھی ہیں، اس طرح گیارہ صوبوں کے مدارس اور ملک کے مساجد کے ذریعہ ۱۲۹۰۹۸۰/ افراد کو روزگار ملتا ہے، وہ تعداد اس کے علاوہ ہے جو ملک کی دیگر ریاستوں میں مدارس کی ہے، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کرنے میں بھی ان مدارس کا اہم حصہ ہے، یہ ضرور ہے کہ ان اداروں میں تنخواہیں کم ملتی ہیں اور مذہبی جذبہ کے تحت معمولی اُجرتوں پر لوگ کام کرتے ہیں، لیکن بہر حال یہ ایک بہت بڑی تعداد کے لئے روزگار کا ذریعہ ہیں۔

۵- اس وقت ملک میں بہت سی قوم دشمن تحریکیں سرگرم عمل ہیں، پورے ملک میں امن وقانون کی دھجیاں بکھیری جارہی ہیں، لوگوں کے مال واسباب پر منظم طور پر حملے کئے جاتے ہیں، بعض شدت پسند تنظیمیں وہ ہیں جن میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ بیروزگار نوجوان شامل ہیں، حکومت نے بار بار کوشش کی ہے کہ گفت وشنید کے ذریعہ انھیں پُرامن زندگی گذارنے پر آمادہ کیا جائے، لیکن اب تک اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، ایسی تحریکوں میں عصری درس گاہوں کے تو سینکڑوں افراد مل جائیں گے لیکن دینی مدارس کے طلباء

اور فضلاء کبھی بھی ایسی غیر قانونی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوئے، شاید ہی ایسی کوئی مثال ہو کہ اس حلقہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص پر اس قسم کے جرائم ثابت ہوئے ہوں، یہاں تک کہ جموں و کشمیر میں بھی مدارس اور علماء نے اپنے آپ کو تشدد آمیز جدوجہد سے دور رکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ مدارس ملک کو امن پسند اور قانون کے پابند شہری فراہم کرتے ہیں۔ پس نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے بلکہ قومی نقطۂ نظر سے بھی مدارس اور یہاں کے فضلاء کا نہایت عظیم الشان تعمیری رول رہا ہے۔

مدارس کے بارے میں چند غلط فہمیاں لوگوں کے ذہن میں ہیں، یا پیدا کی جاتی ہیں، ان پر بھی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنا ضروری ہے:

۱- ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مدارس اور ان سے متعلق علماء انگریزی زبان اور عصری علوم کے مخالف ہیں، اسی لئے مدارس میں ان مضامین کو داخل نصاب نہیں کیا جاتا ہے، یہ بات بالکل غلط ہے، کسی بھی قابل ذکر مستند عالم نے انگریزی زبان اور ان مضامین کی مخالفت نہیں کی ہے، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند و دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا ہے، جامعہ ملیہ کی بنیاد علماء ہی نے رکھی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے ہاتھوں اس کا افتتاح ہوا، تاریخ، فلسفہ، فلکیات وغیرہ شروع سے مدارس کے نصاب میں شامل ہیں، اس وقت اکثر مدارس میں پرائمری سطح کی تعلیم بڑی حد تک سرکاری نصاب کی رعایت کے ساتھ ہوتی ہے، عربی جماعتوں میں بھی متوسطات تک انگریزی پڑھائی جاتی ہے، تخصصات کے شعبوں میں انگریزی و عصری مضامین باضابطہ داخل نصاب ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے بشمول کئی اداروں میں فضلاء مدارس کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا گیا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان مدارس کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ ہے اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی حفاظت و صیانت، اس لئے ضروری ہے کہ مدارس میں بنیادی مضامین وہ ہوں جو طلباء کو ان مقاصد کی تکمیل کے لائق بناتے ہوں، اگر اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا تو نہ وہ دین کے کام کے باقی رہیں گے اور نہ دنیوی کام میں کوئی نمایاں خدمت انجام دے سکیں گے، مثلاً

اگر میڈیکل سائنس کے کسی طالب علم کو انجینئرنگ پڑھانے کی کوشش کی جائے تو نہ وہ کامیاب ڈاکٹر ہوسکے گا اور نہ کامیاب انجینئر، اس لئے مدارس کے فضلاء سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ماڈرن ایجوکیشن کو بھی اپنے اداروں میں نمایاں حیثیت دیں، ایک غیر ممکن اور نا قابل عمل مطالبہ ہے۔

مدارس میں عالم کورس کے لئے طلباء سے آٹھ سال کا وقت لیا جاتا ہے اور اس مدت میں ان کو حسب ذیل مضامین پڑھائے جاتے ہیں:

اسلامی علوم

- تفسیر قرآن
- حدیث شریف
- حدیث شریف
- اُصول حدیث
- کلام وعقیدہ
- فقہ اسلامی
- اُصول تفسیر
- علم فرائض (میراث)
- سیرت نبوی
- تاریخ اسلام

عربی زبان سے متعلق علوم

- نحو
- صرف
- فن معانی وبلاغت
- عربی ادب
- عربی انشاء

دیگر علوم

- منطق
- فلسفہ
- انگریزی
- حساب
- تاریخ ہند
- فارسی

اس طرح آٹھ سال کے عرصہ میں ۲۱/ مضامین اور ہر مضمون کی مختلف کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، بنظر انصاف غور کیا جائے کہ اگر دوسرے مضامین مناسب مقدار میں شریک نصاب کئے جائیں تو یہ کس قدر بوجھل ہو جائیں گے اور اپنے اصل مقصد کے اعتبار سے کتنے بے استعداد طلباء پڑھ کر نکلیں گے؟ مدت تعلیم میں اضافہ بھی دشوار ہے، کیوں کہ جو پسماندہ اور غریب طلباء اس لائن میں آتے ہیں وہ اتنی مدت کے بھی مشکل سے متحمل ہوتے ہیں، اگر پرائمری میں ان کی تعداد پچاس ہو تو دورۂ حدیث تک ان کی تعداد پانچ رہ جاتی ہے، اس لئے

ہم اپنے دانشور بھائیوں سے عرض کریں گے کہ وہ ٹھنڈے دل و ماغ کے ساتھ اور عملی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں۔

۲- کچھ لوگ مدارس کے فضلاء کے مسئلہ کو روزگار کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم سے ان کو باعزت روزگار نہیں مل سکے گا.......... اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ اولاً تو بیروزگاری اس قدر عام ہے اور اب پرائیوٹیشن نیز آدمی کا کام مشینوں سے لینے کی وجہ سے روزگار کے مواقع محدود تر ہوتے جارہے ہیں، اس لئے یہ مسئلہ صرف دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کا نہیں ہے، ہر طرح کی تعلیم حاصل کرنے والے اس مسئلہ سے دوچار ہیں، اگر ان میں تھوڑی سی ٹیکنیکل ایجوکیشن شامل کرلی جائے اور انھیں الیکٹریشن، کارپنٹری وغیرہ کے کام پر لگا دیا جائے تو اس سے دو نقصان ہوں گے، ایک تو سماج میں پیشہ کے لحاظ سے ان کی کوئی خاص وقعت باقی نہیں رہے گی اور ان کا جو مقصد ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاشرہ میں مؤقر حیثیت کے حامل ہوں، غور کیجئے کہ آپ مسجد کے امام کی بات جس عزت واحترام سے سنتے ہیں، آپ اپنے گھر میں کام کرنے والے الیکٹریشن اور پلمبر کی بات کو اس اہمیت کے ساتھ سن سکتے ہیں؟ شاید ایسا نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ دینی خدمت گزاروں کی تنخواہیں عام طور پر کم ہوتی ہیں اور وہ صبر وقناعت کے ساتھ اپنے آپ کو ایک مشن کا حصہ سمجھ کر کام کرتے رہتے ہیں، اگر وہ ان کاموں میں لگ جائیں تو ان مشاغل اور معاشی فوائد کے ساتھ خدمت دین کا کام کرنا بہت مشکل ہوگا، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہزاروں دیہاتوں میں علماء کی ضرورت ہے اور لوگوں کا مطالبہ ہے لیکن بہت سے فضلاء دیہاتوں کا رُخ نہیں کرتے، جب وہ اس طرح کے کام کرنے لگیں گے تو شہروں میں بھی دینی خدمت گزاروں کا مہیا ہونا مشکل ہوجائے گا۔

اس لئے مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم علماء کو خدمت دین کے کام سے ہٹا کر کسبِ معاش کی دوڑ میں لگادیں، بلکہ مسئلہ کا حل یہ ہے کہ قوم اور اُمت کا یہ مزاج بنائیں کہ وہ مدارس ومساجد اور دینی کاموں کو اپنی ضرورت سمجھیں، ملی کاز کے لئے زیادہ تعاون کریں اور دینی خدمت گزاروں کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کریں، اس سلسلہ میں عیسائی مشنریز کا

نظام اور مذہبی پیشواؤں کے ساتھ ان کا حسن سلوک بہترین مثال ہے ورنہ اگر علماء کو دنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح مادی اور معاشی دوڑ میں لگا کر اصل میدان کار سے ہٹا دیا گیا تو یہ ایسا نقصان ہوگا کہ جس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی، بلکہ یہ بالواسطہ طریقہ پر سنگھ پریوار اور یہودی لابی کے عزائم کو تقویت پہنچانے اور ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے مترادف ہوگا۔

۳- مدارس کے بارے میں ملکی اور عالمی سطح پر دہشت گردی کی بات کہی جارہی ہے، لیکن آج تک کم سے کم ہندوستان میں حکومت اور پریوار کی طرف سے اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکی، دوسری طرف آزادی کے بعد ہی سے فسادات کا سلسلہ جاری ہے۔ کئی بار گورنمنٹ کے مقرر کئے ہوئے کمیشن نے فسادات کے لئے سنگھ پریوار کے لوگوں کو ملزم ٹھہرایا ہے، گجرات کے فسادات کو سنگھ ہندو بیداری قرار دیتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک خوں آشام گروہ ہے جسے مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں کا خون پینے کی عادت ہوگئی ہے، سنگھ کے ودیا بھارتی اسکولوں کی تعداد اس وقت تیرہ ہزار ہے جن میں ۴۷ ہزار اساتذہ اور ساڑھے سترہ لاکھ طلباء ہیں، یہ سرسوتی اور شیشو مندر کے علاوہ ہیں، سنگھ پریوار نے ۱۹۹۳ء میں پروسینک سیوا پریشد قائم کی ہے جس میں سابق فوجیوں کے ذریعہ ساتویں سے نویں کلاس تک کے طلباء کو ملٹری ٹریننگ دی جاتی ہے، اس طرح تین رہائشی اسکول اس وقت ناگپور اور مہاراشٹر میں چل رہے ہیں اور نینی تال کا اسکول ان کے علاوہ ہے، ان کو جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، وہ مسلمانوں سے نفرت پر مبنی ہے، عجب بات ہے کہ حکومت کو سنگھ پریوار کے مدارس سے تو دہشت گردی اور تشدد کی بو نہیں آتی لیکن مدارس اسلامیہ جو امن وآشتی کا گہوارہ ہیں ان سے تشدد کی بو آتی ہے۔

مسلمانوں کے لئے لمحہ فکر یہ ہے کہ آخر اس ملک میں مسلمانوں نے اسکولس، کالجس، ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے بھی قائم کئے ہیں جو یقیناً ضروری ہے اور ابھی ان میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے، لیکن فرقہ پرست عناصر یا حکومت ان کے خلاف آواز نہیں اُٹھاتی اور نہ عالمی سطح پر اس کی مخالفت کی جاتی ہے، مگر یہ مدارس جو نہ حکومت سے اعانت کے طالب ہیں، نہ ملازمت کے خواستگار ہیں، یہاں تک کہ یہ بھی مطالبہ نہیں کرتے کہ ان کی سند کو مان لیا جائے، پھر بھی

ان کی شدت سے مخالفت کی جارہی ہے۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی؟ وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ سنگھ پریوار چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو اکثریتی ثقافت میں جذب کرلیا جائے، علمی سطح پر بھی اسلامی تہذیب وثقافت اعدائے اسلام کی آنکھوں میں چبھ رہی ہے، اس لئے امریکہ بھی تہذیبی تصادم کی بات کرتا ہے، اس تہذیبی انضمام وانجذاب کے معاملہ میں دینی مدارس طاقتور اور موثر رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، انھوں نے محسوس کرلیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی فکر کا اصل سرچشمہ اور ملی تشخص کی شہ رگ ہے۔ جب تک یہ باقی رہیں گے ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکے گا، اسی چیز نے مدارس کے خلاف نفرت اور پروپیگنڈہ کی مہم کو تیز کردیا ہے۔ افسوس کہ بہت سے مسلمان تو اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکے لیکن ان کے دشمنوں نے اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حضرات گرامی! یہ کنونشن اسی مقصد کے لئے بلایا گیا ہے ہم سب متحدہ طور پر مدارس کے معیار تعلیم وتربیت کو بہتر بنائیں اور ان کی حفاظت وصیانت کے لئے بنیان مرصوص بن کر کام کریں، وقت کی آواز اور نوشتہ دیوار ہے کہ ہم مسلک ومشرب، جماعتوں اور تنظیموں اور دوسرے فروعی اختلافات سے اوپر اُٹھ کر دوش بدوش اور قدم بہ قدم آگے بڑھیں کہ اسی میں ہمارا بقاء اور ہماری کامیابی ہے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

☆☆☆

دینی مدارس اسلام کی حفاظت گاہیں

دنیا میں ایسے بہت سے علاقے ہیں جہاں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا، بام عروج تک پہنچا اور پھر مائل بہ انحطاط ہوکر ڈوب گیا، ایشیاء اور یورپ میں متعدد ممالک ہیں جہاں یہ کیفیت پیش آئی اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہماری شامتِ اعمال اور کوتاہیوں کا نتیجہ ہے، عام طور پر جن ملکوں میں مسلمان ان حالات سے دوچار ہوئے وہاں اسلامی تہذیب کا چراغ یا تو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، یا اس کی لو ایسی مدھم ہوئی کہ وہ نہ ہونے کی درجہ میں ہے، وہاں لوگ اسلامی تعلیمات اور اپنے مذہبی تشخصات سے ایسے محروم ہوئے کہ ان کے دلوں سے احساس زیاں بھی جاتا رہا، انھوں نے کلی طور پر مادیت کے سامنے اپنی پیشانی خم کردی۔ اسپین، مغربی اور مشرقی یورپ کے بعض علاقے اور روس وچین کے مسلم اکثریت صوبے اس کی واضح مثال ہیں، اسپین تو اس کی بدترین مثال ہے، جو کسی زمانہ میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کا دارالخلافہ تھا اور عالم اسلام میں اس کی حیثیت کسی تاجِ گہر بار سے کم نہیں تھی، لیکن جب مسلمانوں کا تخت اقتدار پاش پاش ہوا تو اسلامی ثقافت کے تمام ہی نقوش نے وہاں سے رختِ سفر باندھا اور چند بے جان وبے روح عمارتوں کے سوا جو قصۂ ماضی پر نوحہ کناں تھیں، ان کی کوئی اور شناخت وہاں باقی نہیں رہی۔

ہندوستان کا معاملہ یقیناً اس سے مختلف ہے، یہاں یوں تو اسلام ابتدائی عہد میں ہی آچکا تھا اور تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور میں ہی ہندوستان کے ساحلی علاقوں تک اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی، لیکن اگر مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی تاریخ بھی دیکھی جائے تو ہندوسندھ کے علاقہ پر انھوں نے کم وبیش آٹھ سو سال حکومت کی ہے۔ اس عہد کو سماجی ارتقاء اور فلاحی اعتبار سے ہندوستان کا ''عہدِ زریں'' کہا جاسکتا ہے، افسوس کہ اتنی

طویل مدت میں مسلمانوں نے سیاسی اور عسکری مہم جوئی پر جتنی توجہ کی اسلام کی دعوت وتبلیغ پر اس کا عشر عشیر بھی توجہ نہیں کی ، ورنہ یقیناً اس ملک کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا اور اللہ کے بندے مسلمانوں کو اپنی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنا کر رکھتے ، بہر حال ! یہ مسلمانوں کی ایسی کوتاہی ہے کہ شاید ہی اس کا کوئی کفارہ ہو سکے اور آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں وہ اسی کوتاہی کی مکافات ہے۔

تاہم یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے تخت وتاج سے محروم ہونے کے باوجود اس ملک میں اپنی شناخت کو باقی رکھا ہے ؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اپنے مذہب سے جس درجہ کی وابستگی پائی جاتی ہے ، کوئی قوم نہیں جو اپنے مذہب سے اس درجہ وابستہ ہو ، اس گئی گذری حالت میں بھی مسجد کی آبادی اور رمضان المبارک کے اہتمام کو دیکھئے ، زکوۃ وانفاق اور کثیر صرفہ کے باوجود حج وعمرہ کی ادائے گی کو سامنے رکھئے اور نکاح وطلاق وغیرہ کے مسائل میں قانون شریعت کے احترام پر نظر کیجئے تو بہ مقابلہ مسلمانوں کے دوسری اقوام میں ایک فیصد بھی اس درجہ کا اہتمام نہیں ملے گا ، کسی اور قوم میں افتاء اور قضاء کے ادارے نہیں ہیں ، جہاں لوگ اپنے معاملات ، کاروبار اور نجی زندگی کے بارے میں بھی درست ونادرست اور حلال وحرام کی بابت استفسار کرتے ہوں ، یہ بہر حال بحیثیت قوم کے مسلمانوں ہی کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو اسلام سے مربوط رکھا ہے۔

ہندوستان اور دوسرے ممالک کے تئیں یہ فرق کیوں ہے؟ گذشتہ ایک صدی میں جو اسلامی تحریکات اٹھی ہیں اور تحریکی شخصیتوں نے جنم لیا ہے ، زیادہ تر ان کا منبع وسرچشمہ ہندوستان ہی ہے ، اس لئے یہ اہم سوال ہے جو سوچنے والوں کو متوجہ کرتا ہے۔ —— اگر غور کیا جائے اور حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے تو اس کا جواب ایک ہی ہے اور وہ ہے دینی مدارس کا نظام ! ہندوستان پر جوں ہی انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا اور اسلام کے خلاف سیاسی اور تبلیغی کوششیں شروع ہوئیں ، تخت وتاج سے بے نیاز اور حکومت واقتدار کی حرص سے آزاد دردمند اور بلند نگاہ علماء کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ صرف منفی کوششوں سے اس طوفان کا مقابلہ ممکن نہیں ، اب اسلام کی حفاظت وبقاء کے لئے مثبت تدبیر مطلوب ہے اور اس تدبیر کو

انھوں نے سرکاری مداخلت سے آزاد ایسے دینی تعلیم کے نظام کی صورت میں دریافت کیا جو غریب سے غریب مسلمانوں کے گھر میں بھی علم کی شمع جلا سکے اور ہر کچے گھر میں دینی تعلیم کی شعاعیں پہنچ سکیں۔

ہمارے بزرگوں نے مدارس کے اس نظام کونہایت ہی معمولی اور سادہ حالت میں رکھا، معمولی عمارتیں جو نگاہوں میں چھبتی نہیں، کم تنخواہیں پانے والے مدرسین و خدام جو سیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہوں، فقیرانہ لباس میں ملبوس طلبہ جن کا سراپا ان کی سادگی اور درویشی پر گواہ ہو، یہ ادارے مستقل اور قابل بھروسہ مالی وسائل سے محروم عام مسلمانوں سے دو دو چار چار پیسے کی مدد ہی ان کا توشۂ سفر، مدارس کی یہ سادگی ایسی تھی کہ لوگ اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہیں تھے اور سوچتے تھے کہ خس پوش جھونپڑیوں میں رہنے والے بوریہ نشیں اور دنیا کی لذتوں سے محروم اور نابلد لوگ کر ہی کیا سکتے ہیں؟ شعراء اور نئی روشنی کے لوگ تو ان کی تحقیر سے بھی نہیں چوکتے تھے اور ان کو ''تنگ نظر ملا'' اور ''دو رکعت کا امام'' جیسے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان ہی درویش مزاج ملاؤں نے اس ملک میں اسلام کے پودے کی حفاظت کی ہے۔ انھوں نے عہد بہار سے کوئی صلہ نہیں کمایا، لیکن عہد خزاں میں اپنے خونِ جگر سے سینچ کر اسلام کے شجر طوبیٰ کو بچایا، اسلامی تہذیب وثقافت کا تحفظ کیا اور مسلمانوں کا اپنے دین اور مذہب سے نہ صرف رشتہ باقی رکھا، بلکہ اس رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں اسلام سے وابستگی کی جڑیں جتنی گہری ہیں اور لوگوں کے مزاج میں جتنی زیادہ مذہبیت ہے، عالم اسلام میں بھی کم ہی اس کی مثالیں مل سکیں گی، اس عجمی نژاد ملک میں علوم اسلامی کی جو خدمت ہوئی ہے، اس کی مثال بہت سے عرب اور مسلم ممالک میں بھی نہیں مل پائے گی، حکومت ختم ہونے کے باوجود لوگوں کے دینی رجحان میں جو اضافہ ہوا ہے، اس میں بنیادی کردار مدارس ہی کا ہے۔ تقریباً گذشتہ ڈیڑھ صدی میں جو بھی تحریک یا جماعت اُٹھی ہے اور اسلام کی حفاظت یا اشاعت کا جو کچھ بھی کام ہوا ہے، اس میں ان مدارس اور مدارس سے پیدا ہونے والی شخصیتوں کا بڑا حصہ ہے، مدارس کی یہ اہمیت جو اس کی ظاہری خستہ سامانی اور سادگی کی وجہ سے محسوس نہیں کی جاتی تھی، اب دوست

اور دشمن سب اس کا احساس کرنے لگے ہیں۔

ہندوستان میں گذشتہ پچاس سال سے فرقہ پرستوں کی کوشش ہے کہ مسلمان فکری اور تہذیبی اعتبار سے اکثریت کے ساتھ ضم ہو جائیں، جس چیز کو آج ''ہندوتوا'' کہا جاتا ہے، اسی مقصد کے لئے ایک زمانہ میں ایسی سیاسی جماعتیں جو اپنے آپ کو سیکولر کہا کرتی تھیں، بار بار مسلمانوں کو قومی دھارے میں شامل ہو جانے کی تلقین کیا کرتی تھیں اور بھارتیہ کرن کا نعرہ لگاتی تھیں، اس دعوت کا مقصد بھی اصل میں یہی تھا کہ اب مسلمان اپنے مذہبی اور تہذیبی شناخت سے آزاد ہو جائیں اور دوسری قوموں کی طرح زیادہ سے زیادہ چند مذہبی رسوم کی ادائے گی پر اکتفاء کر لیں۔ ان نامسعود کوششوں کی ناکامی کا سہرا دینی مدارس کے سر جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ارباب اقتدار نے بھی محسوس کر لیا ہے، اس لئے دینی مدارس فرقہ پرست طاقتوں کا نشانہ ہیں، کبھی ان مدارس کو آئی ایس آئی کا مرکز قرار دیا جاتا ہے اور کبھی ان پر دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے، کبھی افغانستان کے طالبان سے ان کا رشتہ جوڑا جاتا ہے، یہ محض اپنے اندرونی عناد کو چھپانے کے لئے ایک بہانہ ہے، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

کسی طبقہ میں دہشت گردی پیدا ہونے کے عام طور پر تین اسباب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو ایسی تعلیم دی جائے جو دوسروں سے نفرت پر اُبھارتی ہو، دوسرے تعلیمی نصاب میں ایسی باتیں شامل نہ ہوں لیکن تربیت ان ہی خطوط پر کی جاتی ہو، تیسرے تعلیم و تربیت کے نظام میں تو ایسے محرکات نہ ہوں لیکن آدمی جس ماحول میں رہتا ہو ان میں جرائم اور دہشت گردی کا ماحول پایا جاتا ہو، جیسا کہ آج کل آر-ایس-ایس کا حال ہے، آر، ایس، ایس کے تعلیمی اداروں میں مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں کے تئیں نفرت انگیز مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ان کی تربیت بھی مار دھاڑ کے طریقے پر مشتمل ہوتی ہے اور ان کے شب و روز کا ماحول ہی دوسری اقلیت سے نفرت پر مبنی ہے۔ دینی مدارس کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، یہاں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ شروع سے اخیر تک انسانیت اور انسانی محبت پر مبنی ہیں، ان کا چوبیس گھنٹے کا تربیتی نظام ایثار اور تواضع کی عملی تصویر ہے، ان کے ماحول میں جرائم پیشہ عناصر کا گذر نہیں، اس لئے مدارس پر عمومی انداز سے دہشت گردی کا الزام لگانا

سفید جھوٹ سے کم نہیں۔

ہندوستان میں دہشت گردی کے ایک سے ایک واقعات پیش آچکے ہیں، گاندھی جی کا قتل ناحق ہو چکا ہے، پھر محترمہ اندرا گاندھی کا قتل ہوا، راجیو گاندھی قتل کیے گئے، بابری مسجد کی شہادت کا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا جس کو موجودہ صدر آر کے نارائنن نے گاندھی جی کے قتل کے بعد سب سے تکلیف دہ واقعہ قرار دیا، میرٹھ، بھاگلپور اور مختلف علاقوں میں خود محافظ دستہ کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کے واقعات پیش آئے، ۱۹۸۴ء میں علانیہ سکھوں کا قتل عام ہوا اور سینکڑوں سکھ لڑکیاں تک غائب کر دی گئیں، سورت میں بے شرمی کا ایسا کھیل کھیلا گیا کہ جس کے تصور سے بھی جبین حیا عرق آلود ہوتی ہے، یہی تو دہشت گردی کے واقعات ہیں، یہ واقعات کن لوگوں کے ہاتھوں پیش آئے، دینی مدارس کے اساتذہ اور طلباء کے ہاتھوں؟ یا مسلمانوں کے ہاتھوں؟؟ —— یہ محض مسلمانوں کو مرعوب کرنے، دینی مدارس کے تئیں غلط فہمیاں پھیلانے کا ایک حربہ اور بالواسطہ طریقہ پر مسلمانوں کو ان کی شناخت سے محروم کرنے کے طویل المدت پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان پورے شعور سے کام لیں، اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں اور اپنی ان دینی قلعوں کی حفاظت میں پہلے سے بڑھ کر فعال کردار ادا کریں۔

دینی مدارس

روشن نقوش، تابناک تاریخ

اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے تمام مسائل کا احاطہ کرتا ہے، انسان جن حالات سے دوچار ہوتا ہے، ان میں سے کوئی گوشہ نہیں، جس کو اسلام نے چھوڑا ہو، ایک ایسا مذہب جو عبادت اور زندگی کے چند رسوم اور طریقوں تک محدود نہ ہو، بلکہ پوری زندگی کو اس نے اپنے دائرے میں لے رکھا ہو، علم کی وسعت اور تحقیق و اجتہاد کے تسلسل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی لئے اسلام میں تمام ہی علوم اور خاص کر علم دین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر مسلمان پر علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے، (ابن ماجہ، حدیث: ۲۲۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص حصول علم کے لئے نکلے وہ جب تک واپس نہ آجائے اللہ کے راستے میں ہے، (ترمذی، حدیث: ۲۶۴۷) علم دین دوسروں تک پہنچانے اور خود حاصل کرنے کی آپ ﷺ نے اس کثرت سے ترغیب دی کہ عہدِ نبوی ہی میں مسجدِ نبوی میں علم کے مذاکرہ کی مجلس منعقد ہونے لگیں، ایک بار آپ ﷺ مسجد نبوی میں داخل ہوئے، تو کچھ لوگوں کو ذکر میں مشغول دیکھا اور کچھ لوگوں کو علمی مذاکرہ میں مشغول پایا، آپ ﷺ نے دونوں کی تحسین فرمائی، لیکن خود اپنے لئے علمی مذاکرہ کی مجلس منتخب فرمائی اور فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ نے ''دارِ ارقم'' کو تعلیم و ارشاد کا مرکز بنایا، جہاں آپ لوگوں کو قرآن پڑھاتے اور دین کی تعلیم دیتے (اخبار مکہ للازرقی: ۲۲۱/۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہیں آکر اسلام قبول کیا اور آپ سے تعلیم پائی، مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے

ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے ایک چبوترہ بھی تعمیر فرمایا جس پر معمولی سا چھپر بنا ہوا تھا، یہ طلبہ کی اقامتی درس گاہ تھی، جہاں دور دراز سے مسلمان آتے اور کسبِ فیض کرتے، اس کو ''صفہ'' کہا کرتے تھے، عام حالات میں اصحابِ صفہ کی تعداد ساٹھ، ستر ہوا کرتی تھی، جو گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم نے ان کی تعداد چار سو تک نقل کی ہے، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے اکابر علماءِ صحابہ اس درس گاہ کے تربیت یافتہ اور پرداختہ تھے۔

آپ ﷺ کی سعی رہتی تھی کہ ہر قبیلہ اور علاقہ میں دینی تعلیم کا نظم ہو، چنانچہ آپ ﷺ مختلف قبائل میں بھی معلم متعین فرمایا کرتے تھے، مدینہ تشریف آوری سے پہلے ہی آپ نے مسلمانانِ مدینہ کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، سیرت کی اکثر کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ فتح مکہ کے بعد وہاں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو معلم مقرر کیا، (طبقات ابن سعد : ۲/۳۴۸) بنوثقیف کی تعلیم و تربیت اور نماز کی امامت کے لئے حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا۔ (طبقات ابن سعد : ۵/۵۰۸) عمان کے لوگ مسلمان ہوئے، تو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت علاء حضرمی کو بھیجا، (طبقات ابن سعد : ۱/۳۵۱) یمن کے مسلمانوں نے معلم کی درخواست کی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو متعین فرمایا، آپ ان کے معلم و مربی بھی تھے اور قاضی و مفتی بھی۔ (مستدرک حاکم : ۳/۲۶۷)

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ دنیا کے کونہ کونہ میں پھیل گئے، اور وہاں تعلیم و تعلم کی محفلیں آراستہ کیں۔ مدینہ، مکہ، کوفہ، بصرہ، بغداد، شام اور مصر وہ خاص مقامات ہیں جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم کی بڑی تعداد فروکش ہوئی، لیکن عالم اسلام کا کوئی خطہ نہیں تھا جہاں ان برگزیدہ نفوس نے پہنچنے اور علم کا فیض جاری کرنے کی سعی نہ کی ہو، حالاں کہ ان حضرات کو ''مدینۃ النبی'' کا قیام زیادہ محبوب و مرغوب تھا، لیکن اسلام اور علومِ اسلامی کی اشاعت کے جذبہ نے ان کو دور دراز علاقوں تک پہنچایا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خود عجم کی سرزمین سے امام ابوحنیفہؒ جیسا فقیہ، امام بخاریؒ جیسا محدث اور حسن بصریؒ جیسا علومِ باطنی کا رمز آشنا پیدا ہوا۔

اسلامی علوم کا دامن بہت وسیع ہے، لیکن عہدِ نبوی سے آج تک ان علوم میں تسلسل

قائم ہے اور کبھی اس میں انقطاع نہیں پیدا ہوا، یہ دراصل اس پیشین گوئی کی تصدیق ہے جو آپ ﷺ نے فرمائی تھی کہ ہرنسل میں اس عہد کے معتبر افراد اس علم کا بار اُٹھائیں گے، جو اس دین میں کی جانے والی آمیزشوں اور باطل تاویلات سے دین کی حفاظت کریں گے۔ (مشکوٰۃ، حدیث نمبر: ۲۴۸)

مسلم سماج میں مساجد کا نظام ایک ایسا نظام ہے جس نے بنیادی دینی تعلیم کے نظام کو بہت آسان کر دیا ہے، ہر مسجد مدرسہ ہے اور امامِ مسجد معلم ومربی، ابتداءً زیادہ تر مدارس مساجد ہی میں ہوا کرتے تھے اور دین کی مبادیات کے سکھانے سے لے کر قرآن وحدیث اور فقہ وکلام کی اعلیٰ تعلیم تک کے مراکز یہی مسجدیں تھیں، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ کا درس زیادہ تر مسجدوں ہی میں ہوتا تھا، بہ تقاضۂ حالات رفتہ رفتہ مدرسوں کی مستقل عمارت بننے لگی، مؤرخین کا خیال ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد مدارس کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا، اور اہل نیساپور ہیں، جن کو سب سے پہلے ''مدرسہ بیہقیہ'' کے نام سے ایک دینی درس گاہ کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا، (کتاب الخطط والآثار: ۳۶۲/۲) اس کے بعد نیساپور میں کئی مدارس قائم ہوئے، پھر پانچویں صدی کے وسط میں وہ مشہور اسلامی جامعہ تعمیر ہوئی جو ''جامعہ نظامیہ بغداد'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔

اس زمانہ میں سلطان الپ ارسلان (متوفی: ۴۶۵ھ) بادشاہ تھا اور نظام الملک طوسی کاروبارِ حکومت میں ان کے معتمد خاص تھے، آج کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ وزیر اعظم تھے، نظام الملک کی ترغیب وتحریک پر بادشاہ نے مدارس کے قیام اور اساتذہ وطلبہ کے وظائف کی منظوری دے دی، چنانچہ نظام الملک نے بغداد، بلخ، نیساپور اور متعدد اہم شہروں میں مدارس کی تعمیر کا آغاز کیا، خود بغداد کے جامعہ نظامیہ کی تعمیر ذی الحجہ ۴۵۷ھ میں شروع ہوئی اور ۱۰/ ذی القعدہ ۴۵۹ھ میں اس کا باضابطہ افتتاح ہوا، مشہور شافعی فقیہ ابواسحاق شیرازی (متوفی: ۴۷۶ھ) جن کی کتاب ''المہذب'' جو فقہ شافعی کی مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے اور فقہ واُصولِ فقہ اور کلامِ رجال کے فنون میں متعدد معروف ومنقول کتابیں جن کے قلم فیض رقم کی رہینِ منت ہیں، وہ اس جامعہ کے استاذ رہے۔

خود ہمارے ملک ہندوستان میں مسلم عہدِ حکومت میں دینی مدارس بڑی تعداد میں قائم تھے، قش قلندی نے اپنی مشہور کتاب ''صبح الاعشٰی'' میں لکھا ہے کہ صرف دلی میں ایک ہزار مدارس تھے، جن میں ایک فقہ شافعی کا تھا اور باقی فقہ حنفی کا، (صبح الاعشی: ۶۹/۵) مشہور محقق مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے مغربی سیاح ہملٹن سے نقل کیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد میں صرف شہر ٹھٹھ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدارس قائم تھے، (نظام تعلیم وتربیت: ۱/۴۱۷) بیجاپور میں محمود گاواں نے جس درس گاہ کی تعمیر کی تھی اس کے ٹوٹے کھنڈرات سے آج بھی اس کی عظمت نمایاں ہے، بیجاپور کے سلاطین میں محمد عادل شاہ ایسا علم پرور بادشاہ تھا کہ اس نے مدرسہ کے طعام خانہ میں روزانہ طلبہ کے لئے بریانی کا نظم رکھا تھا اور ہر طالب علم کو اس کے علاوہ ایک ''ہون'' (اس زمانہ کا سکہ) بطور وظیفہ دیا جاتا تھا۔ (نظام تعلیم وتربیت: ۱/۴۱۹)

جب ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا سورج غروب ہوا، تو دین اور اُمت کے لئے گھلنے والے بزرگوں کو فکر ہوئی کہ کسی طرح اس ملک میں مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا سروسامان کیا جائے، اس مقصد کے لئے خوب سوچ سمجھ کر دینی مدارس کے قیام کی کوشش کی گئی اور شہر شہر، گاؤں گاؤں ان مدارس و مکاتب کا جال بچھایا گیا، اس سعی محمود اور جہد مسعود میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے خلفاء اور مجازین پیش پیش رہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی جو بلند پایہ عالم بھی تھے اور ہندومت، عیسائیت اور مذاہب باطلہ کے مقابلہ دندان شکن مناظر بھی اور عظیم سماجی مصلح بھی، انھوں نے ۱۸۶۲ء میں مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، جو از ہر ہند کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کے فیض کی شعاعیں دنیا کے کونہ کونہ کو روشن کر رہی ہیں، —— اسی دور میں ہندوستان کے جنوبی علاقہ میں فضیلت جنگ حضرت مولانا حافظ محمد انوار اللہ رحمۃ اللہ نے حیدرآباد میں جامعہ نظامیہ اور حضرت مولانا عبدالوہاب ویلوری نے ویلور میں مدرسہ باقیات صالحات کی بنیاد رکھی اور ان دونوں مدارس نے جنوبی ہند کو خوب خوب فیض یاب کیا، اسی طرح ہندوستان کے شمالی مشرقی علاقہ ''بہار'' میں حضرت مولانا حاجی منور حسینؒ نے ''مدرسہ امدادیہ'' دربھنگہ قائم فرمایا، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور علامہ ابراہیم بلیاویؒ جیسے محقق علماء اس مدرسہ کے طالب علم رہ چکے ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ

سبھی بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء اور تربیت یافتہ ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جاں گسل حالات کے باوجود آج اس ملک میں اس شان وبان کے ساتھ اسلام کا باقی رہنا دینی مدارس ہی کی دین ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور آج ملک کے گوشہ گوشہ میں مخلص اور دین دار مسلمانوں کے تعاون سے ایسی درس گاہیں چل رہی ہیں، یہ ہمارے لئے لال قلعہ سے زیادہ مضبوط، چار مینار سے زیادہ بلند اور تاج محل سے زیادہ خوب صورت میراث ہے۔!

☆☆☆

لڑکیوں کی دینی تعلیم

وقت کی ایک اہم ضرورت! ☆☆☆

خواتین انسانیت کا نصف حصہ ہیں، وہ نصف جس سے ماں کی ممتا، بیٹی اور بہن کی محبت اور بیوی کا سکون ملتا ہے، جو انسانیت کے لیے تسکین دل و جان ہے: ﴿ لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا ﴾ (الروم:۲۱) اور جو اس رنگا رنگ کائنات میں اصحابِ دل نگاہ اور اربابِ ایمان وصلاح کی نظر میں ''خیر متاع الدنیا'' کا مصداق ہے، شاید اسی حقیقت کی طرف اقبال مرحوم نے اشارہ کیا ہے کہ:

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

اگر عورت ایک طرف صنفِ نازک اور جنس لطیف ہے اور اس لیے شریعت نے اس کو بہت سے فرائض و واجبات سے بریٔ الذمہ اور ذمہ داریوں سے فارغ رکھا ہے، تو دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ فطرت نے اس کے اندر اثر انداز ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے، اسی لیے عورت جو سماج کا جذام اور معاشرہ کا ایک عضونا کارہ سمجھی جاتی تھی، اسلام نے اس کو سماج میں بلند مقام دیا، اس کی صلاحیتوں کو سماج کی تعمیر میں صرف کرنے کی راہ نکالی، اس کے لیے فعال ومؤثر کردار فراہم کیا اور اس نے عورت کے وجود کو ''مستقل حیثیت'' دی۔ (نسائی:۱۲۴)

اس نے عورت کو اظہارِ رائے کی ایسی آزادی عطا کی کہ ایک معمولی خاتون خلیفۂ وقت کا برسر عام محاسبہ کر سکتی تھی، (تفسیر ابن کثیر:۱/ ۶۷-۴۶۶) اس نے عورت کے لیے تعلیم کا راستہ

☆☆☆ یہ کلیدی خطبہ ہے جو ملی کونسل کے خصوصی اجلاس بابت مدارس اسلامیہ منعقدہ دہلی میں پیش کیا گیا۔

کھولا اور خود پیغمبر اسلام ﷺ نے ہفتہ میں ایک دن اور مقام ان کے لیے متعین فرمادیا، جہاں وہ جمع ہوتیں اور آپ ﷺ ان کو دین کی تعلیم دیا کرتے۔ (بخاری ومسلم عن ابی سعید الخدری ؓ) باوجود کہ عورتوں کے لیے ایسے مقام پر جانا شریعت میں عمومی طور پر پسند نہیں کیا جاتا جہاں لوگوں کا اجتماع ہو، مگر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مواقع پر آپ ﷺ نے خواتین کو عیدگاہ میں جمع ہونے کا حکم فرمایا، تاکہ وہ بھی آپ ﷺ کی تعلیمات سے مستفید ہوسکیں۔ (بخاری ومسلم، عن ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) اور خود صحابیات میں طلبِ علم کی ایسی چنگاری آپ ﷺ نے سلگادی تھی کہ وہ اس میں حیاء کو بھی حجاب نہ بننے دیتی تھیں، اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خواتین انصار کی تعریف کی کہ ''خواتین انصار بہترین عورتیں ہیں کہ حیاء کو دین کے سمجھنے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتیں'' (بخاری، کتاب العلم)

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف آپ ﷺ کی توجہ خاص کا یہ حال تھا کہ باندیوں تک کو علم سے آراستہ کرنے کی ترغیب دی اور فرمایا:

''جو اپنی باندی کی بہتر تربیت کرے اور اچھی تعلیم دے، پھر اسے آزاد کردے اور اس سے نکاح کرلے، اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ (بخاری، عن ابی بردہ ؓ)

حضرت ابو وائل ؓ کی ایک روایت میں بیٹی کی تربیت کرنے کی صراحت موجود ہے۔ (مجمع الزوائد: ۸/ ۱۵۸)

اس ترغیب نے قرنِ اوّل ہی میں خواتین میں ایک تعلیمی انقلاب پیدا کردیا، علومِ اسلامی میں سب سے اہم فن حدیث کا ہے، حدیثیں جن لوگوں سے ایک ہزار سے زیادہ مروی ہیں وہ مکثرین کہلاتے ہیں، علامہ سخاویؒ کی تحقیق کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی احادیث کی تعداد (۲۲۱۰) اور مکثرین میں دوسرا نام انہیں ام المؤمنین کا ہے، تفسیر میں جن صحابہ کو ید طولیٰ حاصل تھا، ان میں ایک اہم نام حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بھی ہے، جنہوں نے بعض اکابر صحابہ پر علمی گرفت فرمائی ہے اور اساطین اُمت نے ام المؤمنین کی گرفت کو قبول کیا ہے۔

فقہ وافتاء میں ابن قیمؒ نے کثرت وقلت کے لحاظ سے جو تین درجات قائم کیے ہیں،

ان میں اوّل درجہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، دوسرے درجہ میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور تیسرے درجہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ام عطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت ام شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت خولہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ام درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت جویریہ، رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عاتکہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت لیلی بنت قائم رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ام ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اسماء گرامی موجود ہیں۔ (اعلاء السنن: ۱/۹-۱۱) بلکہ سیدنا حضرت عمر ﷺ نے فوجیوں کے لیے گھر سے باہر رہنے کی جو مدت مقرر کی اس میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی رائے پر فیصلہ کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں سے متعلق مسائل میں خواتین اہل افتاء کی رائے کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔

کتابت سے مکہ میں بہت کم لوگ واقف تھے، اہل تاریخ نے ۹، ۱۳، اور ۳۰ کے اعداد بتائے ہیں جو تحریر سے واقف تھے، لیکن عہد رسالت مین نہ صرف مرد بلکہ عورتوں میں بھی کتابت کا ذوق پیدا ہوا، حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کتابت سیکھی۔ (ابو داؤد، عن شفاء) اسماء بنت مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عطر فروخت کرتی تھیں اور اُدھار رقم کا کھاتہ لکھ لیا کرتی تھیں، (طبقات ابن سعد: ۸/۲۱۲) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا شاید کتابت سے واقف نہ تھیں، لیکن تحریریں پڑھتی تھیں، چنانچہ انہوں نے اپنے غلام ابو یونس سے قرآن کے نسخہ کی کتابت کرائی تھیں۔ (مؤطاً امام مالک عن ابی یونس)

حفظِ قرآن مجید کا ذوق بھی خواتین میں عام تھا، ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں ملتا ہے کہ وہ باضابطہ حافظہ تھیں، علوم اسلامی سے اس دلچسپی نے صحابیات میں ادبی ذوق اور زبان شناسی بھی پیدا کی، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جامع الصفات ذات اس باب میں بھی ممتاز تھی، ان کے بعض شاگردوں کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ فصیح نہیں دیکھا۔ (ترمذی عن موسی بن طلحہ) خود حضور ﷺ کے سراپا کا حضرت امّ معبد نے جو لطیف اور حقیقت ترجمان

کھینچا ہے۔ (سیرت ابن ہشام:۲/۵۵) وہ ادب عربی کا ایک نمونہ ہے، خواتین صرف تعلیم حاصل ہی نہیں کرتی تھیں، بلکہ علوم اسلامی کی امانتِ عظمیٰ دوسروں تک بھی پہنچاتی تھیں، صرف مسند احمد ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دوشاگردوں کا ذکر موجود ہے۔

(سیرت ابن ہشام:ص:۲۶)

علاوہ دینی علوم کے عورتوں کے حسب حیثیت دوسرے ضروری علوم کی بھی قدرافزائی کی جاتی تھی، چرخہ کاتنے کی آپ ﷺ نے خود ترغیب دی ہے، حضرت امّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خنجر بناتی تھیں، (مسلم عن انس) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ ذاتی صنعت وکاریگری اور اس کی کمائی سے اپنے علاوہ شوہر اور بال بچوں کی کفالت کرتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۲۱۲/۸) حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا پکوان ممتاز تھا، شوہر کے پیسے صحیح طور خرچ کرنے اور بچوں کی نگہداشت پر توجہ دینے کی خود آپ ﷺ نے خواتین کو ترغیب دی ہے، یہ گویا امور خانہ داری کی تعلیم وتربیت کی اساس تھی، طب وعلاج سے بھی خواتین دلچسپی لیتی تھیں، غزوات میں خواتین نے مجاہدین کی مرہم پٹی کی ہے، ہشام بن عروہؒ کا بیان ہے کہ میں نے کسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بڑھ کر ماہر طب نہیں پایا، خود حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی ان طبی معلومات کی بابت فرمایا کہ جب آپ ﷺ بیمار رہتے تو اطباء عرب آتے تھے، میں ان کے نسخے یاد کرلیتی تھی۔ (مسند احمد:۶/۶۷)

اور یہ کچھ عہد رسالت ہی پر موقوف نہیں، بعد کے ادوار میں بھی خواتین اسلام میں اہل فضل کی ایک طویل فہرست ملتی ہے، ابن قیمؒ نے عہد اسلام کی افاضل روزگار خواتین کا ذکر کیا ہے، جن میں چند ہی صحابیات ہیں، باقی بعد کی ہیں، ان میں بشر حافی کی بہن سخہ جیسی متورع خاتون بھی ہیں، جو امام احمد سے دریافت کرتی ہیں کہ میں چراغ میں بھی سوت کاتتی ہوں اور چاندنی کی روشنی میں بھی، تو کیا مجھے فروخت کرتے ہوئے ان دونوں کی بابت فرق بھی واضح کردینا ضروری ہے؟ حفصہ بنت سیرین جیسی یگانۂ روزگار محدثہ بھی ہیں، جن کو بجا طور پر اہل زمانہ ابن سیرین کا علمی جانشین تصور کرتے تھے، امۃ الواحد سکینہؒ بھی ہیں دارقطنیؒ جیسے محدث جن کے تلامذہ میں تھے اور ان کے احسان شناس خاص اور فضل وعلم کے معترف تھے، اور جو بہ

قول ابن جوزی ''احفظ الناس للفقه علی مذهب الشافعی'' تھیں، (کتاب احکام النساء باب ۱۱۰) عمر رضا کحالہ جیسے صاحبِ نظر فاضل نے خواتین اسلام وعرب کی جو موسوعہ تیار کی ہے، وہ چوبیس سو سے زیادہ فاضل وممتاز خواتین کے ذکر سے مزین ہے، یہ سب کچھ اسی نبی ﷺ امی کا فیض ہے، جس نے عرب کی جہالت کی زمین میں علم کا صور پھونکا اور علم ونظر کو ایسی جاودانی بخشی کہ انسانیت کا کوئی طبقہ اس کے فیض عالم سے محروم نہ رہا۔

آپ ﷺ کا دورِ نبوت علم کا دور ہے اور یہ جوں جوں آگے سفر کرتا جائے گا، علم کی نئی نئی راہیں کھلتی جائیں گی اور علم کی اشاعت وابلاغ کے نت نئے وسائل وذرائع پیدا ہوتے جائیں گے، اس دور نے خواتین میں حصول علم کی ایک نئی لہر پیدا کی ہے اور چوں کہ علماء وزعماء پے بہ پے پیش آنے والے واقعات کی گرہ کشائی میں اس طرف توجہ نہ کر سکے، اس لیے جن مسلم گھرانوں نے خواتین کی تعلیم کی موجودہ تحریک میں حصہ لیا، ان کے لیے مخلوط وآزادانہ فضا کی درسگاہوں کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، گو ادھر ایک دو دہائی سے اب لڑکیوں کے علاحدہ اسکول قائم ہوئے ہیں، لیکن تربیت اور ذہن سازی کی کیفیت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے، اس نے خواتین کی ایک ایسی نسل تیار کر دی ہے جو مغرب کے نعرۂ آزادی کو مسحور، مغربی تہذیب کی اسیر اور اسلامی تعلیم اور مشرقی اخلاق واقدار کے احساس سے عاری ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم سماج کا مضبوط حصار آڑے نہ آئے تو اس سماج میں بہت سی ''تسلیمہ نسرین'' منظر عام پر آجائیں ان حالات میں لڑکیوں کی دینی تعلیم وتربیت پر غور اور علمی اقدام غالبًا اسی قدر ضروری ہے، جتنا ضروری اپنے زمانہ میں لڑکوں کی درسگاہوں کا قیام تھا، اس لیے لڑکیوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ وقت کی اہم اور اوّلین ضرورت ہے۔

☆☆☆

یہ بھی ایک سازش ہے!

جس دین کے ہم حامل ہیں، یہ ہم تک واسطوں سے پہنچا ہے، ایسا نہیں ہوا کہ ہر شخص پر براہ راست اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام نازل کئے ہوں؛ بلکہ فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اللہ کے پیغمبروں تک پہنچی، پھر انبیاء نے خدا کا پیغام اپنے رفقاء کو سنایا، رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دین حق کا آخری مکمل اور بے آمیز ایڈیشن انسانیت کو ملا، سب سے پہلے اس امانت کا بوجھ صحابہ ؓ کی برگزیدہ جماعت نے اُٹھایا، یہ ایسے پاکباز، ایثار پیشہ اور بے نفس لوگ تھے، کہ کسی اور نبی کے حصہ میں ایسے رفقاء میسر نہ آئے، اور اس میں مبالغہ نہیں کہ انبیاء کے سواء چشم فلک نے ان کی نظیر نہیں دیکھی، پھر ہر عہد کے بہتر لوگ اس امانت نبوی کے حامل اور امین بنتے رہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر نسل کے بہتر لوگ اس بارِ امانت کے حامل بنیں گے، (مشکوۃ:۱/۳۶، باب العلم) چوں کہ یہ آخری دین ہے ، اور اسے قیامت تک انسان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے، اس لئے من جانب اللہ اس کا نظم ہوتا رہا، کہ ہمیشہ اُمت میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں، جو ایک طرف علم وفضل کے اوجِ کمال پر تھیں اور دوسری طرف ورع وتقویٰ اور خشیتِ الٰہی میں بھی وہ اپنے اہل زمانہ پر فوقیت رکھتی تھیں، یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ ہر صدی میں ایسا شخص یا ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہیں گے، جو اہل باطل کی تاویلات اور آمیزشوں سے دین کی حفاظت فرمائیں گے، (ابوداود:۲/۵۸۹، باب مایذکر فی قرن) چنانچہ محدثین، فقہاء اور ائمۂ متبوعین اور ہر عہد کے مصلحین یقیناً اس پیشین گوئی کے مصداق ہیں، اور ہر دور کے دین کے مزاج شناس علماء اس میراث کے حامل رہے ہیں۔

ان واسطوں پر اعتبار و اعتماد ضروری ہے، اگر ان پر اعتماد ختم ہو جائے اور مسلمانوں کی نظر میں ان کی عظمت باقی نہ رہے تو یقیناً اس دین کا اعتبار و استناد بھی مجروح ہوگا، جو ان واسطوں سے ہم تک پہنچا ہے، اسی لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام جو وحی لے کر آتے تھے، قرآن نے خاص طور پر ان کی امانت و دیانت کی گواہی دی، ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ '' (.....؟)، رسول اللہ ﷺ کی صرف اتباع و پیروی ہی کو کافی قرار نہیں دیا گیا؛ بلکہ آپ کی محبت بھی شرط ایمان ٹھہری، اور آپ ﷺ کی تعظیم بھی واجب قرار دی گئی، شخصیت کی عظمت اس کا احترام اور اس پر مکمل اعتماد و اعتبار نہ ہو تو اس کی کامل اطاعت اور مکمل پیروی بھی نہیں ہوسکتی۔

جو لوگ اسلام پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، اور براہ راست اسلام پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں پاتے، وہ ان واسطوں کو مجروح کرتے ہیں، جن واسطوں سے لوگوں تک دین پہنچا ہے، یا پہنچ رہا ہے، ایسے عناصر محسوس کرتے ہیں کہ اگر قرآن کے خلاف کوئی بات کہی جائے، مسلمان اسے ہرگز برداشت نہیں کریں گے، مسلمان جیسا کچھ بھی ہو، رسول اللہ ﷺ کی محبت میں اپنی رگ گلو کٹالے گا، لیکن آپ ﷺ کی ادنیٰ بے احترامی کو برداشت نہیں کرے گا، اس لئے معاندین اسلام نے دین کے دوسرے واسطوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے، بعضوں نے حدیث کے دلیل و حجت ہونے کا انکار کیا، کیوں کہ اگر حدیثیں ہی نامعتبر ٹھہریں، تو دین کے نام پر بد دینی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی، اور قرآن کی من مانی اور من چاہی تفسیر کا راستہ کھل جائے گا، کچھ لوگوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شخصیت کو مجروح کرنے کی ناروا کوشش کی؛ کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تو دین کے حامل اول ہیں، اگر وہی نامعتبر ٹھہریں گے تو اس دین پر کیا اعتبار باقی رہے گا؟ کچھ لوگوں نے فقہاء سلف پر طعن و تشنیع کی زبان کھولی، اور کوشش کی کہ اُمت میں وہ ناقابل اعتماد، کم فہم، اور اجتہاد و استنباط میں کوتاہ کار اور کوتاہ فکر سمجھے جائیں؛ کیوں کہ فقہ فقہاء کی کوئی طبع زاد چیز نہیں ہے؛ بلکہ یہ کتاب و سنت کا نچوڑ ہے، جس میں اللہ اور اس کے رسول کے مقصد و منشاء کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے مرتب کر دیا گیا ہے، اور اس طرح عام لوگوں کے لئے دین تک رسائی اور دین پر عمل آسان ہو گیا ہے، گویا یہ کتاب و سنت کے مقصد و منشا کے ترجمان اور اس کے بے آمیز شارح ہیں، اگر ان پر اعتماد ختم ہو جائے، اور ان کے

اجتہادات یکسر قابل رد قرار پائیں تو پھر ہر شخص کے لئے کتاب وسنت کی حسبِ خواہش تشریح و توضیح کا موقع نکل آئے گا، اور دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا۔

اب اس وقت عالمی سطح پر اس بات کی کوشش کی جارہی ہے، کہ علماء کو مجروح کیا جائے، ان کو نکما، کم فہم، اُمت کے لئے بوجھ، جذباتی اور مشتعل مزاج، نیز شدت پسند ثابت کیا جائے، تمام جنوبی قوتیں اسی پر متفق ہیں، بلکہ اس مہم کے لئے ایک دوسرے کا بھرپور تعاون کررہا ہے، دینی مدارس پر جو اعتراضات کئے جارہے ہیں، اور ان کو ہدف طعن بنایا جارہا ہے، یہ اسی ناروا کوشش کا ایک حصہ ہے، اور اب طالبان کی آڑ میں اس موضوع کو اور بھی ہوا دی جارہی ہے۔

اعداء اسلام کی طرف سے مدارس، اور علماء کے خلاف یہ مہم جوئی خود اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی عقیدہ، اسلامی ثقافت اور اسلامی تشخصات کی حفاظت اور مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے میں اس طبقہ کا کتنا بڑا حصہ ہے، جو آج دشمنوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ کھٹک رہا ہے، اور وہ یہ محسوس کررہے ہیں کہ جب تک یہ درویش صفت اور مادی وسائل کے اعتبار سے خستہ حال لیکن اسلام کے لئے ہر طرح کی قربانی پر آمادہ وتیار گروہ باقی رہے گا، ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے عقیدہ وایمان کو اغوا کیا جاسکے، اور انھیں مغربی یا زعفرانی تہذیب میں جذب کیا جاسکے، یا ایسا سخت جان گروہ ہے کہ اسے بیگانے بھی برا کہتے ہیں، اور جو اپنے ہیں، وہ بھی اس پر تحقیر وملامت کا تیر پھینکنے سے نہیں چوکتے، بے گھر، یا خستہ حال گھر کے مالک، بہت سے اسبابِ عیش جو آج زندگی کی ضرورت کہلاتی ہیں، ان کے کام تو کیا، نام سے بھی نابلد، جہاں دو چار گھر مسلمان موجود ہوں، خواہ سڑکیں نہ ہوں، بجلی نہ ہو، اور دوسری سہولتیں بھی نہ ہوں، مسجد کے چبوترے پر بوریہ بچھائے وہیں فروکش، خاموش اور غیر محسوس طریقہ پر کام میں مصروف، لیکن؛ آہستہ آہستہ اس کی تعلیم اور اس کی صحبت سے پوری آبادی کا رنگ ڈھنگ بدل جاتا ہے، عقیدہ کی اصلاح ہوتی ہے، لوگ فسق اور گناہ سے توبہ کرتے ہیں، چھوٹے چھوٹے بچے اسلامی وضع کا نمونہ بن جاتے ہیں، جو بوڑھی پیشانیاں سجدہ کی لذت سے ناآشنا تھیں، وہی اتباعِ سنت کا مظہر بن جاتی ہیں، ان کے ذریعہ نہایت خاموش، ٹھوس، دوررس اور وسیع الاثر انقلاب پورے سماج میں آتا ہے، اور آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر تک کی سطح پر ایک ایسا

انقلاب رونما ہوتا ہے، کہ چند سال پہلے تک اس کا تصور بھی دشوار تھا، یہی وہ حقیقت ہے جو اسلامی تشخصات سے بیر رکھنے والوں کی آنکھوں میں چبھتی ہے۔

روس میں جب کمیونسٹ انقلاب آیا تو اس کی ابتداء اسی طرح ہوئی کہ علماء کے خلاف بہتان باندھے گئے، بدگمانیاں پھیلائی گئیں، ان کے بارے میں بے سروپا باتیں مشتہر کی گئیں، اور عوام اور علماء کے درمیان ایک خلیج پیدا کردی گئی، یہ خلیج اتنی بڑھی کہ مریدوں نے اپنے پیر اور مصلیوں نے اپنے امام کے کام خود تمام کئے، اس کے بعد دشمنانِ دین کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، اور انھوں نے بہت آسانی سے دلوں میں الحاد و دہریت کی تخم بودی، اور اس طرح وہ اشتراکی انقلاب رونما ہوا، جس کی خونچکاں داستان اہل نظر کی نظر سے مخفی نہیں، اب عالمی سطح پر اسی تجربہ کو دہرانے کی کوشش کی جارہی ہے، اور چوں کہ ہندوستان مدارس کا مرکز اور علم دین کا سرچشمہ ومنبع بنا ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی ایسی سعی نامسعود جاری و ساری ہے۔

غیروں کی عیاری اور اپنوں کی سادگی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بہ ظاہر زمانہ آگاہ لوگ بھی بے تکلف اس سازش کا شکار بن جاتے ہیں، اور وہ بھی ان مدارس کے خدام اور ان کے فضلاء کو اپنی کم نگاہی کی وجہ سے کم نگاہی سے دیکھنے لگتے ہیں، مولویوں پر اعتراض بہت سے لوگوں نے کئے، گویا پیدائشی حق ہے، مگر یاد رکھنا چاہئے کہ علماء کے اعتماد کو مجروح کرنا دراصل دین کو مجروح کرنے کے مترادف ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بہت سی کمزوریاں اس طبقہ میں ہوسکتی ہیں، ممکن ہے کسی خاص مدرسہ سے آپ کی شکایت بجا ہو، ہوسکتا ہے کہ کسی خاص عالم پر آپ کی خفگی برحق ہو، لیکن اس شخصی اور جزوی کوتاہی کو پورے طبقۂ علماء اور مدارس سے بدگمانی کا ذریعہ بنانا یہ اپنے گھر کو آپ آگ لگانے کے ہم معنی ہے، دیکھنا یہ چاہئے کہ بہ حیثیت مجموعی اس گروہ سے کیا نفع پہنچ رہا ہے؟ تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ!

اگر ہندوستان میں یہ مدارس اور ان کے فضلاء نہیں ہوتے تو
مسلم حکومت کے زوال کے بعد سے آج تک ہم کس حشر میں
ہوتے، ہمارے نام اور کام میں کہیں اسلام کا ادنیٰ سا رنگ بھی

> ہوتا؟ ہمیں حلال وحرام کے بنیادی مسائل کی رہنمائی بھی کسی سے حاصل ہوسکتی؟ اور ہمیں فکری وتہذیبی ارتداد سے بچنے کا کوئی سامان مہیا ہوتا؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے، مسلمان اس ملک میں خون کے دریاؤں سے تیر کر باہر نکلے ہیں، انھوں نے ظلم وجور کا برہنہ رقص نہ جانے کتنی بار دیکھا ہے، معیشت کے نقصان اُٹھائے ہیں، تعلیم میں پسماندگی کو سہا ہے، گاہے اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کو تڑپتے ہوئے اور اپنی عزت وآبرو کو سرِ بازار نیلام ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے، ان پر تحریص کے ہتھیار بھی آزمائے گئے ہیں، اور مال وجائداد سے لے کر عزت وجاہ اور کرسی واقتدار کی طمع بھی انھیں دلائی گئی ہے، کہ وہ دین کی حبل متین کو چھوڑ دیں؛ لیکن یہ سارے ہتھیار کیوں ناکام ہوئے، اور غارت گرانِ ایمان کو کیوں کفِ افسوس ملنا پڑا؟ یقیناً یہ انھیں مدارس اور ان کے فضلاء کی بے لوث کاوشوں اور انتھک محنتوں کا نتیجہ ہے۔

علماء کی عظمت اور ان پر اعتماد قائم رہے، اسی مقصد کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات اور عمل کے ذریعہ مسلمانوں کے ذہن میں اس سبق کو راسخ فرمایا، قرآن نے کہا کہ علماء اور دوسرے لوگ برابر نہیں ہوسکتے، **قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ**، (الزمر:۹) نماز کی امامت سب سے معزز کام تھا، جسے زندگی بھر حضور نے فرمایا، آپ کے بعد خلفاء راشدین نے امامت کی، اور مسلم دور میں عرصہ تک امراء اور گورنر امامت کیا کرتے تھے، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے علم ہی کو معیار بنایا ہے، اور فرمایا کہ سب سے زیادہ امامت کا مستحق عالم قرآن ہے، پھر عالم حدیث، **یؤم القوم اقرؤھم بکتاب اللہ، فان کانوا فی القرأۃ سواء فاعلمھم بالسنه**، (مسلم، حدیث نمبر:۶۷۳) نماز میں بھی ہدایت تھی کہ آپ سے قریب اہل علم رہا کریں، **لیلینی منکم اولوا لاحلام والنھی**،

(مسلم، حدیث نمبر: ۴۳۲) یہاں تک کہ موت کے بعد بھی آپ نے تعظیم واحترام کے اس مقام کو باقی رکھا، غزوۂ اُحد کے دو دو شہید ایک ساتھ دفن کئے جاتے، آپ تحقیق فرماتے کہ ان میں سے کون زیادہ قرآن کا حافظ تھا، جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا، اسے قبلہ کی سمت میں آگے کی جانب رکھتے، (بخاری، عن جابر) حضرت عمرؓ نے باوجود کم سنی کے اکابر صحابہؓ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو مجلس شوریٰ میں جگہ دی، علم اور علم میں اشتغال کو نفل نماز سے بھی آپ ﷺ نے افضل قرار دیا، رسول اللہ ﷺ کے ان اشارات کا مقصد یہ بھی ہے کہ علماء دین کے حاصل کرنے اور دین کو سمجھنے کے لئے واسطہ ہیں، اگر یہ واسطہ مجروح ہو جائے تو دین پر اعتماد باقی نہیں رہے گا۔

پس؛ موجودہ عالمی حالات اور خود ہمارے ملک کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پس منظر میں اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ علماء کو مجروح کرنے کی کوشش بالواسطہ خود اس دین پر تیشہ چلانے اور مسلمانوں کا اسلام سے رشتہ کمزور کرنے کی ایک سازش ہے، اگر اسے نہ سمجھا گیا تو ایسا نقصان ہوگا کہ جس کی تلافی بھی ممکن نہ ہوگی۔

☆☆☆

دینی مدارس کے فضلاء

صبر و برداشت ضروری ہے

رسول اللہ ﷺ نے علماء کو چودہویں کے چاند سے تشبیہ دی اور بعض روایتوں میں انھیں ستاروں کے مانند قرار دیا گیا ہے، اس میں غور وفکر کا ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جس کا نفع اس کے قریبی دائرہ تک محدود رہتا ہے اور بعض چیزوں کا نفع پوری کائنات کو محیط ہوجاتا ہے، دریا اپنے گرد و پیش پانی فراہم کرتا ہے، درخت اپنے سایہ میں رہنے والوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے، دنیا کی اکثر چیزیں اسی نوعیت کی ہیں، لیکن سورج اپنا سینہ جلا کر پوری کائنات کو تمازت بخشتا ہے، چاند اپنی خنک بار روشنی سے پوری زمین کو چاندی کی سفید چادر اُوڑھاتا ہے، تاروں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے چشم و ابرو کے اشارہ سے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو منزل مقصود کا راستہ بتاتے ہیں۔ پس، علماء کو چاند اور ستاروں سے تشبیہ دینے میں بھی اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ اس کے علم کی روشنی کسی ایک علاقہ کے لئے مخصوص نہیں، اس کا دائرہ غیر محدود اور بے پناہ ہے۔

ایسا نہیں ہوتا کہ چاند اور ستارے شہر کی پر رونق آبادیوں کو اپنی روشنی بکھیرتے ہوں، لیکن دیہات کی تنگ اور میلی کچیلی پگڈنڈیوں سے آنکھیں موند لیتے ہوں، کہ ان گندی بستیوں اور دور افتادہ آبادیوں تک اپنی کرنیں کیوں پہنچائی جائیں؟ یہی بات فضلاء مدارس کے سوچنے کی ہے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ علماء کی ساری تعلیمی اور دعوتی سرگرمیاں شہروں تک

محدود ہوکر رہ گئی ہیں، شہر میں نہ صرف یہ کہ ہمارے دینی تعلیمی ادارے کام کررہے ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ بعض مقامات پر جو زائد از ضرورت ادارے قائم ہورہے ہیں، چھوٹے چھوٹے محلوں میں ایک سے زیادہ درس گاہیں قائم ہیں۔ وہاں طلبہ کی تعداد اتنی کم ہے کہ ایک ادارہ ان کے لئے کافی تھا۔ پھر ان اداروں میں باہم کمرشیل اداروں کی طرح رقابت اور منافست کی کیفیت بھی ہے، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمیٹی میں اختلاف ہوگیا، ایک گروہ مدرسہ پر قابض ہوگیا، دوسرے گروہ نے قریب ہی دوسرا مدرسہ کھول لیا، گویا ادارے کسی ضرورت یا خدمت کی کسی نئی جہت کے لئے قائم کرنے کے بجائے محض مقابلہ اور تفاخر کے جذبہ سے بھی قائم کئے جارہے ہیں، یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ایک دینی کام دینی جذبہ سے خالی ہوکر انجام دیا جائے!

اس کے برخلاف دیہاتوں کا حال دیکھئے، بہت سے دیہات ایسے ہیں جہاں کوئی نماز جنازہ پڑھانے والا میسر نہیں اور بہت سی لاشیں بغیر نماز کے دفن کردی جاتی ہیں، کہیں قادیانیت حملہ زن ہے، کہیں ہندو فرقہ پرست تنظیمیں مسلمانوں کو مرتد کرنے پر کمر بستہ ہیں، کہیں عیسائی مشنریز ایمان پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں۔ جہالت کا حال یہ ہے کہ محرم رشتوں کا پاس ولحاظ بھی اُٹھ چکا ہے، ہندو رسم ورواج سے متاثر ہوکر ماموں بھانجی میں نکاح ہوتا ہے اور چچازاد بھائی سے نکاح نہیں ہوتا، مسلمان طرح طرح کی اخلاقی اور سماجی برائیوں میں مبتلا ہیں اور سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص تک نہیں پڑھ سکتے، بلکہ کتنے ہی لوگ ہیں، جو کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت سے بھی محروم ہیں، آخر ان ناواقف مسلمانوں کی اصلاح وہدایت کی ذمہ داری کن پر ہے؟ کیا علماء اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوسکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ان دیہاتوں میں مکاتب کے قیام کی ضرورت ہے، ان مکاتب میں چھوٹے بچوں کی تعلیم بھی ہو اور تعلیم بالغان کا بھی انتظام ہو، جس کے ذریعہ ضروریات دین سے لوگ واقف ہوجائیں، سب سے اہم مسئلہ ان دیہاتوں میں کام کرنے والے لوگوں کا ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے فضلاء شہر کی رونقوں کو چھوڑ کر دیہاتوں میں جانے اور کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ جو لوگ دیہاتوں میں پیدا ہوئے

اور دیہات کے ماحول میں ان کی نشو ونما ہوئی، وہ بھی شہر کی آب وتاب پر اس قدر ریجھ جاتے ہیں کہ دیہات کی طرف واپس جانے کو تیار نہیں ہوتے، یہ نہایت ہی افسوس ناک صورتِ حال ہے، مقام حیاء ہے کہ عیسائی مشنریز تو یورپ اور امریکہ سے آکر ہندوستان کے پسماندہ ترین دیہاتوں میں کام کریں اور عیسائیت کو پھیلانے میں اپنی پوری قوت صرف کردیں، اس کا نتیجہ آپ خود آندھرا کے دیہاتوں میں جا کر دیکھ سکتے ہیں، جہاں جگہ جگہ نوتعمیر شدہ چرچ آپ کو نظر آئیں گے، قادیانی ختم نبوت کے باغی ہیں اور اسلام کو سخت نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ کشمیر اور پنجاب جیسے دور دراز علاقوں سے ان کے مبلغین آتے ہیں اور ایسے گاؤں میں کام کرتے ہیں، جہاں موٹر اور بس کے پہنچنے کے لئے راستے تک میسر نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ گورے چٹے نوجوان دیہات کی کالی کلوٹی، اَن پڑھ اور غیر مہذب لڑکیوں سے نکاح کرلیتے ہیں، تاکہ انھیں جائے پناہ میسر آجائے اور وہ اسے اپنے مشن کے لئے تیار کریں، لیکن ہمارے فضلاء جو یقیناً حاملین حق ہیں اور جن کا مقصد زندگی ہی اسلام کی حفاظت واشاعت ہے، وہ ایسے مقامات پر جانے کے لئے تیار نہ ہوں اور شہر وقصبات سے آگے قدم نہ بڑھائیں۔

اگر یہ مدارس عام درس گاہوں کی طرح محض درس گاہ نہیں، بلکہ حفاظت اسلام کی ایک زندہ تحریک ہے اور اگر یہ مدارس کسب معاش کے پیشوں میں سے ایک پیشہ نہیں، بلکہ یہ آخرت کی ''تجارت رابحہ'' ہے، اگر ہم احیاء اسلام کی مساعی کا ایک حصہ ہیں اور اس کاروان عزیمت سے نسبت رکھتے ہیں، جس نے اس ملک میں دین کے بقاء وارتقاء کے لئے سر دھڑ کی بازیاں لگادی تھیں، تو یہ ہمارے لئے ایک امتحان ہے کہ کیا ہم زندگی کی معمولی سہولتوں کی قربانی کو بھی دین اور اُمت کے لئے گوارا نہیں کرسکتے؟ کیا ہم ان اہل باطل سے بھی گئے گذرے ہیں، جو اپنے فاسد عقیدے کی سوغات لے کر سماج کو بے روح بنانا چاہتے ہیں، یہ وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے کہ فضلاء مدارس دیہاتوں میں کام کریں وہاں تعلیمی ادارے قائم کرنے کو تیار ہوں اور اس کو اپنا فریضۂ منصبی سمجھیں۔

فضلاء مدارس کے لئے ایک ضروری وصف جو مطلوب ہے وہ حلم وبردباری ہے، جیسے

بوئے گل پھیلنے اور لوگوں کو عطر بار کرنے کے لئے بادِ نسیم کی محتاج ہوتی ہے، اسی طرح علم اس وقت نافع ہوتا ہے اور اللہ کے مخلوق تک اس کا نفع پہنچتا ہے جب عالم کے اندر تحمل اور بردباری ہو۔ وہ ناموافق باتوں کو سہہ سکتا ہو اور مشتعل کرنے والی باتوں پر بھی بے برداشت نہ ہوتا ہو، قرآن مجید میں انبیاء اور ان کی اقوام کا تذکرہ اس پہلو سے دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ مقام نبوت سے ناآشنا لوگ کیسی کیسی جسارتیں کر جاتے تھے، لیکن انبیاء کا جواب کبھی بھی متانت و سنجیدگی اور محبت و ہمدردی کے تقاضے کے خلاف نہیں ہوتا۔

یہ نہایت ضروری وصف ہے، جو علماء کے میدانِ عمل میں مؤثر ہونے اور ان کی کاوشوں کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے ضروری ہے۔ مشہور ہے کہ ایک جیوتشی نے ایک بادشاہ سے کہا کہ آپ کے تمام اعزہ آپ کی موجودگی میں مر جائیں گے، بادشاہ اس بات سے بہت خفا ہوا اور اس نے اسے قتل کرادیا، پھر اس نے دوسرے جیوتشی سے رجوع کیا، اس نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کے تمام رشتہ داروں کے مقابلہ آپ کو عمر دراز عطا فرمائیں گے۔ بادشاہ اس کے جواب سے بہت خوش ہوا اور اسے انعام واکرام سے نوازا، بات ایک ہی تھی، لیکن تعبیر کے فرق نے ایک کو تختۂ دار پر پہنچایا اور دوسرے کو انعام شاہی سے ہمکنار کیا۔

بردباری کا پہلا اثر زبان اور گفتگو پر ہی ظاہر ہوتا ہے، ایک ہی بات کو سخت لب ولہجہ میں کہا جائے تو اس کا اثر اور ہوتا ہے، اسی بات کو نرم زبان میں محبت آمیز تبسم کے ساتھ کہا جائے تو اس سے دشمن دوست اور بیگانے اپنے بن جاتے ہیں، ایک معرکہ پر رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو بھیجا، اتفاق سے اس معرکہ میں مسلمانوں کو پسپائی ہوئی، جو لوگ واپس ہوئے وہ اتنے شرمسار تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا کرنے سے بھی گریزاں تھے اور مارے حیا کے کہتے تھے، کہ ہم تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں، نحن الفرارون۔ رحمتِ عالم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے فرمایا: ''بل انتم الکرارون'' یعنی: ''تم پیچھے ہٹ کر دوبارہ حملہ کرنے والے ہو، اس سخن دل نواز کو دیکھئے کہ اس نے کس قدر جاں نثاروں کا حوصلہ بڑھایا ہوگا!

نوجوان فضلاء جب نہی عن المنکر یعنی برائی سے روکنے کا کام کرتے ہیں تو اکثر حلم کا

پہلو نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے، بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ معمولی منکر کے لئے سخت لب ولہجہ اختیار کرلیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصلاح کے بجائے ضد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، موقع ومحل کی رعایت، سن وسال کا خیال اور مخاطب کی حیثیت عرفی کا لحاظ طریقۂ انبیاء رہا ہے، نہی عن المنکر کا مقصد کسی مسلمان کی تذلیل یا اپنی انا کی تسکین نہیں، بلکہ ایک مسلمان کو گناہ سے بچانا اور برائی سے روکنا ہے، یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہئے، جو لوگ ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ ہوں، وہ بعض دفعہ ناشائستہ گفتگو کر گذرتے ہیں، بعض لوگ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، لیکن علماء کے بارے میں ان کے ذہن میں غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات ہوتے ہیں، وہ اپنی ناواقفیت اور ناسمجھی کی وجہ سے تحقیر آمیز لب ولہجہ اختیار کرلیتے ہیں، اگر ان کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب کا معاملہ رکھا جائے تو یقیناً ان سے اس کی زبان گنگ ہوسکتی ہے، لیکن ایسے جواب سے دل میں محبت کے پودے نہیں اُگائے جاسکتے، ایسے مواقع پر تحمل اور بردباری کی ضرورت ہے، کہ ہماری گفتگو کانٹوں کے مقابلہ پھول اور پتھر کے مقابلہ موم جیسی ہو، اس طرح بظاہر ایک بار ان کی بات سہنی پڑے گی، لیکن یہ متانت وسنجیدگی اور کلمۂ نصح ومحبت انھیں مجبور کرے گا، کہ وہ اپنے رویہ پر نظر ثانی کریں، ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں، کہ ایک شخص نے کسی عالم دین سے تلخ کلامی کی، لیکن ان کے تحمل اور صبر کے رویہ کی وجہ سے وہی شخص اس کا ایسا گرویدہ ہوگیا، کہ اب وہ اپنا کوئی فیصلہ ان کے مشورہ کے بغیر نہیں کرتا، میٹھا پھل کھانے اور اپنی محنت وصول کرنے کے لئے صبر وبرداشت ضروری ہے اور یہی نظامِ فطرت ہے!

☆☆☆

کس سے کہوں کہ

زہر ہے میرے لیے مئے حیات!

شعبان کا مہینہ برصغیر میں ایک خاص روایت کا حامل ہو گیا ہے، کیوں کہ دینی مدارس کا آغاز شوال سے ہوتا ہے اور شعبان پر تعلیم اور حساب و کتاب کا اختتام عمل میں آتا ہے، جو مدارس ابتدائی تعلیم کے ہیں، ایک خاص حد تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلباء وہاں سے نسبتاً بڑے مدارس میں منتقل ہو جاتے ہیں، جن درس گاہوں میں حفظ قرآن کی تعلیم کا نظم ہے، وہاں یہی تکمیل درس قرآن کا موسم ہوتا ہے، جہاں دورۂ حدیث تک یا تخصصات کی تعلیم کا انتظام ہے، وہاں سے طلباء سندِ فراغت حاصل کرتے ہیں، یہ ان کی زندگی میں ایک نیا مرحلہ اور نیا موڑ ہوتا ہے، اب انھیں اُمت کے مختلف کاموں کی ذمہ داری انجام دینی ہوتی ہے، عام طور پر امامت، خطابت، مکتب کی تعلیم یا نسبتاً اونچی جماعتوں کی تدریس ان سے متعلق ہوتی ہے، لیکن ان کی جدوجہد کا دائرہ اسی میں محدود نہیں ہوتا، وہ ان کاموں کو کرتے ہوئے دوسرے اُمور بھی انجام دیتے ہیں اور اُمت کی دوسری دینی ضروریات بھی ان ہی سے پوری ہوتی ہیں، مسلمانوں میں اختلاف ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرانا، اور سماج میں جو بھی مسئلہ پیش آئے ان کے بارے میں شرعی احکام کی رہنمائی کرنا، سماج کو نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا، ہر عالم اس کو اپنا فریضہ سمجھتا ہے، اور اپنی صلاحیت اور توفیق کے مطابق اسے انجام بھی دیتا ہے، اس لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بڑی اہم ہیں اور بحیثیت مجموعی اُمت کو اسلام سے مربوط رکھنے اور ان

کے شیرازہ کو بکھراؤ سے بچانے میں ان فضلاء کا بڑا اہم رول ہے۔

ان مدارس کا نظام سادگی پر رکھا گیا ہے، سادہ عمارت، سادہ رہن سہن، خورد ونوش کا سادہ انتظام، پہننے اوڑھنے میں سادگی، ہر طرح کے تکلفات اور تعیشات سے دور، ابتداءً ان مدارس کا یہی مزاج تھا اور بہت سے دینی درس گاہیں اپنے زمانہ کے معیار زندگی کے اعتبار سے اسی روش پر قائم ہیں، ایسا لگتا ہے کہ تحریک مدارس کے موسسین نے قصداً یہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا، تاکہ ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے لوگ مشکل حالات میں کام کرنے کے عادی رہیں اور دین کی خدمت انجام دے سکیں، یہ نہایت اہم پہلو ہے، اور ہمارے فضلاء کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھیں۔

اللہ تعالیٰ کو جن لوگوں سے اپنے دین کا کام لینا مقصود ہوتا ہے، ان کی تربیت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے اور اس کا سب سے اہم حصہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں مشقتیں جھیلنے اور خلاف طبیعت باتیں برداشت کرنے کی عادت ہوجائے، قرآن مجید نے انبیاء کرام کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے، ان میں زیادہ تر واقعات انبیاء اور ان کی اقوام کے درمیان کشمکش اور مخالفین حق کی جانب سے ایذاء رسانی کے ہیں، رسول اللہ ﷺ آخری نبی اور انسانیت کے لئے اسوۂ کاملہ تھے، اس لئے آپ اور زیادہ ابتلاؤں سے گذارے گئے اور آپ کو اوروں سے بڑھ کر آزمائش کی بھٹیوں میں تپایا گیا، غور کیجئے! کیا خدا اس پر قادر نہیں تھا کہ جو غلبہ آپ کو فتح مکہ کے بعد حاصل ہوا وہ نبوت کے پہلے ہی دن حاصل ہوجاتا، اور جن لوگوں نے ۸ ہجری میں آپ کے شوکت وجلال کو دیکھ کر سر تسلیم خم کیا وہ اول دن ہی اسلام کے سامنے سر جھکا دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا، آپ نے پتھر بھی کھائے، گالیاں بھی سنیں، چوٹیں بھی سہیں، بھوکے بھی رہے، طائف کی سڑکوں سے بھی گذارے گئے، بدر واُحد کے معرکوں میں بھی آزمائے گئے، چہرۂ انور بھی لہولہان ہوا، منافقین مدینہ کی ستم انگیزیاں اور جفا کاریوں کو بھی برداشت کرنا پڑا، پھر جاکر اسلام کو فتح وکامرانی حاصل ہوئی، کیا خدا اس بات پر قادر نہیں تھا کہ اول دن سے ہی اہل مکہ کے قلوب کو آپ کے لئے نرم کردیتا اور وہ ایمان لے آتے؟ اللہ یقیناً اس بات پر قادر تھے؛ لیکن اس کے ذریعہ تربیت اور امتحان کے مراحل سے آپ کو گذارنا مقصود تھا۔

علماء جب انبیاء کے وارث ہیں تو یقیناً انھیں بھی آزمائشوں سے گذرنا ہوگا، انھیں زندگی کا ایک سادہ نقشہ تیار کرنا ہوگا، جس میں معمولی کھانے، پینے، معمولی مکان، معمولی لباس اور معمولی طرزِ زندگی کی ہی گنجائش ہوگی، لوگوں کے طعنے بھی سننے پڑیں گے، تکلیف دہ باتوں کو بھی انگیز کرنا ہوگا اور زندگی کی بہت سی نعمتوں سے اپنے آپ کو دور رکھنے پر آمادہ رکھنا ہوگا، یہ مشقتیں اوروں کے لئے مشقت ہے اور کاروانِ عشق کے لئے حاصل حیات، بقول اقبالؒ کے:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزم کائنات، تازہ ہیں میرے واردات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس مئے حیات کو بچانا وقت کی ضرورت ہے، جہاں پوری فضاء مادیت کی پرستار اور دلدادہ ہو، وہاں قناعت وتوکل کی بات مضحکہ خیز سمجھی جاتی ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قناعت ہی کی خمیر سے ان مدارس کا وجود اُٹھا ہے اور جس قدر اس کی اہمیت کل تھی اس سے زیادہ آج ہے، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے علاقے شہر کی رونقوں اور راحتوں سے دور ہیں، وہاں ہمارے خاندان کا ایک حصہ آباد ہے، ان میں بعض مسلمان ایسے ہیں جن کے کانوں نے آج تک اللہ اکبر کی صدا بھی نہیں سنی ہے اور جن کی زبانیں جہالت کی وجہ سے اللہ اور رسول کا نام بھی صحیح طریقہ پر نہیں لے سکتیں، ہمارے نوجوان فضلاء وہاں کام کرنے سے گریزاں ہیں؛ کیوں کہ وہاں وہ سہولتیں نہیں ہیں اور معاشی اعتبار سے بھی وہاں کے حالات بہت مایوس کن ہیں، —— اگر ان مقامات پر ہم جا کر اپنی قوم کی خدمت نہیں کریں تو کون ان کے ایمان کی حفاظت کرے گا اور کیوں کر ان کو اسلام پر قائم رکھنا ممکن ہوگا؟ اگر ایسی جگہوں پر عیسائی مشنریز اور قادیانیت پہونچتی ہے، تو ہمارے لئے شکوہ سنج ہونے کا کوئی جواز نہیں، یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی طبقے کو آپ ٹھکرائیں اور اسے کوئی اور بھی نہ اپنائے؟

دوسری اہم بات یہ ہے کہ علماء کا اُمت سے تعلق محض ایک قانونی تعلق نہیں ہے، بلکہ روحانی اور ایمانی تعلق ہے، قانونی تعلق میں انسان اپنے آپ کو ڈیوٹی تک محدود رکھتا ہے، مقررہ

کام کے سوا اور وہ کوئی اور کام کرنا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اس کا اسے معاوضہ نہیں ملتا؛ لیکن عالم کی حیثیت ایک ایسے چوکیدار کی ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے، وہ ملازم نہیں؛ بلکہ رضا کار ہے، اس کے فرائض غیر محدود ہیں، اس کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ تمام اُمور اس کے فرائض میں داخل ہیں جو اس اُمت سے اللہ کو مطلوب ہے، اگر کوئی شخص فساد عقیدہ میں مبتلا ہو تو اس کے عقیدہ کی اصلاح، بے نمازی ہو تو نماز کی دعوت، کسی برائی میں مبتلا ہو تو اس کو برائی سے بچانے کی کوشش، مسلمان خاندان یا شوہر اور بیویوں میں اختلاف ہو، تو رفع اختلاف کی سعی، بچوں اور بڑوں کی تعلیم کا انتظام نہ ہو، تو ان کی تعلیم کا انتظام، کوئی آفت سماوی آجائے تو لوگوں کی مدد کے لئے اُٹھ کر کھڑا ہونا، الیکشن ہو رہا ہو تو مسلمانوں کے مفاد کی رعایت کے ساتھ لوگوں کی رہنمائی، اگر وہاں برادران وطن کی آبادی بھی ہو تو ان کے ساتھ داعیانہ ربط وضبط، فرقہ وارانہ منافرت پھیل رہی ہو تو امن وامان قائم کرنے کی کوشش، غرض اُمت کا کوئی مسئلہ ہو، عالم کا فرض ہے کہ وہ کسی دنیوی منفعت کی طمع کے بغیر محض ملی مفاد اور دینی تقاضہ کے تحت اُٹھ کھڑا ہو، یہ نہایت اہم ضرورت ہے اور یہی علماء سلف کا طریقہ تھا، افسوس کہ اب فضلاء مدارس نے اپنے دائرہ عمل کو مسجد اور مدرسہ تک محدود کر دیا، اس کی وجہ سے مسلمانوں میں صالح اور بے لوث قیادت کا خلا پیدا ہو گیا ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ جاہل اور غیر سماجی عناصر نے مسلمانوں کے مسائل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور ان کے عمل دخل سے جن نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے، وہی نتائج ظہور میں آرہے ہیں۔

تیسری اہم بات مصلحت اندیشی اور زمانہ شناسی ہے، ہمارے نوجوان فضلاء میں بہ تقاضۂ عمر جوش اور زود رنجی زیادہ ہوتی ہے اور وہ زمین کے تیار ہونے سے پہلے پودا لگانے کی کوشش کرتے ہیں، اگر زمین نرم نہ کی گئی ہو اور اس میں بیج ڈال دیا جائے، اگر توا گرم نہ ہوا اور اس پر روٹی رکھ لی جائے، پھل تیار نہ ہو اور اسے مصنوعی طور پر پکایا جائے تو مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا، اسی طرح اگر کوئی برائی جڑ پکڑ چکی ہے اور مدت دراز سے اس کی خو چلی آتی ہو، تو بیک لمحہ اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور ایسی اصلاح سے اندیشہ ہے کہ فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو، اسی لئے احکام شریعت میں تدریج کا لحاظ رکھا گیا ہے، اکثر محرمات بہ تدریج حرام قرار دی

گئیں اور شراب کا معاملہ تو بالکل واضح ہے، وہ تین مرحلوں میں حرام ہوئی، اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ حکمت و مصلحت کے پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے، انسان جو کچھ کہے حق کہے، لیکن ہر حق بات کا ہر وقت کہہ دینا ضروری نہیں۔ بعض دفعہ مرحلہ وار حق کا اظہار زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے — اگر علماء اس بات کو ملحوظ رکھیں تو بہت سے باہمی اختلاف جو مسجدوں اور دینی کاموں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان کی نوبت نہ آئے۔

چوتھی اہم بات اُمت کی وحدت کی حفاظت اور اس کو انتشار سے بچانا ہے، اتحاد کی ضرورت کب نہیں رہی؟ لیکن موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، یوں تو اختلاف کے مختلف اسباب ہیں، سیاسی، خاندانی، کاروباری وغیرہ، لیکن مذہبی اختلاف کا مسلم سماج پر زیادہ گہرا اثر پڑتا ہے اور اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مساجد، دینی درس گاہیں اور دینی اجتماعات اور مذہبی تقریبات جن کو اُمت کے اتحاد و اتفاق کا نمونہ ہونا چاہئے۔ وہی اختلاف و انتشار کا سبب بن جاتا ہے اور جو لوگ اُمت کو جوڑنے کا کام کرتے، وہی اختلاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں کون ہے جو ان بکھرے ہوئے تسبیح کے دانوں کو پرو سکے، اور شکستہ دلوں پر مرہم رکھ سکے! —— ہمارے فضلاء کو اس پر ضرور توجہ دینی چاہئے کہ وہ اُمت کے کسی ایک طبقہ کے رہنما نہیں ہیں، بلکہ پوری اُمت کے لئے دواء دل کا درجہ رکھتے ہیں، ان کو تمام مسلمانوں سے بحیثیت مسلمان محبت رکھنی چاہئے اور اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان کی زبان اور قلم کہیں اُمت میں انتشار کا باعث نہ بنے۔

پانچویں اور بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ ہے جس نے جدید علوم کو حاصل کیا ہے، جیسے ہمارے علماء دین کا وجود ایک ضرورت ہے ویسے ہی عصری علوم کے ماہرین بھی ہمارے لئے بہت بڑی ضرورت ہیں، ہم ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے، یہ قوم کا بہت بڑا اثاثہ ہیں، یہ عام طور پر اسلام کے بارے میں مخلص بھی ہیں، اگر کچھ لوگ ایسی باتیں کرتے ہوں جو دین کے مزاج و مذاق کے خلاف ہیں، تو یہ زیادہ تر ان کی ناواقفیت اور ناآگہی کی وجہ سے ہے اور باہمی غلط فہمی کی وجہ سے علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان ایک خلیج سی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

یہ بہت افسوس ناک ہے اور اس میں زیادہ تر محض باہمی دوری اور غلط فہمی کو دخل ہے، علماء کا فریضہ ہے کہ وہ اس طبقہ کو اُمت کی بہترین امانت سمجھ کر قریب کریں، ان کے شکوک و شبہات کو تحمل کے ساتھ سنیں اور محبت کے ساتھ ان شکوک کے کانٹوں کو ان کے دلوں سے نکالیں، اُمت میں جو لوگ فکری اعتبار سے راہ مستقیم سے منحرف ہوں، ان کے ساتھ ہمارا سلوک وہی ہونا چاہئے جو ایک ہمدرد اور فرض شناس معالج کا اپنے ناسمجھ مریض کے ساتھ ہوتا ہے، ہمارا رویہ ان کے ساتھ فریق اور رقیب کا نہ ہو، بلکہ رفیق اور صدیق کا ہو۔

یہ ہمارے نوجوان فضلاء کے لئے ان کے ایک ایسے بھائی کی گذارشات ہیں جو اس راہ سے بہ مقابلہ ان کے کسی قدر پہلے گذر چکا ہے، یہ ایسی حقیقتیں ہیں کہ جن پر دھیان دینا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے، اور جن سے پہلو تہی اُمت اور علماءِ اُمت دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔

☆☆☆

علماء

دعوت دین اور خدمت خلق کی ذمہ داری

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ایمان کی دعوت دیں، ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۴) آپ ﷺ کا تعلق قریش کی شاخ بنو ہاشم سے تھا، بنو ہاشم اور بنو مطلب مکہ کے قبائلی نظام میں ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون و مدد گار رہتے تھے، یہ باہمی نفرت وتعاون کا تعلق زمانۂ جاہلیت میں بھی تھا اور زمانۂ اسلام میں بھی رہا، آپ ﷺ نے اس حکم خداوندی کی تعمیل کے لئے یہ تدبیر کی کہ ان کے لئے دعوتِ طعام کا نظم کیا، انھیں کھانا کھلایا اور کھلانے کے بعد ان پر اسلام پیش کیا، ابولہب نے تو اس کو قبول کرنے سے علانیہ انکار کر دیا، دوسرے لوگ خاموش رہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے —— جو اس وقت کم عمر تھے، —— آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، اس سے معلوم ہوا کہ خدمتِ خلق کسی گروہ تک پہنچنے کا مؤثر ذریعہ ہے اور اپنے جائز اور بہتر مقاصد کے لئے انسانی خدمات کے وسائل کو اختیار کرنا عین سنت نبوی ہے، یہ تقاضۂ دین کے خلاف نہیں۔

آپ ﷺ کے مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد مکہ میں ایک موقع پر سخت قحط آیا، سارے لوگ اس سے پریشان تھے، اہل مکہ کی عداوت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، اور اس عداوت کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ایک خطیر رقم مکہ کے قحط زدہ لوگوں کی مدد کے لئے روانہ فرمائی اور بھیجا بھی ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کے پاس، جو

اس وقت اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ظاہر ہے اس میں انسانی ہمدردی کے ساتھ ساتھ یہ فکر بھی کارفرما تھی کہ اہل مکہ کے دل کی زمین اسلام کے حق میں نرم اور بار آور ہو۔

قرآن مجید نے اسی مقصد کے لئے زکوٰۃ کا ایک مستقل مد ''مؤلفۃ القلوب'' کو بتایا ہے، یعنی غیر مسلموں کو ترغیب اور نو مسلموں کو دین پر استقامت کے لئے مالی مدد دینا، اسی طرح آپ ﷺ مالِ غنیمت میں سے بھی غیر مسلموں کی گاہے گاہے مدد فرمایا کرتے تھے، حدیث وتفسیر کی کتابوں میں اس طرح کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ معروف کی دعوت اور منکرات سے روکنے کے لئے انسانی خدمت بھی بہت بڑا ذریعہ ہے اور بہتر مقاصد کے لئے اس ذریعہ کو استعمال کرنا عین منشأ نبوی ہے، اولاً تو مسلمان خدمت خلق کے کاموں میں بہت پیچھے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں، ان میں علماء کا حصہ بہت کم ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدمتِ خلق کے جو کام مسلمانوں کی جانب سے ہو رہے ہیں، ان کو لوگ محض تجارتی بنیاد پر کرتے ہیں اور کسب معاش کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، اس سے کوئی دینی اور دعوتی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

مثلاً موجودہ دور میں خدمت خلق کے دو اہم ذرائع ''علاج اور تعلیم'' ہیں، مسلمانوں کے ہسپتال کم ہیں، لیکن جو ہیں، وہ کمرشیل بنیاد پر کام کرتے ہیں، مریض مانوس تو کیا ہوگا، مالی گراں باری اور ہسپتال کے لوگوں کے رویہ کی وجہ سے الٹا اثر لے کر جاتا ہے، ہماری جو تعلیم گاہیں ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے، تعلیمی معیار کے پست ہونے کی شکایت عام ہے، ذمہ داروں کا رویہ ایسا ہے کہ غیر مسلم تو کیا بہت سے مسلمان بھی بعض درس گاہوں کے نام سے گھبراتے ہیں اور تجارتی ذہن ان سب سے سوا ہے، یقیناً بعض دواخانے اور درس گاہیں اس سے مستثنیٰ بھی ہیں، لیکن ان کی مقدار آٹے میں نمک کی سی ہے، اس کے برخلاف عیسائی مشنریز ان ہی دواخانوں اور تعلیم گاہوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے استعمال کر رہی ہیں اور اس میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے یہاں یہ ادارے مذہبی عناصر، مذہبی مقاصد اور تبلیغی تحریک سے مربوط ہیں، اس لئے وہ اپنی خوش اخلاقی اور مروت ورواداری کی وجہ سے لوگوں کے دل بھی

جیتتے ہیں، اگر وہ کچھ لوگوں سے پیسے وصول بھی کرتے ہیں تو ایک بہت بڑے غریب طبقہ پر اپنے مقاصد کے لئے انھیں خرچ بھی کرتے ہیں اور اس طرح خدمتِ خلق کے ان اداروں کو سکہ ڈھالنے کی مشین بنانے کے بجائے افکار واذہان کو اپنے سانچہ میں ڈھالنے کی مشین بنائے ہوئے ہیں۔

اس وقت علماء نے عام طور پر مساجد ومدارس، دارالافتاء ودارالقضاء اور وعظ وتقریر نیز تصنیف وتالیف کی ذمہ داریاں سنبھال رکھی ہیں، یقیناً یہ بہت اہم کام ہیں، لیکن عام مسلمانوں اور غیر مسلموں تک رسائی اور ان تک اللہ کے دین کو پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ علماء خدمتِ خلق کے میدان میں اُتریں اور رسول اللہ ﷺ کی اس سنت کو بھی اپنے لئے مشعل راہ بنائیں، اس سے دو بڑے فائدے ہوں گے، ایک یہ ہے کہ ان کاموں کا تجارتی رُخ بننے کے بجائے جذبہ خدمت کی کیفیت ان میں زیادہ نمایاں ہوگی اور غریب وپسماندہ لوگوں کو اس سے فائدہ اُٹھانے کا موقع مل سکے گا۔ اس کی مثال دینی مدارس ہیں، آج دینی مدارس جتنے کم اور واجبی اخراجات میں عام لوگوں تک علم کی روشنی پہنچا رہے ہیں، اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ان اداروں کے خدام خدمتِ دین اور خدمتِ قوم وملت کے جذبہ سے اس کام کو انجام دیتے ہیں۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ یہ ادارے دعوتی اور تبلیغی کام میں معاون بن سکیں گے، نہ صرف عام مسلمانوں بلکہ غیر مسلم بھائیوں میں بھی کام کا موقع بہم پہنچے گا اور اسلام جس جذبہ کے تحت خدمتِ خلق کے کام کی تائید کرتا ہے، اس جذبہ کے مطابق خدمت انسانیت کا کام ہوگا، یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے، اور علماء کو اس جانب توجہ کرنا چاہئے، بحمد اللہ کہیں کہیں علماء نے اس سلسلہ میں قدم بڑھائے ہیں، فنی تعلیم کے ادارے قائم کئے ہیں، عصری تعلیم کی درس گاہیں قائم کی ہیں، یا ہسپتال کھولے ہیں، وہاں یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ ان درس گاہوں میں پڑھنے والے طلبہ اپنے فن میں کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب وثقافت کے بھی حامل ہیں، ان کی وضع قطع اور طور وطریق سے مذہبیت نمایاں ہے، ان میں جذبۂ خدمت ہے، نسبۃً خدا ترسی کی کیفیت ہے، جو غیر مسلم طلبہ ان درس گاہوں میں آتے ہیں

وہ بھی اسلامی اخلاق کے بارے میں اچھے تصور کے ساتھ واپس ہوتے ہیں، اگر ملک کے مختلف علاقوں میں علماء خدمت خلق کے ادارے قائم کریں، قدرتی حادثات کے مواقع پر ریلیف کے کاموں میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اپنے اس کام میں اسلامی اخلاق، جذبۂ خدمت اور مقصدِ دعوت کو ملحوظ رکھیں، تو اس کے نہایت ہی گہرے اثرات مرتب ہوں گے اور جیسے علماء نے مساجد و مدارس کے واسطہ سے عوام میں رسوخ حاصل کیا ہے، کہ مسلمانوں کی کوئی تحریک ان کی شمولیت کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتی، اسی طرح غیر مسلم بھائیوں اور دین سے بے بہرہ مسلمانوں میں بھی وہ رسائی حاصل کرلیں گے۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء اصل میں غیر مسلموں کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے آئے تھے، قرآن میں مختلف انبیاء اور ان کی اقوام کے واقعات کو پڑھ جایئے، ہر جگہ اس عہد کے غیر مسلم ہی ان کے اولین مخاطب نظر آتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی کے امام و خطیب بھی تھے، مقدمات کے فیصلے بھی فرماتے تھے، لوگوں کے سوالات پر فتوے بھی دیتے تھے، احکام و اخلاق کے درس بھی دیتے تھے، میدانِ کارزار کے سپہ سالار اور مملکت اسلامی کے قائد باتدبیر بھی تھے، لیکن آپ ﷺ کا اصل مشن گم گشتہ راہ بندوں کو اللہ کی طرف بلانا تھا، اسی کے لئے آپ ﷺ راتوں میں اپنے مالک کے سامنے دستِ التجا پھیلاتے تھے، اور دن میں بندگان خدا کی خوشامد کر کے انھیں اللہ کی طرف بلاتے تھے، مکہ کی تیرہ سالہ زندگی کی ہر ساعت اسی مہم میں گذری، پھر صلح حدیبیہ کے بعد سے وفات تک آپ اسی کام میں لگے رہے کسی قبیلہ میں خود جاتے، کہیں اپنے رفقاء کو بھیجتے اور بہت سے قبائل وہ تھے جنھوں نے خود اپنے وفود خدمت اقدس میں بھیجے، فتح مکہ کے بعد ان وفود کی ایسی کثرت ہوئی کہ سن نو ہجری کا نام ہی ''عام الوفود'' قرار پایا۔

پس انبیاء کی میراث میں یقیناً غیر مسلم بھائیوں تک دعوت حق پہنچانا بھی شامل ہے، اسلام میں ایسی کوئی تقسیم نہیں کہ جب تک مسلمان پوری طرح نیک و صالح نہ بن جائیں، اس وقت تک غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت نہ دی جائے یہ بات نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں، نہ صحابہ و سلف صالحین نے اس سوچ کے ساتھ کبھی کام کیا۔ غور کیجئے! کہ اُمت مسلمہ میں فرق

باطلہ کا ظہور حضرت عثمان غنیؓ کے آخری عہد میں شروع ہوا اور عہد عباسی تک یہ فتنہ بڑھتا ہی گیا، نیز فلاسفہ یونان کی کتابوں کے عربی زبان میں منتقل کئے جانے اور بہت سے مجوسیوں کے نیم دلی کے ساتھ اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے الحاد و دہریت کی ایک نئی بلا مسلمانوں میں داخل ہونی شروع ہوئی، لیکن اسی عہد میں مسلمانوں نے دور دراز علاقوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی، انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب تک موجودہ مسلمانوں کی پوری طرح اصلاح نہ ہو جائے اور فرق باطلہ کا استیصال نہ کرلیا جائے، اگلے محاذ پر توجہ نہ دی جائے، بلکہ انھوں نے ایک ساتھ دونوں کوششیں جاری رکھیں۔

گذشتہ دو تین صدیوں پہلے تک ہر عہد میں ایک نیا خون اس اُمت کا جزء بنتا رہا ہے، جس نے ایک نئے حوصلہ اور جوش عمل کے ساتھ اسلام کی دعوت کو آگے بڑھایا اور اس کے پیغام کو اونچا اُٹھایا، جیسے جسم کو نئے اور تازہ خون کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح قوموں اور اُمتوں کو بھی تازہ دم خون کی ضرورت ہوتی ہے، جس میں بھرپور ولولہ، محکم عزم، جان پر کھیل کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے اور طوفانوں سے گذر کر ساحل مراد تک پہنچنے کا مصمم ارادہ موجود ہوتا ہے، علماء کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس سماج میں رہتے ہوں، وہاں برادرانِ وطن سے قربت پیدا کریں، اپنے پروگراموں میں انھیں مدعو کریں اور خود ان کے پروگراموں میں جائیں، ایسے مواقع پیدا کریں جن میں ان کو اپنی بات سمجھانے اور کہنے سننے کا موقع ملے، اس سے غلط فہمیاں دور ہوں گی، فاصلے کم ہوں گے، دعوتی کاز کو تقویت حاصل ہوگی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم ایک فریضہ منصبی کو ادا کر پائیں گے۔ دعوت کے کام کو قرآن وحدیث اور سیرت سے آگاہ علماء جس بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں، کوئی طبقہ انجام نہیں دے سکتا۔

☆☆☆

فضلاءِ دینی مدارس کی ذمہ داریاں

حضرت ابودرداء ﷛ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے:

''جو طلب علم کی راہ میں چلے، اللہ تعالیٰ اسے جنت کی راہ فراہم کرتے ہیں، طالبِ علم کی خوشنودی کے لئے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں، عالم کے لئے زمین وآسمان کی تمام چیزیں دُعاء مغفرت کرتی ہیں، یہاں تک کہ پانی کی آغوش میں رہنے والی مچھلیاں بھی، عالم کی فضیلت عبادات گذار شخص پر ایسی ہی ہے جیسے چودہویں شب کے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر، علماء انبیاء کے وارث ہیں، کہ انبیاء نے درہم ودینار کی میراث نہیں چھوڑی، بلکہ علم کی میراث چھوڑی ہے، جو علم سے سرفراز ہو، اس نے (انبیاء کی میراث سے) بڑا حصہ پایا''۔

(ترمذی، حدیث نمبر:۲۶۸۲)

اس ارشاد نبوی ﷺ میں علم دین کے حاملین اور طالبین کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، یہاں تک کہ فرمایا گیا کہ کائنات کی تمام چیزیں ان کے لئے دعا گو ہوتی ہیں، عبادت وبندگی مشقت طلب عمل ہے اور ہر مذہب میں عبادتوں اور ریاضتوں کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے، لیکن عالم کو نمایاں طور پر عبادت گذار سے افضل قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر عابد ستارہ ہے تو عالم چودہویں کا چاند، پھر علماء کو میراثِ نبوت کا حامل قرار دیا گیا، اس سے بڑھ کر کیا

فضیلت ہوگی؟ لیکن اگر اس حدیث پر گہرائی سے غور کیا جائے اور جن الفاظ وکلمات سے عالم کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اس کے دائرہ کو ملحوظ رکھا جائے، تو اس حدیث سے عمل کا پیغام بھی ملتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہایت خوش اُسلوبی اور حکمت کے ساتھ مدح وستائش کے پیرایہ میں علماء کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

چاند کا کام کیا ہے؟ اندھیروں کو روشن کرنا، راہ گیروں کے لئے راستہ کی پہچان کو آسان کرنا، راہ بھٹکے ہوؤں کو گم گشتہ راہی سے بچانا اور اپنا سینہ جلا کر ایک عالَم کو روشنی پہنچانا، اس سے صاف معلوم ہوا کہ عالم کا یہ فریضۂ منصبی ہے کہ وہ اُمت بلکہ پوری انسانیت کے لئے رہنمائی کا فریضہ انجام دے، وہ اپنے ماحول اور سماج کے لئے قبلہ نما کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے ذریعہ لوگ اپنے کعبۂ مقصود کو جان سکیں، اسی لئے بہ مقابلہ عابد کے اس کی فضیلت زیادہ ہے؛ کیوں کہ عبادت کرنے والے کے عمل کا جو کچھ نفع ہے وہ اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے اور عالم ایک چاند کی طرح ہے جس کی روشنی سے پوری دنیا مستفید ہوتی ہے۔

جو لوگ علم دین حاصل کرتے ہیں، وہ دراصل حق کے چوکیدار ہیں، ان کا کام صرف اس قدر نہیں کہ کسی مدرسہ میں بچوں کو تعلیم دیں، کسی مسجد میں امامت کرلیں اور سمجھیں کہ ہماری ذمہ داری پوری ہوگئی، یقیناً بچوں کی تعلیم اور مسجد کی امامت بھی بڑا کام ہے اور ان ہی وسائل کے صدقہ بہ ظاہر اس ملک میں ہر چہار طرف سے آتش عناد سلگنے کے باوجود اسلام کا شجرۂ طوبی سر سبز وشاداب صورت میں موجود ہے، لیکن علماء کی ذمہ داریاں اس سے زیادہ ہیں، جو لوگ مدارس میں نہیں آتے، ان میں طلبِ علم کی پیاس کیوں کر پیدا ہوگی؟ جو لوگ بارگاہِ خداوندی میں سجدہ کی لذت سے محروم ہوں، انھیں کس طرح خدا کی چوکھٹ تک لایا جائے گا؟ جن کی زندگیوں میں حلال وحرام کی سرحدیں ٹوٹ چکی ہیں، یہاں تک کہ شعائر اسلام کے تعظیم واحترام کی توفیق سے بھی وہ محروم وتہی دامن ہیں، ان کے ایمان کی سرد انگیٹھیوں کو کیوں کر سلگا یا جائے گا؟ جو مسلمان انسانی حقوق کے تقاضوں سے بے گانہ ہوتا جا رہا ہے اور ایثار کی جگہ خود غرضی، اُخوت ومحبت کی جگہ نفرت وعداوت، عدل کے بجائے ظلم، تواضع وانکسار کے بجائے کبر ونخوت، اسلامی بھائی چارہ کے بجائے طرح طرح کے تعصبات اور شرافت وحیاء کی جگہ

تہذیب وثقافت کے نام پر بے حیائی نے لے لی ہے، آخران سماجی اور روحانی بیماریوں کا علاج کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ علماء کا منصبی فریضہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کو ایک اور موقع پر کس خوبصورتی سے بیان فرمایا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

"زمین میں علماء کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آسمان میں ستاروں کی، جن سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راستے کی رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، پھر اگر ستارے ڈوب جائیں تو قریب ہے کہ راہ چلنے والے راستہ سے بھٹک جائیں" (مسند احمد، حدیث نمبر : ۱۲۱۸۹)

یہ تعبیر کتنی بلیغ ہے! کہ جیسے ستارے رات کی تاریکی میں سفر کرنے والے راہ رووں کے لئے راستہ بتانے کا کام کرتے ہیں، اسی طرح جو لوگ بے دینی، بے عملی اور فسادِ عقیدہ کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہوں، انھیں منزلِ مقصود تک جانے والا راستہ دکھانا علماء کی ذمہ داری اور ان کا منصبی فریضہ ہے۔ موجودہ حالات میں جب کہ اسلام پر چومکھا حملہ ہو رہا ہے اور بیک وقت کئی جہتوں سے دین حق پر یورشیں کی جارہی ہیں، علماء اور دینی مدارس کے فضلاء کے لئے اس حقیقت کو جان لینا ضروری ہے کہ ان کی حیثیت کسی اسکول اور جز وقتی آفس کے ملازم کی نہیں، بلکہ ان کی حیثیت سرحد پر مقرر حفاظتی فوجیوں کی ہے، ایک ایسے سپاہی کی ہے جو صرف خدا سے اجر پانے کے لئے کام کرتا ہے اور جو اپنی سرحد کی ایک ایک انچ کی حفاظت کے لئے خونِ جگر کا تحفہ پیش کرنے کو تیار رہتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل مصر سے کہا تھا کہ تم مسلسل سرحد کی حفاظت پر مامور رہو، گویا جنگ کی حالت میں ہو، حالاں کہ اس وقت مصر کی سرحدوں کو کوئی قابل ذکر خطرہ درپیش نہیں تھا۔ یہ کون سی جنگ تھی؟ یہ جنگ تہذیب وتمدن کی جنگ تھی، یہ جنگ مسلمانوں کو شعائرِ اسلام پر باقی رکھنے کی جنگ تھی اور یہ جنگ ان ہزاروں لوگوں کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کی جنگ تھی، جو ابھی دامن اسلام میں آئے تھے۔

یہی جنگ ہے جو اس وقت مسلمانوں کو اس ملک میں لڑنی ہے اور اس کی کمان علماء کو اپنے ہاتھ میں لینی ہے، یہ جنگ تیغ وشمشیر اور توپ وتفنگ کی نہیں، بلکہ دعوت واصلاح اور اُمت کے مسائل کے بارے میں فکرمندی اور دردمندی کی ہے۔ جولوگ انبیاء کے وارث بنیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس درد کی میراث میں بھی حصہ دار ہوں، کہ یہ انبیاء کی خصوصیت رہی ہے، انسانیت کے بے راہ لوگوں کے لئے ان کی آنکھیں رات رات بھر خدا کے سامنے اُبلتی رہتی تھیں، ان کا سوز دروں لوہے جیسے دلوں کو بھی پگھلا کر رکھ دیتا تھا اور جیسے کوئی مچھلی پانی کے لئے اور کوئی مریض جاں بہ لب صحت وشفاء کے لئے بے چین ہوتا ہے، اسی طرح وہ بے چین ہوتے تھے کہ کیوں کر محرومان ہدایت کو ایمان کا آبِ حیات پلادیں اور کس طرح مریضانِ روح کو صحت وشفا سے شادکام کریں! یہی کسک جب تک کلیجوں کو بے سکون نہیں کرے، ممکن نہیں کہ عالم اس فریضہ کو انجام دے سکے جو وارث نبوی ﷺ کی حیثیت سے اس کے ذمہ آتی ہے، اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ علماء اور مشائخ موجودہ حالات میں اس حقیقت کو سمجھ لیں، کہ درس گاہوں کی چھتوں اور خانقاہوں کی خلوت گاہوں میں بیٹھ کر مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت نہیں ہوسکتی، اگر علماء، اُمت کے دوسرے مسائل سے پہلوتہی کرنے لگیں تو یہ ایسا خسارہ ہوگا جس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی۔

یہی ہندوستان میں علماء کا طریقہ کار رہا ہے، سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے کارواں کو دیکھئے کہ کلکتہ کے ساحل سمندر سے سرحد کے میدانِ کارزار تک کہاں کہاں اس کے نقش پا ثبت ہیں؟ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دیوبند کی درس گاہ میں بھی ہیں، شاملی کے کارزار میں بھی اور میلۂ خداشناسی میں حق کی ترجمانی کا حق بھی ادا کررہے ہیں، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ عیسائیت کا تعارف کرنے کے لئے آگرہ سے حجاز ومصر اور ترکی تک پہنچتے ہیں، مولانا محمد علی مونگیریؒ اپنے شیخ کے حکم پر کانپور کے راحت کدہ کو چھوڑ کر مونگیر پہنچتے ہیں اور فتنۂ قادیانیت سے ایک بڑے علاقہ کے مسلمان کی حفاظت کرتے ہیں، مولانا انورشاہ کشمیریؒ ایک بلند پایہ محقق اور ایسے محدث ہیں کہ علماء کے درمیان ان کے علم کا طوطی بولتا ہے، لیکن حضور ﷺ کی ختم نبوت کی حفاظت کے لئے کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہیں؟ اور اپنے خلوت کدہ کو خیرباد کہہ کر فتنۂ

قادیانیت کی عین جائے پیدائش پنجاب پہنچ کر اس نامراد فتنہ کی سرکوبی فرماتے ہیں، مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کے مقبول عام وخاص مدرس تھے، لیکن اُمت کی حفاظت اور ایمان کی تڑپ نے بہار کے چھوٹے چھوٹے گاؤں کی آبلہ پائی پر مجبور کیا، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ استاذ الاساتذہ ہیں، لیکن اپنے گوشۂ عافیت کو چھوڑ کر کہاں کہاں کی صحرا نوردی کی؟ یہاں تک کہ جرم بے گناہی میں مالٹا کے قید خانہ تک پہنچے۔

پھر ذرا اور اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھئے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، حضرت شرف الدین یحیٰ منیری اور ملک کے کونہ کونہ میں آسودۂ خواب صوفیاء کی تاریخ پڑھئے، یہ سب اپنے عہد کی مشہور ومقبول درس گاہوں کے تربیت یافتہ تھے، وہ کہاں پیدا ہوئے؟ کہاں سے فیض حاصل کیا؟ کہاں کہاں جاکر خیمہ زن ہوئے؟ اور کہاں خود ان کے ذریعہ چشمۂ فیض جاری ہوا؟ اسی شہر حیدرآباد کو جن بزرگوں کی نسبت سے عزت حاصل ہے، ان میں ایک بابا شرف الدین سہروردیؒ ہیں، جو عراق میں پیدا ہوئے اور کتنے ہی دشت و بیابان سے گذر کر دکن میں اولین داعیٔ اسلام کی حیثیت سے فروکش ہوئے اور ۵۸۷ھ میں یہیں وفات پائی، اگر اس نقطۂ نظر سے صوفیاء کے احوال کا مطالعہ کیا جائے، تو اسلام کی تاریخ دعوت کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے اور یہ علماء کے لئے متاعِ عبرت ہے۔

سلف صالحین میں کم ہی ایسے لوگ ملیں گے، کہ جس مٹی میں وہ پیدا ہوئے ہوں اسی مٹی کو اپنی ابدی خواب گاہ بھی بنایا ہو، غرض علماء زندگی کے تمام مسائل میں اُمت کے رہنما ہیں، انھیں اپنے مقام کا ادراک کرنا ہوگا، جب ہی وہ حالات کے بھنور سے اس سفینہ کو ساحل مراد تک پہنچا سکیں گے، ایمان وعقیدہ کی حفاظت کا مسئلہ ہو، عبادات اور شعائر اسلامی میں کوتاہی کی صورت ہو، سماجی زندگی میں حق تلفی اور ظلم و ناانصافی کی بات ہو، مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کی مہمات ہوں، ہر محاذ پر انھیں ایک مخلص سپاہی کی طرح آگے بڑھنا ہوگا، اس کے بغیر وہ بدلتے ہوئے حالات میں اس اُمت کی رہنمائی کا فریضہ ادا نہیں کرسکتے اور اگر علماء نے اس کو نظر انداز کیا، تو پھر کوئی طبقہ نہیں جو اس ذمہ داری کو اس کے حدود وآداب اور تقاضوں کے ساتھ ادا کرسکے۔

دینی مدارس کا نصابِ تعلیم

ایک مخلصانہ مشورہ!

دینی مدارس اشاعت علم اور تربیت اخلاق کا جو کام کر رہے ہیں، وہ کسی عام سے عام آدمی کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں، برصغیر میں مدارس کا جو منفرد نظام ہے، اس نے سماج کے غریب طبقات کو اونچا اُٹھانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلام کے تحفظ، مسلمانوں کے عقیدہ وعمل کی اصلاح اور دور دراز کے دیہاتوں تک کتاب وسنت کی روشنی پہنچانے میں ان درس گاہوں کا جو عظیم رول ہے، وہ اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے مغربی استعمار اور مغربی ثقافت کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باوجود نہ صرف برصغیر، بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے اندر اسلامی روح کو بیدار رکھنے بلکہ اس کو مزید طاقتور بنانے کا سہرا ''نظام مدارس'' ہی کے سر ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ '' ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں''، کوئی بھی نظام ہو، وقت اور حالات کے لحاظ سے، اس میں جزوی تبدیلی ضروری ہوجاتی ہے، پھر ہر عہد میں جو نئے وسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس پہلو سے بھی مدارس کے ذمہ داروں کو غور وفکر کی ضرورت ہے اور یہ تبدیلی وقتاً فوقتاً ہوتی بھی رہی ہے، مثلاً اس وقت زیادہ تر مدارس میں ملا نظام الدین سہالوی کا نصاب جاری وساری ہے اور انہی کی نسبت سے یہ ''درسِ نظامی'' کہلاتا ہے، اس وقت درس نظامی کا سب سے نمائندہ ادارہ دارالعلوم دیو بند کو خیال کیا جاتا ہے، خود دارالعلوم دیو بند نے مدارس کے نظام پر جو گہرے اثرات ڈالے ہیں؛ بلکہ ایک

نئے نظام کو وجود بخشا ہے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی حقیقت پسند شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا، آج نہ صرف ایشیا بلکہ افریقہ ویورپ اور امریکہ تک دیو بند کے طرز پر مدارس کا جال سا بچھا ہوا ہے اور انھیں اسلام کی حفاظت واشاعت میں ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔

لیکن کیا دیو بند کا نظام تعلیم وہی ہے جو ملا نظام الدین سہالوی کا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ دیو بند کے نصاب پر ملا نظام الدین سے زیادہ شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی چھاپ ہے، اصل درس نظامی میں زیادہ بلکہ اغلب ترین حصہ معقولات کی کتابوں کا تھا، حدیث میں صرف مشارق الانوار اور تفسیر میں صرف مدارک التنزیل پڑھائی جاتی تھی، فقہ کی کتابوں میں قدوری اور شرح وقایہ، لیکن اب دیو بند کے نصاب میں صرف دورۂ حدیث میں حدیث کی ۹/ کتابیں شامل نصاب ہیں، ان کے علاوہ دورہ سے پہلے مشکوٰۃ شریف اور ریاض الصالحین یا اس سے مماثل کوئی اور کتاب نصاب میں شامل ہے اور بعض درس گاہوں میں آثار السنن بھی پڑھائی جاتی ہے، اس طرح صرف حدیث کی ۱۴/ کتابیں ہوگئیں، فقہ میں ہدایہ کی ۴/ جلدیں، شرح وقایہ، کنز الدقائق، قدوری، نور الایضاح یا اس کے مماثل کوئی اور کتاب داخل نصاب ہے، تفسیر میں متن قرآن کا مکمل ترجمہ مع تفسیر، نیز جلالین مکمل اور بعض مدارس میں بیضاوی کے اسباق بھی ہوتے ہیں اور مجموعی طور پر تین چار سالوں میں پانچ تا سات گھنٹیاں تفسیر کے مضمون کے لئے دی جاتی ہیں۔ اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دیو بند کے نصاب پر ذوق ولی اللہی کی چھاپ غالب ہے!

اصل درس نظامی میں بھی معقولات کی بعض ایسی کتابیں —— جن کے مصنفین ملا سہالوی کے بعد کے ہیں —— شامل تھیں، اس لئے زمانہ اور حالات کے لحاظ سے نصاب تعلیم میں جزوی طور پر کمی بیشی کوئی نامناسب بات نہیں ہے، مدارس کے موجودہ نصاب کے بارے میں بعض حضرات یہ خیال رکھتے ہیں کہ دینی مدارس میں مکمل عصری تعلیم ہونی چاہئے، یعنی ایک شخص عالم بھی ہو اور ڈاکٹر بھی، عالم بھی ہو اور انجینیر بھی، عالم بھی ہو اور میکانک بھی، وغیرہ وغیرہ، یہ ایک غیر فطری اور غیر عملی خواہش ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی درخت سے چاہا جائے وہ آم کا پھل بھی دے اور سیب کا بھی، اب یہی دیکھئے کہ کسی ڈاکٹر سے آج تک یہ خواہش نہیں کی گئی کہ وہ انجینیر بھی ہو، اور نہ کسی انجینیر پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ قانون داں کیوں نہیں؟

اس لئے کہ اب علوم وفنون کی شاخ در شاخ ہوگئی ہے اور ایک شخص کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ علمی شعبوں کی مکمل تحصیل عادتاً ممکن نہیں ، یہ بات کہ ایک طالب علم عربی زبان میں بھی استعداد حاصل کرلے اور انگریزی زبان پر بھی اس کو بڑی حد تک دسترس ہو جائے ، عمومی طور پر دشوار ہے؛ اس لئے یہ ایسی باتیں ہیں جو کانوں کو یقیناً بھلی لگتی ہیں اور بادی النظر میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں ، لیکن یہ ہیں غیر عملی ، جن اداروں میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے ، وہاں لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ اس طرح کا نصاب تعلیم دونوں طرف آدمی کو ادھورا رکھتا ہے ، اس سے نہ تو طالب علم اچھا عالم دین بن سکتا ہے اور نہ دوسرے علوم میں کوئی مفید اور کام کا آدمی ، ہاں یہ بات ممکن ہے کہ کسی عالم کو آپ موٹر میکانک یا الکٹریشن بنادیں ، لیکن سوچئے کہ اس کا حاصل کیا ہے؟ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان پیشوں سے ذریعۂ معاش حاصل کرلے تو یقیناً یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔

لیکن جو لوگ ان پیشوں میں لگ جاتے ہیں ، وہ بہ حیثیت عالم دین سماج میں اپنا کردار ادا نہیں کرپاتے ، اس کی بہت سی مثالیں ہم لوگوں کی نگاہ میں ہیں ، اس لئے یہ پیشے علماء کے لئے موزوں نہیں اور سماج میں ان کے کام کرنے کے لئے جو وقار مطلوب ہے ، اس سے ہم آہنگ بھی نہیں ، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ قوم کے جو بچے ان پیشوں میں تربیت پارہے ہوں ، ان کے لئے ضروری حد تک دینی تعلیم کا نظم کردیا جائے تاکہ وہ اپنا کام کرتے ہوئے بہتر مسلمان ثابت ہوں ۔ محض دین دار میکانک تیار کرنے کے لئے سات آٹھ سال ان کی تعلیم کے لئے وقت لینا اور ان کی پرورش پر قوم کی کثیر اعانت کو خرچ کرنا ایک بے معنی بات ہوگی ، نصابِ تعلیم میں ایسی تبدیلی مدارس کے کردار کو ختم کرکے رکھ دے گی ، چنانچہ برصغیر کے نہج سے ہٹ کر بعض ممالک ، جیسے مصر ، شام ، عراق اور ترکی وغیرہ میں دینی تعلیم کا جو نظام ہے ، وہاں اس کیفیت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے ، سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ جیسے آج کے سماج میں ایک ڈاکٹر کو خدمت خلق کے جذبہ سے زیادہ کسب زر کی خواہش بے چین رکھتی ہے ، اسی طرح اُن علماء کے اندر دینی حمیت ، حفاظت دین کا جذبۂ ایمانی غیرت اور اسلامی شعائر سے محبت کا

عنصر بہت کم نظر آتا ہے، وہ اس لئے پڑھاتے ہیں کہ یہ ان کا ذریعہ معاش ہے، وہ اس لئے تصنیف وتالیف کا کام کرتے ہیں کہ اس سے ان کے معاشی واخلاقی مفادات متعلق ہیں، ورنہ عوام سے ان کا کوئی ربط ہے اور نہ عوام میں پھیلی ہوئی عقیدہ وعمل کی کمزوریوں کے بارے میں کوئی گہری فکر۔

برصغیر میں مدارس کا جو تعلیمی نظام ہے وہ صرف دماغ ہی کو روشنی فراہم نہیں کرتا بلکہ فکر کی ارجمندی کے ساتھ ساتھ دل کی دردمندی بھی عطا کرتا ہے۔ یہ اس تعلیم کے ساتھ علاقہ کے عوام پر بھی اپنی گرفت رکھتا ہے۔ ان کے عقیدہ وعمل کے اصلاح کے لئے جگہ جگہ جاکر بیانات کرتا ہے، کہیں مسلمان بچے تعلیم حاصل نہیں کررہے ہیں، تو وہاں قیام مکاتب کی تحریک بیدار کرتا ہے، کہیں دبے پاؤں کوئی مخالف اسلام فتنہ سر اُٹھارہا ہے۔ تو اس کی سرکوبی کے لئے سرگرم عمل ہوجاتا ہے، یہ اسی نظام تعلیم کا اثر ہے۔

لیکن علماء کے اپنے عہد کے تقاضوں سے باخبر رہنے کے لئے مدارس کو اپنے نظام میں کچھ تبدیلیاں لانے کی بھی ضرورت ہے، اس میں سب سے اہم مسئلہ زبان کا ہے۔ انگریزی زبان اس وقت عالمی رابطہ کی زبان ہے، یہ زبان نہ صرف غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے ضروری ہے، بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل بھی تیزی سے اُردو کی گرفت سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے ہمیں ایک طرف اُردو زبان کی ترویج کی کوشش کرنی چاہے اور دوسری طرف علماء کو انگریزی زبان سے آراستہ کرنا چاہئے، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج اسلام کے خلاف جو کچھ لکھا جارہا ہے اور علمی وفکری جہت سے دین حق پر جو یلغار ہورہی ہے، وہ زیادہ تر اسی زبان میں ہے، اگر علماء اس زبان کے سمجھنے اور اسی میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لائق نہ ہوسکے، تو وہ اسلام کی حفاظت واشاعت کا فریضہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو نظر انداز کرنا چڑھتے سورج سے آنکھیں موندنے کے مترادف ہوگا۔ ایک صاحبِ علم نے لکھا ہے کہ انگریزی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے علماء اس صدی میں مقام احترام پر تو فائز ہوئے لیکن مقام قیادت پر فائز نہیں ہوسکے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے!

زبان محض ایک ذریعۂ اظہار ہے،اس کا صحیح وغلط اور مناسب ونامناسب استعمال مفید یا مضر ہوا کرتا ہے،کوئی بھی زبان اسلام کی نگاہ میں بذات خود ناپسندیدہ نہیں ،اس لئے انگریزی زبان پر دسترس آج وقت کی اہم ضرورت ہے،مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند کے ابتدائی نصاب تعلیم میں سنسکرت کو بھی داخل نصاب کیا تھا، یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علماء نے کبھی بھی انگریزی زبان کی مخالفت نہیں کی ۔سرسید احمد خاں مرحوم کے بعض افکار جمہورِ اُمت کے خلاف تھے اور وہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب و ثقافت کی طرف بھی جھکاؤ رکھتے تھے ، علماء نے اس میلان و رجحان سے اختلاف کیا تھا،موجودہ حالات میں خاص طور پر انگریزی زبان کی ایک خاص اہمیت ہوگئی ہے جس سے کسی بھی طرح صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

انگریزی کے علاوہ معاشیات ، سیاسیات کی مبادی ، تاریخ ، جغرافیہ ، اور حساب وغیرہ کے بارے میں بھی ضروری حد تک آگہی علماء کے لئے ضروری ہے،اس لئے کہ بہت سے شرعی مسائل اور دینی حقائق انھیں مضامین سے متعلق ہیں ، آج کے فقہاء اور ارباب افتاء کو خاص طور پر نظام معیشت کے بارے میں جاننا ناگزیر ہے، جب ہی وہ اپنے عہد کے مسائل کے بارے میں صحیح رائے دے سکتے ہیں ۔

ان مضامین کے لئے جگہ نکالنے کی دوصورتیں ہیں ،ایک صورت تو یہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں چھ کے بجائے سات گھنٹیاں کردی جائیں اور ایک گھنٹی ان مضامین کے لئے رکھی جائے اور اس کے لئے کچھ اور گنجائش پیدا کرنے کی غرض سے منطق اور فلسفہ کی قدیم کتابوں میں کچھ کمی کی جاسکتی ہے ۔اس لئے کہ منطق میں مرقات ،شرح تہذیب ، قطبی اور سلم العلوم اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں ، گویا چار سال یہ مضمون پڑھائے جاتے ہیں ، اسی طرح قدیم فلسفہ میں ہدایۃ الحکمۃ ، ہدیہ سعیدیہ اور میبذی کے اسباق ہوتے ہیں ، ان تین کتابوں کے لئے دوسال میں ایک ایک گھنٹی دی جاتی ہے،اب اگر منطق کے لئے دو گھنٹی اور قدیم فلسفہ کے لئے ایک گھنٹی پر اکتفا کردیا جائے ،تو مزید تین گھنٹیاں نکل آتی ہیں ،اسی طرح عربی کی ابتدائی جماعتوں میں بعض اسباق جو روزانہ ہوا کرتے ہیں ،اگر ہفتہ میں چار دن ہو

ں تب بھی کتاب پوری ہوسکتی ہے، اس طرح ہفتہ میں دو دن کا وقت خالی کیا جاسکتا ہے ----- اگر ہم اس طرح وقت نکالیں تو معمولی تبدیلی کے ساتھ ان ضروری مضامین کے لئے وقت فراہم ہوسکتا ہے۔

دوسری اور اس سے اعلیٰ صورت یہ ہے کہ میٹرک تک تعلیم ہر طالب علم کو دی جائے؛ البتہ اس میں شروع سے دوتین گھنٹیاں اسلامیات کے لئے لے لی جائیں اور میٹرک کے بعد جیسے پانچ سال میں انٹر اور گریجویشن ہوتا ہے، اسی طرح پانچ سال میں عالم کورس کو مکمل کیا جائے، اگر میٹرک تک عربی نحو وصرف، ادب وغیرہ کی مبادیات طلبہ پڑھ چکے ہوں تو اس پانچ سال میں جو عربی و اسلامی علوم ہی کے لئے مخصوص ہوں، بہ سہولت درس نظامی کی تکمیل کرسکتے ہیں، اور چوں کہ یہ ساری تعلیم مدرسہ کے ماحول میں ہوگی، اس لئے اسلامی خطوط پر ان کے ذہن ومزاج کی نشو ونما ہوتی رہے گی، مدارس کا موجودہ نصاب نو سالہ عالم کورس اور چار تا پانچ سالہ شعبہ ابتدائی پر مشتمل ہے، گویا تیرہ چودہ سال کا عرصہ اس کورس کی تکمیل پر لگتا ہے اور اگر میٹرک کے ساتھ عالم کورس ہو تو اس کی مدتِ تعلیم ۱۵/ سال ہوجائے گی، یعنی ۱۹/۲۰/ سال کے عرصہ میں لڑکے میٹرک کرنے کے ساتھ ساتھ عالم کورس مکمل کرلیں گے، گویا یہ اسلامی علوم میں گریجویشن کرنے کے مماثل ہوگا، اب جو طلبہ باصلاحیت ہوں وہ تخصص اور تحقیق کے شعبوں میں پڑھ سکتے ہیں، یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے اور اس طرح جدید وقدیم کے درمیان جو فاصلہ محسوس کیا جاتا ہے، اسے بہتر طریقہ پر پُر کیا جاسکے گا۔

ذمہ داران مدارس سے دردمندانہ درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ میں غور کریں اور موجودہ حالات کے تناظر میں مدارس کے موجودہ نصابِ تعلیم کا جائزہ لیں؛ کیوں کہ تعلیم کا مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو اپنے عہد میں اسلام کی حفاظت واشاعت کی خدمت انجام دے سکیں، مدارس بر قول مولانا علی میاںؒ میوزیم اور عجائب خانہ نہیں ہیں، جہاں مداحت کی حامل از کار رفتہ یادگاریں محفوظ کی جاتی ہیں۔ اگر اس نقطۂ نظر سے نصاب میں کچھ مضامین بڑھائے اور کچھ گھٹائے جائیں، تو یہ عین اس مقصد ومزاج کے مطابق ہے، جس کے لئے مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے، اسی لئے تو منطق وفلسفہ کو علماء نے داخل نصاب کیا تھا، یہ ایسے فنون نہیں

ہیں جن کا اسلام سے براہ راست رابطہ ہو بلکہ ان کے بعض نظریات تو اسلامی نقطۂ نظر سے متعارض ہیں۔اس کے باوجود ان علوم کو شریک نصاب رکھا گیا۔کیوں کہ ایک زمانہ میں انہی علوم کے ذریعہ اسلام کے خلاف اعتراضات کئے جاتے تھے۔آج کے دور میں انگریزی زبان اور بعض عصری مضامین کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

☆☆☆

دینی مدارس میں فقہ اسلامی کا نصاب ☆

اسلامی تعلیمات کے دو سرچشمے ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ —— قرآن مجید میں اصل بحث اعتقاد اور اساسیاتِ دین سے کی گئی ہے، زندگی کے عملی مسائل پر بہت کم اظہار خیال فرمایا گیا ہے، چنانچہ محققین کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں احوال شخصیہ سے متعلق ستر، شہری قوانین سے متعلق ستر، قانون جرم وسزا سے متعلق تیس، عدالتی قانون سے متعلق تیرہ، مالی اور اقتصادی قانون سے متعلق دس، دستوری اور آئینی قوانین سے متعلق بھی دس اور بین الاقوامی معاملات سے متعلق پچیس آیات نازل ہوئی ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ قرآن نے ہر شعبۂ حیات سے متعلق بنیادی اُصول وقواعد متعین فرمادیئے ہیں اور شریعت کے اساسی مقاصد اور مقتضیات کو واضح کردیا ہے۔

حدیث میں نسبتاً عملی احکام پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے اور زندگی کے ایک ایک گوشہ کے لئے عملی نمونہ فراہم کردیا گیا ہے، لیکن حدیث میں بھی عبادات اور اخلاقیات کی تو پوری طرح تحدید کردی گئی ہے، لیکن معاملات کے باب میں کچھ ضروری اور اصولی احکام پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے؛ اس لئے ہر دور میں پیدا ہونے والے مسائل کے لئے قرآن وحدیث میں بنیادی ہدایات تو مل جاتی ہیں، لیکن ان کے قطعی حل کے لئے غور وفکر کی حاجت باقی رہ جاتی ہے اور ایسا کیا جانا ضروری بھی تھا کہ اگر یہ صورت اختیار نہ کی جاتی تو اُمت کے لئے بڑی تنگی پیدا ہوجاتی اور بعض دفعہ بدلے ہوئے حالات میں جزوی تفصیلات پر عمل کرنے کی وجہ سے شریعت کے بنیادی

☆ یہ مقالہ دار العلوم حیدرآباد میں منعقدہ دینی تعلیمی کانفرس میں پیش کیا گیا، جس کی صدارت مولانا ابو العرفان ندوی نائب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء فرمارہے تھے، اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ، مولانا وحید الدین خان (مدیر الرسالہ) اور ہندوستان بھر سے آئے ہوئے موقر علماء اس میں شریک تھے۔

مقاصد مجروح ہو کر رہ جاتے۔

اسی غور وفکر کا نام ''اجتہاد'' ہے اور علماء کے اجتہادات کی مرتب شکل کا نام ''فقہ'' ہے گویا فقہ ایک طرف کتاب وسنت سے ماخوذ اور اس کی تعلیمات کا عطر وخلاصہ ہے اور دوسری طرف انسانی زندگی سے اس کا گہرا رشتہ ہے؛ اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامی میں سے کوئی اور فن انسانی زندگی سے اس درجہ مربوط نہیں ہے، جیسا فقہ ہے۔ یہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک مرتب نظام نامۂ حیات اور شریعت کے منشأ ومقصود کی عملی تشکیل ہے، اس لئے علماء اور دینی علوم کے حاملین کے لئے فقہ میں مہارت اور درک ومعرفت ناگزیر ہے۔

اس وقت ہمارے مدارس میں فقہ کا جو نصابِ تعلیم ہے، وہی ہمارا موضوع ہے، اور نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم دونوں پہلوؤں سے دوچار باتیں عرض کرنی ہیں۔

فقہ کے فن کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک فقہ، دوسرے اُصولِ فقہ اور تیسرے قواعد فقہ، فقہ میں علامہ ابوالحسن مرغینانی کی ''ہدایہ'' ایک بے نظیر کتاب ہے، مرغینانی نے امام قدوری کی مختصر اور امام محمد کی الجامع الصغیر دونوں کو ملا کر فقہ کا نہایت جامع متن تیار کیا اور پھر اس کی نہایت طویل ومبسوط شرح ''کفایۃ المنتھی'' کے نام سے لکھی، پھر اس کی نہایت جامع اور ''قلّ و دلّ'' کا مصداق تلخیص ''ہدایہ'' کے نام سے کی، جو اہل علم اور ارباب ذوق کے لئے صدیوں سے چشم عقیدت کا سرمہ ہے، مصنف کو بعضوں نے ''مجتہد فی المذہب'' قرار دیا ہے اور بعضوں نے ''اصحاب ترجیح'' کے زمرہ میں رکھا ہے، واقعہ ہے کہ مؤلف کو ''مجتہد فی المذہب'' قرار دینا قرین انصاف ہے، مسائل کے احاطہ، منقول ومعقول دلائل کے انتخاب، طرزِ استدلال کی قوت اور ایجاز میں اس کا جواب نہیں۔ اس کتاب کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ یہ اپنے قارئین کو غور وفکر کا ایک نہج عطا کرتی ہے اور استنباط واستنتاج کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اگر یہ تقاضۂ بشریت اس میں یہ کمزوری نہیں ہوتی کہ احادیث سے استدلال میں صحیح روایات کے ساتھ بہت سی سقیم روایات بھی آ گئی ہیں، جس کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو کہنا پڑا:

''مصنف دے درا کثر بناء کار بر دلیل معقول نہادہ واگر

حدیث آوردہ نزد محدثین خالی از ضعفے نہ غالباً اشتغال گوں اسناد در علم حدیث کم تر بودہ است''۔ (شرح سفر السعادۃ:۱۲۳)

تو شاید فقہ اسلامی کے پورے ذخیرہ میں اس کے مماثل ہی نہیں، بلکہ اس سے قریبی درجہ پانے کی بھی کوئی اور کتاب مستحق نہیں ہوتی، دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں اس کتاب کا جگہ پانا: ''حق بہ حقدار رسید'' کے مصداق ہے، مگر صورتِ حال یہ ہے کہ ہدایہ کے چار حصوں میں عملاً صرف پہلا حصہ ہی مکمل ہو پاتا ہے، جو عبادات پر مشتمل ہے اور جس کی بحثیں مختلف کتب فقہ کے علاوہ کتب حدیث میں بھی کثرت و تکرار کے ساتھ آتی رہتی ہیں، ہدایہ کی بقیہ جلدیں جو معاشرتی احکام، بین ممالک قانون اور اقتصادی قوانین سے متعلق ہیں، تشنۂ تکمیل رہتی ہیں، یہ وہ مسائل ہیں جن میں احکام کی بنیاد نصوص سے زیادہ قیاس اور عرف و مصلحت پر ہے، ان سے طلبہ کا نا آشنا رہ جانا، زندگی کے مختلف گوشوں میں اسلامی تعلیمات و ہدایات سے ان کی محرومی کے ہم معنی ہے، اس لیے اس حقیر کا خیال ہے کہ دو سال میں چار کے بجائے پانچ گھنٹوں میں اگر یہ کتاب مکمل کر دی جائے تو طلبۂ فقہ پر احسان عظیم ہوگا۔

ہمارے نصاب میں اس سلسلہ کی دوسری کتاب ''المختصر للقدوری'' پڑھائی جاتی ہے، اس کے مصنف امام ابوالحسین احمد بن محمد قدوری (م ۴۲۹ھ) ہیں، جو پانچ واسطوں سے امام محمد کے شاگرد ہیں، قدوری مسائل کے احاطہ و انتخاب، تعبیر کی سلاست و وضاحت، استناد کے اعتبار سے تثبت و احتیاط، نیز حسن ترتیب میں نہایت اعلیٰ درجہ کی تالیف ہے اور فقہی متون میں اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے، یہ کتاب عربی تعلیم کے ابتدائی سالوں میں پڑھائی جاتی ہے اور غالباً اکثر مدارس میں یہ بھی تشنۂ تکمیل ہی رہتی ہے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ تین اور کتابیں اس موضوع پر داخل درس ہیں، ابتدائی جماعت میں ''نورالایضاح'' جو ابوالاخلاص حسن بن عمار شرنبلالی (۱۰۶۹ھ) کے قلم سے ہے، اس کا موضوع عبادات یعنی ارکان اربعہ ہیں، شرنبلالی کو فقہاء میں وہ درجہ نہیں دیا گیا ہے جو مرغینانی اور قدوری نے پایا ہے اور اس کی مثال خود یہ کتاب ہے جس میں سنن و آداب وغیرہ کے نقل کرنے میں جابجا تسامح ہوا ہے، عبارت میں بھی وہ سلاست و برجستگی نہیں ملتی، جو امام قدوری

کے متن میں ہے، اور نصابی نقطۂ نظر سے سب سے قابل توجہ امر یہ ہے کہ کتاب کی ابتداء ہی میں غسل واستنجاء وغیرہ کے مسائل میں ایسی وضاحت کا اُسلوب اختیار کیا گیا ہے، جو کم سن اور شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے والے طلبہ کے سادہ ذہن کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

دوسری کتاب ''کنز الدقائق'' ہے، ابوالبرکات نسفی (۷۱۰ھ) نے حنفیہ کی مستند آراء پر مشتمل نہایت جامع متن اس کتاب کی صورت میں مرتب فرمایا ہے، خود نسفی نے اس کو ظاہر روایت سے ثابت شدہ احکام کا مجموعہ بتایا ہے: ''لانه موضوع لظاهر الرواية'' (البحر الرائق : ۷/۲۳۲) —— علامہ نسفی کے علمی مقام و مرتبہ کی شاہد تفسیر میں ''مدارک التنزیل'' اور اُصول میں ''المنار'' ہیں، کہ ان کو جو شہرت عام اور نقش دوام اپنے فن میں حاصل ہوا، اس کی مثال کم ہی مل پاتی ہے۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ اس دور وسطی کی تالیف ہے جب فن پر توجہ دینے اور اس میں اضافہ کرنے کے بجائے ایسی تحریروں کا رواج پڑ گیا تھا، جس میں مختصر سے مختصر عبارت میں بیش از بیش معانی کو سمیٹ لیا جائے، خواہ الفاظ و عبارت کی اس کفایت کے نتیجہ میں قارئین کا وقت کتنا بھی صرف ہو جائے اور ایک ایک سطر کی عقدہ کشائی میں بے چارے شارحین کے صفحات بھی کافی نہ ہو پائیں، افسوس کہ خود ''کنز الدقائق'' بھی اسی مزاج کی کتاب ہے اور اس کے اختصار نے حد ایجاز کو پار کر کے اغلاق کی صورت اختیار کر لی ہے۔

تیسری کتاب تاج الشریعہ محمود کے فقہی متن ''وقایہ'' پر ان کے پوتے صدر الشریعہ الاصغر عبید اللہ بن مسعود (م ۷۴۷ھ) کی مفصل شرح ہے، جو ''شرح وقایہ'' کے نام سے معروف و متداول ہے، ''شرح وقایہ'' کو فتاویٰ وغیرہ میں ''ہدایہ'' و ''قدوری'' اور ''کنز'' کا سا استناد حاصل نہیں، بہت سے مقامات پر طول بیان ہے اور درازنفسی کا احساس ہوتا ہے، اور اس کی بعض مقامات پر مزید اُلجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

یہ دو کتابیں ایسی ہیں کہ ان کا متبادل موجود ہے، ''شرح وقایہ'' کی جگہ ملا علی قاری کی ''شرح نقایہ'' بڑی عمدہ چیز ہے، ملا علی قاری بلند پایہ محدث ہیں اور جب کسی مصنف کے ذوق

میں حدیث وفقہ کا ''قران السعدین'' ہوجائے تو اس کی آب وتاب ہی اور ہوتی ہے، میں نے سنا کہ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی رائے بھی یہی تھی، بہتر ہوگا کہ شرح وقایہ کی جگہ اس کتاب کو شریک نصاب کیا جائے، —— نورالایضاح کی جگہ مولانا شفیق الرحمٰن ندوی نے ''الفقہ المیسر'' کے نام سے اس سن وسال کے طلبہ کے لئے بڑی اچھی چیز تیار کردی ہے۔ زبان سہل ہے، چھوٹے فقرے ہیں، تراکیب بھی آسان ہیں، مسائل وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، ترتیب بھی اچھی ہے، ان مسائل سے صرف نظر کیا گیا ہے جن کی ابھی ان طلبہ کو ضرورت نہیں، ساتھ ہی نئے طریقہ پر ''تمرینات'' بھی قائم کردی گئی ہیں، ضرورت ہے کہ ''دینی مدارس'' اسے قبول کریں، مگر افسوس کہ بعض دفعہ گروہی حد بندیاں اور تنگنائیاں اعتراف وتسلیم میں رکاوٹ ہوجاتی ہیں، وإلى الله المشتكى۔

تقابلی مطالعہ

تقابلی مطالعہ وبحث کا ذوق واقعہ ہے کہ دوسرے اہل فن کے مقابلہ فقہاء کے ہاں زیادہ ہے، اہل سنت کے چاروں دبستانِ فقہ پر متعدد کتابیں اس موضوع کی لکھی گئی ہیں، قدیم علماء نے بھی لکھی ہے اور ماضی قریب میں بھی بعض عرب اہل علم نے اس پر بڑا قیمتی کام کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ پر ایک ایسی کتاب بھی شریکِ نصاب ہو جو مختلف فقہی آراء کا معروضی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کراتی ہو، اس سے نگاہ میں وسعت اور فکر وخیال میں فراخی پیدا ہوگی اور نقد وتحقیق کی صلاحیت اُبھرے گی، اس سلسلہ میں ابن رشد قرطبی کی ''بدایۃ المجتہد'' کی عظمت شان اور قدر وقیمت سے کسے انکار ہوگا؟ پوری کتاب نہ سہی کچھ ابواب بھی پڑھا دیئے جائیں تو مسائل میں فقہی جزئیات پر قناعت کی بجائے ان کی بنیاد واساس کو سامنے رکھ کر سوچنے کا ذوق پیدا ہوگا۔

طریقۂ تعلیم

لیکن مسئلہ کتاب سے زیادہ کتاب پڑھانے کے اُسلوب ونہج کا ہے، اساتذہ کا ذوق اور ان کی محنت اصل میں طلبہ کے ذہن وفکر کی تعمیر کرتی، ذوق کو پروان چڑھاتی اور آتش شوق کو سلگاتی اور بھڑکاتی ہے، فقہ کی تعلیم میں دو بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ کتاب

اور مسائل کے حل میں طلبہ کو شریک کیا جائے، کتاب کی عبارت ان سے حل کرائی جائے، گاہے گاہے دلائل پر ان کو بحث کا موقع دیا جائے، ان سے کہا جائے کہ اس پر تنقیدی نظر سے غور کریں، استحسانی مسائل میں خود طلبہ سے یہ بات نکلوائی جائے کہ اس سلسلہ میں قیاس جلی اور قیاس خفی کیا ہے اور وجہ استحسان کیا ہے؟ اس سے ان میں نقل و روایت کی بجائے مسائل کی روح پر غور کرنے اور سوچنے کا ذوق پیدا ہوگا۔

دوسری اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اس دور میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، وہ بالعموم فقہاء کے قدیم اجتہادات سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتے ہیں۔ تو جہاں ایسے مسائل آئیں جن سے موجودہ زمانہ کے کسی نو پید مسئلہ کا تعلق ہو، وہاں خصوصی اہتمام اور شرح و بسط کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈالیں، جیسے: ربا کے تحت بینک انٹرسٹ کا، قمار کے تحت انشورنس کا بیع کے تحت موجودہ زمانہ کی بیع کی بہت سی نت نئی شکلوں کا، جہاد و سیر کے ابواب میں ہندوستان کی شرعی حیثیت کا، بیع صرف کے ذیل میں زر کی حقیقت اور زر اصطلاحی اور فی زمانہ مروج کرنسی نوٹوں کا، اگر اس بیدار مغزی اور چوکسی کے ساتھ تعلیم دی جائے تو طلبہ مسائل عصر سے بے بہرہ نہ رہ پائیں گے، مگر ہر مدرس سے اس کی توقع رکھنا مشکل ہے؛ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مدرسین کے لئے ایک ایسی ''کلید'' مرتب کی جائے جو ان کی رہنمائی کرتی ہو کہ ان کو کسی نصابی کتاب کے کس مسئلہ کے ذیل میں کن نئے مسائل پر بحث کرنی ہے؟ ممکن ہے اس طرح اس دشواری کا حل نکل سکے۔

ہمارے موجودہ طرز تدریس میں علوم شرعیہ میں مختلف فنون کی تعلیم کے لئے یکساں انداز اختیار کیا جاتا ہے، مثلاً حدیث کے درس اور فقہ کے درس میں کوئی اجنبی شخص بیٹھے تو کم ہی فرق کر پائے، فقہ کے درس کا بھی یہی حال ہے ابواب وفصول کے درمیان باہمی ارتباط کی بحث، مصنف سے کہیں تسامح ہوگیا ہے تو اس کے لئے بہ ہزار تکلف تاویل وتوجیہ —— اس طرح کی بحثوں کی بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہی باب کو پڑھانے سے پہلے اس باب فقہی سے متعلق فقہ کے بنیادی ضوابط وقواعد طلبہ کو بتا دئے جائیں، تاکہ طلبہ کے لئے تطبیق میں آسانی ہو اس مقصد کے لئے بھی مدرسین کو کلید فراہم کرنا ہوگی، اس کے لئے شیخ حمزہ دمشقی

کی ''الفوائد البھیة فی القواعد الفقھیة'' بڑی عمدہ چیز ہے، جس میں قواعد فقہ کو ابواب فقہیہ کی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے، اس سے ہر باب میں شریعت کا مزاج و مذاق اور بنیادی اصول سامنے آجاتے ہیں۔

جدید فنون کی مبادیات

فقہ — جیسا کہ عرض کیا گیا — محض کوئی نظری اور خیالی فن نہیں ہے؛ بلکہ وہ انسان کی عملی زندگی سے مکمل طور پر مربوط و ہم رشتہ ہے؛ اس لئے زندگی کے نت نئے تجربات اور انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے والے افکار و خیالات سے آگہی ضروری ہے، اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ معاشیات، سیاسیات، جغرافیہ، جنرل سائنس، عالمی قانون کی مبادیات پر مشتمل کتابیں مرتب کی جائیں اور مختلف جماعتوں میں اس طرح ان مضامین کو پڑھا دیا جائے کہ دوسرے مضامین کی تعلیم متاثر نہ ہو، منطق اور فلسفہ کی کتابوں میں تخفیف کر کے بہ سہولت اس کی گنجائش فراہم کی جاسکتی ہے۔

غور کیجئے کہ جو شخص زر کی حقیقت سے واقف نہ ہو وہ سکوں کی فقہی جہت کیوں کر متعین کرسکتا ہے؟ جو بین الاقوامی قوانین سے آگاہ نہ ہو وہ مسلم اور غیر مسلم ممالک کے تعلقات اور ان کی شرعی حیثیت پر کیا بحث کرسکتا ہے؟ جو ملک کے دستور و آئین سے بے خبر ہو وہ کس طرح ہندوستان کی شرعی حیثیت متعین کرسکتا ہے؟ اسی طرح کے بے شمار مسائل ہیں جو ان جدید فنون کے جاننے پر موقوف ہیں۔

اسرار شریعت

کسی بھی قانون میں محض جزئیات اور عام مقررہ اُصول کو جان لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ اس کے ساتھ اس کی حکمت و مصلحت، باہمی ربط و انتظام اور اس کی بنیادی اور اساسی فکر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ایسا ممکن ہے کہ شریعت کے عام اُصول اور عام احکام کے مقابلہ کسی خاص مسئلہ میں شریعت کے مقصد اور مصلحت کی تکمیل کے لئے الگ راہ اختیار کی جائے، اہل علم نے استحسان کی بہت سی تعریفیں کی ہیں، لیکن اس فقیر کا خیال ہے کہ اصل میں جہاں علت اور حکمت کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور قیاس ظاہر پر عمل کرنے کی وجہ سے شریعت کے بنیادی مقصد و منشا اور

مزاج و مذاق کی رعایت نہیں ہو پاتی ، وہاں علت پر حکمت کی ترجیح اور ظاہری قیاس سے عدول کر کے شریعت کے اساس مقصد و منشا کی تکمیل کا نام ''استحسان'' ہے، استحسان کی مثالوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے اسرار شریعت سے آگہی ضروری ہے، افسوس کہ اس فن پر مستقل کتابیں کم لکھی گئیں ہیں، امام غزالیؒ نے ''احیاء العلوم'' میں اور حافظ ابن قیم نے ''اعلام الموقعین'' میں نیز حافظ عز الدین ابن عبد السلام نے ''قواعد الاحکام'' میں اس موضوع پر اچھی گفتگو کی ہے۔ لیکن چوں کہ ان کتابوں میں اسرار شریعت کا ذکر ضمنی طور پر ہوا ہے؛ اس لئے یہ بحثیں منتشر ہیں اور یکجا نہیں ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' بے ریب اس موضوع پر اپنی مثال آپ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسرار شریعت کے فن کو جس کو ہم ''فلسفہ فقہ'' بھی کہہ سکتے ہیں، ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے داخل نصاب کیا جائے ، اختصاص و افتاء کے درجہ میں تو ''حجۃ اللہ'' کے منتخب ابواب پڑھائے جائیں اور اصل نصاب کے لئے مذکورہ کتابوں کو سامنے رکھ کر ایک مختصر کتاب آسان عربی زبان میں مرتب کی جائے ، اُمید ہے کہ اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔

نصابی کتابوں پر بعض ضروری کام

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت ہمارے نصاب میں جو کتابیں داخل ہیں، وہ اصل میں عام استفادہ کے لئے لکھی گئیں تھیں، شاید مصنف کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ رہی ہو کہ ان کی یہ کتب کبھی داخل نصاب ہوگی؛ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ جیسے سلف صالحین نے شروح و حواشی کے ذریعہ ان کتابوں کی خدمت کی ہے، نصابی نقطۂ نظر سے آج ان پر کچھ کام کیا جائے۔

اور وہ کام یہ ہے کہ ذیلی عناوین قائم کئے جائیں، فقروں کی ترقیم کی جائے، پیراگراف متعین کیا جائے ، کتاب کو مضمون کے اعتبار سے دروس میں تقسیم کیا جائے ۔ ہر درس کے ختم پر تمرینی سوالات تحریر کئے جائیں، کتاب پر ایک نہایت مختصر ایسی تعلیق لکھی جائے۔ جس میں شخصیات، کتب، مقامات اور نسبتوں پر مختصر نوٹس لکھے جائیں، کتاب کے شروع میں مؤلف

کے حالات، کتاب کی خصوصیات، موضوعِ کتاب کا تعارف اور اس کتاب کے طریقہ تدریس سے متعلق مختصراً صفحہ ڈیڑھ صفحہ کے نوٹس مرتب کردیئے جائیں اور کتاب کے مسائل واحکام کی مفصل فہرست بندی کردی جائے۔

اگر ہماری متداول نصابی کتب پر اس طرح کا کام کیا جائے، تو یہ کارنہیں ''کارنامہ'' ہوگا اور اساتذہ وطلباء کو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، نیز اس سے طریقہ تعلیم میں بھی مفید اور مثبت تبدیلی پیدا ہوگی۔وما أرید إلا الإصلاح واللہ ولي التوفیق وھو المستعان۔

راہِ عمل ۵

ہندوستان کے دینی مدارس میں اصولِ فقہ کی تعلیم

ہندوستان کی دینی جامعات میں

اُصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کی تعلیم ☆

کسی بھی قانون میں اُصولِ قانون کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے؛ کیوں کہ قانونی جزئیات وتفصیلات وقت اور حالات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں؛ لیکن اُصول کو ثبات و استمرار اور بقاء ودوام حاصل ہوتا ہے، اللہ جزاء خیر دے ہمارے سلف صالحین کو، کہ انھوں نے فقہ اسلامی کے اُصول کو مرتب ومنقح کرنے میں اتنی دیدہ وری وژرف نگاہی سے کام لیا کہ تاریخِ قانون میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، یہاں تک کہ مستشرقین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ اُصولِ فقہ اور بین ملکی قوانین (جن کو فقہ اسلامی میں ''قانونِ سیر'' کہا جاتا ہے) کی ترتیب و تدوین میں فقہاء اسلام کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

علوم اسلامی میں ''اُصولِ فقہ'' کی تدریس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ اس فن کا تعلق صرف فقہ ہی سے نہیں، بلکہ کتاب اللہ سے بھی ہے، حدیث سے بھی ہے، اور ایک گونہ عقیدہ وکلام سے بھی؛ اسی لئے ہندوستان کے مدارس میں اس موضوع کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، اور اُصولِ فقہ کی متعدد کتابیں داخل درس کی گئی ہیں، —— تاہم ہندوستان کے مدارس اسلامیہ میں اُصولِ فقہ کی تدریس کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے بہ طور تمہید کے دو نکات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اول ان مضامین کی جو اس فن میں زیر بحث آتے ہیں، دوسرے ان مناہج کی جو مصنفین نے اس فن کی ترتیب وتوضیح میں اختیار کیا ہے۔

☆ یہ تحریر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور المعہد العالمی للفکر الاسلامی امریکہ کے باہمی تعاون سے منعقد ہونے والے ''مقاصدِ شریعت ورکشاپ'' کے لئے مرتب کی گئی، جو ہمدرد سیمینار ہال دہلی میں ۲۱ تا ۲۵/ دسمبر ۲۰۰۳ء کو منعقد ہوا تھا اور جس میں علماءِ ہند کے علاوہ امریکہ سے ڈاکٹر صلاح الدین سلطان بھی شریک ہوئے تھے۔

اُصولِ فقہ کے مباحث

اُصولِ فقہ میں جو مباحث آتے ہیں، ان کو بنیادی طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱) ''حاکم''، یعنی حکم دینا اور حلال و حرام کرنا کس کا حق ہے؟ یہ بات تو ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلامی میں حکم کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف:۶۷)، ﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ﴾ (انعام:۶۲)، ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ (اعراف:۵۴)، لیکن ایک بحث فقہاء اور متکلمین کے یہاں یہ آتی ہے کہ کسی شیٔ کا حکم متعین کرنے میں عقل کا کیا مقام ہے؟ اور اس سلسلہ میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور معتزلہ کے درمیان جو مشہور اختلاف ہے، آپ حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں؛ اس لئے یہ بحث بیک وقت فقہ اور علم کلام دونوں سے مربوط ہے، اور اسی لئے اس میں فقہ کے مختلف مکاتب فقہ کے بجائے، علم کلام کے مختلف مکاتب کے درمیان اختلاف زیادہ اُبھر کر سامنے آیا ہے۔

۲) دوسری بحث ''حکم شرعی'' کی آتی ہے، چاہے حکم تکلیفی ہو یا حکم وضعی، حکم کا بنیادی مقصد بندوں سے صادر ہونے والے افعال کے وصف شرعی، حلال و حرام، مباح و مکروہ وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے، اور ہر مسلمان اپنی عملی زندگی میں اس کی واقفیت حاصل کرنے کا زیادہ ضرورت مند ہوتا ہے۔

۳) ''أدلة الأحكام'' — یہ اُصولِ فقہ کی سب سے اہم بحث ہے، جسے ''ادلہ شرعیہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس میں چار ادلہ کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ، اجماع اور قیاس متفق علیہ ہیں، آٹھ کے بارے میں معتبر ہونے یا نہ ہونے میں فی الجملہ اختلاف پایا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: ''قولِ صحابی، شرائع ما قبل، استحسان، مصالح مرسلہ، سد ذرائع، استصحاب، عرف و عادت، تعامل اہل مدینہ'' چوں کہ یہی مصادر تمام احکام شرعیہ کے لئے ماٰخذ ہیں، اس لئے اُصولِ فقہ میں اس باب کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ ظاہر ہے۔

۴) ''مقاصد و مدارج احکام'' مقاصد سے مراد احکام شرعیہ کے عمومی مقاصد خمسہ، حفظ دین، حفظ نفس، حفظ نسل، حفظ مال اور حفظ عقل ہیں، اور مدارج سے مراد اہمیت کے اعتبار

سے احکام کے مدارج یعنی ضرورت و حاجت اور تحسین ہے، جسے بعض اہل علم نے تین کے بجائے پانچ اور بعض نے ہر درجہ کے ساتھ ایک مکمِل کا اضافہ کر کے چھ درجات مقرر کئے ہیں، اُصولِ فقہ کا یہ حصہ نہایت اہم ہے، اور مجتہد کے لئے اجتہاد و استنباط کے حدود اربعہ کو متعین کرتا ہے؛ لیکن کم ہی مصنفین نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

۵) ''دلالت الکلام'' —— دین کا اصل ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی یہ امانت عربی زبان میں محفوظ ہے؛ اس لئے جو شخص احکام شرعیہ کا استنباط کرنا چاہتا ہو، اس کے لئے عربی زبان اور اس کے اسالیبِ تعبیر سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً یہ کہ امر کی دلالت وجوب پر ہوتی ہے یا استحباب و اباحت پر؟ نہی کا صیغہ کب تحریم کے لئے آتا ہے اور کب بطور ارشاد کے وارد ہوتا ہے؟ عام اور مطلق کی دلالت اپنے افراد پر قطعی ہوتی ہے، یا وہ بیان کا محتاج ہوتا ہے؟ ''و'' صرف جمع کے لئے ہے، یا جمع و ترتیب دونوں کے لئے ہے؟ ''ب، ف، ثم، الی، حتی اور مِن'' یہ کلمات کب کن معنوں میں استعمال ہوتے ہیں؟ وغیرہ ان تمام مباحث کا تعلق اصل میں عربی زبان کے قواعد سے ہے، لیکن چوں کہ کتاب وسنت کی زبان بھی عربی ہی ہے؛ اس لئے یہ موضوعات اُصولِ فقہ کا بھی اہم حصہ ہیں؛ بلکہ علامہ بزدویؒ اور سرخسیؒ وغیرہ کی ترتیب میں کتاب کا ابتدائی بڑا حصہ اسی بحث پر مشتمل ہے۔

منہجِ تالیف

اُصولِ فقہ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ طریقۂ تالیف اور ترتیب کے لحاظ سے تین طرح کی ہیں: ایک ''طریق الشافعیة''، جس کو ''طریق المتکلمین'' بھی کہتے ہیں، دوسرے ''طریق الحنفیة'' جس کو ''طریق الفقهاء'' بھی کہتے ہیں، اور تیسرے ''جامع بین الطریقین''۔

متکلمین، مالکیہ اور شوافع کے یہاں اُصولی مسائل کی توضیح کا اسلوب یہ ہے کہ وہ نفسِ قواعد کو ذکر کرتے ہیں، اس کی حدود و قیود بیان کرتے ہیں، اور اس پر دلائل قائم کرتے ہیں، فروع و جزئیات پر اس کی تطبیق کا التزام نہیں کرتے، امام غزالیؒ (م: ۵۰۵ھ) کی ''المستصفی'' علامہ آمدیؒ (م: ۶۳۱ھ) کی ''الإحکام'' اور قاضی بیضاویؒ (م: ۶۸۵ھ)

کی ''المنہاج ''اس سلسلہ کی اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

فقہاء حنفیہ کا طریق یہ ہے کہ وہ اپنے ائمہ کے مجتہدات کو سامنے رکھ کر اُصول وقواعد وضع کرتے ہیں، اوران قواعد کوذکر کرتے ہوئے ان کی تفریعات کونقل کرتے ہیں، اور اُصول و فروع کے ارتباط پر زیادہ توجہ دیتے ہیں ؛اس لئے شوافع کے یہاں اُصول اوران کے دلائل پر زیادہ زور ہوتا ہے، اوراحناف کے یہاں اُصول اورفروع سے ان کے ارتباط پر، اس طریقہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں قاضی ابوزید دبوسیؒ (م: ۴۳۰ھ) کی ''تقویم الأدلة'' فخر الاسلام بزدویؒ (م: ۴۴۲ھ) کی ''اُصول''، شمس الأئمہ ابوبکر سرخسیؒ (م: ۴۹۰ھ) کی ''اُصول'' اور بعد کے علماء میں علامہ حافظ الدین نسفیؒ (م: ۷۱۰ھ) کی ''کتاب المنار'' بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

بعد کو کچھ اہل علم نے ان دونوں طریق کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اوراس حیثیت سے علامہ مظفرالدین بغدادی حنفی المعروف بابن ساعاتی (م:۶۹۴) کی ''بدیع النظام'' جو آمدی کی ''الإحکام'' اور فخر الاسلام بزدوی کی ''اُصول'' کو جامع ہے، صدرالشریعہ کی ''التوضیح'' علامہ ابن ہمام کی ''التحریر'' اور علامہ تاج الدین سبکی کی ''جمع الجوامع'' اوران کتابوں کی شروح اہم سمجھی جاتی ہیں اوراسی سلسلہ کی ایک کڑی ملامحبّ اللہ بن عبدالشکور (م:۱۱۱۹ھ) کی ''مسلّم الثبوت'' ہے۔

ہندوستان کے دینی مدارس میں
داخل نصاب اُصولِ فقہ کی کتابوں پرایک نظر

اس تمہید کی روشنی میں ہندوستان میں داخل درس اُصولِ فقہ کے مضمون پر دو جہتوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اول ان کتابوں پر جو داخل نصاب ہیں، دوسرے اس مضمون کے طریقۂ تعلیم پر۔

جہاں تک کتابوں کی بات ہے تو عام طور پر تین کتابیں اُصولِ فقہ میں پڑھائی جاتی ہیں: ''اُصول الشاشی ،نورالأنوار اورحسامی''۔

اُصول الشاشی

اصحابِ تحقیق کی رائے ہے کہ یہ اسحاق بن ابرہیم شاشی سمرقندی (متوفی: ۳۲۵ھ) کی تالیف ہے، یہ کتاب بڑی تقطیع سے ۱۰۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں بڑا حصہ دلالت کلام سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے، جو ابتدائی کتاب سے صفحہ نمبر: ۶۷ تک پر محیط ہے، حاکم اور مقاصدِ احکام کے مباحث سے اس کتاب میں تعرض نہیں کیا گیا ہے، ادلہ شرعیہ میں کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کی بحثیں ہیں، اس طرح یہ کتاب اُصولِ فقہ کے تمام مباحث کو جامع نہیں ہے، اور طلبہ کو مضمون سے مانوس کرنے کے لئے پڑھائی جاتی ہے، ایک دشواری یہ بھی ہے کہ اس کتاب کی ابتدائی بحثیں طلبہ کے لئے نسبتاً دشوار ہوتی ہیں۔

نور الانوار

یہ ایک ہندوستانی عالم ملاجیون کی تالیف ہے، علامہ نسفی کی ''منار'' پر مبسوط و مفصل شرح ہے، اور ہندوستانی مطبوعہ بڑی تقطیع سے ۳۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں بھی حاکم اور احکام شریعت کے مقاصد و مدارج کا ذکر نہیں ہے؛ البتہ قیاس اور استحسان کے مباحث بالتفصیل مذکور ہیں، لیکن کتاب کا ابتدائی نصف حصہ (اور زیادہ تر اسی کا درس ہوتا ہے) ''دلالت کلام'' کی بحثوں اور اس پر تفریعات سے متعلق ہیں، مختلف فیہ ادلہ شرعیہ ''قول صحابی، شرائع ماقبل، استصحاب، عرف، تعامل اہل مدینہ، سد ذرائع وغیرہ'' پر بحث نہیں کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ شارح نے متن کی عبارت کو حل کرنے اور اس سلسلہ میں لفظی موشگافیوں، نیز دخل اور دفعِ دخل میں اتنی زیادہ کاوش کی ہے، جو مصنف کے گہرے علم کی دلیل تو ضرور ہے، لیکن طالب علم کی توجہ کو اصل فن سے ہٹا دیتی ہے۔

حسامی

''حسامی'' شیخ محمد بن محمد بن عمر اخسیکثی کی تالیف ہے، یہ اُصولِ فقہ کا عظیم الشان متن متین ہے، اور ترتیب وہی ہے جو بزدویؒ اور سرخسیؒ وغیرہ کی ہے، اور مباحث بھی قریب قریب وہی ہیں، جو ''منار'' اور ''نور الانوار'' کے سلسلہ میں مذکور ہوئے ہیں، البتہ اس میں قیاس و استحسان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض وہ اُصول جس کے دوسرے فقہاء قائل ہیں، احناف قائل نہیں، اور ان کا تعلق دلالتِ کلام سے ہے، کو وجوہ فاسدہ کے عنوان سے بالتفصیل

ذکر کیا گیا ہے، چوں کہ اُصولِ فقہ میں نقد کی بعض بحثیں فن مناظرہ سے متعلق ہیں، اس لئے ''نورالانوار'' اور ''حسامی'' دونوں ہی کتابوں میں ان مباحث کا بھی قابل لحاظ حصہ ہے؛ لیکن اس کتاب (حسامی) میں ''ایجاز واغلاق'' اس درجہ ہے کہ اس کو فقہ اور اُصولِ فقہ پر لکھی گئی چند مغلق ترین کتابوں میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا؛ اس لئے ایک تو اکثر مدارس میں یہ کتاب مکمل نہیں ہو پاتی ہے، دوسرے دقتِ تعبیر کی وجہ سے اساتذہ وطلبہ کی محنت کا بڑا حصہ فن کی گہرائیوں میں غواصی کے بجائے حل عبارت میں صرف ہوجاتا ہے، اگر حسامی کو نصاب میں وہاں سے رکھا جائے جہاں سے کتاب اللہ کی بحث ختم ہوتی ہے، اور پھر ختم کتاب تک پڑھا دیا جائے، تو بہت مناسب ہوگا؛ تاکہ قیاس، استحسان، عوارض اہلیت وغیرہ کی بحثیں تفصیل سے آجائیں، پھر موقع ہو تو ابتداء سے پڑھا جائے۔

بعض مدارس میں فضیلت کے بعد اُصولِ بزدوی پڑھائی جاتی ہے، اور بعض میں ''التوضیح والتلویح''، یہ فن کی اہم کتابوں میں ہیں؛ لیکن بحیثیت مجموعی قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان کتابوں میں صرف فقہاء احناف کے اُصول کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جیسے ہم ہدایہ پڑھتے ہوئے مختلف دبستانِ فقہ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں، اسی طرح ان کتابوں کے ذریعہ ہم مختلف مکاتب فقہ کے اُصول سے آگاہ نہیں ہو پاتے، اسی طرح وہ ادلہ شرعیہ جن کے دوسرے فقہاء قائل ہیں ؛لیکن احناف ان کے قائل نہیں، یا قائل ہیں تو بعض شروط وقیود کے ساتھ، ان پر نگاہ نہیں ہو پاتی ہے، خاص کر وہ مصادر جن سے جدید مسائل کا حل متعلق ہے، جیسے مصالح مرسلہ، عرف وعادت، فتح ذریعہ اور سد ذریعہ، اسی طرح اجتہاد اور تقلید وتلفیق کے اُصول، مجتہد کے اوصاف ، اجتہاد کے مختلف مراحل، تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط وغیرہ جیسے اہم موضوعات ان کتابوں میں زیر بحث نہیں آئے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے طلبہ وہ ہیں، جن کے کان ان عنوانات سے تک آشنا نہیں ہوتے، اسی طرح شریعت کے عمومی مقاصد اور احکام شرعیہ کے مدارج سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے؛ تاکہ نئے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے ان کو ملحوظ رکھا جائے، ان کتابوں سے ان مضامین کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔

اس پس منظر میں نصابی نقطہ سے دو باتوں کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے، اول یہ

کہ اُصول الشاشی سے پہلے فن کی اصطلاحات ومبادی پر مشتمل ایک مختصر کتاب جو ایک سہ ماہی میں مکمل ہو جائے، پڑھادی جائے، جس میں اصطلاحات کی تعریف، مثال، اور ضروری قواعد آجائیں، خواہ یہ کتاب عربی میں ہو، یا طلبہ کی مادری زبان میں، اسی نقطۂ نظر سے راقم الحروف نے '' آسان اُصولِ فقہ '' کے نام سے ایک مختصر رسالہ (تقریباً ۸۰/صفحات پر) مرتب کیا ہے، جو شائع ہو چکا ہے، اور اسی قبیل کا ایک کام محب گرامی مولانا عبید اللہ اسعدی کی ''تسہیل اُصول الفقہ '' بھی ہے، یہ یا اس طرح کی کوئی کتاب شروع میں پڑھا دینا طلبہ کے ذہن کو مانوس کرنے اور انھیں اُصولِ فقہ کے مضامین سے قریب کرنے میں بہت ہی معاون ثابت ہوگا۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ منتہی جماعت کے نصاب میں کوئی کوئی ایسی کتاب بھی شامل کی جائے جو طریق الحنفیہ اور طریق الشافعیہ دونوں کو جامع ہو، اور مضمون کے اعتبار سے واضح ہو، تاکہ تمام متفق علیہ اور مختلف فیہ مصادر، اُصولِ فقہ کی تمام ابحاث اور اہل سنت کے تمام مکاتب فقہ کے نقطۂ نظر سے آگہی حاصل ہو سکے، --- اور وہ کتاب درج ذیل خصوصیات کی حامل ہو :

اول : اس کی ترتیب وہی ہو جو علامہ ابن ہمام وغیرہ کی ہے، یعنی حنفیہ اور شوافع کے طریق بیان اور ترتیب احکام کو جامع ہو۔

دوسرے : اُصولِ فقہ کے سلسلے میں مختلف دبستانِ فقہ کے نقطۂ نظر کو انصاف کے ساتھ پیش کیا جائے۔

تیسرے : متفق علیہ ادلہ شرعیہ کے علاوہ مختلف فیہ ادلہ کو بھی ذکر کیا جائے اور اس بات کی وضاحت کی جائے کہ ان ادلہ کے سلسلہ میں کن نکات پر فقہاء کا اتفاق ہے اور کن نکات پر اختلاف ہے؟

چوتھے : اُصول کے ضمن میں احکام شریعت کے مقاصد اور احکام کے مدارج پر بھی روشنی ڈالی جائے؟

پانچویں : جو اُصول ذکر کیے جائیں ان کی چند روایتی مثالوں ہی کے ذکر کرنے پر اکتفاء نہیں کیا جائے، بلکہ نئی مثالیں بھی درج کی جائیں، بحمد اللہ ماضی قریب میں مختلف عرب

علماء نے ان اُمور کی رعایت کرتے ہوئے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، لیکن میرے خیال میں ان کتب میں نصابی اعتبار سے شیخ ابوزہرہ اور شیخ خلاف کی کتابیں زیادہ مفید ہیں، اور خوشی کی بات ہے کہ بعض اداروں نے اس کتاب کو داخل نصاب کرنے میں پہل بھی کی ہے۔

اس کے علاوہ تکمیل اور افتاء کے درجہ کے لئے علامہ شوکانیؒ کی ''ارشاد الفحول'' بھی بڑی عمدہ چیز ہے، اُصول کا مکمل احاطہ، اُصولی مسائل میں فقہاء کے اختلاف کی بکمال وتمام وضاحت، سادہ اور سہل عبارت، طول نویسی سے گریز، لیکن اغلاق سے پاک، واقعہ ہے کہ یہ کتاب ماضی قریب میں اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ایک خاص درجہ وامتیاز کی مالک ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ مصنف ظاہری نقطۂ نظر کے حامل ہیں، اور کتاب پر اس کا اثر موجود ہے۔

قواعدِ فقہ

اُصولِ فقہ سے قریب تر ایک موضوع ''قواعدِ فقہ'' کا ہے، اور بعض جہتوں سے قواعد کی اہمیت اُصول سے بھی زیادہ ہے؛ کیوں کہ قواعدِ فقہ شریعت اسلامی کے مزاج ومذاق اور مقاصد ومصالح کو واضح کرتے ہیں، ہندوستان کے دینی مدارس کے مروجہ نصاب میں فضیلت تک کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی، بلکہ جو طلبہ فضیلت کے بعد تدریب افتاء کرتے ہیں ان کو علامہ ابن نجیم مصریؒ کی ''الاشباہ والنظائر'' پڑھائی جاتی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ یہی کتاب، یا اس کی متبادل کوئی اور کتاب جیسے مولانا عمیم الاحسان مجددی کی ''قواعد الفقہ'' یا شیخ مصطفیٰ زرقاءؒ کی ''شرح القواعد الفقهية'' طلبہ کو سبقاً سبقاً پڑھائی جائے اور مجلّہ ''الأحکام العدلیۃ'' کے شروع میں جو ۹۹ قواعد آئے ہیں، وہ طلبہ سے زبانی یاد کرائے جائیں، پھر تدریب افتاء کے شعبہ میں اس موضوع پر کوئی کتاب پڑھاتے ہوئے، یا اس کے بغیر ان سے تخریج کا کام لیا جائے کہ وہ کتبِ فقہ سے ایسی جزئیات کا انتخاب کریں جن پر یہ فقہی قواعد منطبق ہوتے ہوں، اس سے طلبہ کے اندر اپنے عہد کے حالات پر شریعت کے مقاصد ومصالح کی تطبیق اور شریعت کے عمومی قواعد اور اُصول کو سامنے رکھ کر مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

طریقۂ تعلیم

دوسرا اہم پہلو طریقۂ تعلیم کا ہے، اُصول وقواعد کی تعلیم میں مفید طریقہ یہ ہے کہ زیادہ

سے زیادہ تطبیقی تعلیم ہو، اور عملی طور پر اس کی مشق کرائی جائے؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ عام و خاص، ظاہر ومشکل، مطلق ومقید، حروف معانی وغیرہ کی مثالیں، جو ایک کتاب میں مذکور ہیں، قریب قریب وہی مثالیں دوسری کتابوں میں بھی آتی ہیں، اس کی وجہ سے طلبہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ اُصول زیادہ تر نظری ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اُصولِ فقہ کو تطبیقی انداز پر پڑھایا جائے، اور تطبیق کے لئے صرف اختلافی مسائل ہی کا انتخاب نہ کیا جائے؛ بلکہ قرآن مجید کی مختلف آیات اور احادیث انھیں دی جائیں اور ان سے خواہش کی جائے کہ وہ ان آیات پر ان قواعد کو منطبق کریں تا کہ جیسے نحوی وصرفی قواعد کو منطبق کرنے کی صلاحیت حاصل کرتے ہیں، یہی صلاحیت ان کے اندر اُصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ کی تطبیق کے سلسلہ میں بھی پیدا ہو۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

☆☆☆☆

دینی مدارس ہی پر نگاہِ عنایت کیوں؟

اس وقت ہمارے ملک ہندوستان میں دینی مدارس پر حکومت کی خاص نظر عنایت ہے اور فرقہ پرست جماعتوں نے بھی ان درس گاہوں کے خلاف اپنے حملے تیز کر دیئے ہیں، بجرنگ دل فرقہ پرست ہندو نوجوانوں کو آتشیں اسلحہ کی تربیت دے رہا ہے اور انھیں دہشت گردی پر اکساتے ہوئے ترشول تقسیم کر رہا ہے؛ لیکن اس پر نہ ہماری حکومت کو کوئی تشویش ہے، نہ سیاسی جماعتوں کو کوئی پریشانی؛ لیکن یہ مدارس جہاں لاٹھی اور غُلیل کی بھی تربیت نہیں دی ہے، ان پر ہر چہار طرف شکوک وشبہات کی نگاہیں اُٹھ رہی ہیں اور عداوت وعناد کے تیر برسائے جا رہے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کھلا ہوا ظلم اور شیشے کے گھر میں بیٹھ کر بے قصور راہ گیروں پر پتھر پھینکنے کے مترادف ہے!

بظاہر حکومت کو دینی مدارس کا شکر گذار ہونا چاہئے، حکومت تعلیم پر کڑوڑ ہا کڑوڑ روپے خرچ کرتی ہے، اساتذہ کو اعلیٰ تنخواہیں دیتی ہے، بیش قیمت بلڈنگیں بناتی ہے، طلبہ کے لئے طرح طرح کی سہولتیں فراہم کرتی ہے، پھر تعلیم کے بعد ان کے لئے ملازمت کا نظم کرنا ہوتا ہے اور خواندگی کے تناسب کو بڑھانے کے لئے بڑے جتن کرنے ہوتے ہیں، یہ دینی مدارس نہایت خاموشی کے ساتھ علم کی اشاعت میں شب وروز مصروف ہیں، نہ حکومت سے پیسوں کا مطالبہ ہے، نہ بلڈنگوں کا، نہ اپنے فضلاء کے لئے سند کی طلب ہے، نہ ان کے لئے ملازمت فراہم کرنے کی خواہش، اور اس طرح ملک بھر میں لاکھوں طلبہ وطالبات علم واخلاق سے آراستہ ہو رہے ہیں، ان مدارس کے علمی معیار کا حال یہ ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں چلے جائیں، عربی، اُردو اور فارسی کے شعبوں میں جہاں فضلاء مدارس نے داخلہ لیا ہے، وہاں وہی فائق اور ممتاز ہیں اور صحافت اور تصنیف وتالیف کے میدان میں دیکھا جائے تو کم سے کم پچاسی فیصد حصہ انھیں کا ہوگا۔ ان مدارس سے ہمارے ملک کو عالم اسلام اور عالم عرب

سے تعلقات کے لئے اچھے مترجم اور سفارت خانوں کے لائق کارکن بھی فراہم ہوتے ہیں، ان کی تصنیفی وتالیفی خدمات سے پورے عالم اسلام میں اس ملک کا نام روشن ہوتا ہے؛ بلکہ یہی خدمات بہت سے خطوں میں ہندوستان کی پہنچان اور شناخت ہیں۔

یہ مدارس ملک کو پرامن، انسانیت دوست اور پابند قانون شہری عطا کرتے ہیں، آج ملک میں دہشت گردی کی جو لہر نظر آتی ہے اور ظلم و جبر کے ساتھ لوگوں کی املاک پر قبضہ کا جو سلسلہ جاری و ساری ہے، اس میں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا بڑا حصہ ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان چوری، ڈکیتی اور دھوکہ دہی میں دن رات پکڑے جاتے ہیں، اخلاقی گراوٹ کا حال یہ ہے کہ ہماری قومی درس گاہوں سے نکلنے والے طلبہ معمولی ملازمت سے لے کر مقننہ اور عدلیہ تک جہاں پہنچتے ہیں، کرپشن کا بازار گرم رکھتے ہیں اور ان کے ذریعے ایسے ایسے اسکینڈل وجود میں آتے ہیں، کہ جنھیں دیکھ کر شاید شیطان کو بھی حیا آتی ہوگی اور اسے احساس ہوتا ہوگا کہ ہمارے شاگرد ہم پر سبقت حاصل کر چکے ہیں؛ لیکن اس کے برخلاف ان دینی مدارس کے فضلاء کے بارے میں شاید ہی کبھی یہ بات سننے اور دیکھنے میں آئی ہو کہ فلاں بے روزگار عالم ڈاکہ ڈالتے ہوئے اور چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے اور فلاں حافظ نے بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرلی ہے۔

ایک ہی سماج میں بسنے والے دو انسانوں اور ایک ہی طرح کی ضرورت رکھنے والے دو اشخاص کے درمیان یہ فرق کیوں ہے؟ یقیناً یہ ان درس گاہوں کی تربیت اور تعلیم کے مذاق کا فرق ہے، آج ہم نے جو درس گاہیں قومی فلاح کے نام پر قائم کر رکھی ہیں، وہ زیادہ پیسوں کے حریص ''انسان نما حیوانوں'' کو جنم دیتی ہے، ان کا پورا وجود زیادہ سے زیادہ کمانے کے لئے مخصوص ہے۔ زبانیں اس لئے گویا ہوتی ہیں کہ انھیں اس حرف اظہار کا معاوضہ ملے، قلم اس لئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنی روشنائی کے ایک ایک قطرہ کی پوری پوری قیمت وصول کریں، ہاتھ اس لئے جنبش کرتے ہیں کہ وہ مال وزر کی سوغات لے کر واپس آئیں، پاؤں اس لئے چلتے ہیں کہ ان کے ہر ہر قدم کی منہ بولی قیمت وصول ہو، دماغ اس مقصد کے لئے سرگرداں ہے کہ وہ کسب زر کے اور کیا نئے راستے دریافت کر سکتا ہے؟ اس میں ناجائز اور قانونی وغیر قانونی کی کوئی حد

نہیں؛لیکن دینی مدارس میں ''انسان'' تیار کئے جاتے ہیں، وہ انسان جو انسان کی فلاح کے لئے سوچنا جانتا ہو، وہ انسان جس کا دل انسانی محبت میں دھڑکتا ہو اور وہ انسان جو اپنی زبان اور قلم کو انسان کی فلاح اور نجات کے لئے وقف سمجھتا ہو؛ کیوں کہ دنیا کی متاع حقیر اس کی لیلائے مقصود نہیں، بلکہ اسے اپنے ہر عمل کا اجر آخرت میں انسان کے خالق سے وصول کرنا ہے؛اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مرنا اور جینا خدا کے لئے ہے: ﴿ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ﴾ (الأنعام:۱۶۲) نقطۂ نظر کے اس فرق کا اثر ضرور ہے کہ ان دونوں درس گاہوں میں پڑھنے والوں کی سوچ اور ان کے عملی رویہ پر بھی پڑے گا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ حکومت کو انہی دینی مدارس سے خطرات و خدشات ہیں حالاں کہ ملک کی آزادی میں ان کا جو رول رہا ہے، وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی ناواقف نہیں رہ سکتا، سوائے اس کے کہ کسی نے دانستہ طور پر ناواقف رہنے ہی کی ٹھان لی ہو اور اس کے برخلاف ایسی تنظیمیں جنھوں نے ملک کے بیرونی غاصبوں سے ہاتھ ملا رکھا تھا اور ان کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ مادرِ وطن سے غلامی کے داغ کو دھوئیں، وہ آج اس ملک کی تقدیر کے مالک بنے ہوئے ہیں، **فیا عجباہ،ویا أسفاہ !**

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ سب کچھ ناواقفیت میں پیش آرہا ہے، درحقیقت اس کے پیچھے گہری منصوبہ بندی کارفرما ہے، ہندوستان شروع سے عرب اور اسلامی ممالک کا روایتی دوست تھا؛لیکن اسرائیل سے قربت کے بعد اب ہمارے ملک میں ایک طبقہ پوری سرگرمی کے ساتھ اس بات پر غور کررہا ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے؟ اور کس طرح اس ملک سے اسلامی نقوش مٹائے جاسکتے ہیں؟ اس کے لئے بار بار اسپین کے دورے کئے گئے کہ وہاں سے کس طرح مسلمانوں کو بے نام ونشان کیا گیا، یہ عجیب بات ہے کہ اسپین اور ہندوستان میں مسلمانوں کا عہدِ حکومت قریب برابر ہے، اسپین میں مسلمان ۱۹ / جولائی ۷۱۱ء کو فاتحانہ داخل ہوئے تھے اور ۳ / جنوری ۱۴۹۲ء کو اسپین میں صدیوں سے درخشاں مسلمانوں کے اقتدار کا آفتاب غرناطہ کے ساحل پر ڈوب گیا اور اس طرح ۷۸۱ سال یعنی تقریباً ۸ صدی مسلمان اس ملک پر حکمراں رہے۔

ہندوستان میں محمد بن قاسم کا قافلہ ۷۱۲ء میں فاتحانہ داخل ہوا اور سب سے پہلے دیبل کا علاقہ فتح ہوا اور ۱۸۵۷ء میں دہلی میں مسلمانوں کے چراغ اقتدار نے آخری سانس لی، اس طرح مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کا عہد حکومت قریب ساڑھے گیارہ سو سال ہوتا ہے۔ لیکن متحدہ ہندوستان کے وسیع حصہ پر مسلم حکومت کا عرصہ یہی آٹھ ساڑھے آٹھ سو سال کا ہوگا، لیکن کیا وجہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار سے محروم رہنے کے بعد بھی اسلام آج پوری تب وتاب کے ساتھ درخشاں ہے، بلکہ اس صدی میں عالمگیر سطح پر جو مسلم تحریکات اٹھی ہیں، زیادہ تر ان کا سرچشمہ یہی کفرستان رہا ہے، گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں ایسی عظیم الشان علمی و دعوتی شخصیتیں اس خطہ میں پیدا ہوئیں جنھوں نے نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام پر اپنے اثرات ڈالے ہیں اور جن کی انقلاب آفریں تحریروں نے مشرق سے لے کر مغرب تک ہر دبستانِ علم سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔

یہ یقیناً دینی مدارس کا اثر ہے، یہ مدارس ہی ہیں جہاں سے اُمت کو بہترین داعی، تحریکات کے لئے باصلاحیت قائد، جماعتوں کے لئے مخلص رہنما، مخالفین اسلام کے مقابلہ کے لئے دندان شکن مناظر اور صاحب تحقیق قلم کار ملے ہیں، مولانا الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ یہیں سے اُٹھی، یہیں تحریک اسلامی کی نشو ونما ہوئی، یہی سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ خلافت کا مولد بھی ہے اور مشہد بھی، مسلمانوں کی اجتماعیت کی حفاظت کے لئے امارت شرعی کے نظام کی بنیاد یہیں رکھی گئی۔ قانون شریعت کی حفاظت اور اس پر استقامت کے لئے جو کوشش ہندوستان میں ہوئی اور وہ نتیجہ خیز بھی ہوئی، اس کی مثال پڑوس کے مسلم ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔

پھر گذشتہ ڈیڑھ صدیوں میں جتنے فتنے اُٹھے، ان کی سرکوبی کے لئے اول اول ہندوستان ہی کے علماء میدانِ عمل میں اُترے، جب مغربی استعمار کے زیر سایہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے یورپ سے پادریوں کی فوج ایشیائی اور اسلامی ممالک میں داخل ہوئی تو اس کا سب سے مؤثر مقابلہ علماء ہند ہی نے کیا اور ایک ہندوستانی عالم نے شہرۂ آفاق عیسائی مناظر پادری فنڈر کا تعاقب مصر وترکی تک کیا اور ان کے ہاتھوں سے ''اظہار الحق'' جیسی زندہ جاوید کتاب منظر عام پر آئی۔ ہندوستان میں ہندو مذہب کے احیاء اور ہندومت کی تبلیغ کی سرگرم کوششیں

در پردہ حکومت برطانیہ کی مدد سے شروع ہوئی اور آریہ سماجی تحریک ایک طوفان کی طرح ملک کے طول وعرض میں چھا گئی، اس کے مقابلہ کے لئے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ اور دوسرے علماء میدان عمل میں اترے اور انھوں نے اس تحتی براعظم میں مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی۔

صلیبی جنگوں میں جب عیسائیوں نے کارزار جنگ میں ہزیمت اُٹھائی اور شکست کھائی تو انھوں نے فکر ونظر کا ایک نیا معرکہ چھیڑا اور اسلام پر فکری یلغار کے لئے ایک ایسے تربیت یافتہ گروہ کو تیار کیا جو علوم اسلامی کو پوری گہرائی کے ساتھ پڑھے اور اپنی قوت مطالعہ اور ذہانت کو مسلمانوں کے ذہن میں شکوک وشبہات کے کانٹے بونے اور ان کو راہ حق سے منحرف کرنے میں صرف کرے۔ عین اس وقت جب مسلمان میدان جنگ میں شکست کھا رہے تھے، یہ گروہ مفتوح قوموں کی نفسیات سے فائدہ اُٹھا کر ان کی فکر پر حملہ زن تھا، اس تحریک کا سب سے مؤثر مقابلہ برصغیر کے اہل علم نے کیا۔ جن میں علامہ شبلیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وغیرہ کے نام خاص طور پر لائق ذکر ہیں، ان حضرات نے مستشرقین کے اعتراضات کے رد وابطال پر جتنا مؤثر کام کیا ہے، عالم اسلام میں بھی کم ہی اس کی مثالیں مل سکیں گی، اسی استشراق کا اثر انکار حدیث کی صورت میں ظاہر ہوا اور خاص کر ہندوستان اور مصر میں کچھ ایسے مغرب زدہ لوگ پیدا ہوئے، جنھوں نے حدیث کی حجیت اور اہمیت کا اعلانیہ انکار کر دیا اور بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات اس مفسد فکر سے متاثر ہوگئے، اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے جو اہل علم اُٹھے، ان میں علماءِ ہند پیش پیش ہیں، ان کی تحریریں بہت وقیع، علمی معیار پر مکمل اور مفید ثابت ہوئیں اور عالم عرب نے بھی ان سے فائدہ اُٹھایا، جن میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، ڈاکٹر حمید اللہؒ وغیرہ کی تحریریں خاص طور پر نہایت ہی بصیرت افروز اور چشم کشا ہیں۔

سب سے بڑا فتنہ وہ تھا جو پنجاب کی سرزمین میں قادیان سے اُٹھا اور جس نے پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت پر حملہ کرنے کی کوشش کی، انگریز تو اس فتنہ کی شہ پر تھے ہی، بلکہ اصل میں تو یہ ان ہی کا لگایا ہوا درخت ہے؛ لیکن بہت سے دانشور جیسے جواہر لال نہرو وغیرہ بھی اس

طبع زاد نبوت سے ہمدردی رکھتے تھے۔ برصغیر کے علماء پوری طاقت اور علمی وقعت کے ساتھ اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُمت پر اس دامِ ہم رنگ زمین کی حقیقت کھول کر رکھ دی، مولانا انوار اللہ شاہ صاحب حیدر آبادی، مولانا انور شاہ کشمیری اور ان کے تلامذہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور پیر کرم علی شاہ وغیرہ نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، اُمت اسلامیہ ہند کبھی اس سے سبک بار نہیں ہوسکتی۔

پھر ان مدارس سے کیسی کیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا احمد رضا خاں صاحب جیسا فقیہ، شاہ نذیر حسینؒ، مولانا خلیل احمدؒ سہارنپوری، مولانا محمد زکریاؒ کاندھلوی اور عبداللہ شاہؒ محدث دکن جیسے محدثین، مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے مصلح، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ جیسے بالغ نظر مفکر، مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے ذہین و بلند نگاہ خطیب اور نہ جانے کیسے کیسے اصحابِ فن اور داعیان دین متین۔

غور کیجئے! کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ہندوستان سے جتنی مذہبی، قومی اور تعلیمی تحریکات شروع ہوئیں اور جو بھی حوصلہ مند، مخلص، اصلاحی اور انقلابی شخصیتیں پیدا ہوئیں، وہ براہ راست یا بالواسطہ دینی مدارس ہی کی دَین ہیں اور ان کی تعمیر میں ان مدارس کا خونِ جگر ضرور شامل ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کا ملک کے فرقہ پرست عناصر نے ادراک کرلیا ہے اور جس کی وجہ سے ان حضرات نے محسوس کرلیا ہے کہ جب تک یہ مدارس اور ان درس گاہوں سے پیدا ہونے والے ''ملا'' اس ملک میں باقی رہیں گے، وہ مسلمانوں کے ایمان کا سودا ہرگز نہیں کرسکتے اور ان کا ہندو کرن کیا جانا ممکن نہیں، یہی چیز ہے جس نے حکومت اور فرقہ پرست جماعتوں کی ان امن پسند، وطن دوست اور انسانیت گر مدارس سے عناد پیدا کردیا ہے۔ ان حالات میں ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ پوری قوت کے ساتھ ان سازشوں کا مقابلہ کریں اور مدارس کے نظام کو دل و جان سے تقویت پہنچائیں، کہ یہ کچھ ملاؤں کی پرورش کا ذریعہ نہیں، بلکہ آپ کے دین و ایمان اور تہذیب و ثقافت کی حفاظت کا سامان ہے!!

☆☆☆

دینی مدارس

ان کے ذرائع آمدنی اور دہشت گردی

ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ

اس وقت ملک میں دینی مدارس کے خلاف ماحول تیار کرنے کے کی پوری کوشش کی جارہی ہے، ایسی تنظیمیں جن پر ہزاروں مسلمانوں کا خون ہے اور جو کھلے عام اپنے کارکنوں کو آتشیں اسلحہ کی تربیت دے رہی ہیں، نیز اخبارات اور الکٹرانک ذرائع ابلاغ میں کھلے عام تلواروں اور ترشولوں سے لیس اور بندوقوں سے نشانہ لیتی ہوئی ان کارکنوں کی تصویریں آرہی ہیں، وہ دینی مدارس کو دہشت گردی کے مراکز قرار دینے میں کوئی حیاء محسوس نہیں کرتے اور حکومت اور اس کے ذمہ دار ترین نمائندے نہایت ہی ڈھٹائی کے ساتھ ان الزامات کو دہرا رہے ہیں، حقائق کو جانے اور الزامات کی تحقیق کئے بغیر ایسی باتیں کرنا کم سے کم ذمہ دارانِ حکومت کو زیب نہیں دیتا، لیکن بدقسمتی سے حکومت مدعی اور جج کے دوہرے فرائض ادا کرنے کی کوشش کررہی ہے۔

مدارس کے بارے میں اس الزام کی حقیقت سمجھنے کے لئے چند پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے، تعلیمی مواد، ماحول اور واقعات و تجربات —— مدارس کے نصاب میں عام طور پر تین طرح کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اول خالص اسلامی علوم، اس میں قرآن، حدیث، فقہ، عقیدہ، اسلام کے اُصولِ قانون اور تفسیر و حدیث سے متعلق اُصول وقواعد داخل ہیں، دوسرے عربی زبان سے متعلق علوم، اس سے عربی گرامر یعنی نحو وصرف، عربی ادب اور

اُصولِ بلاغت مراد ہیں، تیسرے وہ مضامین جو انسان کی عام ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہیں، ان میں منطق، فلسفہ، حساب، انگریزی، تاریخ اور مقامی زبان وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ان میں سے دوسری اور تیسری قسم کا مواد زبان وادب یا عام عملی زندگی سے متعلق ہے۔

خالص اسلامی علوم سے متعلق جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اسی سے ذہن وفکر کی تعمیر اور عمل کی تحریک متعلق ہے، پھر اسلامی علوم میں اُصولِ قانون، اُصولِ حدیث اور اُصولِ تفسیر بجائے خود مقصود نہیں، بلکہ ان سے وہ قواعد وضوابط معلوم ہوتے ہیں جن کی روشنی میں قرآن کی تفسیر اور حدیث کی تشریح کی جاتی ہے، حدیث نقل کرنے والوں کو پرکھا جاتا ہے، قرآن وحدیث سے اعتقادات اور عملی زندگی کے احکام کس طور سے مستنبط کئے جاتے ہیں؟ ان پر بحث کی جاتی ہے، گویا یہ علوم قرآن وحدیث اور فقہ وعقیدہ کے لئے وسائل وذرائع اور کلید کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے ان علوم کا تعلق بھی سماجی زندگی میں انسان کے رویہ اور طریقۂ کار سے نہیں ہے، اب جو چار مضامین باقی رہ گئے، ان میں قرآن وحدیث اصل ہیں اور فقہ وعقیدہ اس کا نتیجہ اور اس سے مستنبط مسائل، عقیدہ سے مراد وہ باتیں ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب وضمیر سے ہو اور جس کے ماننے پر کسی شخص کا مسلمان ہونا موقوف ہو، اعضاء وجوارح سے اس کا تعلق نہ ہو، اللہ ایک ہے، اللہ ہی نے کائنات کی اس بستی کو بسایا اور تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، اس نے انسان کی ہدایت اور رہبری کے لئے ہر عہد، ہر علاقہ اور ہر زبان میں اپنے رسول اور دوست کو کتاب ہدایت دے کر بھیجا ہے۔ انسان نے وقتاً فوقتاً اس میں اپنی طرف سے ملاوٹیں کر دی ہیں، اس طرح اس کتاب ہدایت کا آخری ایڈیشن سرزمین عرب میں محمد رسول اللہ ﷺ پر قرآن مجید کی شکل میں نازل ہوا، اس لئے قرآن اللہ کی آخری کتاب اور محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔

انسان کو دنیا میں نیکی کا حکم دیا گیا ہے، برائی سے روکا گیا ہے، گویا وہ امتحان کی حالت میں ہیں؛ اس لئے ایک دن یہ دنیا ختم کر دی جائے گی اور آخرت کا نظام قائم ہوگا، جس میں تمام انسانوں کو بے کم وکاست اس کی اچھائی اور برائی پر جزاء وسزاء دی جائے گی —— توحید، رسالت اور آخرت یہ تینوں باتیں اسلامی عقیدہ کی بنیاد اور اساس ہیں۔ غور کیجئے کہ اس میں کون سی بات انسان کو تشدد پر اُکسانے والی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آخرت میں جواب

دہی کا احساس ایسی بات ہے جو انسان کو ظلم وزیادتی اور دہشت گردی سے روکتی ہے اور پابند قانون شہری بناتی ہے۔

''فقہ'' سے مراد وہ احکام ہیں جو انسان کی عملی زندگی سے متعلق ہوں، ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اول عبادات یعنی وہ افعال جو بندہ اور خدا کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی۔ دوسرے پرسنل لاء سے متعلق قوانین، جن کو آج کل ''احوال شخصیہ'' اور فقہاء اسلام کی قدیم اصطلاح میں ''مناکحات'' کہا جاتا ہے، اس عنوان کے تحت وہ حقوق وفرائض آتے ہیں جو قرابت داری کی بناء پر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں۔ نکاح، طلاق وتفریق، مہر، عدت، ثبوتِ نسب، والدین، اولاد اور بیوی کا نفقہ، میراث اور وصیت وغیرہ احوال شخصیہ میں شامل ہیں۔ تیسری قسم ان قوانین کی ہے جو مالی لین دین سے متعلق ہیں جیسے خرید وفروخت، آجر اور مزدور، مالک اور کرایہ دار کے احکام، ہبہ، قرض وغیرہ ان قوانین کو ''معاملات'' کہتے ہیں۔ چوتھے ملک کے انتظامی قوانین ہیں، اس شعبہ میں امیر کا انتخاب، عدلیہ کی تشکیل، جرائم پر سزائیں اور امن وامان قائم رکھنے کی تدبیریں وغیرہ سے متعلق احکام ذکر کئے جاتے ہیں، ان قوانین کا تعلق مسلم حکومتوں سے ہے، عام مسلمانوں سے ان کا تعلق نہیں۔ پانچویں امن وجنگ اور قومی تعلقات سے متعلق قوانین ہیں، اس قانون کی روح بقاء باہم کا اُصول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، جنگ سے گریز کیا جائے، امن وآشتی قائم رکھی جائے اور صلح کی فضاء بنائی جائے اور ہر صورت میں انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ قانون کا یہ چوتھا اور پانچواں شعبہ ایسا ہے کہ خود فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اس کا تعلق مسلمان حکومتوں سے ہے، نہ کہ عام مسلمانوں سے، عام مسلمانوں کو ہرگز اس بات کا حق نہیں کہ وہ ان قوانین کو اپنے ہاتھ میں لے لیں کہ اس طرح لاقانونیت کا مزاج پیدا ہو جائے گا —— پھر احکام فقہیہ کی تفصیل بھی اس ترتیب سے ملتی ہے، سب سے زیادہ عبادات، پھر احوال شخصیہ اور معاملات اور ان سے کم انتظام ملکی اور تعلقات بین ملکی سے متعلق قوانین، ان میں کہیں دہشت گردی کے مضمون کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں، دہشت گردی لاقانونیت ہے اور فقہ اسلامی خلوت سے جلوت اور نجی زندگی سے سماجی اور قومی زندگی تک ہر مرحلہ پر

مسلمانوں کو پابند قانون شہری اور امن پسند انسان بناتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا فقہ وعقیدہ کا اصل سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔ قرآن اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے اور حدیث محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمودات اور معمولات ہیں۔ قرآن کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے، جس کے معنی ہیں، اس اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، گویا قرآن کا آغاز ہی رحمتوں اور مہربانیوں کے ذکر سے ہوتا ہے، جو اُمت مہربان اور رحم دل خدا کی پرستار ہوگی، ضرور ہے کہ وہ خود بھی جذبۂ رحم سے معمور ہو، خدا کی ایسی تصویر کہ اس کے ہاتھوں میں تلوار اور نیزہ ہے، منہ سے آگ کے انگارے نکل رہے ہیں، اس کے بال پھن مارتے ہوئے زہریلے سانپ سے آراستہ ہیں اور وہ خود منہ کھولے ہوئے شیر پر براجمان ہے، خدا کی یہ تصویر صحیح ہے یا غلط؟ اس سے قطع نظر ایسے خدا پر یقین سے انسان میں وحشت پیدا ہوتی ہے اور طاقت کے فلسفہ پر اس کا یقین قائم ہو جاتا ہے، قرآن ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتا ہے جو شفقت ورحمت کے اتھاہ جذبات رکھتا ہو۔

پھر قرآن کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ ہے، یہ سات مختصر آیتوں پر مشتمل ہے، جس میں خالق کائنات کی تعریف بھی ہے، جس میں بندہ اور خدا کے تعلق کو ظاہر کیا گا ہے اور اخیر میں خدا سے دُعاء مانگی گئی ہے، اس سورت کی پہلی تین آیتوں کا ترجمہ اس طرح ہے :

> تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے، بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، بدلہ کے دن کا مالک ہے۔

غور کریں کہ پہلی آیت میں خدا کے رب العالمین یعنی تمام عالم کا رب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح انسانی اخوت کا پیغام دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے رشتہ سے تمام انسان بھائی بھائی اور گویا ایک ہی کنبہ کے افراد ہیں۔ دوسری آیت میں خدا کے مہربان اور رحم دل ہونے کی بات کہہ کر بتایا گیا ہے کہ رحم دلی اور درگذر ایک قابل تعریف وصف ہے۔ تیسری آیت میں آخرت کی جواب دہی کے احساس کو اُبھارا گیا ہے، جس سے انسان میں قانون کی اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور غیر آئینی طریقۂ کار سے بچنے کا خیال؛ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ

اگر انسان اپنے جرم کو دنیا کی آنکھوں سے چھپا لے تب بھی آخرت کی پکڑ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ یہ تمام نکات وہ ہیں، جو انسان کو دہشت گردی سے بچاتے ہیں، نہ کہ دہشت گردی میں مبتلا کرتے ہیں۔

دہشت گردی کے عام طور پر تین عوامل ہوتے ہیں نسلی، مذہبی اور معاشی، جب کوئی ایک گروہ نسلی اعتبار سے اپنے آپ کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھنے لگتا ہے تو اس سے حقیر سمجھے جانے والے لوگوں میں محرومی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، اسلام نے اس کا یہ علاج کیا ہے کہ جیسے اس نے خدا کے ایک ہونے کا اعلان کیا، اسی طرح تمام انسانیت کی وحدت کو بھی پوری قوت کے ساتھ بیان فرمایا، قرآن کہتا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ. (نساء: ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے۔

پس، قرآن پوری انسانیت کو ایک کنبہ اور ایک خاندان قرار دیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نے اس کو اور زیادہ واضح کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی عرب کو غیر عرب پر اور گورے کو کالے پر محض رنگ و خون کی بنیاد پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، اس طرح گویا نسلی جارحیت اور اس کی بنیاد پر پیدا ہو جانے والی دہشت گردی کی جڑ ہی کاٹ دی گئی، مذہب کے معاملہ میں قرآن کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے کہ اس میں کسی بھی طرح کا جبر و اکراہ نہیں:

﴿ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ﴾

(البقرة : ۲۵۶)

پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اپنی عملی زندگی میں قرآن کے اس اُصول کو برت کر دکھایا۔ مدینہ میں یہودی عددی اعتبار سے معمولی درجہ کی اقلیت تھے، آپ ﷺ نے ان پر اسلام کی دعوت پیش کی، لیکن کبھی ان پر کوئی جبر روا نہیں رکھا، ان کی بار بار کی بدعہدیوں کے باجود ان کی عبادت گاہ اور تعلیمی نظام وغیرہ میں کوئی مداخلت نہیں کی، ان کو اپنے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی

پوری آزادی رہی، مکہ فتح ہونے کے بعد مشرکین مکہ اور ان کے سردار پوری طرح مسلمانوں کے قابو میں تھے لیکن آپ نے عام معافی کا اعلان فرمادیا، اور کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا، مذہبی آزادی کا اسلام میں اس قدر پاس ولحاظ ہے کہ اگر کسی مذہب میں ماں اور بہن سے نکاح کی اجازت ہو اور وہ مسلمان حکومت میں رہتا ہو، تب بھی حکومت کو اس کے مذہبی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں۔ مسلمانوں کے لئے شراب حرام ہے اور مسلمانوں کے لئے اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے؛ لیکن مسلمان ملک میں جو غیر مسلم رہتے ہوں اگر ان کے مذہب میں شراب ممنوع نہ ہو تو انھیں اپنے ہم مذہب لوگوں سے شراب بیچنے کی اجازت ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کو کس قدر مذہبی رواداری اور درگذر کی تعلیم دی گئی ہے، جو مذہب اپنے زیر حکومت رہنے والوں کے ساتھ اس فراخ دلی کا رویہ سکھاتا ہو، وہ کیا مسلمان اقلیت کو غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مذہب کے معاملہ میں جبر وتشدد کی تعلیم دے سکتا ہے؟

انسان پر وہ ماحول بھی گہرا اثر ڈالتا ہے، جس میں اس کی تربیت ہوتی ہے، جیسے گرم ماحول چیزوں کو گرم اور سرد ماحول چیزوں کو سرد کردیتا ہے، اسی طرح انسان کے اخلاق و عادات اور اس کے مزاج و مذاق پر بھی ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے، جو شخص راہزنوں اور لٹیروں کے درمیان رہتا ہے اور ہر وقت لاٹھی، تلوار، خنجر، بھالے اور بندوق، رائفل دیکھنے کا عادی ہو تو اگر وہ خود تشدد نہ کرے تو کم سے کم تشدد کو دیکھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے اور جو شخص بااخلاق، وضع دار، نرم خو اور انسانیت دوست لوگوں کے درمیان زندگی گذارتا ہو، ممکن نہیں کہ وہ نرم خوئی، شرافت سے کوئی حصہ نہ پائے، اس کی زبان، چال، ڈھال، طرزِ تخاطب، طبیعت میں رچاؤ اور رکھ رکھاؤ سے وہ بخوبی پہچانا جاتا ہے، اس لئے کسی کی شخصیت اور مزاج کے مطالعہ کے لئے اس کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ کس ماحول میں اس کی نشو ونما ہوئی ہے

دینی مدارس کے ماحول کو ہمیں اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہئے، درس گاہوں میں انحراف اور طلبہ میں بغاوت کے جو محرکات پائے جاتے ہیں، اگر تجزیہ کریں تو وہ بنیادی طور پر تین ہیں۔ ایک تو سیاسی جماعتوں کی طلبہ تنظیمیں، دوسرے اساتذہ وطلباء کے درمیان محاذ آرائی

اور مخاصمانہ جذبات، تیسرے لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط —— آج کل تمام بڑی درس گاہوں میں طلباء کی یونین قائم ہیں، یہ تعمیری کام تو برائے نام کرتی ہیں، لیکن ان کے اشارہ پر تخریب اور فساد کا ماحول زیادہ پیدا ہوتا ہے، نوجوانی کی عمر بغاوت کی عمر ہے، اجتماعیت اور آزادی اس جذبۂ بغاوت کو دوآتشہ کر دیتی ہے، اس کے نتیجہ میں ہڑتال، احتجاج، جلسہ جلوس کالجوں، یونیورسٹیوں میں روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے موقع سے ایک وقتی ضرورت کے تحت جنگِ آزادی کے قائدین اس بات پر مجبور ہوئے کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلباء کو آزادی کی لڑائی میں شریک کیا جائے، کیوں کہ نوجوان نسل کے گرم خون کے بغیر کوئی انقلابی تحریک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوتی، اس میں شبہ نہیں کہ طلباء کی شمولیت کی وجہ سے اس تحریک کو بڑی قوت حاصل ہوئی، لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائی اور پرتشدد احتجاج ہماری تعلیم گاہوں کے مزاج میں داخل ہو گیا، تعلیم وتحقیق کا کام یکسوئی اور ایک طرح کی عزلت گزینی اور خلوت نشینی کو چاہتا ہے، جب کہ سیاسی مہم جوئی، دوڑ دھوپ اور تگ ودو کی متقاضی ہوتی ہے، اس لئے تعلیم گاہوں میں سیاسی مزاج ومذاق کا داخل ہو جانا تعلیمی ماحول کے لئے فائدہ مند سے زیادہ نقصان دہ ہے۔

آزادی کے بعد مزید ستم یہ ہوا کہ سیاسی طالع آزماؤں نے اپنی اپنی جماعتوں میں اسٹوڈنٹس ونگ قائم کئے، اس وقت اکثر یونیورسٹیوں میں دائیں اور بائیں بازو کی فکر کے حامل طلباء کے گروپ موجود ہیں اور یونین کے الیکشن میں پبلسٹی، کنویسنگ کے علاوہ تشدد، مار دھاڑ اور قتل واغواء وغیرہ کے واقعات اسی طرح پیش آتے ہیں، جیسا کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے الیکشن میں، یہ ملک کے بہی خواہوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

دینی مدارس اب تک بحمد اللہ ایسی تحریکات سے پاک ہیں، عام طور پر ان مدارس میں طلباء کی یونین قائم نہیں ہے، کچھ چھوٹی موٹی انجمنیں محض تقریر وتحریر کی مشق کے لئے مدارس میں ہوتی ہیں، جن کی باگ ڈور انتظامیہ اور اساتذہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، یہ انجمنیں ہفتہ وار تقریر وتحریر کے پروگرام منعقد کرتی ہیں، انجمن کے تحت مختلف گروپ بنا دیئے جاتے ہیں، جو

دس بارہ طلبہ پر مشتمل ہوتا ہے، یہ اخلاقی موضوعات پر تقریروں کی مشق کرتے ہیں، یا چند صفحات کے مضامین لکھتے ہیں، نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، والدین کے حقوق، عورتوں کے حقوق، استاذ کے حقوق، قرآن مجید کی عظمت، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، علم کی اہمیت، اتحاد و اتفاق اور خدمت خلق، عام طور پر ان ہی موضوعات پر تقریریں اور تحریریں لکھی جاتی ہیں، نہ مختلف افکار کی ترجمانی کرنے والے طلباء کے گروپ، نہ الیکشن کی مہم جوئیاں، نہ احتجاجی جلسے اور ریلیاں، اس لئے ان میں تعمیری رجحان پنپتا ہے نہ کہ تخریبی۔

اس وقت عصری درس گاہوں میں صورتِ حال یہ ہے کہ انتظامیہ اساتذہ اور طلباء کے درمیان ایک طرح کی مقابلہ آرائی کی فضاء ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعلیم و تعلم کے پیشہ سے تقدس جاتا رہا اور خود غرضی نے اس کی جگہ لے لی، اساتذہ کسبِ زر کے لئے پڑھاتے ہیں، یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ بہت سی دفعہ ایم-فل اور پی-ایچ-ڈی کی ڈگریوں کو منظور کرنے کے لئے بیش قیمت تحائف یا رقوم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، غیر حاضری اور دیر حاضری عام ہے، نصاب نامکمل ہوتا ہے اور ایسی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ طلبہ ٹیوشن پڑھنے پر مجبور ہو جائیں، انتظامیہ اساتذہ کی تقرری اور طلباء کے مسائل کو حل کرنے میں رشوت حاصل کرتی ہے، گویا کسبِ معاش کا ایک کاروبار ہے، جس میں ہر شخص جائز اور ناجائز طور پر زیادہ سے زیادہ سیم وزر کے حصول کے لئے بے چین ہے، ایسے خود غرضانہ ماحول میں احترام و تقدس کی فضاء کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ نہ انتظامیہ میں اساتذہ و طلبہ کی ہمدردی و بہی خواہی ہے، نہ اساتذہ میں فرض شناسی اور طلبہ کے ساتھ شفقت و محبت ہے، نہ طلبہ میں اساتذہ کے تئیں احترام و عقیدت کے جذبات ہیں، ایسا نہیں کہ تعلیم گاہوں میں سارے ہی لوگ ایسے ہیں، لیکن کوئی حقیقت پسند اور حقیقت آگاہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ ایک قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے۔

دینی مدارس کا ماحول اس لحاظ سے نہ صرف غنیمت ہے، بلکہ ایک قابل تقلید نمونہ ہے، انتظامیہ کا حال یہ ہے کہ وہ در در پہنچ کر اپنے طلبہ کے لئے چندے جمع کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ وہ پیسے پیسے بھیگ مانگ کر اساتذہ و طلباء کی ضرورت پوری کرتے ہیں تو بے جا نہ ہو، خود ان

کی تنخواہیں معمولی ہوتی ہیں، گو اس معاملہ میں اب کسی قدر بے اعتدالی ہونے لگی ہے، لیکن مدارس کے منتظمین کی اکثریت آج بھی متوسط سے کم درجہ کی زندگی گذارتی ہے، بعض مثالیں تو ایسی بھی ملتی ہیں کہ ان کی کوششوں سے مدرسہ کی ایسی پرشکوہ اور راحت رساں عمارتیں بن گئیں جو نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں، لیکن خود ان کی زندگی آج بھی خس پوش مکانوں میں گذرتی رہی اور وہ دنیا سے اس حال میں گئے کہ ان کے ورثہ کے حصہ میں پانچ ہزار روپے بھی نہ آسکے۔

اساتذہ کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ قابل رشک ہے، ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ ایک عالم چالیس، چالیس سال سے درس دے رہا ہے، اس کی زبان پر علم بولتا ہے، اسی خدمت میں اس کے بال سفید ہوگئے اور اس کی ہڈیوں کے گودے پگھل گئے، لیکن اس کی تنخواہ سرکاری محکموں کے چپراسی سے بھی کم ہے، اس کے باوجود نہ زبان پر شکوہ وشکایت ہے، نہ دل میں حرص وطمع ہے، نہ دوسروں کی دولت وثروت کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکتی ہیں، ان کے سینے طلبہ پر شفقت ومحبت کے جذبات سے معمور ہیں اور دین کی اس خدمت پر اللہ کے شکر وسپاس سے ہر بُن مولبریز ہے، طلبہ سے کچھ لینے کا سوال ہی نہیں، بلکہ ان مدارس میں طلباء کی اکثریت اس لائق ہی نہیں ہوتی کہ وہ کچھ پیش کر سکے، بلکہ اکثر اوقات یہی اساتذہ اپنی قلیل تنخواہوں میں سے حسبِ توفیق ان غریب لڑکوں پر کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کے تعاون کے لئے کوشاں رہتے ہیں، عام طور پر مدرسہ کے اُصول کے مطابق اساتذہ کی ڈیوٹی چھ گھنٹہ کی ہوتی ہے، لیکن کم سے کم سال کے آخری تین مہینوں میں اونچے درجہ کے اساتذہ دس دس گھنٹے پڑھاتے ہیں، کیوں کہ مقررہ نصاب کے اعتبار سے وقت کم ہے اور اس لئے خارجی اوقات میں پڑھا کر اس نصاب کو پورا کیا جاتا ہے، تاکہ طلبہ کا نقصان نہ ہو۔

طلبہ کو اساتذہ سے جو محبت ہوتی ہے اور اساتذہ ومنتظمین کا جو احترام وہ کرتے ہیں، ایسے احترام کی مثال شاید ہی مل سکے، یہ ایک حقیقت ہے کہ بال بچے اپنے ماں باپ کا بھی نہ اس درجہ احترام کرتے ہیں اور نہ ایسی والہانہ خدمت۔ خدمت اور احترام کا یہ جذبہ مدارس کے طلباء میں نسلاً بعد نسل گویا میراث کے طور پر چلا آرہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس اُمت کے معلم اول تھے، قرآن نے سب سے زیادہ آپ ﷺ کی جس حیثیت کو ذکر کیا ہے، وہ یہی معلم ہونے

کی حیثیت ہے، صحابہ آپ کا اس طرح احترام کرتے کہ جب آپ کوئی گفتگو کرتے، تو کمال توجہ کی وجہ سے ایسا لگتا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، یہی حال بعد کے ادوار میں رہا، امام ابوحنیفہؒ اپنے استاذ حماد کے گھر کی طرف پاؤں پھیلانے سے بھی گریز کرتے، مدارس میں محبت و احترام اور خدمت و اکرام کی یہ روایت بڑی حد تک اب بھی باقی ہے، کیوں کہ طلبہ گویا اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ استاذ کی ناراضگی کے ساتھ ان کا علم بافیض نہیں ہوسکتا۔

اس لئے دینی مدارس کی فضاء نہایت ہم آہنگی کی فضاء ہوتی ہے، اس میں خودغرضی کے بجائے ایثار و بے غرضی، رشوت کے بجائے اعانت، قانونی تعلق کے بجائے روحانی تعلق، فکر معدہ کے بجائے فکر معاد اور خدمتِ نفس کے بجائے خدمت دین کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور ایک خاص اسپرٹ کے تحت کام کرنے کی وجہ سے ان کو حالات کی تلخ کامیوں میں حلاوت اور کلفتوں میں راحت کا احساس ہوتا ہے۔

جہاں تعلیم گاہ کے ان تینوں عناصر انتظامیہ، اساتذہ اور طلباء کے درمیان تصادم، ٹکراؤ اور منافست کی کیفیت ہوگی، وہاں اختلاف وتشدد کا ذہن پروان چڑھے گا اور تخریب و دہشت گردی کا مزاج پیدا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ آج نکسلائیٹ تحریک میں بہت بڑی تعداد تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہے، جہاں ان تینوں طبقوں کے درمیان ہم آہنگی، ایثار اور محبت کی فضاء ہوگی، وہاں امن وسلامتی اور انسانیت نوازی کا مزاج پیدا ہوگا؛ اسی لئے دینی درس گاہوں کے فضلاء ایسی تشدد آمیز تحریکوں میں نہیں دیکھے جاتے کہ ان کی تعلیم ہی ہم آہنگی اور ایثار کے ماحول میں ہوئی ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط کا ماحول بھی بعض اوقات مجرمانہ سوچ کو جنم دیتا ہے اور بعض مفسد لوگ اپنی ہوس نفس کو پورا کرنے کے لئے اغواء اور تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں، جب ایک دفعہ انسان تشدد اور لاقانونیت کی وادی میں قدم رکھ دیتا ہے، تو پھر بعض اوقات اس راہ میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک جگہ ہوں اور لڑکیوں کے لئے اپنے گیسو، بازو اور ٹانگوں کو کھلا رکھنا درس گاہی ثقافت کا ایک حصہ بن گیا ہو، وہاں جسارت

انگیز طبیعتوں کا مشتعل ہوجانا چنداں عجیب نہیں ، چنانچہ ہمارے ملک میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ اور طالبات کے درمیان غیر قانونی تعلق ، اغواء ، زنا بالجبر اور بعض دفعہ آبرو ریزی کے ساتھ قتل کے کتنے ہی واقعات پیش آتے رہتے ہیں ، ان سب سے مزاج میں تشدد اور جرم کی طرف میلان اور منصوبہ بندی کے ساتھ زبردستی اپنی ہر خواہش کی تکمیل کا ذہن بنتا ہے ، یہی دہشت گری کی اصل اور اس کی بنیاد ہے۔

دینی مدارس میں بحمد اللہ اب تک مخلوط تعلیم کا تصور نہیں ، لڑکوں کی تعلیم گاہیں الگ ہیں ، لڑکیوں کے مدارس الگ ہیں ، لڑکیوں کے مدارس میں معلمات پڑھاتی ہیں ، یا پردہ کے پورے اہتمام کے ساتھ مرد اساتذہ درس دیتے ہیں ، اسی لئے دینی مدارس کے طلباء یا فضلاء کی طرف سے اغواء یا اس طرح کے جرائم کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے گی —— غرض جو منفی اسباب درس گاہوں میں تشدد کی پرورش کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے انجام کار بعض لوگ دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں ، بحمد اللہ دینی مدارس ایسی باتوں سے پاک وصاف ہیں۔

اب ایک نظر ان مدارس کے روزمرہ کے ماحول اور معمولات پر بھی ڈالئے کہ ان ہی معمولات سے انسان کے فکر وعمل کا سانچہ تیار ہوتا ہے اور اس کے سلوک واخلاق کی عمارت بنتی ہے ، ان مدارس کا عام معمول یہ ہے کہ صبح سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اساتذہ وطلبہ بیدار ہوتے ہیں ، عام طلبہ بھی اور خاص کر قرآن مجید حفظ کرنے والے طلبہ تلاوتِ قرآن میں مشغول ہوجاتے ہیں اور بہت سے اہل توفیق رات کی اس تنہائی میں خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے اور تہجد ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل کرتے ہیں ، پھر صبح ہوتے ہی صبح سویرے سناٹے میں مؤذن کا نغمۂ توحید رس گھولتا ہے اور دوگانہ سنت ادا کرنے کے بعد فجر کی نماز ادا کی جاتی ہے ، نماز فجر کے بعد مختلف مدارس کے نظام الاوقات کے لحاظ سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تمام ہی طلبہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں ، پھر ناشتہ کیا جاتا ہے اور ناشتہ کے بعد اسباق شروع ہوجاتے ہیں۔

اسباق کا یہ سلسلہ دوپہر تک چلتا ہے ، پھر دوپہر کا کھانا اور کھانے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قیلولہ واستراحت ، قریب دو بجے دن ظہر کی اذان ہوتی ہے ، طلبہ بیدار کئے جاتے ہیں اور

اساتذہ وطلبہ وضو کر کے مسجد میں نماز ظہر ادا کرتے ہیں، ظہر کے بعد سے سہ پہر یعنی پانچ، ساڑھے پانچ بجے شام تک پھر اسباق کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس کے بعد عصر کی نماز پڑھی جاتی ہے، عصر اور غروب آفتاب کے درمیان موسم کے فرق کے ساتھ ایک گھنٹہ سے ڈیڑھ دو گھنٹہ کا وقفہ ملتا ہے، اس وقفہ میں کچھ لوگ چہل قدمی کرتے ہیں، کچھ لوگ اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے بازار جاتے ہیں اور کچھ فٹ بال یا والی بال وغیرہ کھیلتے ہیں۔

ابھی سورج اپنی آنکھیں موندنے کے لئے تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ اساتذہ اور طلبہ بارگاہِ خداوندی میں حاضری کے لئے وضو کرتے ہیں، اِدھر سورج نے اپنی کرنوں کو سمیٹا، اُدھر مؤذن نے صدا لگائی اور سب نے نماز مغرب ادا کی، نماز کے بعد حسب توفیق سنت ونفل پڑھی، مغرب کے بعد ڈیڑھ تا دو گھنٹہ طلبہ اپنے اسباق کا مذاکرہ کرتے ہیں، مذاکرہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جماعت کا ذہین طالب علم استاذ کے پڑھائے ہوئے سبق کو دوہراتا ہے اور دوسرے طلبہ اس سے استفادہ کرتے ہیں، اساتذہ اس وقت آئندہ اسباق کے لئے مطالعہ میں مشغول ہوتے ہیں، پھر عشاء کی اذان ہوئی، نماز ادا کی گئی اور کھانے کا دسترخوان بچھا، سب نے کھانا کھایا، کھانے کے بعد پندرہ بیس منٹ چہل قدمی اور دوسری ضروریات کے لئے وقفہ دیا گیا اور پھر اساتذہ وطلبہ آئندہ دن کے اسباق کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے، اپنی اپنی قوت برداشت کے اعتبار سے گیارہ سے بارہ اور بعض حوصلہ مندرات کے ایک ڈیڑھ بجے اللہ کا ذکر کرتے ہوئے محوِ خواب ہو گئے۔

یہ ہے ان مدارس کے روزمرہ کا معمول، رہائش کے کمرے معمولی، اکثر مدارس میں طلبہ فرش خاک ہی پر اپنا بستر بچھا لیتے ہیں، بعض مدارس؛ بلکہ بہت سے مدارس میں تو درس گاہوں کے لئے بھی علاحدہ عمارت نہیں ہے، اور رہائشی کمروں میں ہی اوقات درس میں اسباق بھی پڑھائے جاتے ہیں، مدارس میں ان غریب طلبہ کے لئے عوامی تعاون سے کھانے اور دوسری ضروریات کا نظم کیا جاتا ہے، یہ کھانے اوسط سے کم درجہ کے ہوتے ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے خاندانی پس منظر رکھنے والے طلبہ کی ہوتی ہے، جو خطِ غربت سے نیچے زندگی گذار رہے ہوتے ہیں۔

یہ ماحول طلبہ میں تواضع ، مسکنت ، قناعت ، ایثار واخوت ، اوقات کی پابندی ، اللہ پر توکل اور بھروسہ کی زندگی گذارنے کا مزاج پیدا کرتا ہے ، زیادہ سے زیادہ دولت اور عہدۂ وجاہ کی حرص کو کم کرتا ہے ، کہ یہی حرص وحوس انسان کو تشدد ودہشت گردی کے راستہ پر لے جاتی ہے ، کوئی صاحبِ انصاف دیکھے کہ یہ ماحول انسان کو دہشت گرد بنائے گا یا امن وآشتی کا پیغمبر اور انسانیت کا علمبردار؟؟

دینی مدارس کے مسائل کو اس پہلو سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مدارس اس ملک میں کیا تعمیری خدمت انجام دے رہے ہیں؟ اور ان کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟ وزارتِ داخلہ نے اس سال پھر حسبِ توقع دینی مدارس کے بارے میں ایک زہریلی ، لیکن دلیل و ثبوت سے عاری رپورٹ پیش کی ہے۔ افسوس کہ اس کے اعداد وشمار میرے سامنے نہیں ہیں ، لیکن میری یادداشت کے مطابق اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پورے ملک میں چھبیس ہزار دینی مدارس کام کررہے ہیں ، جن میں ڈھائی لاکھ کے قریب مدرسین اور ملازمین مصروفِ خدمت ہیں اور انیس لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔

یہ رپورٹ مبالغہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے اور غالباً چھبیس ہزار کی تعداد میں ان صباحی اور مسائی مکاتب کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو مساجد میں چلائے جاتے ہیں ، ورنہ بظاہر چھبیس ہزار کی تعداد بہت مبالغہ آمیز ہے ، دہلی کے ایک تحقیقی ادارہ ''انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹیڈیز'' کے سروے کے مطابق مدارس کی تعداد تین ہزار ہے ، پھر ان مدارس میں طلبہ کی تعداد انیس لاکھ ہونا بھی نہایت قابل تعجب ہے ، لیکن اگر یہ درست ہو اور محتاط اندازہ کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد بیس کروڑ مانی جائے تو یہ تعداد ایک فیصد سے بھی کم ہوتی ہے ، جب کہ حکومت ایسا تاثر دیتی ہے کہ گویا پوری مسلمان اُمت دینی مدارس کی طرف بھاگی جارہی ہے۔

حکومت کے انھیں اعداد وشمار سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تقریباً تین لاکھ ہندوستانی شہریوں کے لئے یہ مدارس باعزت روزگار فراہم کرتے ہیں ، جو ظاہر ہے کہ بجائے خود ایک بڑا تعمیری کام ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پرائیوٹیشن اور تمام محکموں میں کمپیوٹر سے استفادہ کرنے کی وجہ سے افرادی وسائل کی ضرورت محدود تر ہوتی جارہی ہے۔ ابتداء میں یہ

بات کہی گئی تھی کہ معاشی نظام میں لائی جانے والی تبدیلیوں کی وجہ سے روزگار کے مواقع بڑھیں گے، لیکن اب یہ ایک خواب ہوتا رجا رہا ہے اور روزگار کے مواقع بڑھنے کے بجائے گھٹتے جارہے ہیں۔ان حالات میں اگر حکومت پر بوجھ ڈالے بغیر کوئی نظام شہریوں کی ایک بڑی تعداد کو روزگار فراہم کرتا ہے، تو یہ تو قابل تحسین اور لائق ستائش بات تھی اور حکومت کو ایسے نظام تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے تھی، نہ یہ کہ اس نظام کو تہہ و بالا کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اگر یہ بات مان لی جائے کہ واقعی بیس لاکھ کے قریب بچے ان مدارس میں زیر تعلیم ہیں تو کم وبیش ان کی نصف تعداد ایسی ہوگی جن کے کھانے، پینے کی ضروریات بھی مدارس کی جانب سے پوری کی جاتی ہوگی، یہ بچے وہ ہوتے ہیں جو خطِ غربت کے نیچے زندگی گذارتے ہیں اور ان کے لئے دو وقت کے کھانے کا انتظام بھی اپنے آپ دشوار ہوتا ہے، اگر انھیں ان مدارس میں جگہ نہ دی جائے تو ان کی غالب ترین اکثریت چائلڈ لیبر کی حیثیت سے مختلف ہوٹلوں اور دوکانوں میں معمولی کام کر کے اپنا پیٹ بھرے گی اور باعزت مستقبل کا تصور بھی ان کے لئے دشوار ہوگا۔

پھر معاشی اعتبار سے ایک اور پہلو قابل غور ہے، ملک بھر میں لاکھوں کی تعداد میں مسجدیں ہیں، جن کو خطباء، ائمہ اور مؤذنین کی ضرورت ہوتی ہے۔بچوں کی بنیادی دینی تعلیم اور اُردو زبان کی تعلیم کے لئے مکاتب کے معلم یا ٹیوٹر کی صورت میں ہزاروں ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے، جو قرآن پاک اور اُردو کی تعلیم دے، ان سب کاموں کے لئے انھیں مدارس سے افراد مہیا ہوتے ہیں۔ مدارس سے تعلیم مکمل کرنے والے فارغین کی تنخواہیں گو کم ہوتی ہیں، لیکن ان کی ایسی ذہن سازی اور تربیت کی جاتی ہے کہ وہ دینی جذبہ کے تحت کم پیسوں میں کفایت شعاری کے ساتھ اپنی زندگی گذار لیتے ہیں، اس طرح مدارس کے ذریعہ سے انھیں افراد کے روزگار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو ان میں تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں یا دوسری خدمتیں کرتے ہیں، بلکہ ایسی تعلیم بھی ان کو مہیا کی جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ ضروری حد تک روزگار حاصل کر سکیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر سال ہزاروں افراد ان مدارس سے فارغ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی فرائض سے متعلق خدمت انجام دیتے ہیں، الحمدللہ انھیں فاقہ کشی کی

نوبت نہیں آتی، چنانچہ اخبار میں ایسی خبریں تو آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں تعلیم یافتہ بے روزگار نے معاشی حالات سے تنگ آکر خودکشی کرلی، لیکن خدانخواستہ کسی عالم یا حافظ کے بارے میں ایسی افسوس ناک خبر پڑھنے کو نہیں ملتی، یہ تو ہے ان مدارس کی معاشی افادیت کا پہلو۔

دوسرا اہم پہلو تعلیمی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں خواندگی کی مجموعی شرح پچاس سے ساٹھ فیصد کے درمیان ہے، یہ تو کم ترین خواندگی کا معاملہ ہے، سند یافتہ پڑھے لکھے لوگوں کی شرح ظاہر ہے کہ اس سے بہت کم ہے، ان مدارس کے ذریعہ ایک بہت بڑی تعداد کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو رہا ہے اور ایسے سند یافتہ فضلاء نکل رہے ہیں جو کم سے کم دو ملکی زبان اُردو اور مقامی اور دو مشرقی زبان عربی اور فارسی اور ایک حد تک انگریزی زبان پڑھے ہوئے ہوتے ہیں، دوسرے علوم ان کے علاوہ ہیں، اگر حکومت اپنے ہی اعداد و شمار کے مطابق انیس لاکھ افراد کی تعلیم کا انتظام کرے تو کس قدر وسائل درکار ہوں گے اور کیا ہماری حکومت جو چار، پانچ فیصد بھی تعلیم پر خرچ نہیں کر پاتی، ان اخراجات کی متحمل ہو سکتی ہے؟

پھر اس بات پر بھی غور کیجئے کہ یہ مدارس کن طبقات تک علم کی روشنی پہنچاتے ہیں؟ ان لوگوں تک جن کے پاس نہ مال و زر ہے، نہ تعلیم کا شعور ہے، نہ شہری تمدن ہے اور نہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے تہذیبی اور ثقافتی معیارات ہیں۔ آج کل جو لوگ اسٹیج پر مسلمانوں کو حصولِ تعلیم کا اُپدیش دیتے ہیں، ان کا اپنا حال یہ ہے کہ ان کی درس گاہوں میں غریب طلبہ اور ان کے اولیاء کے لئے زینہ پر قدم رکھنے کی بھی گنجائش نہیں، سرکاری اسکولوں کا حال یہ ہے کہ وہاں طلبہ کے لئے فرنیچر اور محفوظ دیواریں اور چھتیں بھی میسر نہیں ہیں؛ اسی لئے شاید ہی کوئی سرکاری عہدہ دار اور عوامی اداروں میں قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ارکانِ پارلیمنٹ و اسمبلی کے لڑکے و لڑکیاں ان درس گاہوں میں زیرِ تعلیم ہوں۔ اس صورتِ حال کے پس منظر میں دیکھئے کہ یہ مدارس کیسا تعلیمی جہاد کر رہے ہیں اور کتنا عظیم کارنامہ ان کے ذریعہ سرانجام پا رہا ہے؟ ہمارے ہندو بھائیوں کو چاہئے کہ اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھیں؛ بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے پس منظر میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ مسئلہ پر غور کریں۔

تعلیمی اعتبار سے ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری یونیورسٹیوں میں مشرقی

زبانوں، عربی، فارسی، اُردو کے جو شعبہ جات قائم ہیں، ان میں زیادہ تر طلبہ دینی مدارس کے فضلاء ہوتے ہیں۔ اگر مدارس سے ان شعبوں کو غذا نہ ملے تو خاص کر عربی اور فارسی کے شعبوں میں طلبہ کا دستیاب ہونا دشوار ہو جائے گا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کے ان شعبوں میں جو طلبہ عصری درس گاہوں کے راستہ سے آتے ہیں، ان کی استعداد افسوس ناک حد تک سطحی ہوتی ہے اور یہی حال ایسے پس منظر رکھنے والے اساتذہ کا ہوتا ہے، کہ بعض دفعہ وہ نہایت مضحکہ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں اور دینی مدارس کے معمولی فضلاء کے لئے بھی ایسی غلطیاں حیرت انگیز ہوتی ہیں۔

تعلیمی اعتبار سے یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اُردو ٹیچرس اور اُردو، فارسی وعربی اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے ان ہی دینی درس گاہوں میں نشو ونما پائی ہے اور تعلیم وتدریس کے اعتبار سے بھی یہی حضرات درس گاہوں میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت اس ملک میں اُردو زبان ان ہی دینی مدارس کے دَم سے باقی ہے، ورنہ جس طرح معیشت اور روزگار سے اس کا رشتہ کاٹ دیا گیا ہے، اُردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، حیدرآباد میں دارالترجمہ کو راتوں رات راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا اور تنگ نظر سیاست دانوں نے بیک جنبش قلم ملک کی واحد اُردو یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کی زبان تراش کر کے رکھ دی، اس اعتبار سے اُردو کا وجود ختم ہو جانا چاہئے تھا، لیکن ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس کا ذریعہ تعلیم چوں کہ اُردو زبان ہی ہے، اس لئے اس نظام نے اُردو کو نئی طاقت دی ہے۔ اس وقت ملک بھر میں اگر اُردو کتابوں اور جریدوں کے اعداد وشمار جمع کئے جائیں تو ان میں نوے فیصد ان ہی مدارس کے فیض یافتہ قلم کاروں کے رشحاتِ فکر ہوں گے۔

غور کیا جائے کہ یہ بجائے خود کتنی بڑی علمی اور تعلیمی خدمت ہے اور ایک ایسی دیسی زبان کی حفاظت ہے جو ملک کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک سمجھی جاتی ہے اور جس کے خوبصورت مکالموں، جل ترنگ غزلوں اور کانوں میں رس گھولنے والے نغموں کا ہر سلیم الفطرت ہندوستانی رسیا ہے۔ کیا ایک قومی زبان کو زندہ و پائندہ رکھنا معمولی خدمت ہے؟

ہندوستان گو اب اسرائیل سے قربت کی وجہ سے ایک جانب دار اور فاشسٹ ملک کی

حیثیت سے اپنی تصویر آپ خراب کر رہا ہے، لیکن ہندوستان کا یہ اصل مزاج نہیں، ہندوستان کے معماروں نے اس ملک کو ایک غیر جانب دار اور انصاف کے طرف دار ملک کی حیثیت سے اُبھارا تھا، یہی اس کی روشن شبیہ ہے، اس شبیہ کو برقرار رکھنے کے لئے وہ دنیا کے چھپن مسلم ممالک جو ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں واقع ہیں، سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا، ان میں سے اکثر ممالک وہ ہیں جہاں کی زبان عربی ہے، ہندوستان میں ان ممالک کے سفارت خانے واقع ہیں اور ان ملکوں میں ہندوستان کے ان سفارت خانوں کی جو سیاسی اور بین الاقوامی اہمیت ہے، وہ کسی صاحبِ نظر کی نظر سے مخفی نہیں، ان سفارت خانوں میں باصلاحیت، محبِ وطن اور مخلص کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس ضرورت کی تکمیل میں بھی عربی زبان وادب کے رمز شناس فضلائے دینی مدارس کا حصہ بہت ہی نمایاں ہے، غرض ملک کی تعمیر اور اس کی خدمت کا جو کام یہ مدارس انجام دے رہے ہیں، وہ نہایت عظیم الشان ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان مدارس کے ذریعہ ملک کو شریف، مخلص، قانونِ ملکی کا پابند اور باشعور شہری ملتے ہیں، حکومت بار بار مدارس کی دہشت گردی کا واویلا مچاتی ہے اور مدارس کو (آئی، ایس، آئی) سے جوڑتی ہے، لیکن آج تک حکومت اس سلسلہ میں کوئی ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ مدارس انسانیت گر ہیں نہ کہ دہشت گرد، دہشت گردانہ تحریک سے نہ ماضی میں ان کا تعلق رہا ہے اور نہ اب ہے۔ ملک میں قتل و غارت گری، سرقہ وراہزنی اور آبروریزی کے کتنے ہی واقعات ہر دن پیش آتے رہتے ہیں، لیکن اس بات کی دو چار مثالیں بھی نہیں مل سکتیں کہ مدارس کے فضلاء اس کے مرتکب ہوئے ہوں۔ ملک کے مختلف علاقوں میں دہشت گرد تنظیمیں سرگرم فساد ہیں۔ آسام، ناگالینڈ، میزورم، منی پور اور پنجاب میں علاحدگی پسند تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ بہار، بنگال، آندھرا پردیش اور تمل ناڈو وغیرہ میں نکسلائیٹ تحریک عروج پر ہے، مدھیہ پردیش اور اس سے متصل علاقوں میں ڈاکوؤں کے منظم گروہوں نے پولیس کی نیند اُڑا رکھی ہے، نیز ایل، ٹی، ٹی، ای کی تحریک اور جنگلات کے اسمگلروں نے کئی ریاستوں کو اپنی دہشت گردانہ حرکتوں سے عاجز کر رکھا ہے، لیکن کیا ان تحریکات میں کہیں ان مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں کی شمولیت پائی گئی ہے؟

کشمیر میں علاحدگی پسندی کی تحریک مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، لیکن وہاں بھی ہندوستان کے دینی مدارس کے فضلاء اور طلبہ کے ان سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا کہیں کوئی ثبوت نہیں ملا ہے ، بابائے قوم گاندھی جی قتل کردیئے گئے ، فاتح بنگلہ دیش اندرا گاندھی کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا ، راجیو گاندھی کے پرخچے اُڑادیئے گئے ۔غور کیجئے کہ دہشت گردانہ حرکتوں میں کون لوگ ملوث رہے ہیں؟ کیا یہ دینی مدارس کے فضلاء اوران کے متعلقین کا کارنامہ ہے؟

حکومت کو یہ فکر پریشان کئے ہوئے ہے کہ ان مدارس کے پاس اتنا فنڈ کیوں کرآتا ہے؟ اول تو لوگوں کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ ان مدارس کے حجم کے اعتبار سے ان کے اخراجات بہت معمولی ہوتے ہیں ، دوسرے یہ اخراجات بڑی حد تک مسلمانوں کے مقامی تعاون سے پورے ہوتے ہیں ، اس سلسلہ میں جو لوگ زکوٰۃ ،صدقۃ الفطر اور چرم قربانی کے نظام پر نگاہ رکھیں گے، ان کے لئے اس کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں ہوگا ، وہ اس طرح کہ ساڑھے باون تولہ چاندی پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے، اگر ملک میں مسلمانوں کی آبادی بیس کروڑ مان لی جائے اور فرض کیا جائے کہ پندرہ فیصد مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو گویا تین کروڑ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہوئی ، مالی حیثیت کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی مختلف مقدار ہوگی ، لیکن اگر فی کس اوسطاً ایک ہزار روپے زکوٰۃ کا مانا جائے ،تو سالانہ تین ارب روپئے زکوٰۃ کے ہوں گے ۔صدقۃ الفطر ، مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ادا کرتی ہے اور چوں کہ اس کے لئے مخصوص اموالِ زکوٰۃ کا مالک ہونا ضروری نہیں ، اس لئے تقریباً پچاس فیصد مسلمانوں کی طرف سے صدقۃ الفطر کی ادائے گی ہوتی ہے ، اس وقت صدقۃ الفطر کی مقدار کم وبیش بیس روپیہ ہے ، دس کروڑ افراد اگر فی کس بیس روپئے ادا کررہے ہیں تو یہ رقم بھی دو ارب ہوجاتی ہے ، اس کے علاوہ اگر پچیس فیصد مسلمانوں کے بارے میں یہ مانا جائے کہ وہ قربانی دیتے ہیں اور اوسطاً ان کے چرم قربانی کی رقم فی کس سو روپئے ہی مان لی جائے تو یہ رقم پانچ ارب ہوجاتی ہے۔

اس طرح عام صدقات وخیرات اور وقف کی آمدنی کے علاوہ دس ارب روپئے زکوٰۃ ، صدقۃ الفطر اور قربانی سے حاصل ہوتے ہیں ، اجناس اور پھلوں میں دس فیصد اور پانچ فیصد بطور عشر جو ادا کیا جاتا ہے، نیز عمومی عطیات کی جو رقمیں ہوتی ہیں ، وہ اس کے علاوہ ہیں ۔ اگر

پورے ہندوستان کے مدارس کے اخراجات کو جمع کیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ وہ پانچ، چھ ارب سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ ان اعداد وشمار سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے مدارس کے اخراجات کو پورا کرنے میں خود مکتفی ہیں، انھیں بیرونی ملکوں کی طرف دیکھنے کی چنداں حاجت نہیں۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ یہ مدارس بیرونی ایجنسیوں سے تعاون حاصل کرتے ہیں اور ان کا چلنا بیرونی امداد پر منحصر ہے، بے خبری اور ناآگہی پر مبنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس دستور وآئین کے پابند، امن پسند، انسانی اخوت ومحبت کے علمبردار ہیں۔ ہر طرح کی ظلم وزیادتی اور دہشت گردی کے مخالف، قوم وملک کے بہی خواہ ادارے ہیں اور ان کے دروازے سبھوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، جو بھی چاہے ان مدارس میں آکر ان کے شب وروز کے نظام کو دیکھ سکتا ہے بغیر دیکھے ہوئے اور بلاتحقیق مدارس کو بدنام کرنا اور ان پر دہشت گردی کا الزام رکھنا یقیناً کھلی ہوئی زیادتی اور بد دیانتی ہے، اس لئے اہل مدارس کی طرف سے سرکاری عہدیداران، اربابِ صحافت اور ہمارے دیگر برادرانِ وطن کے لئے صدائے عام ہے کہ وہ بچشم سران مدارس کے نظام کو دیکھیں اور سچائی کے گواہ بنیں، نہ کہ جھوٹ اور بہتان کے پرچارک۔

☆☆☆

دینی مدارس انسان گر یا دہشت گرد؟

اگر کسی ہندوستانی سے پوچھا جائے کہ تم اپنے ملک میں کچھ ایسے ادارے اور تنظیموں کی رہنمائی کرو جو نوعمروں کو انسان بناتی ہو، جو اس لئے تعلیم دیتی ہو کہ آدمی، آدمی بن جائے، جس کے نزدیک تعلیم کا مقصد پیٹ بھرنا نہ ہو، بلکہ جس کا نشانہ روح کو پاکیزہ بنانا ہو، جہاں ایسے علوم سکھائے جاتے ہوں، جس کا بنیادی مقصد مخلوق کی محبت پیدا کرنا اور ان کی خدمت کا جذبہ اُبھارنا ہو، تو یقیناً یہ ایک مشکل سوال ہوگا اور اس کا جواب دینا آسان نہ ہوگا۔

اگر آپ ایوانِ سیاست میں ایسے لوگوں کو تلاش کریں گے تو یہ رات میں سورج کو تلاش کرنے کے مترادف ہوگا۔ جھوٹ، دھوکہ بازی، غلط بیانی، عہد شکنی، جوڑ توڑ اور کرپشن آج کی سیاست کا خمیر ہے، سیاست کی منزل اونچے سے اونچے عہدے کا حاصل کرنا اور اس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانا ہے، قوم کی فلاح و بہبود یا ان کے مسائل سے اہل سیاست کو کوئی دلچسپی نہیں، اور اگر کچھ ہے تو صرف ووٹ بینک کی حفاظت کے لئے۔ چلئے اس ایوان سے باہر آیئے اور کچھ ان تنظیموں کا حال بھی دیکھئے جو کچھ مذہبی اور کچھ رفاہی ہیں۔ ایسی تنظیموں میں سب سے نمایاں نام ''راشٹریہ سیوک سنگھ'' کا ہے، جس کے لاکھوں ممبران ملک کے کونہ کونہ میں موجود ہیں، اس تنظیم نے اپنے لئے جو نام انتخاب کیا ہے اس کے معنی ہیں: ''انجمن خدام وطن'' گویا خدمت اور سیوا اس کا جزءِ نام ہے، لیکن یہ تنظیم لاٹھی اور بلم کی عسکری مشق سے پہچانی جاتی ہے، گویا وہ قوم کی خدمت لاٹھیوں اور بندوقوں سے کرنے کی مشق کر رہی ہے اور یہ ایک

حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد سے وہ بے قصور اور کمزور لوگوں پر اس کی خوب مشق کر چکی ہے۔

آیئے ایک قدم آگے اور عالی شان اور بلند نشان درس گاہوں کے احاطہ میں تشریف لایئے، یہاں آپ کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسیٹوں کی خوب صورت اور دیدہ زیب عمارتیں نظر آئیں گی، ایسے سبزہ زار ملیں گے کہ نگاہ ہٹنا نہ چاہے، کتابوں سے آراستہ و پیراستہ کتب خانے بھی آپ کا خیر مقدم کریں گے اور طلبہ و طالبات کی ایک بھیڑ تتلیوں کی طرح ایک طرف سے اُڑ کر دوسری طرف جاتی ہوئی نظر آئے گی؛ لیکن کیا آپ کو یہاں انسان مل جائیں گے؟ اس کا مثبت جواب دینا مشکل ہے، شور و غل، احتجاج، مظاہرے، نعرہ بازیاں، بھوک ہڑتال، اساتذہ کے ساتھ استہزاء، طلبہ کی ایک دوسرے کے ساتھ رقیبانہ اور حریفانہ کشمکش، منشیات، ایسی باتیں ہیں جنھیں تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کی حاجت نہیں ہوگی، بلکہ آپ اس کو اتنا وافر اور اس قدر علانیہ محسوس کریں گے کہ جیسے کوئی شخص لمبے چوڑے اور رواں دواں دریا کے پاس بیٹھا ہو اور پانی کی طلب میں ہو، کوئی برائی نہیں کہ آپ اسے اس ماحول میں تلاش کرنا چاہیں اور آپ کو مایوسی ہو، قتل، اغواء، غصب، چوری، عصمت ریزی، بڑوں کی بے توقیری، چھوٹوں کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کے واقعات اب کالجوں اور اسکولوں میں اتنے زیادہ ہونے لگے ہیں کہ یہ ایک معمول کی بات ہے اور ابتداءِ تعلیم ہی کے زمانہ میں ریگنگ کے ذریعہ ان غیر اخلاقی افعال کی ابتداء ہو جاتی ہے۔

اس میں صرف طلبہ و طالبات کو قصوروار قرار دینا قرین انصاف نہیں، اصل میں ہم نے نظام تعلیم ہی ایسا بنایا ہے جس میں اخلاق اور تہذیب کے لئے کوئی جگہ نہیں، طلبہ ہوں یا اساتذہ، ان کے نزدیک تعلیم محض ذریعہ معاش ہے، تعلیم کا مقصد اول تا آخر پیسے کا حاصل کرنا اور پیٹ کا بھرنا ہے، ان علوم میں خدمت انسانی کے اعتبار سے سب سے اہم شعبہ ''طب'' کا ہے، لیکن آج معالجین کا حال یہ ہے کہ چاہے مریض جاں بہ لب اور آپریشن کی میز پر ہو، جب تک معقول پیسے وصول نہ کر لئے جائیں، ڈاکٹر کا قلم جنبش کرنے کو بھی تیار نہیں، قتل و راہزنی کے بڑے بڑے مقدمات میں ایسے لوگ ماخوذ ہو رہے ہیں جن کے پاس اعلیٰ ڈگریاں موجود ہیں، کھانے کا ذائقہ خراب ہو تو نمک سے اس کی اصلاح ہوتی ہے، لیکن جب نمک ہی کا مزہ

بگڑ جائے تو اس کی اصلاح کیوں کر ہوگی؟ یہی بات آج کل تعلیم گاہوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے، سماجی بگاڑ دور کرنے کا ذریعہ تعلیم ہے، لیکن اگر تعلیم حاصل کرنے والے اور دینے والے ہی اخلاق اور انصاف کا دامن چھوڑ دیں تو کس طبقہ سے اُمید رکھی جائے کہ وہ شرافت، تہذیب، اخلاق اور انسانیت کا علم تھامے رہیں گے؟؟

لیکن ابھی آپ مایوس نہ ہوں، ان شاء اللہ اس نا اُمیدی کا علاج آپ کو دینی مدارس میں ملے گا۔ کسی درس گاہ کے مزاج کو سمجھنے کے لئے تین عوامل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اول: درس گاہ کا تربیتی ماحول، دوسرے: درس گاہ کا نصاب تعلیم، تیسرے: تعلیم دینے والے اساتذہ کا مزاج وکردار۔ جہاں تک تربیتی ماحول کی بات ہے تو عام طور پر صبح کی پو پھٹنے سے پون گھنٹہ ایک گھنٹہ پہلے ہی مدارس میں طلبہ بیدار کئے جاتے ہیں اور تلاوتِ قرآن سے مدارس کی فضا گونج اُٹھتی ہے، پھر فجر کی نماز اور نماز کے بعد پھر تلاوتِ قرآن، اس کے بعد صبح سے رات گئے تک یہی پڑھنا اور پڑھانا اور وقتاً فوقتاً دس بیس منٹ کے تذکیری اجتماعات جس میں اخلاق اور تقویٰ کی تعلیم دی جاتی ہے، صرف عصر تا مغرب کا وقت ورزش، کھیل کود وغیرہ کے لئے مخصوص ہے۔ اس ماحول میں چھوٹے جس طرح بڑوں کا ادب کرتے ہیں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، اساتذہ سے بے پناہ محبت، احترام، بے حد جذبۂ خلوص اور اساتذہ کی خدمت کرنے میں مسابقت کا جذبہ، پھر اساتذہ کے اندر بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ اتھاہ شفقت ومحبت اور چاہت، ان کو بہتر سے بہتر بنانے کی اُمنگ اور خوب سے خوب تر کی کوشش، اساتذہ وطلبہ کی عام زندگی سادہ، تکلفات سے خالی اور قناعت شعار۔ اس پورے ماحول میں ہر جگہ محبت کی شبنم ہی ملے گی نہ کہ نفرت کا شعلہ، نہ کسی کے خلاف لاٹھی اور تلوار کی مشق۔ کیا یہ ماحول کسی انسان کو دہشت گردی کی تعلیم دے سکتا ہے؟

انسانی ذہن کی تشکیل میں بہت بڑا حصہ ان مضامین اور کتابوں کا ہوتا ہے جن کو وہ پڑھتا ہے؛ اس لئے شخصیت سازی میں نصابِ تعلیم کا بھی اہم کردار ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو دینی مدارس کے بنیادی عناصر دو ہیں: قرآن اور حدیث، قرآن خدا کی کتاب ہے اور اس کی ابتداء '' بسم اللہ الرحمٰن الرحیم '' سے ہوتی ہے، ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کے معنی

''نہایت مہربان'' اور ''بے حد رحم کرنے والے'' کے ہیں، گویا قرآن اپنے پہلے فقرہ میں ایسے خدا کی یاد دلاتا ہے جس کا بنیادی وصف رحم وکرم ہے، یہ گویا انسان کو اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ سب سے پیارا وصف اور سب سے بہتر صفت رحم وکرم کی ہے، پھر سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت میں خدا کے ''رب العالمین'' یعنی تمام عالم کے پروردگار ہونے کا ذکر ہے، اس میں بھی امن و آشتی کی تعلیم ہے کہ ایک انسان نہ صرف تمام انسانوں کو بلکہ تمام مخلوقات کو ایک ہی خاندان اور کنبہ تصور کرے، کیوں کہ خدا کی ربوبیت کے رشتہ نے ان سب کو ایک ڈوری میں باندھ رکھا ہے، قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ یہی محبت و پیار، رحم دلی اور عفو ودرگذر ہے۔

''حدیث'' پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات، آپ ﷺ کے افعال اور آپ ﷺ کے احوال کو کہتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ آپ ﷺ کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ آپ ﷺ تمام عالم کے لئے پیکر رحمت تھے، کتنے ہی مظالم تھے کہ آپ ﷺ نے انسانیت کو اس سے نجات دلائی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو میرے ساتھ ظلم کرے، مجھے اس کے ساتھ بھی رحم اور انصاف کا حکم دیا گیا ہے، جو میرے ساتھ قطع رحمی کرے، میں اس کے ساتھ بھی صلہ رحمی پر مامور ہوں اور آپ ﷺ نے عملی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا، عفو ودرگذر سے بڑھ کر آپ ﷺ کو کوئی وصف محبوب نہیں تھا اور ظلم وشقاوت سے بڑھ کر کوئی وصف آپ کو مبغوض نہ تھا۔ حدیث کی کتابوں میں مخلوق پر شفقت و رحمت، ظلم کی مذمت، اقرباء کے ساتھ صلہ رحمی، غرباء کی مالی اعانت، بھلائی کی دعوت اور برائی سے روکنے کی کوشش، ظالموں کے خلاف احتجاج اور بدرجۂ مجبوری طاقت کے استعمال کی ترغیب، ان سے متعلق احادیث میں مستقل ابواب موجود ہیں، ظاہر ہے کہ یہ تعلیمات انسان کو امن پسند اور محب انسانیت بنائیں گی، نہ کہ دہشت گرد اور انسانوں سے نفرت کرنے والا۔

جیسا کہ مذکور ہوا انسان کی شخصیت سازی میں دوسرا اہم کردار استاذ اور مربی کا ہوتا ہے، دینی مدارس کے اساتذہ کی ایک روایت رہی ہے، قناعت، تکلفات سے دوری، سادگی اور توکل علی اللہ ان اساتذہ کا خاص وصف رہا ہے اور یہی وصف ہے جو ان کو ان کے شاگردوں کی نگاہ میں محبوب بنا دیتا تھا، اگر اس سلسلہ میں واقعات لکھے جائیں تو ایک اچھی خاصی ضخامت

کی کتاب بھی تنگ دامانی کا گلہ کرے گی، مگر ایک واقعہ جو بہت پہلے کا نہیں، ماضی قریب کا ہے، ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاتا، سید محمد مبارک محدث بلگرامیؒ، مولانا نور الحقؒ (مصنف تیسیر القاری شرح فارسی صحیح بخاری) کے شاگردوں میں تھے، ان کے بارے میں میر طفیل محمد بلگرامی نے نقل کیا ہے کہ ایک روز میں میر مبارکؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، میر مبارکؒ وضو کے لئے اٹھے اور اچانک گر پڑے، ایک گھنٹہ کے بعد افاقہ ہوا، میر طفیل محمد نے بے ہوشی کی وجہ دریافت کی تو بہت اصرار کے بعد فرمایا:

"تین دن سے کوئی غذا میسر نہیں آئی ہے، لیکن نہ کسی کے سامنے زبانِ سوال کھولی اور نہ ہی قرض لیا، میر طفیل محمد فوراً گھر گئے، عمدہ کھانا جو آپ کو مرغوب تھا تیار کرایا اور خدمت میں پیش کیا، میر مبارک نے پہلے تو خوشی ظاہر کی اور دعائیں دیں، پھر فرمایا کہ بارِ خاطر نہ ہو تو ایک بات کہوں اور وہ یہ کہ جب تم میری یہ کیفیت دیکھ کر گئے تو مجھے خیال ہوا کہ تم میرے لئے کھانا لانے گئے ہو، اسی کو "اشراف" کہتے ہیں اور ایسے کھانے کو صوفیاء منع کرتے ہیں، اس لئے میں اسے نہیں کھا سکتا، شاگرد بھی باکمال اور نکتہ شناس تھے، فوراً کھانا اُٹھالیا، واپس لے آئے اور لمحہ بھر رک کر دوبارہ اسی کھانے کے ساتھ میر مبارکؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ جب میں نے اس کھانے کو اُٹھالیا تو یقیناً آپ کو یہ امید نہ رہی ہوگی کہ میں اسے دوبارہ آپ کے پاس لاؤں گا، پس اب "اشراف" کی کیفیت باقی نہیں رہی، استاذ نے شاگرد کی اس سمجھداری کی داد دی اور پھر پوری رغبت سے کھانا تناول فرمایا"۔

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت: ۳۹)

یہ کہنا تو مبالغہ ہوگا کہ آپ دینی مدارس کے تمام اساتذہ سے میر مبارکؒ کے کردار کی توقع رکھیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک اچھی چیز کی سطح گر بھی جائے تب بھی اس کا ایک معیار ہوتا ہے، اس لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی ''اجرت'' کے بجائے ''اجر'' پر نظر رکھنے، تعلیم کو ایک مقدس فریضہ سمجھنے اور طلبہ سے محبت وشفقت کا برتاؤ کرنے کی جو روایت باوجود بہت سارے انحطاط کے ان مدارس میں پائی جاتی ہے، شاید ہی کہیں اور اس کی مثال مل سکے، جو لوگ اس مزاج و مذاق کے حامل ہوں وہ انسانیت دوستوں کے بجائے انسانیت دشمنوں کو پیدا کریں گے اور محبت وآشتی کے بجائے ان کو نفرت اور دہشت گردی کا سبق دیں گے؟ اس لئے دینی مدارس کو دہشت گردی کا طعنہ دینا دن کو رات کہنے سے کم بڑا جھوٹ نہیں اور دراصل یہ اپنے جرم کی پردہ پوشی اور سورج پر تھوکنے کی سعی ہے۔

☆☆☆

دینی مدارس

حکومت اور مسلمانوں کے درمیان

جیسے ہوا اور پانی انسان کے لئے ایک ضرورت ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر دین انسان کی ضرورت ہے۔ دین ہی کے ذریعہ انسان کو جینے کا سلیقہ آتا ہے، گویا یہ مہذب زندگی کی کلید ہے، اسی لئے کائنات کے خالق و مالک نے جس طرح انسان کو ہوا، پانی اور دوسری ضروریات مہیا کی ہیں، اسی طرح پیغمبروں اور رسولوں کی معرفت دین حق بھی بھیجا اور جینے اور مرنے کا طریقہ بتایا۔ کائنات میں جو پہلا انسان آسمان کی سیر کر کے جنت کی خوش رنگیوں کو دیکھ کر آیا، وہ پہلا انسان بھی تھا، پہلا پیغمبر بھی اور دین حق کا حامل و داعی بھی۔

انسان کی ایک بیماری خالص چیزوں میں آمیزش اور ملاوٹ کی ہے۔ غور کیجئے کہ دنیا کی کون سی چیز اس کی آمیزش سے محفوظ ہے؟ کھانے کی ہو، پینے کی ہو، پہننے کی ہو، رہنے سہنے کی ہو، یا کسی اور طریقہ پر استعمال کی، جہاں جہاں اس کے لیے ملاوٹ کی گنجائش اور طاقت ہے، وہ ضرور ہی اس حرکتِ ناشائستہ کا ارتکاب کرتا ہے اور دین کے معاملہ میں بھی اس نے یہی کیا، اس کی ''طبع آمیز خو'' نے دین میں بھی آمیزشوں اور ملاوٹوں کو راہ دے دیا، انبیاء آتے، کھرے کھوٹے کو الگ کرتے، زرِ خالص پر پڑے ہوئے غبار کو صاف کرتے، اُدھر وہ گئے،

اِدھر قوم نے کھوٹ کو جمع کیا، غبار اکٹھا کئے اور دین خالص کو اپنی آمیزشوں اور ملاوٹوں سے بگاڑ کر رکھ دیا، محمد رسول اللہ ﷺ آخری پیغمبر تھے، جیسے سورج نکلنے کے بعد تارے منہ چھپا لیتے ہیں اور آسمان کی پیشانی پر چشم ناز دکھانے والی کہکشاں ڈوب جاتی ہے، اسی طرح نبوتِ محمدی ﷺ کائنات کے اُفق پر ایک خورشیدِ ہدایت اور مہر صداقت کا طلوع تھا، جس نے پچھلے چراغوں کو بجھا دیا۔ اب اگر یہ آفتابِ عالم تاب بھی گہن آلود ہو جائے، تو کون ہوگا جو حق و راستی کی بے غبار روشنی لوگوں تک پہنچائے؟

اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود اس دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ (الحجر: ۹) دین اور سرچشمۂ دین ''قرآن مجید'' کی حفاظت کا جو انتظام و انصرام رب کائنات کی طرف سے ہوا ہے، وہ بجائے خود ایک معجزہ اور اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ مفسرین، محدثین، فقہاء اور عربی زبان و ادب کے رمز شناس ماہرین یہ سب وہ قدسی گروہ ہیں، جن کو حفاظتِ ربانی کے اس نظام کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی دینی مدارس بھی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اہم تاریخی حقیقت قابل توجہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے، ان کی تشریح وتوضیح اور تبلیغ واشاعت حکومتوں سے متعلق تھی، وہی مذہبی اقتدار کے حامل بھی ہوتے تھے، ہندو مذہب میں ورنوں کی تقسیم کے ذریعہ اس کا ایک مضبوط نظام قائم تھا، یہودی حکومتیں اسی اساس پر قائم تھیں، یونانیوں کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد یہی بات عیسائیوں کے یہاں پیدا ہوئی اور عیسائیت نے توحید سے تثلیث کا سفر ہی یونانی فرماں رواؤں کے قدیم نظریہ سے ہم آہنگ ہونے کے لئے کیا، کم وبیش یہی حال دوسرے مذاہب کا بھی رہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حکومتیں اپنے مفادات کے مطابق مذہب میں تبدیلیاں کرتی رہتی تھیں اور عقیدہ کو سیاسی استحکام کا وسیلہ بنایا جاتا تھا۔ اسلام کی تاریخ میں خلافت راشدہ کے بعد سے ہی سیاسی اور مذہبی اقتدار کے مراکز بدل گئے، اس کے نتیجہ میں مذہب ہر طرح کی دست برد سے آزاد رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں مذہبی شخصیات وارباب اقتدار کے

درمیان فاصلے رہا کرتے تھے۔ کیوں کہ مذہبی شخصیتیں کسی ایسی فکر کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں جو کتاب وسنت کے مزاج سے الگ ہو، اور یہ بات بعض اوقات اہل سیاست کے مفاد کے خلاف جاتی تھیں۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، سعید بن جبیرؒ، سعید بن میتبؒ، امام سرخسیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام نسائیؒ، غرض اصحابِ عزیمت علماء کی ایک طلائی زنجیر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اقتدار کے چشم وابرو کے اشارہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جرم بے گناہی میں طرح طرح کی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گذرے۔

اسی لئے تمام ہی علوم اسلامی کی تدوین وترتیب اور اس کا ارتقاء ان لوگوں کے ذریعہ انجام پایا جو ایوانِ حکومت کے سائے سے بھی بھاگتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بے آمیز طریقہ پر ان علوم کی ترتیب عمل میں آئی۔ صورت حال یہ تھی کہ اگر کوئی محدث حکمرانوں کے یہاں آمد ورفت رکھتا تو اہل فن اس کی روایت کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے، اگر کوئی فقیہ حکومت کے عہدے قبول کر لیتا تو عوام ان کے فتوے کو قبول نہیں کرتے اور دوسرے فقہاء اس سے گریز کی راہ اختیار کرتے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی علوم بے آمیز طریقہ پر ترتیب دیئے گئے، پروان چڑھے اور انھوں نے دین خالص کی ترجمانی کی۔

ایک طویل دور ایسا گذرا کہ مختلف اہم شخصیتیں علم وفن کا مرجع بنی رہیں، جس کو جس فن کی تعلیم حاصل کرنی ہوتی، وہ اس فن کی ممتاز شخصیت کے پاس چلا جاتا اور اس سے کسبِ فیض کرتا، گویا یہ ''شخصی مدرسہ'' ہوتے، جو تشنہ کامانِ علم کی پیاس بجھاتے۔ پھر ایک دور مدارس کا آیا، جس میں ایک جگہ مختلف علوم وفنون کی تعلیم ہوا کرتی اور فن کی مناسبت سے مختلف شخصیتیں درس دیا کرتیں۔ جیسے ایک زمانہ میں اپنے عہد کے عبقری علماء کے ذریعہ دین کی حفاظت سرانجام پاتی تھی، اسی طرح اب مدارس کے ذریعہ دین کی حفاظت واشاعت کا فریضہ انجام پانے لگا۔

اس سلسلہ میں ہندوستان اور برصغیر کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، تقریباً ڈیڑھ سو سال سے یہی خطہ اسلامی تحریکات کا مرکز رہا ہے اور ان تمام تحریکات کو ان ہی مدارس سے خونِ جگر ملا ہے، اسلام کے خلاف جو سازشیں کی گئیں، قادیانیت، انکارِ حدیث، نیچریت، الحاد، یہ بھی زیادہ تر اسی خطہ سے اُٹھیں، اس لئے نظام غیبی کے تحت یہ بات ضروری تھی کہ اسی خطہ میں

وہ لوگ بھی پیدا ہوں جو فتنوں کو دبا سکیں اور ان سازشوں کا مقابلہ کرسکیں، یہ کام ان ہی مدارس کے ذریعہ انجام پایا۔ یہاں سے جو دینی تحریکات اُٹھیں، عالمی سطح پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور یہاں مخالف اسلام تحریکوں سے جو پنجہ آزمائی کی گئی، اس نے بھی عالمی سطح پر اپنے اثرات ڈالے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ یورپ سے اخلاقی اور مذہبی قدروں کے خلاف جدیدیت اور آزادی کا جو صور پھونکا گیا اور الحاد اور عیش کوش کی جو دعوتِ عام دی گئی، اس نے پوری دنیا میں بلا کسی خاص رکاوٹ اور مقابلہ کے کامیابی حاصل کرلی، یہاں تک کہ عرب دنیا اور اسلامی دنیا میں بھی، لیکن برصغیر کو وہ اسلامی شعائر کے احترام اور مسلمہ مذہبی اور اخلاقی قدروں کی پابندی سے محروم نہیں کرسکی۔ اس کا اندازہ برصغیر اور دوسرے ممالک کے مسلم سماج کی تہذیبی اور ثقافتی کیفیت سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ان ہی مدارس کا فیض ہے اور جس چیز کو آج اسلامی لہر کہا جاتا ہے، اگر آپ اس کے اصل سوتے اور سرچشمے کو تلاش کریں تو آپ بالآخر ان ہی درس گاہوں تک پہنچیں گے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس نے مغرب کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے اور اسی لئے امریکہ نے جنگِ افغانستان کو ''تہذیبی تصادم'' سے تعبیر کیا تھا۔ اس پس منظر میں عالمی سطح پر بات سوچی جارہی ہے کہ فکرِ اسلامی کے ان سرچشموں ہی کو بند کردیا جائے، اس کے لیے کئی رخی تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں، ایک طرف مدرس کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلاتے ہوئے انھیں بدنام کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں اور ان پر دباؤ ڈالا جارہا ہے، دوسری طرف مدارس کے ذرائع آمدنی کو مسدود کرنے کی سعی کی جارہی ہے، دولت مند مسلمان ملکوں کو امریکہ مدارس کی اعانت سے روک رہا ہے، ہندوستان کے جو مسلمان دوسرے ملکوں میں برسرِ ملازمت ہیں اور اپنی زکوٰۃ ہندوستان کے مدارس کو بھیجتے ہیں انھیں بھی روکنے کی کوشش کی جارہی ہے، تیسرے حکومتیں اس بات کی کوشش کررہی ہیں کہ مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم میں تبدیلیاں لائی جائیں اور مدارس کو اس پر راغب کرنے کے لئے انھیں کچھ اعانت بھی دی جائے، لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے ظاہر یہ کیا جارہا ہے کہ اس کا مقصد دینی مدارس میں جدید علوم کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے،

لیکن درحقیقت ان کا مقصد مدارس کے آزادانہ کردار کو متاثر کرنا ہے، حکومت چاہتی ہے کہ تنخواہ دار اساتذہ ہوں، جو حکومت کی سوچ کے مطابق نئی نسل کا مزاج بنا سکیں، حکومت کے وظیفہ خوار علماء ہوں، جو ایوانِ اقتدار کے چشم و ابرو کو دیکھ کر فتوے دیں، فیصلے کریں اور وعظ کہیں، تاکہ ایک ایسا ماڈرن اسلام وجود میں آسکے جو نظام کفر کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگی رکھتا ہو اور سماجی زندگی سے اپنا دامن سمیٹ کر مسجد کے بند دروازوں کے اندر معتکف ہو کر رہ جائے۔

امریکہ ہو یا یورپ، روس ہو یا چین، یا ہندوستان میں سنگھ پریوار کے لوگ ہوں سبھوں کا اصل منشا یہی ہے! کم از کم ہندوستان کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مدارس کے اندرونی معاملات میں مداخلت اور مدارس بورڈ کی تشکیل اقلیتوں کو دیئے گئے دستور کے مخالف و مغائر ہے اور یہ اس جمہوریت اور سیکولرزم سے بغاوت ہے جس پر اس ملک کی اساس اور بنیاد ہے، عجیب بات ہے کہ سنگھ پریوار تو ششو مندر اور سرسوتی مندر کے نام سے ہزاروں کی تعداد میں تعلیمی ادارے قائم کریں اور معصوم بچوں کے ذہن میں فرقہ واریت اور نفرت کا زہر پیوست کریں، لیکن اس پر کوئی شور و غوغا نہ ہو، اور جو درس گاہیں اپنے ہم مذہب لوگوں کو اپنا مذہب سکھائیں، دوسروں کے خلاف نفرت کا پرچار نہیں کریں، انھیں اتحاد و یکجہتی کے لئے خطرناک قرار دیا جائے؟

اب مسلمانوں کے لئے یہ بات سوچنے کی ہے کہ انھیں یہ مدارس خود چلانا ہے یا حکومت کے حوالہ کرنا ہے؟ انھیں ان مدارس کو اسلام کا دعوتی اور حفاظتی مشن برقرار رکھنا ہے یا حکومت کے فکر و نظر کا آئینہ دار بنانا ہے؟ یہ سوال نہایت اہم ہے، کیوں کہ ابھی چند دنوں پہلے ایک مسلمان تنظیم اور بعض مسلمان شخصیتوں کی خواہش بلکہ گذارش پر حکومت آندھرا پردیش نے سرکار کی طرف سے مدارس بورڈ کی تجویز پر غور کرنے کی بات کہی ہے، افسوس کہ اگر حکومت یہ بات کہتی تو مسلمان اسے رد کرتے، اس کے بجائے بعض انجام ناشناس مسلمانوں ہی کی طرف سے حکومت کو اس کی پیشکش کی گئی ہے، پھر مزید قابل افسوس امر یہ ہے کہ جب علماء اور حیدرآباد کی بعض مسلمان مذہبی اور سیاسی تنظیموں نے اس کی مخالفت کی تو وہ ادارے اور شخصیتیں جو عصری تعلیمی درس گاہوں کی نمائندگی کرتی ہیں انھوں نے بالکل ہی سکوت اختیار

کرلیا، گویا یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ جب علی گڑھ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار متاثر کیا گیا تو اس کی تحریک چلانے والوں میں پیش پیش علماء تھے اور ہر جگہ ممتاز دینی مدارس نے اس سلسلہ میں احتجاجی پروگرام منظم کئے، لیکن جب دینی مدارس کی آزادی پر یلغار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تو ہمارا یہ دانشور حلقہ مہر بہ لب ہے۔

میڈیا کے مسلسل پروپیگنڈہ کی وجہ سے اب بعض مسلمان بھی سوچنے لگے ہیں کہ مدارس کے نظام تعلیم کو بدلنا چاہئے اور یہاں کے طلبہ کو مکمل طور پر عصری تعلیم سے بھی آراستہ کرنا چاہئے، نیز اس کے لئے حسب ضرورت حکومت سے بھی تعاون لینا چاہئے۔ یہ نہایت خطرناک اور ناسمجھی پر مبنی سوچ ہے۔ اگر مدارس کا اسلامی کردار مجروح ہو جائے، ان اداروں کا مقصد ''تعلیم برائے تعلیم'' رہ جائے اور ان میں دین کی دعوت واحیاء اور اشاعت وحفاظت کا سرفروشانہ جذبہ باقی نہ رہے، تو پھر اندیشہ ہے کہ ہماری عظیم الشان مسجدیں مسجدِ قرطبہ کی طرح تماشہ گاہِ عالم بن جائیں اور ایک ایسا قالب رہ جائے جو روح وزندگی اور قوت وتوانائی سے محروم ہو۔

اسوقت مدارس کی آمدنی کو روکنے اور متاثر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہماری سادگی، عاقبت نااندیشی اور نتیجہ وانجام سے بے خبری کا یہ حال ہے کہ بعض لوگ مشورہ دے رہے ہیں کہ انگریزی اخبار نکالنے کے لئے چند ماہ مدارس بند کردیئے جائیں۔ اُمت کی اس نادانی پر جتنا سر پیٹئے کم ہے۔ اب مسلمانوں کو یہ بات سوچنی ہے کہ وہ اپنی قوتِ بازو اور گاڑھی کمائی سے ان مدارس کو چلائیں گے اور آئندہ نسلوں کے دین وایمان کی حفاظت کریں گے یا انھیں وقت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں گے اور اس ناپاک منصوبہ کو کامیاب ہونے دیں گے جو دشمنانِ اسلام کا منشأ ومقصود ہے؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ مدارس اسلام کی حفاظت واشاعت کا کام کرتے رہیں اور دین وایمان کی امانت کو اگلی نسلوں تک پہنچائیں تو اپنی دولت کا ایک مناسب حصہ اس کاز کے لئے وقف کرنا ہوگا اور جیسے یہودی اور قادیانی اپنی دولت کا ایک قابل لحاظ حصہ اپنے مذہب کے لئے خرچ کرتے ہیں، مسلمانوں کو بھی بلند حوصلگی اور فراخ قلبی کے ساتھ ان مدارس کے تعاون کے لئے آگے بڑھنا اور اس کو حکمرانِ وقت کی دست برد سے بچانا ہوگا، ورنہ ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں'' !!

دینی مدارس اور موجودہ حالات

ہندوستان میں دینی مدارس کی ایک تاریخ رہی ہے، روشن اور تابناک تاریخ، ایثار وقربانی اور صبر وقناعت کے تابندہ نقوش سے آراستہ تاریخ، یہ ملک کی غریب اور پس ماندہ اقلیت کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنے دو دو، چار چار پیسے جمع کر کے قوم کے لاکھوں نونہالوں کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا نظم کر رکھا ہے، مفت تعلیم کا انتظام اصل میں تو حکومت کی ذمہ داری تھی، لیکن حکومت کے بجٹ میں تعلیم کے شعبہ پر جتنی کم توجہ کی جاتی ہے، وہ عام اخبار بینوں اور زمانہ آگاہ لوگوں سے بھی مخفی نہیں، دینی مدارس کے اس الہامی نظام میں نہ صرف تعلیم، بلکہ خورد ونوش اور دوسری ضروریات بھی طلبہ کے لئے مہیا کی جاتی ہیں، پھر ان اداروں میں اکثریت ایسے بچوں کی ہوتی ہے، جو دیہات وقریہ جات کے رہنے والے اور خطۂ غربت سے بھی نیچے کی زندگی گزارنے والے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، دینی نقطہ نظر سے ہٹ کر ناخواندگی کو دور کرنے اور دور دراز علاقوں تک تعلیم کی روشنی پہنچانے کے اعتبار سے بھی ان کی خاص اہمیت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حکومت کو اس سلسلہ میں ان مدارس کے قیام کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، نہ کہ حوصلہ شکنی۔

ملک کی آزادی کو ساٹھ سال مکمل ہونے کو ہے اور ان مدارس کا حال ملک کے چپہ چپہ میں بچھا ہوا ہے، لیکن پچپن سال کی مدت میں پچپن مقدمات بھی ان مدارس سے وابستہ اساتذہ اور طلباء کے سلسلہ میں ایسے نہیں آئے جو غیر قانونی رویہ کے مظہر ہوں، لیکن حکومت کے زیر انتظام جو درس گاہیں چل رہی ہیں، ان کے اخلاقی ماحول کا حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو کہ ان درس گاہوں سے پڑھ کر نکلنے والوں کو تو چھوڑیئے، خود ان درس گاہوں کے احاطہ میں قتل، راہ زنی، آبروریزی، چھیڑ چھاڑ اور اساتذہ وانتظامیہ کے ساتھ انتہائی بدسلوکی

وغیرہ کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش نہیں آتا ہو، ملک میں جتنی انتہا پسند اور دہشت گرد تنظیمیں ہیں، جنھیں انسانوں کا شکار کرنے میں جانوروں کے شکار سے زیادہ لطف آتا ہے، ان سب میں ان تعلیم یافتہ جاہلوں اور نادان دانشوروں کا دماغ اور خون جگر شامل ہے، حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس اخلاق اور روحانیت کی تربیت گاہیں ہیں، جہاں صبر وتحمل، انسانیت سے محبت، شرافت ومروت، بلند اخلاقی اور اعلیٰ ظرفی کا سبق دیا جاتا ہے اور ان مدارس سے ملک کو قانون کا احترام کرنے والے اچھے شہری فراہم ہوتے ہیں۔

افسوس کہ ہماری حکومتیں عالمی دباؤ کے تحت ان حقائق کو نظر انداز کر کے مدارس کے گرد گھیرا تنگ کرتی جارہی ہے، آر-ایس-ایس (R.S.S) کے فرقہ وارانہ نظریات اور تنگ نظری پر مبنی افکار وخیالات قوم وملک کے سامنے ہیں، جو ملک کے دستور پر ایقان نہیں رکھتے، جس کے کاندھوں پر بابائے قوم گاندھی جی کا خون ہے، جو خود اور اس کی ذیلی تنظیمیں اپنے کارکنوں کو آتشیں اسلحہ کے استعمال کی تک تربیت دے رہے ہیں، جو فرقہ پرست اذھان کی پرورش کے لئے اپنا مستقل نظام تعلیم رکھی ہے اور اس نظام پر مبنی ہزاروں درس گاہیں ملک کے کونہ کونہ میں گروکل، سرسوتی مندر اور سرسوتی ودیا مندر کے نام سے کام کر رہی ہیں، ایک باخبر قائد کے بیان کے مطابق ان کی تعداد میں حالیہ برسوں میں چوبیس ہزار کا اضافہ ہوا ہے، شہر شہر اور قصبہ قصبہ یہ درس گاہیں قائم ہیں اور ہورہی ہیں، اور شب وروز نئی نسلوں کے ذہن میں فرقہ واریت کا زہر بونے کا کام انجام دے رہی ہیں، وی، ایچ، پی (V.H.P) کی شاخیں جو اکثر مشرقی اور مغربی ممالک میں قائم ہیں، ان کے لئے ڈھیر سارا سرمایہ فراہم کررہی ہیں، لیکن حکومت کی نگاہ میں ان سے قوم اور ملک کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اس کے برخلاف یہ مدارس جو روحانیت اور اخلاق کا درس دیتے ہیں اور نفرت کی بجائے محبت کے سوداگر ہیں، ان کا وجود ہماری حکومت کو کھٹکتا ہے، ایک محبّ وطن کے لئے اس سے زیادہ افسوس کی اور کیا بات ہوسکتی ہے۔؟

کارگل کے واقعہ نے ملک کی سرحدات کی طرف سے ہماری حکومت کی غفلت اور بے خبری کو جب طشت ازبام کردیا تو حکومت نے وزیر داخلہ جناب لال کرشن اڈوانی، وزیر خارجہ جسونت سنگھ، وزیر دفاع جارج فرنانڈیز، وزیر خزانہ یشونت سنہا اور سکوریٹی کے مشیر جناب

برجش مشرا پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، اس گروپ نے دوسرے ماہرین سے بھرپور مدد لیتے ہوئے دس ماہ کی محنت اور سعی کے بعد ایک جامع رپورٹ (Reforming the National Securinty System Recommendation of the group of ministers, February 2001.) کے نام سے تیار کی، اس تفصیلی رپورٹ میں جابجا مسلمانوں کی وطن کے تئیں وفاداری کو مشکوک کرنے اور انھیں مشتبہ بنانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے، رپورٹ کے (ص:۱۲، پیراگراف نمبر۲/۲۹) میں لکھا گیا ہے:

> ''ایک تازہ رُخ یہ ہے کہ اتحاد اسلامی جنگجو تیزی سے بڑھ رہے ہیں، ان کا تعلق سعودی عرب، پاکستان، سوڈان اور بعض دوسرے مغربی ایشیائی ممالک کی بنیاد پرست تنظیموں سے ہے اور سعودی اور خلیجی ممالک کے سرمایہ سے، حال کے چند برسوں میں، پورے ملک میں، بہت سے نئے مدارس کا قیام عمل میں آیا، خاص طور پر بڑی تعداد میں پچھمی ساحلی علاقوں، پچھمی بنگال اور اُتر پورب کے سرحدی علاقوں میں—— یہ بھی رپورٹ ہے کہ سرحدی علاقوں کے مسلمانوں میں بنیاد پرست اُصول ونظریات کی مرتب انداز پر تخم ریزی کی جارہی ہے، جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے لازمی طور پر خطرناک ہے۔''

برسر اقتدار جماعت اور حکومت کی جانب سے مدارس کے بارے میں زہرافشانی کا سلسلہ عرصہ سے جاری ہے، لیکن اب تک اس کا کوئی عملی ثبوت باوجود بار بار کے مطالبہ کے حکومت کی جانب سے فراہم نہیں کیا جاسکا ہے کہ دہشت گرد سرگرمیوں سے ان مدارس کا کوئی تعلق ہے، محض بدگمانیوں اور افواہوں کی بنیاد پر ذمہ دارانِ حکومت کا ایسی بات کہنا کس قدر غیر ذمہ دارانہ عمل ہے؟ یہ محتاجِ اظہار نہیں، افسوس کہ اب حکومت کے ذمہ دار اپنے عہدوں کا بھی پاس ولحاظ نہیں کرتے اور سچائی کو بار باران کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا ہے۔

بہر حال یہ مدارس میں مداخلت کی راہ تلاش کرنے کے لئے حیلے اور بہانے ہیں، خدا ان کی نظر بد سے ان درس گاہوں کی حفاظت کرے، تاہم اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل مدارس اور عام مسلمانوں کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں، جن سے پہلوتہی کرنا اب کسی بھی طرح مناسب نہیں۔

اِدھر آر، ایس، ایس (R.S.S) اور اس کے زیر اثر تنظیموں نے ایک نئی اصطلاح ''غیر قانونی مدارس'' کی شروع کی ہے، چنانچہ آج (۲۵/ڈسمبر/۲۰۰۱ء) روزنامہ آزاد ہند کلکتہ کے (ص:۲) پر شاہ سرخی ہمارے سامنے ہے'' ملک میں غیر قانونی مدرسے بند کردئے جائیں''، یہ''غیر قانونی'' کی اصطلاح خود''غیر قانونی'' ہے، کیوں کہ دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کے تحت اقلیتوں کو خود اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق حاصل ہے، اس لئے دینی مدارس کو غیر قانونی کہنا قطعاً ناواجبی ہے، لیکن بہر حال احتیاطی طور پر موجودہ حالات میں یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مدارس کو ٹرسٹ یا سوسائٹی کے تحت لے آیا جائے اور اس کے نظم ونسق کو ''شخصی'' کے بجائے، ''شورائی'' بنایا جائے، تاکہ اس کا نظام قانونی طور پر زیادہ محفوظ ہو سکے، شورائی نظام میں بڑے فوائد بھی ہیں اور بعض نقصانات بھی، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شورائی نظام کے تحت کارکردگی میں ایک تسلسل کی کیفیت برقرار رہتی ہے، ہندوستان کے بعض بڑے مدارس میں اختلاف وانتشار کی صورت پیدا ہوئی اور ایسی شخصیتیں ادارے سے کنارہ کش کردی گئیں، جن کی کنارہ کشی ہر علم دوست شخص کے نزدیک ایک سانحہ سے کم نہیں، اور اس سانحہ کو''علم پر سیاست کی فتح'' سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہو، لیکن اس کے باوجود یہ ادارے کام کرتے رہے، بلکہ مقدار اور حجم کے اعتبار سے ان میں اضافہ ہی ہوتا رہا، یہ اسی شورائی نظام کی برکت ہے۔

اسی طرح جس ادارے کا انتظام شورائی اور اجتماعی ہوتا ہے، اس کے بارے میں لوگوں کو بدگمانی کا موقع کم ملتا ہے، پھر شورائی نظام میں ضروری مسائل پر بحث ہوتی ہے، اس سے اس معاملہ سے متعلق حسن وقبح کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں، اور صحیح رائے قائم کرنے میں سہولت ہوتی ہے، تاہم اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ کمیٹیوں کے اختلاف اور اصل کام کرنے

والوں پر پابندیوں اور قدغنوں کی وجہ سے بہت سے مواقع پر شخصی نظم کے تحت ادارے جلد آگے بڑھتے ہیں اور انتظامی کمیٹیوں کے باہمی اختلافات اور آویزشوں کی وجہ سے ترقی کی رفتار سست ہوجاتی ہے، اس پس منظر میں یہ صورت بہتر ہے کہ انتظامیہ میں ہم خیال و ہم فکر افراد لئے جائیں اور ایسے اُصول وقواعد مقرر کئے جائیں کہ اصل کام کرنے والوں کو زیادہ اختیارات حاصل ہوں، وہ آزادی کے ساتھ کھل کر کام کرسکیں، البتہ حساب وکتاب وغیرہ باضابطہ طور پر مجلس انتظامی کو پیش ہوں، اس طرح ایک متوازن شورائی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔

اہلِ مدارس کو حساب وکتاب کی شفافیت پر بھی پوری توجہ دینی چاہئے، ہر مد کی رقم اسی مد میں خرچ ہو، اخراجات کا صحیح طور پر اُصول کے مطابق اندراج ہو، حسابات کو آڈٹ کرایا جائے اور مجلس انتظامی میں پیش کر کے اس کی توثیق کرائی جائے، مدرسہ کے معاونین کو اس بات کا حق دیا جائے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے اطمینان کے لئے حسابات کو دیکھیں اور تشفی حاصل کریں، حسابات کے لکھنے کے لئے باضابطہ اکاؤنٹنٹ مقرر کیا جائے، کہ وہ مروجہ ضابطہ کے تحت کام کریں اور اگر کبھی گورنمنٹ کا کوئی محکمہ حسابات کو دیکھنا چاہے اور از روئے قانون اُسے یہ حق ہو، تو وہ اُسے آئینہ کی طرح صاف ستھرا پائے، ہندوستان کی بعض بڑی جامعات جن کے سالانہ اخراجات کروڑوں میں پہنچ چکے ہیں، ان کے یہاں ایک ایک روپیہ کا حساب محفوظ ہے اور کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں، موجودہ حالات میں مدارس کو اس پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے۔

شفافیت ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ مدرسہ کی املاک مدرسہ کے نام پر ہونی چاہئے، شخصی ناموں پر لی بھی گئی ہو تو بعد کو مدرسہ کے نام پر منتقل ہوجانی چاہئے، ورنہ اس سے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں، بجا طور پر بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر آئندہ ورثہ میں امانت و دیانت نہ رہی تو قومی ملکیت کے ''انفرادی ملکیت'' بن جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

عام مسلمانوں کو بھی مدارس کی اہمیت اور اسلام کے تحفظ و بقاء میں ان کے تاریخی کردار کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے اور انھیں جانی، مالی، قانونی اور اخلاقی مدد کے ذریعہ بھرپور قوت پہنچانی چاہئے، افسوس کہ ناسمجھی اور نادانی کی وجہ سے خود مسلمانوں کے بعض حلقے بھی دینی تعلیم اور دینی مدارس کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے کوشاں ہیں، بعض حلقے اس طرح کی بات بھی اُٹھا رہے

ہیں کہ زکوۃ مدارس کے بجائے سماج کے دوسرے غرباء پر خرچ کی جانی چاہیے، ایک طبقہ کی رائے ہے کہ اگر حکومت مدارس میں دخیل ہو کر جدید تعلیم کو شامل کرنا چاہتی ہے تو اس کو قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ایسی باتیں سن کر خیال گزرتا ہے کہ ''غیروں کی عیاری اور اپنوں کی سادگی'' دونوں کی مثال نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مدارس کو بھرپور تقویت پہنچانا وقت کا سب سے اہم فریضہ اور مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور مدارس کو کمزور کرنا بالواسطہ ان سازشوں کو طاقت پہنچانا ہے جو اس ملک میں اسلامی تشخصات کی بیخ و بن اُکھاڑنے کے لئے کی جارہی ہے اور جو انشاء اللہ ناکام و نامراد ہو کر رہے گی!!

☆☆☆

دینی مدارس اور زکوٰۃ

ادھر بعض دوستوں نے دینی مدارس کو زکوٰۃ سے اعانت کا مسئلہ اُٹھایا ہے اور روزنامہ ''منصف'' میں اس موضوع پر کئی مراسلے آچکے ہیں، گذشتہ سال ہندوستان کے ایک معروف شہر میں زکوٰۃ پر سیمینار منعقد ہوا تھا، اس میں بھی یہ مسئلہ بڑی شدومد سے زیر بحث آیا تھا، نیز یہ مسئلہ یوں بھی اہم ہے اور موجودہ حالات کے پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی سوا ہوگئی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اہم موضوع پر کچھ عرض کیا جائے۔

اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے دو باتیں پیش نظر رکھنی ضروری ہیں: اول یہ کہ زکوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اور زکوٰۃ کی ادائے گی میں کیا رعایت ملحوظ ہے؟ دوسرے کیا یہ مقصد دینی مدارس کو زکوٰۃ ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے؟ —— قرآن مجید نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف ذکر کئے ہیں، فقیر، مسکین یعنی غریب اور بہت زیادہ غریب، عاملین یعنی زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کا کام انجام دینے والے لوگ، مؤلفۃ القلوب یعنی وہ نومسلم جن کو اسلام پر استقامت کے لئے یا وہ غیر مسلم جن کو اسلام کی ترغیب کے لئے کچھ دیا جائے، غلام، مقروض، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور مسافر، (توبہ: ۶۰) ان آٹھ مصارف میں پانچ وہ ہیں جن کا مقصد غرباء اور حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنا ہے، فقیر و مسکین سے عام محتاج مراد ہیں، غلام، مقروض اور مسافر سے مخصوص نوعیت کے اور وقتی طور پر پریشان حال لوگوں کی حاجت برآری مقصود ہے، مؤلفۃ القلوب اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی رعایت کا منشاء اسلام کی سربلندی اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے، ''عاملین'' کی مد زکوٰۃ سے متعلق انتظامی اُمور کی انجام دہی اور اس کے اخراجات کی تکمیل کے لئے ہے، پس ان مصارف زکوٰۃ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے بنیادی طور پر دو مقاصد ہیں: غربا کی حاجت پوری کرنا، اسلام کی بلندی اور اس کی دعوت واشاعت

اور حفاظت وصیانت کے نظام کو تقویت پہنچانا۔

مصرف زکوٰۃ کی روح کو سامنے رکھ کر دینی مدارس کے نظام اور اس کے کردار پر غور کیجئے۔

—— دینی مدارس کی حیثیت عام درس گاہوں کی نہیں ہے، عام درس گاہوں کا مقصد بچوں کو ایسی تعلیم سے آراستہ کرنا ہے جو آئندہ ان کو ملازمت دلائے اور زیادہ سے زیادہ کمانے کے لائق بنائے، جس تعلیم سے جس قدر مستقبل کی معاشی فلاح و بہبود متعلق ہے۔ وہ اسی قدر لوگوں کے لئے مرکز توجہ بھی ہے اور گراں بھی، بلکہ سرکاری تعلیم گاہوں کی زبوں حالی اور بے سروسامانی نے اب تعلیم کو ایک نہایت ہی نفع بخش اور نفع رساں تجارت بنا دیا ہے، لیکن دینی مدارس کی حیثیت اس سے مختلف ہے، خاص کر ہندوستان میں اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔

مسلم دورِ حکومت تک وہ علوم جن کو آج "جدید علوم" کہا جاتا ہے، اس قدر شاخ در شاخ نہ ہوتے تھے، جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں، بعض فنون مدون ہو چکے تھے، لیکن ان پر ایک آدھ کتابوں کی تدریس کے ساتھ تجربہ کافی سمجھا جاتا تھا، بعض فنون مدون بھی نہ ہوئے تھے اور ان کے تجربات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے آئے تھے، جیسے: مختلف شعبوں کی انجینیرنگ اور زراعت وغیرہ، اس کے لئے حکومت کی طرف سے عمومی نوعیت کی درس گاہیں ہوتی تھیں، ان میں زبان، مذہب، اخلاق اور طب وغیرہ کی تعلیم مشترک طور پر ہوتی تھی اور مختلف قوموں کے لوگ مل جل کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔

جب ہندوستان سے مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہونے لگا اور انگریز نہایت چالبازی کے ساتھ اپنے قدم بڑھانے لگے، تو انھوں نے سونے کی اس چڑیا کے بال و پر نوچنے کو کافی نہ سمجھا بلکہ ہندوستان کو مستقل طور پر اپنے زیر اثر رکھنے کی غرض سے رعایا کی فکر و نظر میں تبدیلی کو بھی ضروری سمجھا اور اس کے لئے چہاررخی تدبیریں کی گئیں، چوں کہ ان کو زیادہ خطرہ مسلمانوں سے تھا، اس لئے انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اور خاص کر مسلمانوں کو اپنی فکری یورشوں کا نشانہ بنایا اور بے سروپا اعتراضات اور خلاف واقعہ شکوک وشبہات اسلام پر شروع کئے، تاکہ ہندوستانیوں کی نئی نسل اپنے مذہب کے بارے میں غیر مطمئن اور بدگمان ہو جائے، دوسرے نہایت ہی قوت کے ساتھ ملک کے چپہ چپہ میں عیسائی مشنریز کو بھیجا

اورعیسائیت کی تبلیغ شروع کردی، بعض اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد کے لئے ایک ایک شہر میں پانچ پانچ سو پادریوں کے قافلے اترتے تھے اور عیسائیت کی تقویت کے لئے بڑے بڑے مناظر برطانیہ سے بلائے جاتے تھے۔

تیسرے انگریزوں نے بلا تاخیر ہندوستان میں ایک نیا نظام تعلیم جاری کیا، جس کا مقصد محض علوم وفنون کی تعلیم نہ تھی بلکہ ہندوستانیوں کو مغرب سے قریب کرنا، ان کو اپنے مذہبی افکار اور اپنی ثقافت کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا کرنا اور انگریز حکومت کے لئے ہندوستانی نوکروں کا ایک انبوہ تیار کرنا تھا، بہ قول لارڈ میکالے ان درس گاہوں کا مقصد تھا کہ ہندوستان کے لوگ رنگ ونسل کے ہندوستانی رہ جائیں اور دل ودماغ میں انگریز بن جائیں، چوتھے ہر طرح کی سرکاری ملازمت کو اسی نئی تعلیم سے متعلق کردیا گیا جس نے بہت جلد ہندوستانیوں کو اس بات پر مجبور کردیا کہ وہ اپنی گردنِ طاعت اس نئے نظام کے سامنے خم کردیں۔

ہندوؤں کے لئے یہ صورتِ حال چنداں قابل تشویش نہ تھی، کیوں کہ ہندو مذہب کی بنیاد کسی متعین فکر وعقیدہ پر نہیں ہے، یہاں تک کہ جو لوگ ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کا مذاق اڑاتے ہیں، وہ بھی ہندومت سے باہر نہیں ہیں، زندگی کے عام مسائل میں یا تو ہندو مذہب کوئی رہنمائی نہیں کرتا، یا کرتا ہے تو وہ آج کے حالات میں ناقابل عمل ہے اور خود ہندو قوم اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے ہندو بھائیوں نے تو بلا تأمل اس پر لبیک کہا اور اس کے فوائد بھی اُٹھائے، انگریزوں کو اصل پرخاش مسلمانوں سے تھی۔

اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے ایمان کا سودا کریں، اس پس منظر میں بالغ نظر اور دردمند علماء نے محسوس کیا کہ سیاسی اقتدار تو اب رخصت ہونے کو ہے، کسی طرح مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کی تدبیر کرنی چاہئے، چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں دینی درس گاہوں کا جال بچھا دیا جائے اور ایک ایسی نسل کو وجود بخشا جائے جو مادی منافع کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنی دنیا کو قربان کرکے مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت پر کمر بستہ رہے، فاقہ مستی اسے گوارہ ہو، معمولی کھانا اور معمولی پہننے پر وہ قناعت کرسکے اور خس پوش جھونپڑیوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے آپ کو خدا کے دین کی

حفاظت اور سربلندی کے لئے وقف رکھے۔

چنانچہ اس منصوبہ کے تحت پورے ملک میں مدارس و مکاتب کا قیام عمل میں آیا اور ایک ایسے تعلیمی نظام کی تشکیل کی گئی جو اپنے اخراجات میں حکومت کا محتاج نہ ہو، بلکہ اگر حکومت مدد کرنا بھی چاہے تو اسے قبول نہ کیا جائے اور ہر طرح سرکاری مداخلت سے آزاد رہ کر یہاں سے دین کی حفاظت واشاعت کے جذبہ سے سرشار اور ایثار وقربانی سے سرمست بادہ خواروں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا کی جائے۔ چنانچہ وہ اس میں کامیاب رہے اور انھوں نے ایک ایسے طبقہ کو وجود بخشا جس نے ایک طرف حکومت کی ابتلاؤں کو برداشت کیا، مادی سہولتوں سے محرومی اور طنز وتعریض کے تیر بھی اپنے سینوں پر سہے، لیکن نہ کوئی خوف ان کو اپنے مشن سے دور کر سکا اور نہ کوئی تحریص ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکی۔

غور کیجئے کہ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال میں اسلام کے خلاف اس ملک میں جتنی یورشیں ہوئی ہیں، ان کا مقابلہ کس نے کیا ہے؟ جب ملک کی گلی کوچوں میں عیسائی منادلوگوں کو دعوت ارتداد دے رہے تھے تو کس نے شہر شہر اور قریہ قریہ ان کا تعاقب کیا؟ جب آریہ سماجی تحریک اُٹھی اور اس نے افلاس زدہ جاہل و ناخواندہ مسلمانوں کو ہندو مذہب کی طرف لوٹنے کی دعوت دی تو کون لوگ تھے جو اس فتنہ کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوئے؟ جب پنجاب سے انگریزوں کی شہ پر مرزا غلام احمد قادیانی نے ختم نبوت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو کون لوگ اس فتنۂ کبریٰ کے خلاف اُٹھے اور ہر سطح پر اس فتنہ کی بیخ کنی کا فریضہ انجام دیا؟ جب کچھ لوگوں نے مستشرقین سے متاثر ہو کر حدیث نبوی کے حجت و دلیل ہونے کا انکار کیا تا کہ شریعت کا طوق اپنے گلے سے نکال پھینکا جا سکے تو کن لوگوں نے ان جھوٹے بازی گروں کی قلعی کھوتی اسلام کے خلاف مسلمان نوجوانوں کو کمیونزم کا نشہ پلایا گیا تو یہ کون لوگ تھے جنھوں نے پوری معقولیت کے ساتھ اس طوفان کا راستہ روکا؟ اور جب مسلمانوں کے بچے کھچے شرعی قوانین کو بھی منسوخ کرنے کی سازشیں رچی جانے لگیں تو کن لوگوں نے تحفظ شریعت کی تحریک چلائی اور ان کالی گھٹاؤں کو اپنا رُخ بدلنے پر مجبور کیا؟؟ —— یہ سب انہی بے نوا فقیروں اور ناسمجھ مسلمانوں کی تنقیدوں کا ہدف بننے والے مولویوں کا کارنامہ ہے، سیاسی قائدین نے سیاسی

فائدہ اٹھائے اور موقع و حال کے مطابق اپنے ضمیر کی تجارت بھی کی، دانشور کہلانے والے حکومت کے اونچے عہدوں پر فائز المرام ہوکر اعلیٰ تنخواہیں وصول کرتے رہے اور جہاں حکومت نے ضرورت محسوس کی ان کی زبان سے اپنی باتیں کہلوائیں اور انھوں نے بھی بے تکلف حق نمک ادا کیا، لیکن یہی دینی مدارس ہیں جنھوں نے مادی نقصان کے باوجود اپنے کاز پر استقامت کی راہ اختیار کی۔

پھر غور کیجئے کہ ادھر سو سوا سو سال میں ہندوستان میں جتنی مذہبی تحریکات اُٹھی ہیں ان کی رگوں میں کن کا خون جگر دوڑ رہا ہے اور ان کا اصل سر چشمہ اور منبع کون ہے؟ یہی مدارس ہیں جنھوں نے جماعتوں کو اچھے داعی اور مبلغ فراہم کئے ہیں، علمی دنیا کو اسلامیات پر اعلیٰ درجہ کا لٹریچر فراہم کیا ہے، عام مسلمانوں کو گاؤں گاؤں امام و خطیب فراہم کیا ہے، جن کا عام مسلمانوں کو اسلام سے جوڑے رکھنے میں بڑا کردار ہے، جنہوں نے اُردو زبان کو زندہ رکھا ہے جس سے مسلمانوں کا بہت بڑا قومی اور دینی ورثہ متعلق ہے، غرض یہ مدارس پاور ہاؤس ہیں، جن سے دین کے تمام شعبوں کو غذا ملتی ہے اور اسلام کے ہر کاز کو قوت بہم پہنچتی ہے۔

اسی لئے فرقہ پرست تنظیمیں آج سب سے زیادہ دینی مدارس کو ہدف بنائے ہوئی ہیں، کیوں کہ انھوں نے محسوس کرلیا ہے کہ جب تک یہ مدارس اور ان درسگاہوں سے پیدا ہونے والے ملا باقی رہیں گے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنا اور ان کو اکثریت کی ثقافت میں جذب کرنا ممکن نہ ہوگا، اور ان کا یہ خیال یقیناً غلط بھی نہیں، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ مدارس ہی ہیں کہ ان کی وجہ سے ہندوستان میں اسپین کی تاریخ دوہرائی نہ جاسکی، اور مذہبی غیرت و حمیت اور اسلامی شعار کا احترام و اہتمام جس قدر اس خطہ میں پایا جاتا ہے اکثر مسلم ممالک بھی اس میں ان کی ہمسری نہیں کرسکتے؛ اس لئے بلا خوف تردید اور بغیر کسی طرفداری کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت اسلام کی حفاظت و بقاء، اس کی دعوت و اشاعت اور اس کی سربلندی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی مدارس ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں ایک بہت بڑی تعداد ان بچوں کی ہے جو غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں ایک بہت بڑا حصہ معاشی اعتبار سے کمزور ہوتا ہے، پس ان مدارس کو زکوٰۃ

ادا کرنے میں زکوٰۃ کے دونوں مقاصد کی بیک وقت تکمیل ہوتی ہے، غرباء کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے اور اسلام کی سربلندی کے مقصد میں بھی مدد ملتی ہے۔

اس لئے ہمارے فقہاء نے خوب سوچ سمجھ کر ضرورت مند علماء اور علم دین حاصل کرنے میں مشغول طلبہ کو زکوٰۃ ادا کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس کو زیادہ باعث فضیلت بتایا ہے، مشہور محدث امام عبداللہ بن مبارکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی اعانتیں علماء ہی پر خرچ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مقام نبوت کے بعد علماء سے بڑھ کر کوئی بلند مرتبہ نہیں۔ (الاتحاف: ۴/۴۱۷) مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے جو شخص اپنے آپ کو علم کے لئے فارغ کرلے اس کے لئے زکوٰۃ لینا جائز ہے؛ کیوں کہ وہ دوسرے ذرائع معاش اختیار نہیں کرسکتا:

" يجوز له أخذ الزكاة و لو غنيًّا إذا فرغ نفسه لإفادة العلم و إستفادته لعجزه عن الكسب"

(درمختار مع الرد: ۶ / ۲۸۵)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

"التصدق على العالم الفقير أفضل وإلى الزهاد"

(حوالۂ سابق: ۳ / ۳۰۴)

"محتاج عالم یا عابد و زاہد لوگوں پر صدقہ کرنا افضل ہے"

اور یہ کچھ فقہاء کی طبع زاد بات نہیں بلکہ خود قرآن مجید سے ماخوذ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْباً فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَّمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾

(بقرة : ۲۷۳)

(صدقات میں) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو

اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں، ملک میں کہیں چل پھر نہیں
سکتے، ناواقف انھیں غنی خیال کرتا ہے، سوان سے ان کی
احتیاط کے باعث، تو انھیں ان کے چہرہ کے نقوش سے
پہنچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم
مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کا خوب
جاننے والا ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو محتاج اور ضرورت مند حضرات دین کے کام کی وجہ سے کسبِ معاش میں مستقل طور پر لگنے کے موقف میں نہ ہوں، وہ صدقات اور اعانتوں کے زیادہ مستحق ہیں، اسی لئے اکابر مفسرین کا رجحان یہی ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت اس سے اشارہ اصحاب صفہ یعنی صفہ میں مقیم طالبان علوم نبوت کی طرف تھا، (دیکھئے تفسیر کبیر: ۶۳۶/۳، تفسیر قرطبی: ۳۴۰/۳) بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے یہ طریقہ مروج تھا کہ اہل ثروت صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے صدقات کی کھجور اصحاب صفہ کے لئے پیش کیا کرتے تھے اور حضور ﷺ کی طرف سے ان کو اس کی ہدایت ہوتی تھی، اس لئے یوں تو تمام محتاج وضرورت مند مسلمانوں کی زکوٰۃ سے مدد کرنی چاہئے لیکن دینی مدارس کا خصوصی استحقاق قرآن سے بھی ثابت ہے، حدیث سے بھی، سلف صالحین کے عمل سے بھی، اور یہ زیادہ مکمل طریقہ پر مقاصد زکوٰۃ کو پورا کرتا ہے اور بالخصوص ہندوستان کے موجودہ حالات میں اسلام کی بقاء اور حفاظت کے لئے یہ نہایت ہی مؤثر ذریعہ اور طاقتور وسیلہ ہے۔

حکومت اور فرقہ پرست تنظیمیں چاہتی ہی ہیں کہ یہ مدارس بند ہو جائیں تاکہ اسلامی تشخصات اور مسلمانوں کی مذہبی شناخت کو مٹانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، اور صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان تو زکوٰۃ ہی پوری طرح نہیں نکالتے ہیں چہ جائے کہ بڑے پیمانے پر ان سے نفل صدقات وعطیات کی توقع رکھی جائے، تو اب اگر زکوٰۃ کا دروازہ بھی مدارس پر بند کر دیا جائے تو وہ خود بخود کمزور ہو جائیں گے اور اس طرح مدارس کو زکوٰۃ نہ ادا کرنے کی بات بالواسطہ طریقہ پر حکومت کے معاندانہ مشن کی خاموش تکمیل ہوگی، لہٰذا اہل نظر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ

اگر یہ تحریک دانستہ اُٹھائی جارہی ہے تو یہ گہری اور خطرناک سازش ہے، اور اگر نادانستہ کہی جارہی ہے تو زمانہ ناآگہی اور فراست ایمانی سے محرومی کے سوا اور کچھ نہیں، ہونا تو یہ چاہیے کہ مدارس کے اس نظام کو تقویت پہنچائی جائے اور مسلمانوں کو دوسرے مقاصد کے لئے بھی انفاق پر اُبھارا جائے، نہ کہ ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ جس سے اعداء اسلام کی مہم کو تقویت پہنچے، اور اس سوتے ہی کو خشک کردیا جائے جس سے دینی کاموں کے ہر شعبہ کو آبِ حیات فراہم ہوتا ہے!!

راہِ عمل ۵

عصری تعلیم اور عصری درسگاہیں

تعلیم —— قوموں کی شہ رگ

اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں عورتوں کو میراث نہیں ملتی تھی ، ان کا خیال تھا کہ جو لوگ دشمن سے پنجہ آزمائی کر سکتے ہیں اور قوم کی حفاظت اور مدافعت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں ، انہیں کو میراث پانے اور خاندان کی املاک میں حصہ دار بننے کا بھی حق حاصل ہے ، غرض جسمانی طاقت اور مقابلہ کی قوت کو بڑی اہمیت حاصل تھی ، اسی کو قوموں کی سر بلندی کا راز اور غلبہ واقتدار کا وسیلہ تصور کیا جاتا تھا اور بڑی حد تک زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ بات درست بھی تھی ، لیکن آج حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور اب قوموں کی تقدیر میدانِ جنگ کے للکار اور شمشیر و آہن کی جھنکار کے بجائے علم وتحقیق کے مراکز اور دانش گاہوں سے متعلق ہوگئی ہے۔

جو قوم علم وفن سے عاری اور فکر ودانش سے محروم ہو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی تعداد رکھتی ہو، لیکن اس کی حیثیت مٹی کے ڈھیر کی ہیں ، جو ہمیشہ پاؤں تلے روندا اور قدموں کے نیچے بچھایا جاتا ہے، اس کی ایک کھلی ہوئی مثال جاپان اور خود ہمارا ملک ہندوستان ہے۔ہم آبادی کے اعتبار سے دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت ہیں اور ہمارے ملک کا رقبہ بھی کچھ کم نہیں ، قدرتی وسائل جتنے اس ملک کو حاصل ہیں، کم ہی اس کی مثال ملے گی ، جاپان آبادی کے اعتبار سے بھی اور رقبہ کے اعتبار سے بھی ہم سے بہت چھوٹا ملک ہے، قدرتی وسائل میں بھی وہ ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتا، لیکن آج کو ہم جاپان کے سامنے دست سوال پھیلانا اور کشکولِ گدائی بڑھانا پڑتا ہے، یہ صورت حال محض علم ودانش کی طاقت کا ادنی کرشمہ ہے

اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنی آمد کے اول دن سے علم پر زور دیا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ جس سماج میں پیدا ہوئے اور نبوت سے سرفراز کئے گئے ، اس میں کیا کچھ برائیاں اور کوتاہیاں

نہیں تھیں؟ شرک عام تھا، سیکڑوں دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، طاقت کی حکمرانی تھی، نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال اور نہ عزت و آبرو، بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات نہیں تھی جو سماج میں نہ پائی جاتی ہو، بظاہر خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں انسانیت کے نام اللہ تعالیٰ کا پہلا پیغام توحید خداوندی کی دعوت اور شرک و بت پرستی کی تردید کا آنا چاہئے تھا، کہ اسلام کی پوری تعلیم کا لب لباب اور خلاصہ یہی خدا کی وحدانیت کا تصور ہے، یا پھر پہلی وحی ظلم و جور کی مذمت اور عدل وانصاف کی ترغیب کی بابت ہونی چاہئے تھی، کیوں کہ انسان سب سے زیادہ ضرورت مند ایسے سماج کا ہوتا ہے جو پُر امن ہو، ظلم و زیادتی سے محفوظ ہو اور بقاء باہم کے اصول پر قائم ہو، لیکن غور فرمائیے کہ آپ ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں صراحۃً ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ فرمایا گیا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھئے جو تمام کائنات کا خالق ہے، یعنی سب سے پہلے پیغمبر کے ذریعہ انسانیت کو جس بات کی دعوت دی گئی وہ ''تعلیم'' ہے، کیوں کہ علم ایسا سرچشمہ ہے، جس سے تمام بھلائیاں پھوٹتی ہے اور تمام مفاسد کا مداوا ہوتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ علم روشنی ہے: ''العلم نور''۔

اگر کوئی مکان اندھیرا ہو تو اس میں چور اور ڈاکو کا داخل ہونا بھی آسان ہوتا ہے اور وہ سانپ کیڑوں کی بھی آماجگاہ بن جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک کا مقابلہ الگ الگ دشوار ہے، لیکن چراغ جلا دیا جائے اور مکان روشن ہو جائے، تو نہ چور اور ڈاکو کو گھر میں آنے کا حوصلہ ہوگا، نہ سانپ کیڑے اس مکان کو اپنا ٹھکانہ بنائیں گے۔ علم کو روشنی کہہ کر آپ ﷺ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ہر برائی کو الگ الگ دور کرنا اور ان کا علاحدہ علاحدہ مقابلہ کرنا آسان نہیں، لیکن تمام برائیوں اور مفاسد کا اصل سرچشمہ جہالت اور علم سے محرومی ہے، کسی سماج میں جب علم کی روشنی آجائے، تو خود بخود سماج کی برائیاں دور ہوں گی اور علم و دانش کی آگ ان کو پھونک کر رکھ دے گی۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کا اتنا پاس و لحاظ تھا کہ مکہ میں ہر طرح کی دشواری کے باوجود آپ ﷺ نے ''دارِ ارقم'' کو تعلیم و تربیت کا مرکز بنایا اور اوّل دن سے اپنے رفقاء کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ رہے، مکہ کا جو لٹا پٹا قافلہ مدینہ آیا اس میں سیکڑوں بے گھر و در تھے، خود

آپ ﷺ کو کوئی ذاتی مکان میسر نہیں تھا اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں مہمان تھے، لیکن آپ ﷺ نے نہ اپنے گھر کی فکر کی اور نہ اپنے ان ساتھیوں کے لیے، جو مستقل اقامت گاہ سے محروم تھے، بلکہ سب سے پہلے مسلمانوں کے لیے ایک عبادت گاہ اور دینی مرکز کی حیثیت سے ''مسجد نبوی'' کی تعمیر فرمائی اور پہلی باضابطہ درسگاہ ایک چبوترہ کی شکل میں قائم کی، جسے ''صفہ'' کہا جاتا تھا، یہی چھوٹی سی جگہ جزیرۂ عرب کے کونے کونے سے آنے والے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا مرکز تھی اور خود رسول اللہ ﷺ اس کے منتظم اور استاذ تھے، حضور ﷺ کا یہ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان گھربار اور دوسرے اسبابِ آسائش سے بڑھ کر اپنے بچوں کی تعلیم پر اولین توجہ دیں کہ جو قوم اپنا گھر پھونک کر علم کا چراغ جلانا نہ جانتی ہو، سربلندی ودرخشانی کبھی اس قوم کے حصہ میں نہیں آسکتی۔

اگر تاریخ کے عجوبہ اور حیرت انگیز واقعات کو جمع کیا جائے تو اس میں ایک یہ بھی ہوگا کہ غزوۂ بدر میں ستر اہل مکہ مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار کئے گئے، اس وقت مسلمان سخت معاشی مشکلات سے گزر رہے تھے، نہ ان کو معقول غذا میسر تھی، نہ ضرورت کے مطابق لباس تھا اور نہ مناسب رہائش گاہ، اور تو اور خود آپ ﷺ کے یہاں ہفتوں چولہا سلگنے کی نوبت نہ آتی تھی، اس عہد میں شاید ہی کوئی مسلمان گھر ہو جو فاقہ مستی کی لذت سے ناآشنا رہ گیا ہو، یہ موقعہ تھا کہ آپ ﷺ فدیہ کے طور پر اہل مکہ سے زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کر لیتے اور مدینہ کی معیشت کو سہارا دیتے۔

لیکن آپ ﷺ نے ان اسیرانِ بدر کا پہلا فدیہ یہ مقرر کیا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، آپ ﷺ کے اس عمل میں امت کے لیے اسوہ ہے کہ گو ہمیں بھوکے رہنا پڑے، ہماری کروٹیں فاقوں سے بے سکون ہوں اور دنیا کے اسبابِ راحت ہمیں کم سے کم میسر ہوں، لیکن ہر قیمت پر ہم اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کو اولیت دیں اور تعلیم سے محروم کر کے ہم ان کے اور پوری قوم کے مستقبل کو ضائع نہ ہونے دیں، آپ ﷺ کے اس عمل سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اسلام نے تعلیم میں کسی تنگ ذہنی اور تعصب کو راہ نہیں دیا ہے، علم کا حصول بہرحال ایک نعمت ہے چاہے وہ غیر مسلموں سے حاصل ہو، بلکہ ان

لوگوں سے حاصل ہو جن سے ہماری زندگی کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہے، بشرطیکہ ان سے ہمارے ایمان وعقیدہ اور ہماری مذہبی قدروں کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

اسلام کسی بھی ایسے علم کا مخالف نہیں جو انسانیت کے لیے نافع ہو، نہ وہ کسی زبان کا مخالف ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض رفقاء کو عربی زبان کے علاوہ بعض دوسری زبانوں کے سیکھنے کی ہدایت فرمائی اور فرمایا کہ تمام ہی زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں، علم نافع کو آپ ﷺ نے بہترین عبادت قرار دیا ہے۔ (مجمع الزوائد: ۱/۱۲۰) اور علم کے حصول کو ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ مقرر فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی موت کے بعد بھی تین چیزوں کا اجر اسے پہنچتا رہتا ہے، من جملہ ان کے ایک ایسا علم ہے جس سے اس کے بعد بھی لوگوں کو نفع پہنچتا رہے۔

افسوس کہ جس امت کو سب سے پہلے پڑھنے کی تعلیم دی گئی اور اس کے ہاتھوں میں قلم تھمایا گیا، وہی ہے کہ آج جہالت و ناخواندگی اور تعلیم سے محرومی اس کے لیے وجہِ امتیاز بنی ہوئی ہے اور دبی کچلی قومیں بھی اس میدان میں اسے پیچھے چھوڑ چکی ہیں، ایک ایسی قوم کے لیے جس نے سیکڑوں سال تک اس ملک کے طول وعرض پر حکومت کی ہے اور آج بھی اس ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں اس کی فرماں روائی اور عظمتِ رفتہ کے انمٹ اور قلب و نگاہ کو محوِ حیرت کر دینے والا نقوش موجود نہ ہوں، مگر عظمتِ رفتہ کے یہ نقوش آج ہمیں منہ چڑاتے ہیں اور زبانِ حال سے ہم پر قہقہہ زن ہیں کہ یہ کیسی قوم ہے کہ جس کے حال کو اس کے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں؟؟

اس ذلت اور پستی سے نکلنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ مسلم محلوں اور آبادیوں کے گلی کوچوں میں تعلیم کی ایسی ہی تحریک چلائی جائے جیسے الیکشن میں امیدوار ووٹوں کی بھیک مانگتا ہے، مسلمان پوری قوم کو اپنا خاندان و کنبہ تصور کریں، وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر بھی توجہ کریں اور اپنے پڑوسیوں کی بھی خبر گیری کریں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی طالبِ علم پڑھتے پڑھتے رُک گیا ہو، معاشی ناہمواری نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھام لئے ہوں یا وہ نفسیاتی کم حوصلگی کا شکار ہو گیا ہو، ایسے بچوں کا حوصلہ بڑھائیں اور اجتماعی طور پر سماج کے ایسے

بچوں کی تعلیمی کفالت قبول کریں، ایسی درسگاہیں قائم کریں جس کا نصب العین قوم کی خدمت ہو، جو تعلیم کو تجارت اور روپیوں کا ٹکسال نہ سمجھتے ہوں، بلکہ پوری اُمت کو ایک خاندان سمجھ کر ان کی خدمت کے لیے میدانِ عمل میں اُترے ہوں، جن کو ہوٹلوں اور معمولی کارخانوں میں کمسن مسلمان بچوں کا برتن دھونا اور جھاڑو دینا تڑپا دیتا ہو، جن کے چہرے بشرے سے ذہانت ہویدا ہے اور جن کی آنکھیں ان کی اندرونی ذکاوت وفراست کی چغلی کھاتی ہیں۔

جب تک قوم کے سر برآوردہ لوگوں میں پوری قوم کے لیے درد اور کسک پیدا نہ ہو، مسلمانوں کی پست حالی ان کی کروٹوں کو بے سکون اور ان کی آنکھوں کو بے آرام نہ کردے، مسلم تعلیمی ادارے مکان کی تعمیر کے بجائے انسان کی تعمیر کی طرف متوجہ نہ ہوں، جو تعلیم وتعلّم کو تجارت کے بجائے عبادت کا درجہ دینے آمادہ نہ ہوں اور پوری قوم میں یہ احساس نہ جاگے کہ تعلیم ہی سے ہماری تقدیر وابستہ ہے، یہ ہماری شہ رگ ہے اور اس سے محرومی کے بعد کسی قوم کے لیے باعزت طور پر زندہ رہنا ناممکن ہے، تب تک ہمارا خوابیدہ نصیب جاگ نہیں سکتا اور ہم روٹھے ہوئے ماضی کو منا کر واپس نہیں لا سکتے!!

(۵/ جون ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

عصری تعلیم ـــــــــ اسلامی نقطۂ نظر

آج کل ہم مسلمانوں میں بھی تعلیم کی نسبت سے دینی تعلیم اور دنیوی تعلیم کی اصطلاح قائم ہوگئی ہے، قرآن وحدیث کی تعلیم کو دینی تعلیم تصور کیا جاتا ہے اور عصری علوم کے سیکھنے سکھانے کو دنیوی تعلیم کہا جاتا ہے، حالاں کہ اسلام نے علم کی ایسی کوئی تقسیم نہیں کی ہے۔ بلکہ علم کی دو ہی قسمیں کی گئی ہیں، ''علم نافع'' اور ''علم غیر نافع'' جو علم انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ہو وہ ''علم نافع'' ہے، اور جو علم انسانیت کے لیے نافع ہونے کے بجائے نقصان رساں ہو اور تعمیر کے بجائے تخریب کی طرف لے جاتا ہو وہ ''علم غیر نافع'' ہے، آپ ﷺ نے علم نافع کی دعاء مانگی ہے اور علم غیر نافع سے پناہ چاہی ہے۔

میڈیکل تعلیم ہو، انجینئرنگ کا فن ہو یا تکنیکی تعلیم کے دوسرے شعبے ہوں، یہ سب انسانی خدمت اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے ذرائع ہیں اور یقیناً یہ علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، ان کا حاصل کرنا قابل تعریف ہے نہ کہ لائق مذمت، اسی لیے امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ اصل علم دو ہی ہیں: ایک علم فقہ تاکہ آدمی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھے، دوسرے فن طبابت تاکہ جسم انسانی کی بابت معلومات حاصل ہوسکے۔ ''العلم علمان: علم الفقه، للأديان، و علم الطب للأبدان'' (مفتاح السعادۃ: ص: ۳۰۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ریاضی اور بعض اور فنون کا بھی ذکر کیا ہے۔ (حوالہ سابق)

اسلام نہ کسی علم کا مخالف ہے اور نہ کسی زبان کا، قرآن مجید نے کتنے ہی ایسے حقائق پر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق فلکیات، طبعیات، نباتات اور حیوانات کے علوم سے ہے، خود انسان کی اندرونی جسمانی کیفیات، اس کی مرحلہ وار پیدائش اور اس کی نفسیات کا بھی بار بار تذکرہ کیا گیا ہے، گزشتہ اقوام کے قصص وواقعات ذکر کیے گئے ہیں، ان کی آبادی اور ان پر ہونے

والے عذاب خداوندی کے محل وقوع کی طرف اشارے کئے گئے ہیں اور پھر ان تمام چیزوں میں غور وفکر اور تدبر کی دعوت دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ تدبر ان علوم کی تحصیل کے بغیر کیوں کر ممکن ہوگا؟ اور ان کو حاصل کئے بغیر کیسے ان میں تفکر کا حق ادا کیا جا سکتا ہے؟

پس ان علوم کو حاصل کرنا جن سے کائنات کے اسرار ورموز کو جانا جا سکے، قرآن مجید کا عین مطلوب ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانہ میں دوسری اقوام سے جو جدید تکنیک حاصل ہو سکتی تھی، اس میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور اس کو کبھی تقاضۂ دین کے منافی تصور نہیں فرمایا، مدینہ کے لوگ زراعت پیشہ تھے اور اسلام سے پہلے کھجور کے نر اور مادہ درخت میں اختلاط کی ایک خاص صورت اختیار کرتے تھے، جس کو "تابیر" کہا جاتا تھا، آپ ﷺ نے ابتداء اسے بے فائدہ اور فضول عمل تصور کرتے ہوئے اس سے منع فرما دیا، لیکن جب اس سال پیدا وار کم ہوئی اور لوگوں نے آپ سے اس کا ذکر کیا، تو آپ ﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور آئندہ ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا کہ تم اپنے دُنیا کے اُمور کے بارے میں زیادہ واقف ہو۔ "أنتم أعلم بأمور دنیاکم" (مسند احمد: ۶/۱۲۳)

آپ ﷺ نے بعض غزوات میں منجنیق کا استعمال فرمایا یہ گویا اس زمانہ کی توپ تھی، جس کے ذریعے پتھر کی چٹانیں دور سے دشمن کے قلعوں اور فصیلوں پر پھینکی جا سکتی تھی، فتح مکہ کے بعد جب بنو ثقیف پر فوج کشی کی تو بنو ثقیف کی ماہرانہ تیر اندازی نے مجاہدین کو بڑی دشواری میں ڈال دیا، اس موقعہ سے آپ ﷺ نے ایسی گاڑیاں بنوائیں، جس پر اُوپر چمڑے کا غلاف ڈالا گیا تاکہ دشمن کے تیر چمڑے میں پھنس کر رہ جائیں اور مجاہدین قلعہ کی فصیل تک نہ پہنچ سکیں، غزوۂ خندق کا واقعہ تو مشہور ہی ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر آپ ﷺ نے میدان جنگ کی پشت پر پہاڑیوں کو رکھتے ہوئے آگے کی سمت سے طویل وعریض خندق کھدوائی، یہ عربوں کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا اور اس حسن تدبیر کے نتیجہ میں اعداء اسلام کی متحدہ قوت (جو تقریباً بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی) خاسر و ناکام واپس ہوئی اور اسلام کا ایسا رعب قائم ہوا کہ پھر کبھی اہل مکہ کو مدینہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اسی لیے اسلامی عہد میں قدیم سائنسی علوم کو نہ صرف قبول کیا گیا بلکہ ان علوم کا ترجمہ

اوران پر مزید ریسرچ اور تحقیق کو جاری رکھنے کے لیے دارالخلافہ بغداد میں ''بیت الحکمت'' کا قیام عمل میں آیا اور مسلمان سائنس دانوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے کہ علم وفن کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر اَدھوری اور ناتمام رہے گی، چنانچہ خود منصف مزاج اور حقیقت پسند مغربی مصنفین نے بھی مسلمانوں کے اس علمی اور تحقیقی کارنامہ کا اعتراف کیا ہے اوراسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔

یہی حال لغت اور زبان کا ہے، زبان کوئی بھی اچھی اور بری نہیں ہوتی، زبان تو محض ذریعۂ اظہار ہے، اگر اس کا استعمال خیر اور نیکی کی تبلیغ واشاعت کے لیے ہو تو قابل تعریف اور لائق ستائش ہے، اور زبان خواہ کوئی بھی ہو، اگر اس کو برائی کی دعوت واشاعت کا وسیلہ بنالیا گیا، تو اس سے زیادہ نامبارک بات کوئی نہیں ہوسکتی، عربی زبان، قرآن وحدیث کی زبان ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی اہل جنت کی زبان ہوگی، لیکن اسی زبان میں بعض ایسی اسلام دشمن اوراخلاق دشمن تحریریں وجود میں آئیں کہ جن سے شاید شیطان کو بھی شرم آتی ہوگی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں انھیں کی زبان میں اپنا کلام نازل فرمایا ہے، تو نہ معلوم کتنی زبانیں ہیں جن کو اللہ کے کلام کے حامل ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لیے کسی مسلمان کے لیے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ کسی بھی زبان کو بحیثیت زبان برا تصور کرے اوران کے سیکھنے سکھانے کو بد دینی اور گمراہی سمجھے، آپ ﷺ نے اپنے ایک ذہین رفیق حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو باضابطہ عبرانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی تھی، جسے بہت کم عرصہ میں انہوں نے سیکھا اور اس زبان کے سمجھنے اور سمجھانے کے لائق ہوئے، بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ چھ زبانوں سے واقف تھے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارسی زبان سے واقف تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی قدر فارسی میں بھی گفتگو کرلیتے تھے۔

نہ جانے کہاں سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ علماء جدید علوم اور انگریزی زبان کے حاصل کرنے کو منع کرتے ہیں یا یہ کہ کسی زمانے میں انہوں نے اس سے منع کیا تھا، یہ محض غلط فہمی، بلکہ بہت بڑا مغالطہ ہے، علماء نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی، مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ نے جب

دیو بند میں دار العلوم کی بنیاد رکھی تو سنسکرت زبان کو بھی داخل نصاب فرمایا، سنسکرت زبان میں مشرکانہ محاورات وتعبیرات زیادہ ہیں، یہ بات کیوں کر سوچی جاسکتی ہے کہ مولانا نانوتویؒ سنسکرت زبان کے مخالف نہ ہوں اور انگریزی زبان کے مخالف ہوں، دیو بند کے نصاب میں شروع ہی سے انگریزی، جیومیٹری اور فلسفہ داخلِ نصاب رہا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی دوسری عصری درسگاہ جامعہ ملیہ ہے، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ نے اس کی بنیاد رکھی اس کے افتتاح میں نہایت بلیغ خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، اور اس یونیورسٹی کے قیام کی ستائش کی، دار العلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد ہی اسی نقطۂ نظر کے تحت پڑی کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کا بھی ایک متوازن حصہ شریک نصاب رکھا جائے، مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو انگریزی زبان کے حصول کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، مولانا نانوتویؒ کی جب ایک انگریز سے اسلام کے بارے میں ترجمان کے واسطہ سے گفتگو ہوئی اور آپ نے محسوس کیا کہ وہ آپ کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کر پا رہا ہے تو آپ کو اس پر بڑا افسوس ہوا، اور اس وقت آپ نے اس ضرورت کا احساس فرمایا کہ فی زمانہ علماء اور مبلغین اسلام کے لیے انگریزی زبان سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے کبھی بھی انگریزی زبان اور عصری علوم کی مخالفت نہیں کی، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں بعض ایسی شخصیتیں عصری تعلیم کا جھنڈا لے کر اٹھیں جو گو اسلام اور مسلمانوں کے تئیں مخلص تھے، لیکن جیسا کہ عام طور پر مفتوح قومیں فاتحین کے سامنے نہ صرف مادی اور فوجی اعتبار سے بلکہ فکری اور ثقافتی اعتبار سے بھی سپر انداز ہو جاتی ہیں اور احساس مرعوبیت میں مبتلا ہو کر فاتحین کے افکار اور ان کی تہذیب وثقافت کو بھی رشک وتحسین کی نگاہ سے دیکھنے لگتی ہیں، اسی طرح انہوں نے بھی مغرب سے آنے والی ہر چیز پر لبیک کہنا شروع کیا، علماء کو اس انداز فکر سے اختلاف تھا، نہ کہ عصری تعلیم اور اس درسگاہ سے، جہاں تک ان مدارس کی بات ہے جہاں خالص اسلامی علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں، تو وہاں پوری طرح عصری علوم کو شامل نصاب کرنا طلبہ کو بیک وقت دونوں علوم سے محروم کر دینے کے مترادف ہوگا، اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور اسلامی علوم وفنون کی کم از کم تعداد چودہ پندرہ تو

ہے ہی، پھر ان میں سے ہر فن کی مختلف اور عر متعدد شاخیں ہیں، ان سب کا حق ادا کرتے ہوئے عصری علوم کو بھی بہ کمال وتمام شامل نصاب رکھنا عملاً ایک ناممکن امر ہے، اسی لیے ان مدارس کے نصاب میں عصری علوم کا حصہ کم رکھا گیا ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ علماء اور دینی جامعات عصری تعلیم کی مخالف ہیں۔

اس وقت اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ مسلمان اعلیٰ فنی تعلیم کی طرف توجہ دیں، اور کوشش کریں کہ ہمارے سماج میں کوئی بچہ تعلیم سے محروم رہنے نہ پائے، تعلیمی سروے سے یہ بات ظاہر ہے کہ پرائمری سے ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے مسلمان بچوں کی بڑی تعداد تعلیم چھوڑ دیتی ہے، کالج تک جو تعداد پہنچ پاتی ہے ان کا تناسب اور بھی کم ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور مسابقتی امتحان تک ان کا تناسب ناقابل شمار حد تک کم ہو جاتا ہے، یقیناً ان میں سے بہت سے بچے ذہین وذکی ہوتے ہوں گے اور محض اقتصادی حالات کی وجہ سے انہیں ترکِ تعلیم کرنا پڑتا ہوگا، آپ ہندوستان کے کسی بھی بڑے شہر میں چلے جائیں اور ہوٹلوں میں معمولی درجہ کا کام کرنے والے چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھیں، ان میں اکثریت مسلمان بچوں کی ہوگی، ان کی آنکھوں میں ذہانت جھانکتی ہوگی، اور ان کی پیشانیوں پر فراست کی چمک ہوگی، لیکن معاشی حالات نے ان کے پاؤں تھام لئے ہیں اور وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ برتن دھو کر اور جھاڑو دے کر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھریں۔

بدقسمتی سے جو ادارے اقلیتوں کی طرف منسوب ہیں اور ان کو مسلم ادارہ سمجھا جاتا ہے، وہ عام طور پر تعلیم کو ایک مقدس قومی فریضہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسی ''تجارت'' کا تصور رکھتے ہیں جو کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ اور جلد سے جلد نفع حاصل کرنے کے اُصول پر مبنی ہے، غریبوں پر ان اداروں کا دروازہ بند ہے، اور انہیں لوگوں کے لیے یہاں حصول تعلیم کی گنجائش ہے جو خطیر اور کثیر رقم خرچ کر کے غیر اقلیتی اداروں میں بھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، کاش! قوم کا ہر فرد پوری اُمت کو ایک خاندان اور کنبہ تصور کرنے کو تیار ہو، قوم کے بچوں کی جہالت اور تعلیم سے محرومی ان کو اسی طرح بے چین کر دے، جیسے خود اپنے بچوں کی جہالت، اور آج کے ''تاجران علم'' اس بات کا احساس کریں کہ تعلیم ایک عبادت ہے نہ کہ تجارت۔ (۱۲/ جون ۱۹۹۸ء)

فلکیات اور مسلمان سائنسداں

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے ’’الکلمة الحکمة ضالة المؤمن ‘‘، انسان کی فطرت یہ ہے کہ یوں تو مال وزر کی محبت اس کے رگ وریشہ میں سمائی ہوئی ہے لیکن خاص کر اپنی گم شدہ چیز کی طرف وہ بہت لپکتا اور تیزی سے بڑھتا ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ علم ودانش کی باتوں سے ایک مسلمان کو ویسا ہی انس ہونا چاہئے جیسا کہ اپنے گم شدہ شی کے ملنے پر انسان محسوس کرتا ہے، اسلام نے علم وتحقیق کی کبھی مخالفت نہیں کی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، مسلمانوں نے حکماء اور سائنسدانوں کو جس طرح اپنے سر آنکھوں پر بیٹھایا اوران کے ساتھ اعزاز واحترام کا معاملہ کیا اسلام سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، مسلمانوں نے کبھی کلیسائی نظام کی طرح علم وتحقیق کے کاموں کی مخالفت نہیں کی اور نہ سائنسدانوں کو پوپ اور پادریوں کی طرح ایسے حکماء اور دانشوروں کو سزائے موت سنائی۔

اسی لئے سائنس کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کی خدمات بہت ہی نمایاں ہیں، فلکیات (Astromnology) سائنس بہت ہی مشکل شعبہ سمجھا جاتا ہے؛ کیوں کہ انسان اس میں ایسی حقیقتوں سے بحث کرتا ہے جہاں تک رسائی حاصل کرنے سے وہ قاصر ہے مسلمان سائنسدانوں کی اس میدان میں بڑی اعلیٰ خدمات ہیں، مسلمان محققین میں غالباً اس سلسلے کا پہلا نام حکیم یحیٰ منصور (۲۱۴ھ) کا ملتا ہے، یحیٰ منصور نے دمشق میں قاسیون نامی مقام پر رصدگاہ تعمیر کرائی تھی، ان کو فلکیات کا پہلا مصنف مانا گیا ہے، حکیم یحی نے چاند اور بعض سیاروں سے متعلق نئے انکشافات کئے، ستارون کے متعلق سب سے پہلے اسی سائنسداں نے زیچ (ASTRONOMICAL TABLES) تیار کی اور اس کا نام خلیفہ وقت مامون الرشید کی طرف نسبت کرتے ہوئے ’’زیچ مامونی‘‘ رکھا۔

مامون رشید ہی کے دور میں فلکیات کا ایک اور محقق عباس بن سعید جوہری (م: ۲۲۹ء) تھا، اس نے مامون سے دو رصد گاہیں تعمیر کروائیں، ایک بغداد میں شماسیہ کے مقام پر اور دوسری دمشق کے قریب قاسیون میں، ان رصد گاہوں کی تعمیر اور آلات رصدیہ کو نصب کرانا اور ان کی دیکھ بھال کرنا جوہری کے ذمہ تھی، اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا، اسی دور کا ایک اور ماہر فلکیات خالد بن ولید مروزی (م: ۲۳۱ھ) ہے، اس نے سورج سے متعلق نئی نئی تحقیقات کیں، اور زیچ مامونی کی ترتیب میں حکیم یحیٰ منصور کا تعاون کیا، اس دور میں چار سائنس دانوں کو فلکیاتی سائنس کا عناصر اربعہ کہا جاتا تھا، جن کے نام اس طرح ہیں:

حکیم یحیٰ بن منصور، خالد بن عبد الملک مروزی، سند بن علی، اور عباس بن سعید جوہری، یہ اس دور کے بہت ہی ممتاز اور کلیدی سائنس داں تھے۔

مسلم سائنس دانوں میں ایک معروف نام ابو عباس احمد محمد فرغانی (م: ۲۴۳ھ) کا آتا ہے، یہ شخص علم ہیئت میں ید طولیٰ رکھتا تھا، یہی دھوپ گھڑی کا موجد ہے، اسی نے طغیانی ناپنے کا آلہ ایجاد کیا، جس سے دریا کے پانی کا صحیح اندازہ ہو جاتا تھا، اور سیلاب کے بارے میں معلومات ہوتی تھی، یہ بھی مامون رشید کے ایوان علم وحکمت سے وابستہ تھا، مامون کو خیال ہوا کہ زمین کی گھیر کی پیمائش کی جائے، اس کے لئے اس نے سائنس دانوں اور انجینیئر وں کی ایک کمیٹی مقرر کی، جس میں قطب تارے کو بنیاد بنا کر زمین کی پیمائش کی، ان سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق ۲۵ ر ہزار ۹ میل ہے، موجودہ زمانہ کی تحقیق کے مطابق زمین کا گھیر ۲۴ ر ہزار ۸۵۸ ر میل ہے، گویا ان دونوں کے درمیان صرف ۱۵۱ ر میل کا فرق ہے، جو کوئی بڑا فرق نہیں، اس سے فرغانی اور اس کے رفقاء کی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، فلکیات پر فرغانی کی ایک مشہور کتاب ''جوامع علم النجوم'' کے نام سے ہے، جس کا لاطینی زبان میں بارہویں صدی ہجری میں ترجمہ ہوا، پھر جرمنی میں ۱۵۳۷ء اور فرانسیسی میں ۱۵۴۶ء میں اس اہم کتاب کا ترجمہ شائع ہوا۔

علی بن عیسی اصطرلابی (م: ۲۲۴ھ) کا نام فلکیاتی سائنس میں ایک ناقابل فراموش نام ہے، جس نے چاند، تاروں اور سورج کے درمیان فاصلوں کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا، اور اسی

نے سب سے پہلے آلۂ سدس (Sex Tant) تیار کیا، جس سے کم سے کم فاصلہ بھی جانا جا سکتا ہے، پہلے اجرام فلکی کی تحقیق میں اسی آلہ سے کام لیا جاتا تھا، موجودہ زمانہ میں ورنیر اسکیل (Vernierscal) سے لیا جاتا ہے، جسے ایک فرانسیسی انجینیئر نے سولہویں صدی میں ایجاد کیا ہے۔ جابر بن سنان حرانی (م: ۲۹۱ھ) بھی علم ہیئت کے ماہرین میں ہیں، ان کو فلکیاتی مشاہدات سے بڑی دلچسپی تھی، اس نے کئی آلات رصدیہ ایجاد کئے، جن میں ایک اہم آلہ "کروی اصطرلاب" (Spherical Astrolobe) سے معروف ہے، جس کے ذریعہ اجرامِ فلکیہ کے مشاہدہ کے وقت اس کے فاصلہ کی پیائش بھی کی جا سکتی ہے۔

تیسری صدی ہجری میں ہی فلکیات کی ایک اہم شخصیت ابوعبداللہ محمد بن جابر بنانی (م: ۳۰۵ھ) کی ہے، زمین کی گردش اور سورج کی رفتار اس کی تحقیق کا اہم موضوع تھا، ان کی تحقیق ہے کہ سورج کی گذرگاہ کا جھکاؤ ۲/۱ ۲۳ درجہ نہیں، بلکہ ۲۳/درجہ ۳۵/منٹ ہے، جابر نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ زمین سورج کے گرد جس مدار میں گھومتی ہے وہ دائرہ کی طرح گول نہیں ہے بلکہ بیضوی شکل کی ہے، اس نے علمِ ہیئت سے متعلق کئی نقشے تیار کئے اور ان نقشوں کے مطابق زیچ (Astronomical Tables) تیار کی، جسے زیچ البنانی کہتے ہیں، جرمنی میں کئی بار یہ کتاب شائع ہو چکی ہے، اس کا ترجمہ پہلی مرتبہ لاطینی زبان میں ۱۱۱۳ء میں شائع ہوا، اس کے بعد یورپ کی متعدد زبانوں میں یہ اہم کتاب شائع ہو کر اہلِ علم و دانش کے درمیان قبول عام حاصل کر چکی ہے۔

بنانی کے شاگردوں میں ایک اہم نام حکیم ابومحمد العدلی القاینی (م: ۳۷۷ھ) کا آتا ہے، یہ بھی فلکیات کے ماہرین میں تھے، رصدگاہ کی تعمیر میں اس نے کئی نئے نئے آلات ایجاد کئے، اور رصدگاہ میں ان کو نصب کیا، محمد بن جابر حرانی اپنے عہد کے بڑے دانش ور بھی تھے اور دولت مند بھی، انہوں نے ایک رصدگاہ تعمیر کی، جو مامون رشید کی شاہی رصدگاہ کے بعد سب سے اعلیٰ معیار کی حامل سمجھی جاتی تھی، سیاروں کے باہمی فاصلہ کو بھی اس نے زیادہ درست طریقہ پر معلوم کیا اور اپنے تجربات کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔

فلکیات میں ایک نہایت اہم نام ابوالحسن یونس صوفی (م: ۳۹۵ھ) کا آتا ہے، یہ

نہایت ہی ذہین حوصلہ منداور عالی دماغ ماہر ہیئت تھا، اور اس نے ایسی دریافتیں پیش کیں کہ آج بھی سائنس داں اس کی تحقیقات سے اتفاق کرتے ہیں، اس نے جن چیزوں کو دریافت کیا ہے ان میں ایک اہم مسئلہ دائرۃ البروج کے انحراف (Inclination of the Eciplic) کا ہے، جو ابن یونس صوفی کے نزدیک ۲۳ر درجہ ۳۵ر منٹ ہے۔ اور یہ جدید تحقیق کے مطابق ہے، صوفی نے ''اوج شمس (Sun's Apogee) کا فلکی طول ۸۶ر درجہ ۱۰ منٹ قرار دیا، جو آج کی تحقیق سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، اسی طرح صوفی کے نزدیک اعتدالین کے استقبال (Percession of Equinoxes) کی قدر (۵۱۴۲) سکنڈ سالانہ ہے، اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ کی دریافت (۵۳۴۷) سکینڈ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی معمولی فرق ہے، غرض، یہ فلکیات کی تاریخ میں نہایت اہم سائنس داں ہیں، اور حیرت انگیز طور پر آج تک ان کی تحقیقات جدید ترین تحقیق سے ہم آہنگ ہے۔

فلکیات میں ابو الوفاء بوز جانی (م: ۳۷۸ھ) کا گمنام نام بھی نا قابلِ فراموش ہے، جہاں وہ ایک ماہر ریاضی داں تھا، وہیں فلکیات کا ایک قابلِ قدر سائنس داں بھی، چنانچہ اس نے پہلی بار ثابت کیا کہ سورج میں کشش ہے، اور چاند بھی گردش کرتا ہے۔ عمر خیام (م: ۱۰۳۹ء) یوں تو ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہے، اور شاعری نے اسے بدنام بھی کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک زبردست سائنس داں بھی تھا، اور خاص کر فلکیات اس کا اصل موضوع تھا، ملک شاہ نے ایک اعلیٰ درجہ کی رصدگاہ اصفہان میں تعمیر کرائی تھی، یہ رصدگاہ اس زمانہ میں ماہرین فلکیات کی تحقیق وریسرچ کا سب سے بڑا مرکز تھا، عمر خیام اس کا افسر اور نگراں تھا، اس نے نہایت گہرائی سے اجرام فلکی کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا، عمر خیام نے نہایت باریک بینی سے شمسی اور قمری سال کی پیمائش کی، اور ثابت کیا کہ شمسی سال ۳۶۵ر دن ۵ر گھنٹے ۴۰ر منٹ ہے، یہ موجودہ تحقیق سے صرف (۱۱ء۳) سکینڈ زیادہ ہے، اس سے عمر خیام کی مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، قمری سال بہ مقابلہ شمسی سال کے ۱۱ر دن چھوٹا ہوتا ہے، اس طرح ۳۲ر شمسی سال میں ۳۳ر قمری سال ہو جاتے ہیں، سرکاری خزانہ کو اس ایک سال کے اخراجات سے بچانے کے لئے عمر خیام نے یہ صلاح دی کہ مذہبی امور تو قمری تقویم سے متعلق رہیں اور مالیہ،

بجٹ اور تنخواہوں کی ادائیگی شمسی سال سے ہو، شمسی سال میں ہر سال ۳۰/دن کے مہینے کے لحاظ سے ۵/دن بڑھ جاتے تھے، جس کو عرب "کبیسہ" کہتے تھے، خیام نے اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ بعض مہینوں کو ۳۱/دن کا بنا دیا، تا کہ ان کا مجموعہ ۳۶۵ دن قرار پائے، پھر ۳۶۵ دن کے سال کے بعد بھی ہر سال قریب چھ گھنٹہ زیادہ ہوتا تھا، اس کا حل یوں نکالا کہ ہر چوتھے سال میں ایک دن کا اضافہ کر کے ۳۶۶ دنوں کا سال قرار دیا، یہی شمسی تقویم ہے جو آج تک یورپ میں مروج ہے، شمسی تقویم کی یہ اصلاح خیام کا ایسا کارنامہ ہے، کہ اہلِ یورپ کا ہمیشہ ان کا شکرگذار اور احسان شناس ہونا چاہئے۔

غرض، یہ ہمارے بزرگوں ہی کے علمی کارنامے ہیں، جن سے روشنی حاصل کر کے یورپ ستاروں سے آگے اپنی کمند ڈالنے کے لئے فکرمند ہیں، اور ہم ایسے گرد کارواں ہیں کہ خود اپنے کارواں کو فراموش کر چکے ہیں۔

(۲۶/مئی ۲۰۰۰ء)

☆☆☆

میڈیکل سائنس اور مسلمانوں کی خدمات

اسلام میں بنیادی طور پر علم کی دو ہی قسمیں کی گئی ہیں، علم نافع اور علم غیر نافع، علم نافع سے ایسے علوم مراد ہیں جو انسانیت کے لئے دنیا یا آخرت کے اعتبار سے فائدہ مند ہو، غیر نافع وہ علوم ہیں جو دین یا دنیا کے اعتبار سے بے فائدہ یا نقصان دہ ہوں، رسول اللہ ﷺ نے ایسے علم سے اللہ کی پناہ مانگی ہے جو غیر مفید ہو، اور ایسے علم کی اللہ سے دعاء مانگی ہے جو نفع بخش ہو آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ حکمت مؤمن کا گمشدہ مال ہے، **الحکمة ضالة المومن**، اس ارشاد کا منشاء بھی یہی ہے کہ جو علم وحکمت کی بات حاصل ہو اور وہ انسانیت کے مفاد میں ہو، اس کو اس رغبت اور اشتیاق کے ساتھ حاصل کرنا چاہئے جیسا کہ کوئی شخص اپنے گمشدہ مال کو محبت وتڑپ اور شوق ورغبت کے ساتھ حاصل کرتا ہے۔

جو علوم انسانیت کے لئے نافع اور فائدہ مند ہیں، ان میں ایک طب اور میڈیکل سائنس ہے، یہ خدمت خلق کا نہایت اہم ترین اور ضروری ترین ذریعہ ہے، کیونکہ کوئی انسان اس ضرورت سے بری نہیں، دولت مند ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا رعایا، طاقت ور وتنومند ہو یا جسمانی اعتبار سے کمزور ونحیف بیماری کے پنجہ سے کوئی محفوظ نہیں، یہ بیماری ہی دراصل انسان کے عجز اور خدا کے سامنے اس کی مجبوری ومقہوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ورنہ نہ جانے انسان کس قدر خودسر اور سرکش ہو جائے، اس لئے میڈیکل سائنس نہ صرف انسان بلکہ تمام حیوانات کے لئے ایک ناگزیر ضرورت ہے، اور اب تو طب وعلاج کا دائرہ فیض نباتات تک متعدّی ہوگیا ہے، اسی لئے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصل علم تو دو ہی ہیں ایک تو فقہ طریقۂ زندگی کو سمجھنے کے لئے اور دوسرے طِبّ اصلاح بدن کے لئے، **العلم علمان، علم الفقه للأديان وعلم الطب للأبدان** اسی طرح کی بات مشہور فقیہ اور محدث امام

شافعیؒ سے بھی منقول ہے۔

اسی لئے مسلمانوں نے شروع سے اس فن کو اپنی تحقیق کا خاص موضوع بنایا ہے، اور اس سلسلہ میں مسلمان اطباء کی خدمات اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ ان کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مغرب نے باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی علمی اور سائنسی خدمات پر پردہ رکھنے کی بے حد کوششیں کی ہیں، اس کے باوجود کہیں کہیں وہ بھی اس بات پر مجبور ہوئے کہ مسلمان سائنس دانوں کی خدمات کا اعتراف کریں، مسلمان اہلِ فن کا عام طریقہ رہا ہے کہ وہ کسی کام کو اپنی طرف منسوب کرنے سے گریز کرتے تھے، اور اس کو اخلاص کے خلاف سمجھتے تھے، اسی لئے آج کل جس طرح نو ایجاد دواؤں اور دریافتوں کو لوگ اپنے نام سے موسوم کرتے ہیں، مسلمانوں کے یہاں یہ طریقہ مروج نہیں تھا، اس لئے مسلمانوں کی بہت سی تحقیقات پر پردہ گمنامی پڑا ہوا ہے۔ اس کے باوجود مسلمان سائنس دانوں کی جو خدمات روشنی میں آگئی ہیں، وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں، اس وقت ان ہی خدمات کا ایک سرسری تذکرہ مقصود ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم ترین نام ابوالحسن علی بن سہل طبری (۲۵۱ھ) کا آتا ہے، جو بغداد کے تمام شفا خانوں پر نگرانِ اعلیٰ تھے، یہ اپنے طبّی تجربات کو ڈائری میں قلمبند کرتے جاتے تھے جس کا تعلق ادویہ کی خصوصیات، علم الحیوانات، صحت، موسم اور آب وہوا سے ہوتا، ان ہی تجربات کو انہوں نے ایک ضخیم کتاب کی صورت ابجدی ترتیب سے ''فردوس الحکمت'' کے نام سے مرتب کیا، یہ پہلی طبّی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جو طبری کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اس کے علاوہ بھی طبّ کے موضوع پر طبری کی بعض اور بھی کتابیں ہیں۔ طب کا ایک اہم شعبہ آنکھ سے متعلق علاج کا رہا ہے، آنکھ انسانی جسم کا انتہائی نازک عضو ہے، جو بہت ہی باریک شریانوں پر مشتمل ہے، ابوالقاسم عمار موصلی (۳۷۷ھ ۱۰۰۵ء) امراضِ چشم کے نہ صرف بڑے ماہر تھے بلکہ اس شعبہ میں کئی جدید تحقیقات واکتشافات بھی پیش کئے۔ موتیا بند کا آپریشن سب سے پہلے عمار موصلی ہی نے کیا۔ گویا موصلی آنکھوں کا سب سے بڑا سرجن ہے۔ آنکھ سے متعلق بیماریوں اور ان کے علاج کے طریقوں کی بابت اپنی تحقیقات اور تجربات کا نچوڑ موصلی نے ''علاج العین'' کے نام سے مرتب کیا، جو اس فن کی نہایت اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ یورپ

میں اس کا ترجمہ بہت پہلے ہو چکا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں جرمنی زبان میں بھی بڑے اہتمام سے اس کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔

اس کے بعد طبّ کی تاریخ میں وہ عظیم الشان نام آتا ہے جسے میڈیکل سائنس کی تاریخ ابوالقاسم زہراوی (۳۹۵ھ، ۱۰۰۹ء) کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اور اس کے سامنے جبین عقیدت خم کرتی ہے۔ یہ طبّ کی تاریخ کا پہلا سرجن ہے۔ جس نے آپریشن کے فن کو مرتب کیا، اس کے آلات بنائے، اور ایک سو سے زیادہ آلات سرجری ایجاد کئے، موتیا بند اور ٹونسل کا آپریشن کیا۔ آپریشن کے ذریعہ ہڈیوں کو جوڑا، جسم کے اندرونی حصہ میں آپریشن کے نازک طریقے ایجاد کئے، حلق، سر، گردہ، پیٹ اور آنکھوں کے آپریشن کا طریقہ بتایا، مریض کو بے ہوش کرنے کے سلسلہ میں مناسب دواؤں کی رہنمائی کی، کینسر کے مرض پر خاص تحقیق کی اور بتایا کہ کینسر کے پھوڑے یا زخم کو چھیڑنا نہیں چاہئے۔ غرض، سرجری کی دنیا میں اس کے کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں، مغربی مصنفین کو بھی جس کا اعتراف ہے۔ زہراوی نے اپنے ملّی تجربات کو ڈائری کی صورت میں لکھنے کا اہتمام کیا، یہ ڈائری ''تصریف'' کے نام سے موسوم ہے اور سرجری کے فن میں نہایت اعلیٰ کتاب تصور کی جاتی ہے۔

تاریخ طب کا کون رمز آشنا ہوگا، جو امام ابوبکر محمد زکریا رازی (۳۰۸ھ، ۹۳۲ء) کے نام سے نا آشنا ہو، ۱۹۳۰ء میں پیرس میں رازی کی ہزار سالہ برسی بڑے اہتمام سے منائی جا چکی ہے اور بین الاقوامی طبی کانگریس کے اجلاس لندن منعقدہ ۱۹۱۳ء میں رازی اور فنِ طبّ کو ایک اہم موضوع کی حیثیت سے شریک رکھا گیا، اور ان کو فن طب کا امام تسلیم کیا گیا۔ طبّ کے میدان میں رازی کی خدمات بہت وسیع ہیں، فرسٹ ایڈ کا طریقہ رازی ہی کی ایجاد ہے، اس نے جڑی بوٹیوں پر بہت تجربات کئے ہیں، وہ طبیعات (Physics) کا بھی بڑا ماہر تھا، اسی نے نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا کی تقسیم کی ہے۔ دواؤں کے صحیح صحیح وزن کے لئے ''میزان طبعی'' (Hydrostatic balance) ایجاد کی، جس سے چھوٹی چیز کا بھی وزن معلوم کیا جا سکتا ہے جراحی کے لئے نشتر (Seton) اسی نے بنایا ہے، الکحل جو آج ایک کثیر المقاصد محلول ہے، رازی ہی اس کا موجد ہے۔ رازی کا سب سے بڑا طبی کارنامہ چیچک کے بارے

میں اس کی تحقیقات ہیں، اس نے چیچک پر تحقیق کی، اس کے اسباب دریافت کئے، احتیاط اور علاج کا طریقہ بتایا۔ اور اس مرض کے بارے میں اپنی تمام تحقیقات کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔ جو چیچک کے موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب مدتوں یورپ کے میڈیکل کالجوں میں داخل نصاب رہی ہے، اس کے علاوہ الحاوی، المصوری اور متعدد کتابیں رازی کے قلم کی رہین منت ہیں، اور اکثر کتابوں کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ رازی کو حکومت وقت نے ایک اچھے اسپتال کے قیام کے لئے مامور کیا اور بہتر جگہ کے انتخاب کرنے کا مشورہ دیا۔ امام رازی نے یہ تدبیر کی کہ شہر کے مختلف مقامات اور محلوں میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے لٹکا دئے اور تین دِنوں تک اس کے رنگ، بو، اور مزے میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیتا رہا، تین دن گذر جانے کے باوجود جس مقام کا گوشت زیادہ سے زیادہ اپنی کیفیت پر باقی رہا، رازی نے اس جگہ کا ہسپتال کے لئے انتخاب کیا، اس سے اس عظیم محقق کی ذہانت اور خداداد فراست کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پیشہ طبّ میں سنان بن ثابت حرانی (۳۲۰ھ، ۹۴۳ء) کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جس نے فنِ طبّ میں پیشہ ورانہ اصلاحات کیں، اطباء کے لئے اسناد جاری کی گئیں، مطب کرنے کی اجازت دی گئی، اور عطائی قسم کے اطباء کو علاج سے منع کیا گیا، اس نے حکومت کی طرف سے فنِ طبّ کی اہلیت کا دعویٰ کرنے والے ایک ہزار امیدواروں کا امتحان لیا۔ جن میں سات سو کامیاب ہوئے، ان ہی کو مطب سرٹیفکٹ جاری کی گئی، گویا پہلی بار سرکاری رجسٹریشن اور مطب کے لئے اجازت نامہ کے حصول کو لازم قرار دیا گیا، سنان بن ثابت حرانی نے گشتی شفاخانہ کا طریقہ بھی ایجاد کیا، کچھ اطباء اس بات پر مامور تھے کہ دواؤں کے ساتھ مختلف محلوں کا دورہ کریں اور مریض کا ان کے مقام پر علاج کردیں۔

علم وفن کی دنیا میں ایک نہایت قابلِ احترام شخصیت حکیم ابونصر فارابی (۳۳۸ھ ۹۵۰ء) کی ہے۔ جس کا شمار تاریخ کے ذہین انسانوں میں ہوتا ہے، فارابی مختلف علوم وفنون کا ماہر اور جامع شخص تھا، ریاضی اور علم تمدن فارابی کا خاص موضوع ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ علم نفسیات کا بھی ماہر تھا، اور اس فن کو طبّ وعلاج سے جو تعلق ہے وہ ظاہر ہے۔

ادویہ اور میڈیسین کی تحقیق میں ایک نہایت نمایاں اور ناقابلِ فراموش کام بلکہ کارنامہ ابومنصور موفق ہروی (۳۴۰ھ ۹۶۱ء) کا ہے، ابومنصور نباتات (Botany) کا بڑا اعلیٰ درجے کا محقق تھا، نباتات کے علاوہ اس نے جماداتی ادویہ پر بھی تحقیق کی ہے، ادویہ پر اس کی کتاب ''حقائق الادویۃ'' بڑی معرکہ کی چیز سمجھی جاتی ہے، اس کتاب میں ۵۸۵ دواؤں کے نام اور ان کی صحیح پہچان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس نے ادویہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، معدنی، نباتاتی اور حیواناتی۔ اسی نے خاصیت اور اثرات کے لحاظ سے دواؤں کے چار درجے کئے ہیں: گرم وتر، گرم وخشک، سرد وتر، سرد وخشک، معدنی مفردات اور مرکبات میں ان کی کئی ایجادات اور نئے انکشافات ہیں، غرض وہ دواؤں کے مثبت اور منفی خواص کا ماہر تھا، اس نے اس مقصد کے لئے بہت سارے تجربات کئے۔ اور طویل وپُر مشقت اسفار کو برداشت کیا۔

حمل اور جنین طبّ کا ایک اہم اور نازک موضوع ہے۔ اس کے ماہر تھے عریب بن سعد الکاتب قرطبی (۳۵۶ھ، ۹۷۶ء)، امراض نسواں عریب بن سعد کا خاص موضوع تحقیق ہے۔ حمل کے استقرار اور جنین کی حفاظت، زچہ اور بچہ نیز دایہ گری کے موضوع پر عریب کی بہت اہم تالیفات ہیں، جو اس کے بہت طویل تجربات اور تحقیقات کا نچوڑ ہیں، وہ نباتات کا بھی ماہر تھا، اور اس نے نباتات سے متعلق بھی بڑے قیمتی تجربات بیان کئے ہیں۔

امراض چشم کے ماہرین میں ایک نہایت اہم نام علی بن عیسیٰ (۴۴۱ھ ۱۰۳۱ء) کا ہے۔ عمار موصلی کے بعد یہ دوسرے بڑے ماہر امراضِ چشم ہیں، علی بن عیسیٰ نے امراضِ چشم سے متعلق تین جلدوں میں نہایت مفصل کتاب ''تذکرۃ الکحلین''، لکھی ہے، جو گویا اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب میں آنکھ سے متعلق ۱۳۰ بیماریوں کا ذکر آیا ہے، نیز آنکھوں کے لئے مفید ۱۴۳ مفرد دواؤں کے نام اور ان کی خصوصیات اس کتاب میں مذکور ہیں۔ ۱۴۹۹ء میں اٹالین ۱۹۰۳ء میں فرانسیسی اور ۱۹۰۴ء میں جرمنی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے، اور بڑے بڑے اہلِ فن نے مصنف کی عبقریت اور کتاب کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔

اب اس کے بعد فنِ طبّ کے امام الائمہ شیخ حسین بوعلی سینا (۴۲۸ھ ۱۰۳۸ء) کا نام نامی آتا ہے، جن کے نام پر دنیاءِ طب کے بڑے بڑے اصحاب تحقیق اور ماہرینِ فن کی گردنِ

اعتراف بھی ختم ہو جاتی ہے، شیخ بو علی سینا سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے اکثر کتابیں یورپین زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں، شیخ کو دنیا کی عظیم باکمال شخصیتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ طبیعات، حیاتیات، تشریح الاعضاء (Biology)، منافع اعضاء (Physiology) نیز علم العلاج اور علم الامراض وعلم الادویہ کا عظیم ماہر اور محقق سمجھا جاتا ہے۔ شیخ کی کتابوں اور خدمات کے سرسری تعارف کے لئے بھی بڑی تفصیل مطلوب ہے۔ شیخ کو علم النفس کا موجد سمجھا جاتا ہے، شیخ نے اعضاء جسمانی کی اعضاء مفردہ اور اعضاء مرکبہ کی حیثیت سے جو تقسیم کی ہے وہی آج تک قائم ہے۔ شیخ نے روشنی کی رفتار پر بھی تحقیق کی ہے، شیخ کی مشہور کتاب ''القانون'' صدیوں یورپ کی طبی درس گاہوں میں داخل نصاب رہی ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ لاطینی زبان میں پندرہویں صدی میں سولہ بار اور سولہویں صدی میں بیس بار اس کا ترجمہ طبع ہو چکا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہوا، یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔ تشریح اعضاء، منافع اعضا اور علم العلاج اس کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر ہورٹن نے جرمن زبان میں شیخ کی کتاب ''الشفاء'' کا ترجمہ کیا ہے، اور اس کی شرح لکھی ہے۔

تشریح اجسام کے ماہرین اور امراضِ چشم کے باکمال معالجین میں ایک نمایاں نام، علاء الدین ابوالحسن ابن النفیس قرشی (۱۲۰۱۔ ۱۲۸۹ء) کا ہے۔ ابن النفیس کا شمار دنیا کے ممتاز اطباء میں ہے۔ اس نے شیخ بو علی سینا کی کتاب القانون پر بھی بحث کی ہے۔ اور بعض اُمور میں ان سے اختلافِ رائے بھی کیا ہے۔ ابن النفیس کا بہت بڑا کارنامہ حیوانی اجسام میں دورانِ خون کے نظام کی دریافت ہے۔ اسی نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ دورانِ خون مسلسل جاری ہے، جو پھیپھڑوں میں پہونچ کر تازہ ہوا حاصل کر کے پورے جسم میں دوڑتا رہتا ہے، عام طور پر ولیم ہاروے "William Harvey" (۱۶۸۷ء) کے سر باندھا جاتا ہے، یہ تاریخ کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے، درحقیقت سب سے پہلے اس کی دریافت ابن النفیس نے کی ہے۔

طبّی تحقیقات میں لسان الدین بن خطیب (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۴ء) کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا، اسی نے سب سے پہلے متعدی اور غیر متعدی امراض کی شناخت کی، پھر متعدی امراض

پر تحقیق کرتے ہوئے اس بات کو ثابت کیا کہ کچھ ان دیکھے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں، جو امراض کے متعدی ہونے کا باعث ہوتے ہیں، یقیناً یہ ابن الخطیب کا بہت بڑا کارنامہ ہے، طاعون کے مرض پر بھی اس کی تحقیقات نہایت قیمتی سمجھی جاتی ہیں، بعد میں فن طب میں جو ترقیاں ہوئیں ان میں جراثیم کے وجود کے نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، اور اسی کی روشنی میں نئی نئی دوائیں ایجاد پذیر ہوئیں، اور جن امراض کو لاعلاج سمجھا جاتا تھا، ان کی دوائیں ایجاد پذیر ہوئیں۔

(۱۴ رجنوری ۲۰۰۰ء)

☆☆☆

تعلیمی پسماندگی —— مرض اور علاج

میرے محلہ میں ایک غیر مسلم بھنگی ہے، وہ سی، آر، پی کی ملازمت کی وجہ سے ملک کے اکثر علاقوں میں جا چکا ہے، اور اب ریٹائر ہونے کے بعد محلہ ہی میں خدمت کر کے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے، لمبا چوڑا، چھ فٹ سے بھی اونچا قد، برسات کی سی رات سے بھی زیادہ سیاہ رنگ، اور اوپر کی طرف چڑھی ہوئی گھنی اور بڑی مونچھیں، جہاں کام کرے وہاں اس شان سے سیلوٹ کرتا ہے کہ عام آدمی کو بھی اپنے بارے میں اعلیٰ سیاسی عہدیدار ہونے کا خیال پیدا ہو جائے، وہ اپنے ڈیل ڈول، بے آمیز رنگ، اور سر اٹھائی ہوئی مونچھوں کی وجہ سے جلاّد سا نظر آتا ہے، لیکن شکل وصورت کے اعتبار سے وہ جس قدر ڈراؤنا اور درشت محسوس ہوتا ہے، طبیعت کے اعتبار سے اسی قدر نرم و بردبار، مزاج میں بچھاؤ، کیا مجال کہ کوئی کام کہا جائے اور انکار کر جائے، اس کی اسی صفت کی وجہ سے وہ لوگوں کے درمیان ''ایک انار سو بیمار'' کا مصداق بنا رہتا ہے، اور صبح ہوتے ہی کئی گھروں کے فرستادے اس کے گھر موجود ہوتے ہیں۔

کوئی سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہوگی کہ مسلسل دس پندرہ دنوں نہ وہ کام پوچھنے آیا، اور نہ اس پر کہیں نگاہ پڑی، میں نے اس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ اسے کتے نے کاٹ لیا ہے، میں نے سوچا کہ جو شخص ہمیشہ لوگوں کی خدمت کرتا ہے، یقیناً وہ بھی ہمارے حسن سلوک کا مستحق ہے، چنانچہ میں عیادت کے لئے اس کے گھر پہنچا، وہ واقعی بیمار تھا، یہ جان کر کہ میں عیادت کے لئے آیا ہوں، اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا، کیوں کہ اس کے خیال میں بھی نہیں تھا، کہ میں خود اس کی عیادت کے لئے پہونچونگا، آج کل غریب اور عزت و مرتبہ کے اعتبار سے کم درجے کا پڑوسی یا ملازم اس لائق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کے ساتھ پڑوسیوں جیسا سلوک کیا جائے، اس لئے وہ میری آمد پر بے حد خوش تھا، اس نے اپنے گھر کے تمام لوگوں کو

میری ملاقات کے لئے بلایا، برادران وطن کے انداز میں سب نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر پرنام کہے، ان میں کئی نوعمر اور بعض نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں، یہ سب اس کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تھے، اس نے مجھ سے ایک ایک کا تعارف کرایا، اس کا نام یہ ہے، یہ فلاں کلاس میں زیرِ تعلیم ہے، اس نے فلاں امتحان پاس کرلیا ہے، غرض کوئی چھوٹا اور بڑا ایسا نہیں تھا، جو تعلیم میں مشغول نہ ہو۔

مجھے واپس کرتے ہوئے وہ بہت خوش تھا، اور اس کے چہرہ کے نقوش سے شکریہ کے جذبات عیاں تھے۔ لیکن خود میں ایک خاص تاثر اور فکر کے ساتھ واپس ہورہا تھا، مجھے یہ بات بے چین کررہی تھی کہ یہ غریب گھر گھر جاکر غلاظتیں صاف کرتا ہے، دو دو چار چار پیسے محنت و مزدوری کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، لیکن اس میں اس درجہ تعلیمی شعور ہے کہ گھر کے ایک ایک لڑکے اور لڑکی کو تعلیم دلانے میں مشغول ہے، اسی محلّہ میں بہت سے مسلمان بھی آباد ہیں، اگر ان گھروں کا تعلیمی سروے کیا جائے تو شاید ہی دو چار فیصد بھی ایسے لوگ نکل پائیں جن کی تعلیم میٹرک تک ہو، حالاں کہ ان کے پاس وسائل نسبتاً زیادہ ہیں، بچوں کی بڑی تعداد سڑکوں پر گلی ڈنڈا اور گولیاں کھیلتی نظر آئے گی، ان کے پاس اچھے سے اچھے کپڑے ہیں، تیز رفتار موٹر سائیکلیں ہیں، تفریح کے لئے گھر میں ٹی وی اور ٹیپ رکارڈ وغیرہ کی سہولتیں ہیں، اور آج کی دنیا جن آسائشوں کی خوگر ہے، ان کا پورا سرو سامان بھی، لیکن والدین تعلیم کی اہمیت اور تعلیمی شعور سے خالی ہیں، اور بچے پڑھنے لکھنے کے شوق اور جذبۂ مسابقت سے عاری۔

ایسا نہیں ہے کہ تمام مسلمان محلوں اور آبادیوں کا یہی حال ہے، لیکن یہ ایک حقیت ہے کہ ہم دن ورات جن اقوام کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے یہاں حصولِ تعلیم کا جذبہ جتنا بے پناہ ہے، ہم ابھی اس میں بہت پیچھے ہیں، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دلت جنہیں ہندوستانی معاشرہ میں کوے اور چیل کے برابر سمجھا جاتا تھا، تعلیم کے میدان میں وہ بھی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے شب وروز کوشاں ہیں، جن گھروں میں اسکول جانے کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، اور بچے عقل و ہوش سنبھالتے ہی اپنے ہاتھوں میں کدال اور پھاوڑے لے کر محنت و مزدوری کے لئے کھیتوں اور بازاروں میں گھومتے رہتے تھے، اب ان کی پیٹھ پر کتابوں کے

بھاری بیگ ہوا کرتے ہیں، اور انہوں نے اسکول کی دنیا کو اپنے آپ سے آباد کر رکھا ہے۔

لیکن ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہمارا سفر پیچھے کی طرف ہے، ہم نے ترقی کی بجائے تنزل کو اور محنت کی بجائے تن آسانی و سہل انگاری کو اپنی منزل بنالیا ہے، اس کے کئی اسباب ہیں، پہلا سبب تعلیم کے معاملہ میں ہماری بے شعوری ہے، مسلمانوں میں آج بھی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو تعلیم کی اہمیت سے نابلد ہیں، مسلمانوں میں جو مزدور اور کم معاش طبقہ ہے، وہ ابھی تک اسی فکر کا اسیر ہے کہ اپنے بچوں کو پتھر پھوڑنے، ہوٹلوں کی میز صاف کرنے اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں لگادیا جائے، تاکہ یومیہ دس بیس روپے آجائیں، اور گھر چلانے میں آسانی ہو، باشعور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ انہیں بتائیں کہ یہ چند پیسے ان کے روشن مستقبل کو تاریک کرنے کا ذریعہ ہیں، اس لئے وہ ابھی تکلیفیں اٹھا کر اور مشقتیں جھیل کر اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں تو آج کے دس روپے کل دس ہزار لا سکتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں میں پڑھے لکھے لوگوں کے لئے دس بچوں کی نوشت وخواند سکھانے کو فدیہ قرار دیا تھا، یہ وہ وقت تھا کہ مسلمان فاقہ مستیوں سے دوچار تھے۔ اور ان کو مالی وسائل کی زیادہ احتیاج تھی، لیکن آپ ﷺ نے معاشی ضرورت پر تعلیمی ضرورت کو مقدم رکھا۔

تعلیم سے غفلت تاجروں کے طبقہ میں بھی پائی جاتی ہے، بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اگر یہ پڑھ لکھ کر اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرلیں تو اس کو اسی تجارت یا کاروبار میں لگنا ہے، ایسی صورت میں زیادہ تعلیم کی کیا ضرورت ہے؟ اگر بہ قدر ضرورت تعلیم کے بعد اسے کاروبار میں لگادیا جائے تو پیسے بھی بچیں گے اور وقت بھی بچے گا، نیز جتنی مدت اس کے حصولِ تعلیم میں لگتی، اس میں اسے کام کا اچھا خاصا تجربہ ہو جائے گا، لیکن یہ کھوٹی سوچ ہے، کاروبار میں اُتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، یہ کوئی قابلِ بھروسہ ذریعۂ معاش نہیں ہے، دُکانیں جلائی جاسکتی ہیں، سامان واسباب لوٹے جاسکتے ہیں، لیکن علم ایسی متاع گراں مایہ ہے کہ نہ اسے لوٹا جاسکتا ہے، اور نہ جلایا جاسکتا ہے، علم انسان کا اصل جوہر ہے، اس سے انسان کی عزت اور اس کے کنبے اور قوم کا وقار متعلق ہے، اس لئے علم بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، قرآن نے اسی لئے کہا ہے کہ علم رکھنے والے اور علم سے بے بہرہ برابر نہیں ہوسکتے،

﴿هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَايَعْلَمُوْنَ﴾

(زمر: ۹)

تعلیمی پسماندگی کا دوسرا سبب ہمارا اسراف اور فضول خرچی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ شادی بیاہ، بچوں کی بسم اللہ، ختنہ اور عقیقہ کی تقریبات نیز موت سے متعلق طبع زاد رسم و رواج کی تکمیل میں ہم اپنے پیسے پانی کی طرح بہاتے ہیں، سودی قرض لینے اور اپنی بنیادی ضرورت کی چیزوں کو فروخت کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، ظاہر ہے کہ جب ہمارے پیسے ایسی بیکار چیزوں میں خرچ ہونگے تو جائز ضروریات کے لئے پیسے کیسے بچ سکیں گے؟ اگر ہم اس اسراف کے خلاف مہم چلائیں اور اپنے اور اپنی قوم کے بچوں کی تعلیم کی فکر کریں تو انہیں پیسوں کے ذریعہ ہم ان کی تعلیمی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں، اگر متوسط آمدنی کے لوگ یہ طے کرلیں کہ وہ سادہ طریقہ پر اپنے بچوں کی تقریبات نکاح انجام دیں گے، اور بچے ہوئے پیسوں سے اپنے بچوں کے علاوہ قوم کے ایک بچہ کی تعلیمی کفالت کریں گے، تو اس طرح سماج کے کتنے ہی غریب بچوں کی تعلیم کی صورت نکل آئے گی۔

ہماری تعلیمی پسماندگانی کا تیسرا سبب طلبہ و طالبات کے اولیاء کا اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف سے بے تعلق اور غافل رہنا ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کردیتے ہیں، اور پھر کبھی پلٹ کر اس بات کا جائزہ نہیں لیتے کہ ان کا تعلیمی رجحان کیا ہے؟ وہ پابندی سے اسکول جا بھی رہے ہیں یا نہیں؟ مسلمان اولیاء طلبہ و طالبات سے عام طور پر اسکول کے ذمہ داروں کو یہ شکایت ہے، اولیاء کی غفلت کا نوعمر اور مستقبل کے نفع و نقصان سے بے خبر بچے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ کثرت سے غیر حاضر رہتے ہیں، مفوضہ کام کو انجام نہیں دیتے، ڈسپلن شکنی کرتے ہیں، اساتذہ اور ذمہ داروں کے ساتھ بدتمیزی کا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور اولیاء کے عدمِ تعاون کی وجہ سے ان کی بروقت فہمائش نہیں ہو پاتی، اس لئے ان کی بیماری بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ناقابلِ علاج ہو جاتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ تعلیم میں طلبہ، اولیاءِ طلبہ اور اساتذہ تینوں کی ذمہ داری برابر درجہ کی ہے، اولیاءِ طلبہ کی غفلت کی وجہ سے نہ صرف ایک تہائی ذمہ داری متأثر ہوتی ہے، بلکہ طلبہ بھی اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں،

اس طرح دوہرا نقصان ہوتا ہے، اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جو اولیاءِ طلبہ خود تعلیم یافتہ ہوں وہ تو آپ اس کی اہمیت محسوس کریں، اور جو اولیاء ناخواندہ یا کم پڑھے لکھے ہیں ان میں یہ شعور پیدا کیا جائے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں اسکول پہنچ کر تفتیش حال کریں۔

ہماری تعلیمی پسماندگی کا ایک اہم سبب مسلمانوں کے زیرِ انتظام تعلیم گاہوں کی زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی پالیسی رہی ہے، ہم اسٹیج پر تو اپنی قوم کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے ہیں، لیکن جو اسکول ہمارے زیرِ انتظام ہیں، ہم نے ان میں نہ نفع اور نہ نقصان کے بجائے ''زیادہ سے زیادہ نفع'' حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اور اب تعلیم ایک نفع خیز تجارت بن چکی ہے، یہ نہایت ہی تکلیف دہ رجحان ہے، جو لوگ اصحابِ ثروت ہیں، وہ تو اپنے بچوں کو کہیں بھی تعلیم دِلا لیں گے، لیکن قوم کے جو غریب لوگ ہیں، وہ اپنے بچوں کی تعلیم کا کیا انتظام کریں؟ اصل تو ان کی تعلیم کا مسئلہ ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری درس گاہوں کی عمارتیں عظیم الشان ہوں، اعلیٰ سے اعلیٰ فرنیچر ہو، اگر سادہ عمارت اور بنیادی ضروریات کے ساتھ ہم معیاری تعلیم فراہم کر سکیں اور اسے سستی بنا سکیں تو یہ قوم ملت کے ساتھ بڑا اُحسنِ سلوک ہوگا، اور نہ صرف دنیا میں نیک نام بلکہ آخرت میں بھی انشاء اللہ وہ سرخرو ہوں گے۔ کاش! درس گاہوں کے ذمہ داران اس پر توجہ دیں!!

(۱۷ مئی ۲۰۰۲ء)

☆☆☆

بچے ——— ہماری ذمہ داریاں

کل ۱۴/ نمبر ہے، اس تاریخ کو ''یوم اطفال'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، گویا یہ ''بچوں کا دن'' ہے جس کا مقصد سماج کو بچوں کے حقوق اور بچوں کے تئیں ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ بچے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا عطیہ ہیں، خود قرآن نے ان کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ (الفرقان:۷۴) اور اللہ تعالیٰ نے دو اولوالعزم پیغمبروں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سلسلہ میں ذکر فرمایا، کہ انہوں نے خدا سے اولاد کے لیے دعاء فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول فرمایا۔ (الصافات:۱۰۰، ریم:۵) اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کی خواہش انسان کی ایک فطری اور جائز خواہش ہے، اللہ تعالیٰ ہی نے ان کو انسان کے لیے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنایا ہے، بچوں کے بغیر کسی خوبصورت اور جاذبِ قلب ونظر سماج کا تصور بھی ممکن نہیں۔

اسلام نے جیسے سماج کے مختلف طبقات کے حقوق اور واجبات متعین کئے ہیں، اسی طرح بچوں سے متعلق ان کے سرپرستوں اور سماج کے فرائض کی بھی رہنمائی کی ہے، بچوں سے متعلق اسلام کا پہلا سبق یہ ہے کہ انسان دُنیا میں نئے انسان کی آمد پر خوش ہو نہ کہ غمگین اور فکر مند، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام (ھود:۱۱/۶۹) اور حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ علیہ السلام (آل عمران:۲۹) کی پیدائش کی اطلاع دی، تو اس کو ''خوشخبری'' سے تعبیر فرمایا گیا، بچوں کی پیدائش خوشی کی بات ہے، اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی کوئی تفریق نہیں، اسلام سے پہلے لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر رنجیدہ خاطر ہوتے اور اس کو اپنے لیے باعثِ عار تصور کرتے تھے، قرآن مجید نے اس کو کافرانہ طریقہ قرار دیا ہے اور اس کی مذمت فرمائی ہے۔ (الزخرف:۱۷) کیوں کہ انسان نہیں جانتا کہ اس کے لیے لڑکے زیادہ مفید ہوں گے

یا لڑکیاں؟ اور کون مشکل وقتوں میں اس کے کام آئے گا؟

بچوں کا سب سے بنیادی حق ان کے زندہ رہنے کا حق ہے، ہندوستان نے بچوں کے حقوق پر منعقدہ کنونشن کے دستاویز پر دستخط کیا ہے، اس میں پہلا حق یہی ہے، اسلام نے جس طرح اس حق کی رعایت رکھی ہے، شاید ہی اس کی مثال مل سکے، عام طور پر بچہ کا قانونی وجود اس وقت مانا جاتا ہے جب اس کی پیدائش ہو چکی ہو؛ لیکن اسلام کی نگاہ میں جس روز ماں کے رحم میں تخم انسانی نے قرار پکڑا، اسی دن سے وہ ایک قابلِ احترام اور لائقِ حفاظت انسان ہے؛ اسی لیے اسلام کی نظر میں اسقاط حمل جائز نہیں، بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی حفاظت اور بقاء کا انتظام نہ صرف والدین اور سرپرست بلکہ پوری انسانی برادری کا فریضہ ہے، اسی مقصد کے لیے شریعت نے ماں پر یہ اخلاقی حق رکھا ہے کہ وہ بچوں کو دودھ پلائیں، قرآن مجید نے ایک سے زیادہ مواقع پر اس کا ذکر کیا ہے؛ اس لیے کہ میڈیکل سائنس میں یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ بچوں کے لیے ماں کے دودھ سے زیادہ مفید کوئی غذا نہیں، پھر جب تک بچے اس لائق نہ ہو جائیں کہ خود کسبِ معاش کر سکیں۔ اس وقت تک بچوں کی کفالت والدین اور والدین نہ ہوں تو دوسرے قریبی رشتہ داروں پر رکھی گئی ہے، ماں باپ کے لیے یہ روا نہیں رکھا گیا کہ وہ نابالغ بچوں کو مزدوری پر لگائیں اور اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی برتیں۔

(الدر المختار مع الرد :۵/۳۳۷)

آپ ﷺ نے سرپرستوں کو اس بات کی تعلیم دی ہے کہ بچوں کے معاملہ میں ایثار سے کام لیا جائے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا نے ہر شخص کے لیے مجھ سے پہلے جنت کا داخلہ حرام کر دیا ہے؛ لیکن میں قیامت کے روز اپنی داہنی طرف ایک عورت کو جنت کے دروازے کی سمت دوڑتے ہوئے دیکھوں گا، میں کہوں گا کہ اسے کیا سوجھی کہ مجھ سے پہلے جنت میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے؟ مجھ سے کہا جائے گا کہ یہ ایک خوبصورت بیوی تھی، اس کی یتیم لڑکیاں تھیں، اس نے اپنی ساری خوبصورتی ان لڑکیوں کی تربیت کی بھینٹ چڑھادی، یہاں تک کہ لڑکیاں جوان ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کی قدردانی کی، اس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ (کنز العمال)

سب سے زیادہ آپ ﷺ نے جس بات کی تاکید فرمائی وہ بچوں کی تعلیم اور ان کی تربیت ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلام بچوں کی جبری تعلیم کا بھی قائل ہے تو بے جا نہ ہوگا؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے ہر مسلمان کے لیے تحصیل علم کو فرض قرار دیا ہے۔ (ابن ماجہ عن انسؓ) ظاہر ہے کہ فرائض میں ضرورت پڑنے پر جبر سے بھی کام لیا جاسکتا ہے، امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک عنوان کے تحت ثابت کیا ہے کہ پانچ سال کی عمر میں تعلیم کا آغاز ہونا چاہئے۔

(بخاری، باب الغتباط فی العلم و الحکمۃ)

''تعلیم'' میں دین کی تعلیم بھی داخل ہے کہ بقدرِ ضرورت علم دین حاصل کئے بغیر نہ انسان اپنی دُنیا کو بہتر بنا سکتا ہے اور نہ آخرت سنور سکتی ہے، اس لیے ایسے علم کا حصول بھی ضروری ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنی معاشی ضروریات کو پوری کر سکے اور ایک باعزت اور خود دار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اس کے لیے ممکن ہو، قرآن مجید نے اس کے لیے ایک جامع تعبیر اختیار کی ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ: ﴿قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:۶) بچوں کو دوزخ سے بچانے کے لیے دین کی تعلیم تو ضروری ہے ہی، طریقۂ معاش کی بھی تعلیم ضروری ہے، تاکہ وہ جائز طریقہ پر اپنی ضروریات کو پوری کر سکیں اور غیر سماجی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

بچوں کی تعلیم اسلام کی نگاہ میں کس درجہ اہم ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ گو اُصولی طور پر بالغ ہونے کے بعد بچوں کی کفالت باپ پر واجب نہیں، سوائے اس کے کہ وہ معذور ہو؛ لیکن اگر لڑکے حصولِ تعلیم میں مشغول ہوں اور والدین ان کے اخراجات ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، تو پھر ان کا نفقہ بھی واجب ہے، اسی طرح فقہاء نے طلبہ کے لیے زکوۃ کو جائز قرار دیا اور بعض اہل علم نے ان کو بھی قرآن مجید کے بیان کئے ہوئے زکوۃ ''فی سبیل اللہ'' کے زمرہ میں رکھا ہے۔

بچوں کی تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی ضروری ہے، تربیت ہی دراصل انسان کو انسان بناتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی شخص نے اپنی اولاد کو اچھے اخلاق و آداب سے بہتر عطیہ نہیں دیا۔ (ترمذی، باب ماجاء فی ادب الولد) ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے

بچوں کو تہذیب اور شائستگی سکھاؤ: ''أحسنوا أدبھم'' (ابن ماجہ۔ باب برالوالد الخ) آپ ﷺ واقعی انسانی نفسیات کے عارف اور رہبر انسان تھے اور ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں رہنمائی فرمایا کرتے تھے، چنانچہ ایک موقعہ پر نہایت جامعیت کے ساتھ آپ ﷺ نے بچوں کے ان حقوق کا ذکر فرمایا، جو والدین پر ہیں، ارشاد ہوا:

''ساتویں دن بچہ کا عقیقہ کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور نہلایا دھلایا جائے، تیرہ سال میں نماز وروزہ کے لیے سرزنش کی جائے، سولہ سال کی عمر میں باپ اس کی شادی کردے، پھر اس کا ہاتھ پکڑے اور کہے: میں نے تجھے اخلاق سکھادئے۔ (قد أدبتک) تعلیم دے دی اور تمہارا نکاح کردیا، میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، اس سے کہ تو دُنیا میں میرے لیے فتنہ کا یا آخرت میں عذاب کا باعث بنے'' (مسند احمد، ابن حبان عن انس)

آپ ﷺ نے اپنے اسوہ اور ارشادات کے ذریعہ ہمیں بچوں کی تعلیم وتربیت کے طریقوں سے بھی آگاہ فرمایا، اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ بچوں کے مزاج اور موقع و محل کو دیکھتے ہوئے کبھی نرمی کا اور کبھی سختی کا معاملہ کیا جائے، بے جا تشدد اور ہر وقت سخت گیری فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچاتی ہے: اس لیے اصل میں بچوں کے ساتھ شفقت مطلوب ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے کسی شخص کو بال بچوں میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ شفیق نہیں دیکھا۔ (مسلم) ایک بار حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بوسہ لے رہے ہیں، حضرت اقرع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں میں نے کبھی ان کا بوسہ نہیں لیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا'' آپ ﷺ کی شفقت ومحبت کچھ اپنے ہی بچوں کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ دوسرے کے بچوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ بہت ہی شفقت اور بے تکلفی کا معاملہ فرماتے، جب سفر میں جاتے یا سفر سے واپس تشریف لاتے تو مدینے سے جو بچے آپ ﷺ کو چھوڑنے یا آپ ﷺ کے استقبال کے لیے آگے تک جاتے، آپ ﷺ ان کو اپنی سواری پر آگے پیچھے بیٹھا لیتے، بچوں کے ساتھ

ہمیشہ بے احترامی اور حوصلہ شکنی کا رویہ بہتر نہیں، ان کے مزاج اور نفسیات کا لحاظ ضروری ہے۔

جہاں حد سے زیادہ سختی بچوں کی تربیت کے لیے مضر ہے، وہیں یہ بھی روا نہیں کہ جہاں تنبیہ اور ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہو، وہاں بھی اپنے آپ کو مہر بہ لب رکھا جائے، اس سے بچوں کی تربیت نہیں ہو پاتی اور ان میں بدتہذیبی کا رجحان بڑھتا جاتا ہے، بعض بچوں میں اپنی ہر ضد کو پورا کرنے کا مزاج بن جاتا ہے، یہ بات بچوں کے مستقبل کے لیے بہت ہی نقصان دہ ہے؛ اسی لیے آپ ﷺ نے حسبِ ضرورت بچوں کی تنبیہ کا بھی حکم دیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بچے دس سال کے ہو جائیں اور نماز پڑھنے میں کوتاہی کریں تو ان کی کسی قدر سرزنش بھی کی جائے۔ (ترمذی: ۱/۹۳) اسی لیے فقہاء نے والدین کو بال بچوں کی اور اساتذہ کو طلباء کی مناسب حد میں رہتے ہوئے تادیب اور سرزنش کی اجازت دی ہے۔

بچوں کے لیے دعاءِ خیر بھی ان کا ایک حق ہے، اپنے بچوں کے لیے بھی اور قوم کے بچوں کے لیے بھی؛ کیوں کہ دعاء بہر حال ایک اثر رکھتی ہے، قرآن مجید میں بعض انبیاء کی دعائیں ذکر کی گئی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ سے اولاد کی صالحیت اور حق پر استقامت کا ذکر آیا ہے، اس سلسلہ میں مشہور محدث اور صاحبِ دل امام عبداللہ بن مبارکؒ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں گانے بجانے اور عیش وعشرت میں مست رہتے تھے، یہاں تک کہ شراب بھی منہ سے لگ گئی تھی، آپ کے والدین کو اس پر بڑی کڑھن تھی اور دن رات رو رو کر اللہ سے دُعائیں کرتے تھے، اسی درمیان جب ایک دن عیش ونشاط کی بزم آراستہ تھی اور شراب کا دور چل رہا تھا کہ آپ کی آنکھ لگ گئی اور آپؒ نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوبصورت باغ ہے، جس میں ایک ٹہنی پر پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ اس آیت کو پڑھ رہا ہے۔

> ’’کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان
> کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق
> کے آگے جھکیں‘‘ (الحدید: ۱۶)

امام عبداللہ بن مبارکؒ بے چین ہو کر اٹھے، ان کی زبان پر تھا کہ ’’خدایا! وہ وقت آ گیا‘‘۔ پھر تو اسی وقت جام وسبو چکنا چور کر دئے، رنگین کپڑے اُتار پھینکے، غسل کیا اور خدا کے

حضور توبہ کی، یہاں تک کہ علم ومعرفت کے اُفق پر خورشید بن کر چمکے کہ شاید ہی کوئی محدث اور فقیہ ہو جس نے ان کی علمی عظمت اور فضل وتقوی کا اعتراف نہ کیا ہو، کہا جاتا ہے کہ یہ والدین کی دُعاء کا اثر تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ مشینی دور میں بچوں کو سرپرست اپنا وقت نہیں دے پاتے، جو بچوں کے لیے سب سے اہم ضرورت ہے، وہ باپ اور بزرگوں کی سچی محبت سے محروم ہیں اور بچوں کی تربیت کے پہلو پر بے توجہی عام ہے، کتابوں کی دکانوں پر ایسی کتابوں کی بھرمار ہے جس سے بچوں کے اخلاق بگڑتے ہیں؛ لیکن ایسا لٹریچر مقدار اور معیار کے اعتبار سے بہت کم ہے جو بچوں کی فطری اور اخلاقی تربیت کا سروسامان ہو، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ بھی بچوں میں تعمیری رجحان پیدا کرنے کے بجائے تخریبی اور غیر اخلاقی میلان پیدا کرنے کا کام کر رہے ہیں؛ اس لیے بچوں کا حق صرف یہ نہیں کہ ان کے لیے خورد ونوش کا انتظام کر دیا جائے، بلکہ ان کے لیے اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کو معلم اخلاق بنایا جائے اور لوگوں کو یہ بات سمجھائی جائے کہ بچوں کے لیے کمانا ہی سب کچھ نہیں، بلکہ بچوں پر اپنے وقت کا صرف کرنا بھی بنیادی اور اہم ہے، اور ان کو اس سے محروم رکھنا ان کے ساتھ ناانصافی اور حق تلفی ہے!!

(۱۳/نومبر ۱۹۹۸)

☆☆☆

تعلیم اور ہماری ذمہ داریاں

رسول اللہ ﷺ جس وقت دنیا میں تشریف لائے، یہ دنیا ہر طرح کی برائیوں کی آماجگاہ تھی، کوئی برائی نہ تھی جو عرب کے سماج میں نہ پائی جاتی ہو، لوگوں کی جان محفوظ تھی نہ مال اور نہ عزت و آبرو، بے حیائی کا یہ حال تھا کہ اور مواقع تو کجا، کعبہ کا طواف بھی بے لباس کرتے تھے، مرد بھی عورت بھی، ظلم و جور کی کوئی حد نہ تھی اور سماج کے تمام فیصلے ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول پر ہوا کرتے تھے، مذہبی پہلو سے دیکھئے، تو بدترین شرک تھا جس میں عرب گرفتار تھے اور عرب سے لے کر چین تک پوری مشرقی دنیا علانیہ شرک میں مبتلا تھی، سلطنتِ روم کا مذہب گو عیسائیت تھا، لیکن یہاں بھی توحید کے پردہ میں شرک ہی کی حکمرانی تھی اور ایک خدا کے بجائے تین افراد پر مشتمل خدا کا کنبہ تشکیل پا چکا تھا اور ان سب کی پرستش کی جاتی تھی۔

ان حالات میں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے اور جب عمر مبارک چالیس سال ہوئی تو نبوت کا تاج گہر بار سر مبارک پر رکھ دیا گیا۔ بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں جو پہلی وحی نازل ہوتی، وہ اصلاحِ عقیدہ کے پہلو سے توحید کے اثبات اور شرک کی رد میں ہوتی، یا انسانی نقطۂ نظر سے ایسی آیت ہوتی جس میں ظلم و جور سے منع کیا گیا ہو اور انسانی اخوت و ہمدردی اور محبت و مروت کی طرف دعوت دی گئی ہو، یا سماجی اصلاح سے متعلق کوئی آیت ہوتی، جس میں بے شرمی اور بے حیائی سے روکا گیا ہو۔

آپ ﷺ پر سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی، اس میں ان میں سے کسی بات کا تذکرہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ،
اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ، عَلَّمَ

الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ. (علق:۱۔۵)

''اپنے رب کے نام سے پڑھ جو سب کا خالق ہے، جس نے
آدمی کو جمے ہوئے لہو سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے،
جس نے قلم سے علم سکھایا، آدمی کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔''

یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تعلیم اور پڑھنے کی طرف متوجہ فرمایا: اس لئے کہ علم کی مثال روشنی کی سی ہے۔ اگر کسی تاریک کمرہ میں سانپ بھی ہو، بچھو بھی اور دوسرے تکلیف دہ کیڑے مکوڑے بھی، آپ ان سب کو مارنے اور بھگانے کے لئے الگ الگ محنت کریں، تو وقت بھی زیادہ لگے گا اور شاید کامیابی بھی نہ ہو، لیکن اگر آپ ایک چراغ جلا کر رکھ دیں، تو خود بخود یہ کیڑے مکوڑے اپنا بسیرا اٹھالیں گے، کیوں کہ تاریکی ہی ان کی پناہ گاہ ہے، یہی کیفیت انسانی سماج میں علم کی ہے، عقیدہ وعمل اور معاشرت واخلاق کی تمام برائیاں جہالت کا نتیجہ ہیں، جہالت کی تاریکی ہی میں یہ تمام مفاسد پرورش پاتے ہیں، تعلیم کی روشنی جتنی پھیلے گی، یہ بگاڑ بھی خود بہ خود دور ہوتا جائے گا، تعلیم کے بغیر سماج کی برائیوں کو دور کرنے کی مثال جڑوں کے بجائے ٹہنیوں اور پتوں پر پانی دینے کی ہے کہ اس سے وقتی فائدہ تو ہوسکتا ہے، لیکن کسی دیرپا تبدیلی کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔

اسی لئے تعلیم کی بڑی اہمیت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے صرف مذہبی تعلیم ہی کو اہمیت دی ہو، بلکہ اسلام نے علم کی تقسیم علم نافع اور علم غیر نافع سے کی ہے، جو علم انسان کو دینی یا دنیوی اعتبار سے نفع پہنچائے اور ان کے مسائل کو حل کرے وہ علم نافع ہے اور جو علم انسانیت کے لئے ہلاکت اور مضرت کا سامان ہو وہ علم غیر نافع ہے، رسول اللہ ﷺ علم نافع کے لئے دعا کیا کرتے تھے اور جو علم نافع نہ ہو، اس سے پناہ چاہتے تھے۔ اس اصول پر غور فرمایئے تو اکثر عصری علوم وفنون علم نافع کی فہرست میں آتے ہیں، طب انسانی جسم کے لئے نفع بخش ہے، انجینئرنگ انسانی ضروریات کی تکمیل میں مفید ہے، علم قانون میں انسان کی عزت وآبرو کی حفاظت ہے، ادب وصحافت کے ذریعہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام ہوتا ہے، جس پر سماج کی اخلاقی اور روحانی اقدار کا تحفظ موقوف ہے، تجارت اور معاشیات سے متعلق علوم کا

مقصد فرد اور سماج کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا اور اس کے صرف کے جائز اور مناسب مواقع کی رہنمائی کرنا ہے، جس کے مفید اور نافع ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ اس لئے یہ تمام علوم اسلام میں مطلوب ہیں اور ان کی حیثیت فرضِ کفایہ کی ہے۔

اسلام نے کبھی علم وتحقیق سے عداوت نہیں رکھی، بلکہ لوگوں کو کائنات کی مخفی حقیقتوں میں غور وفکر اور تدبّر کی دعوت دی اور حکمت ودانائی کی ہر بات کو مؤمن کی متاعِ گم گشتہ قرار دیا، علم کے اعتراف میں اپنے اور بےگانے کا فرق نہیں کیا، حضور ﷺ نے اُمیہ بن صلت کے اشعار کی تعریف فرمائی، جو زمانۂ جاہلیت کا شاعر تھا اور علم کی تحصیل میں بھی آپ ﷺ نے کبھی دوست اور دشمن کا فرق نہیں کیا۔ غزوۂ بدر میں جو لوگ قید ہو کر آئے، ان کے بارے میں آپ ﷺ نے یوں فرمایا کہ ان میں جو لوگ پڑھے لکھے ہوں، وہ دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں، یہی ان کا فدیۂ رہائی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ دشمن تھے نہ کہ دوست اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ مشرک تھے، علم دین تو ان سے حاصل ہو نہیں سکتا تھا۔ اگر آپ ان سے تعلیمی فدیہ وصول کرنے کے بجائے مالی فدیہ ہی وصول کرنے پر اصرار کرتے تو معاشی نقطۂ نظر سے اہلِ مدینہ کے لئے یہ مناسب ہوتا، کیوں کہ اس وقت مسلمان سخت غریب اور افلاس کی حالت میں تھے اور فاقہ کشی کے ساتھ گذر بسر عام تھی، لیکن آپ ﷺ نے ان حالات میں بھی تعلیم کو ترجیح دی۔ یہ گویا اس بات کا سبق ہے کہ تعلیم کا حاصل کرنا بہر حال ضروری ہے، چاہے اس کے لئے پیٹ کاٹنا پڑے، یا فاقے برداشت کرنے پڑیں، لیکن بچوں کی تعلیم کو کسی قیمت پر نظر انداز نہ کیا جائے۔

آج مسلمانوں کو یہی سمجھانے کی ضرورت ہے کہ وہ معمولی کھائیں، معمولی کپڑے پہنیں، عیش وعشرت کے دوسرے اسباب سے اپنے آپ کو بچائیں، معاشی تنگی کو گوارا کریں، لیکن ہر قیمت پر اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں، ہمارے سماج کا کوئی بچہ ایسا نہ ہو جو تعلیم سے محروم رہے۔ عام طور پر غریبوں کی مدد اور تعاون کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ وقتی طور پر کچھ پیسے دے دئے جائیں، کچھ کھانے پینے کی چیز مہیا کر دی جائے، عید کا موقع ہو تو کپڑے دئے جائیں، ہم اسی کو بڑی خدمت سمجھتے ہیں، حالاں کہ خدمت کا زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس کے لئے روزگار اور

معاشی سطح کو مستقل طور پر اونچا اٹھانے کی تدبیر ہو، جیسے کوئی دوکان لگا دی جائے، کہیں ملازمت دلا دی جائے۔ اس کی فضیلت زیادہ ہے اور رسول اللہ ﷺ سے ایسی تدابیر کا اختیار کرنا ثابت ہے۔ ایسی ہی تدابیر میں ایک یہ ہے کہ کوئی شخص اگر خود اپنے بچہ کو پڑھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو ان کے بچوں کو تعلیم دلا دی جائے۔ یہ صدقۂ جاریہ ہوگا اور اس بچہ کے ذریعہ خود اس کی، اس کے والدین کی اور خاندان وسماج کی جو کچھ خدمت ہوگی، یہ اس کے اجر میں شریک ہوگا۔ یہ انسانی خدمت کا سب سے اہم اور مفید طریقہ ہے۔ اگر کسی شخص کے دو بچے ہوں تو اس کو خیال کرنا چاہئے کہ گویا اس کے تین بچے ہیں اور وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ اپنی قوم کے ایک اور بچہ کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری قبول کر لے۔ یقیناً یہ بہت بڑی خدمت ہوگی اور اس طرح سماج کی بہت سی مشکلات حل ہوسکیں گی۔ جب تک پورا سماج نہ بڑھے اور پوری قوم ترقی نہ کرے، یقیناً ہماری ترقی ادھوری اور ناتمام ہوگی۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان بچوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پرائمری کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہے، بہت سے طلبہ ہائی اسکول کی سطح پر تعلیم ترک کر دیتے ہیں اور اعلیٰ فنی تعلیم میں تو ہمارے بہت ہی کم بچے پہنچ پاتے ہیں، یہ نہایت افسوس ناک بات ہے۔ ترکِ تعلیم کی وجہ کبھی معاشی ہوتی ہے، کبھی طالب علم کی پست ہمتی اور بہت سے گھروں میں والدین کی جہالت اور سرپرستوں کی ناواقفیت۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان رہنما اور اہلِ دانش نئے تعلیمی سال کے آغاز کے موقع پر گاؤں گاؤں اور شہر کے مختلف محلوں میں چند پڑھے لکھے رضا کاروں کی ایک کمیٹی بنائیں، جو سلسلۂ تعلیم منقطع کرنے والے بچوں اور ان کے سرپرستوں کے حالات کا جائزہ لیں، اگر طالب علم پست ہمتی کا شکار ہو رہا ہے تو اس کے لئے کچھ کوچنگ کا انتظام کریں اور ان کی ہمت بڑھائیں، اگر سرپرستوں کی غفلت اور ناسمجھی ہو تو ان کا شعور بیدار کریں اور جو مواقع گورنمنٹ کی طرف سے حاصل ہیں، ان کو ان سے استفادہ کی راہیں بتائیں اور جو بچے معاشی پسماندگی کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہو رہے ہوں، ان کی تعلیمی وسائل میں مدد کریں اور اہلِ خیر کو اس

جانب متوجہ کریں، کسی کو کتابوں کی ضرورت ہوتو کتاب دلا دیں، کسی کو اسکولوں کے داخلہ فیس کا مسئلہ ہوتو اس میں تعاون کردیں، اس طرح ہم تھوڑی سی کوشش اور فکر مندی کے ذریعہ بہت سے طلبہ کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ایک اہم مسئلہ زبان کا بھی ہے۔اسلام کسی زبان کا مخالف نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، خود آپ ﷺ کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کئی زبانیں سیکھیں اوران میں مہارت حاصل کی ،لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مضمون کی تعلیم کے لئے سب سے بہتر ذریعہ ''مادری زبان'' ہے،اجنبی زبان میں طالب علم کو دہری مصیبت پیش آتی ہے۔ایک زبان کو سمجھنے کی اور دوسرے،اس مضمون کو اپنے گرفت میں لانے کی ، مادری زبان ایک دشواری کو آسان کردیتی ہے اور طالب علم کو اپنا ذہن اس مضمون کے سمجھنے پر مرکوز رکھنے کا موقع ملتا ہے،اس لئے ہر سال اچھے رینک لانے والے اور مقابلاتی امتحان میں بہتر پوزیشن حاصل کرنے والے بچے وہ ہوتے ہیں، جو مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بناتے ہیں۔اس حقیقت کو تمام ماہرین تعلیم تسلیم کرتے ہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ مادری زبان کی اہمیت کی طرف خود قرآن مجید میں بھی اشارہ ملتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے ہر قوم میں اس قوم کی زبان میں پیغمبر بھیجا ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم:۴)

بدقسمتی سے مسلمان اردو زبان کے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہیں، جو لوگ اردو زبان کے تحفظ کی تحریک چلاتے ہیں، بلکہ اردو ہی کی روٹی کھاتے ہیں، وہ خود بھی اپنے بچوں کے لئے اردو ذریعہ تعلیم کو پسند نہیں کرتے ،اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اردو اقامتی اسکول قائم کرتی ہے،لیکن بچے دستیاب نہیں ہوتے ، یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے ہیں،لیکن طلبہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ وہ بند ہوجائیں۔ یہ نہایت تکلیف دہ صورتِ حال ہے اوراس سلسلہ میں قومی سطح پر شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ آہستہ آہستہ ہم سے ہماری زبان بھی چھن جائے گی۔

قوم سے صحیح محبت یہی ہے کہ ہم اپنی نسلوں کو تعلیم میں آگے

بڑھائیں اور جس شرمناک تعلیمی پسماندگی سے ہم دو چار ہیں، پوری قوم کو اس سے باہر نکالنے کی کوشش کریں، مسلم جماعتیں ایک لائحۂ عمل مرتب کریں اور ایک محدود مدت کا پروگرام بنائیں کہ ہم اس مدت میں مکمل طور پر ناخواندگی کو مٹا دیں گے اور ہمارے سماج کا کوئی لڑکا یا لڑکی ایسا نہ ہوگا جو تعلیم سے محروم ہو!

(۱۸؍ جون ۱۹۹۹ء)

☆☆☆

تعلیم کی تجارت

علم انسانیت کا سب سے بیش قیمت جوہر ہے، اور اسی سے انسان کی عزت وتکریم، کائنات کی تسخیر کی صلاحیت اور اس کی ساری سربلندیاں اور سرفرازیاں متعلق ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا کہ علم والے اور علم سے محروم برابر نہیں ہو سکتے، "**ھلیستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون**" چنانچہ مسلمانوں کے لئے علم کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے، افسوس کہ اسلام میں جس قدر حصول علم کی تاکید آئی ہے، دین سے دوری کی وجہ سے مسلمان اسی قدر تعلیم سے دور ہیں، اور آج جہالت اور لاعلمی مسلمانوں کی پہچان بن کر رہ گئی ہے۔

ان حالات کے پس منظر میں بحمد اللہ تعلیمی بیداری کے لئے مختلف تحریکات اٹھ رہی ہیں، اور اس میں شبہ نہیں کہ بحیثیت مجموعی ان تحریکات سے بڑے فوائد ہوئے ہیں اور اُمید ہے کہ مستقبل میں ان کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے، لیکن دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اکثر وبیشتر جن شخصیتوں، اداروں اور تنظیموں نے تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں، انہوں نے ان اداروں کو کمرشیل بنیاد پر قائم کیا ہے، اور وہ اسی حیثیت سے اسے چلا رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو اصحاب ثروت ہیں، اور جو دوسری درسگاہوں میں بھی منہ مانگی رقم دے کر تعلیم حاصل کر سکتے تھے، وہ تو ان تعلیم گاہوں سے استفادہ کر رہے ہیں؛ لیکن مسلمانوں کا غریب اور متوسط طبقہ جو مسلم آبادی کا پچاس فیصد یا شاید اس سے بھی زیادہ ہے وہ ان اداروں سے کسی قسم کا استفادہ کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔

کچھ فنی اعلیٰ تعلیمی ادارے تو ایسے ہیں جن میں بہت ہی قیمتی مشنریز کی ضرورت پڑتی ہے، یا ملازمین واساتذہ کو اعلیٰ تنخواہیں دینی پڑتی ہیں، ان میں تو ایک حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کافی اخراجات اس کے لئے مطلوب ہوتے ہیں، لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ پرائمری ادارے بھی اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ڈونیشن کے معاملہ میں وہ دوسروں سے پیچھے رہیں، نرسری اور کے جی، کے لئے بھی ہزار ہا رقم بطورِ ڈونیشن طلب کی جاتی ہیں، مسلمانو ں کے اقامتی اسکولوں کا حال یہ ہے کہ ایک بچہ کی ماہانہ فیس پانچ، چھ ہزار روپے لی جاتی ہے، حالانکہ ان کے کھانے پینے، رہائش اور تعلیم کا معیار معمولی ہی سا ہے، یہ بہت ہی تکلیف دہ صورتِ حال ہے، اس لئے بعض تعلیمی ادارے اور ان کے سربراہان جب مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ اپنے بچوں کو تعلیم دلائیے تو ان سے درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آپ اس اپیل میں کچھ اضافہ کیجئے، تاکہ واقعہ کے مطابق ہوجائے، اور یوں کہتے کہ ''اگر آپ مالدار ہیں، تو اپنے بچوں کو تعلیم دلائیے، اور غریب ہیں تو ہمارے اداروں کے قریب بھی مت پھٹکئے'' ! گویہ بات ہمارے بہت سے بھائیوں کو تلخ محسوس ہوگی، لیکن یہ حقیقت کی تلخی ہے، جسے ہمیں گھونٹنا چاہئے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم، صحت اور انصاف یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کی مفت فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے، لیکن بدقسمتی سے اس وقت یہی تینوں چیزیں سب سے زیادہ مہنگی ہیں، انصاف کا حال یہ ہے کہ غریب انسان تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے صبر کرنے میں ہی عافیت محسوس کرتا ہے، وکیل صاحب کی بیش مقدار فیس، پھر ہر پیشی پر مختلف عنوانات سے کچھ نہ کچھ وصول کرنا اور مقدمہ کو طول دینا، فریقِ مخالف کی طرف سے رشوت لینا اور اس رشوت کو روکنے کے لئے مؤکل کی جانب سے بار بار منھ بھرنا، پھر فیصلہ کے لئے عمر نوح علیہ السلام اور صبر ایوب علیہ السلام کی ضرورت، یہ ایسی سرگرانیاں ہیں، کہ شریف لوگ بالکل اضطرار و مجبوری ہی کے درجہ میں عدالت کے زینہ پر چڑھتے ہیں، اور اگر خدانخواستہ کسی معاملہ میں پولیس سے رجوع کرنا پڑا تو ''الامان و الحفیظ'' یہاں تو مال کے ساتھ جان اور عزت وآبرو کے بھی لالے پڑ جاتے ہیں۔

صحت کا معاملہ بھی اس سے چنداں مختلف نہیں، سرکاری دواخانوں کے بارے میں لوگوں کا تصور ہے کہ جس سخت جان کو جلدی موت نہ آتی ہو وہ یہاں آجائے کہ یہاں بہت کم وقت میں وہ ملک الموت کی ملاقات سے شرفیاب ہوسکتا ہے، اور اب یہی حال تعلیم کا ہے، سرکاری درسگاہوں میں عملہ کی فرض ناشناسی اور کوتاہ عملی کی وجہ سے لوگوں کو یقین ہوگیا ہے کہ یہاں اپنے بچوں کو داخل کرنا ان کی عمر اور وقت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے، اس لئے نجی اسکولوں میں تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے خود اعلی سرکاری عہدہ داران اور بلند قامت سیاسی رہنما بھی سرکاری اداروں سے پہلوتہی برتتے ہیں، جب اصحاب رُسوخ کا یہ حال ہے تو بے چارے عوام کیا کرسکتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ یا تو اپنے بچوں کو تعلیم دِلانے سے قاصر ہے، یا تعلیم میں تسلسل برقرار رکھنے سے عاجز۔

ان اداروں میں طلبہ وطالبات کے اولیاء سے کثیر رقم حاصل کرنے کی غرض سے مختلف حربے اپنائے جاتے ہیں، ہر سال دو سال پر نصاب تعلیم میں تبدیلی، ایسی کتابوں کو نصاب میں شامل کرنا جو بہت مہنگی، لیکن جن کی تعلیمی افادیت کتاب کے حجم کے لحاظ سے بہت محدود ہے، وقتاً فوقتاً یونیفارم کی تبدیلی، ماہانہ تعلیمی فیس کے علاوہ مختلف عنوان سے نئی نئی فیسوں کا عائد کرنا، یہ نہایت ہی تکلیف دہ صورتحال ہے، اور زبان حال سے لوگوں کو کہنا ہے ''کہ آپ اپنے بچوں کو اپنی اس غربت کے ساتھ تعلیم دلانے کا حوصلہ نہیں رکھیں، اس تعلیمی تجارت کا مستقبل کے اعتبار سے بھی بڑا نقصان ہے، علم کا اصل مقصود خدمت خلق ہے، نہ کہ صرف اپنی ذات کی خدمت، لیکن جو بچہ تین سال کی عمر سے لے کر چوبیس، پچیس سال کی عمر تک تجارت گاہوں سے علم کو خرید کرتا ہے اور گھر بار بیچ کر سودی قرض لے کر، تکلیفیں اور مشقتیں اٹھا کر اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر تعلیم کی قیمت فراہم کرتا ہے، کل ہوکر جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلے گا ڈاکٹر یا انجینیر بنے گا، قانون داں، یا صحافی بنے گا اور منتظم یا استاذ بنے گا تو وہ اپنے آپ کو ایک ایسا شخص محسوس کرے گا جس نے بہت مہنگی قیمت میں اپنے فن کا سودا خرید کیا ہے، اور اسے جلد سے جلد بھرپور قیمت لے کر اس سودے کو نئے گاہک کے ہاتھ فروخت کرنا ہے، وہ ایک خرید وفروخت کرنے والا ایک تاجر ہے، وہ ایک بنیا ہے نہ کہ قوم وملک کا خادم، وہ سوداگر ہے نہ کہ انسانیت کا

غمخوار و رہبر، وہ پیسہ کمانے والی مشین ہے، نہ کہ انسان کے غم میں گھلنے والا انسان، وہ خوب کمانے کے لئے پیدا ہوا ہے نہ کہ انسانیت کو فائدہ پہونچانے کے لئے، اس کے نزدیک دل سے زیادہ قیمت پیٹ کی اور انسانی محبت سے زیادہ قیمت بے جان سکوں کی ہوگی، ایسا ہونا ایک فطری بات ہے اور آج اس کا شب و روز مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، ایک غریب مریض چاہے اپنی جان توڑ دے اور ڈاکٹر کا ایک معمولی نشتر بظاہر اسے بچاسکتا ہے، لیکن کیا مجال کہ ڈاکٹر اپنے سینہ پر اس مریض کے درد کی کوئی چوٹ محسوس کرے، ایک مظلوم و ستم رسیدہ چاہے انصاف کے حاصل کرنے سے محروم رہ جائے لیکن ممکن نہیں کہ قانون داں اپنے سینہ میں اس کے لئے جذبۂ رحم کی کوئی رمق پائے، اس اخلاقی انحطاط، بے مروتی، انسانیت سوزی، دردِ دل سے محرومی اور رشتہ انسانیت سے مہجوری کا بڑا سبب ہمارا یہ تعلیمی نظام ہے، اس لئے تعلیم کا تجارت بن جانا صرف افراد کا نقصان نہیں، بلکہ پوری قوم کا نقصان ہے، اور اس سے صرف معاشی مسئلہ متعلق نہیں، بلکہ اخلاقی و انسانی مسائل بھی اس سے متعلق ہیں۔

بنیادی طور پر تعلیم تین مقاصد کے لئے حاصل کی جاسکتی ہے، کسبِ معاش، یعنی خالص مادی مقصد کے لئے، فلاح معاد یعنی آخرت کی کامیابی اور خالص روحانی مقصد کے لئے، خدمت خلق یعنی انسانی بھلائی کے لئے، اسلام کی نگاہ میں تعلیم کا اصل مقصد روحانی ترقی اور انسانی خدمت ہے، کسبِ معاش تعلیم کا اصل مقصود نہیں، بلکہ ضرورت کے درجہ میں اس کی گنجائش ہے، اسی لئے اسلامی تاریخ میں جو مشہور علماء اور سائنسداں گذرے ہیں، ان کا حال یہ تھا کہ وہ نہ صرف مفت تعلیم دیتے تھے، بلکہ اپنے طلبہ کی ضروریات بھی خود پوری کرتے تھے، انہیں اپنے طلبہ سے اولاد سے بڑھ کر محبت ہوتی تھی، اور چوں کہ تعلیم و تعلم کا یہ رشتہ بے غرضی پر مبنی ہوتا تھا، اس لئے طلباء کو اپنے اساتذہ سے ماں، باپ سے بھی بڑھ کر محبت ہوا کرتی تھی، ان کا تعلق اپنے اساتذہ سے روح و قلب کا ہوتا تھا، نہ کہ پیسوں کا، اسی لئے رسول اللہ نے کلمہ خیر سکھانے اور تعلیم دینے کو صدقہ قرار دیا ہے، صدقہ وہ مال ہے جو محض اجر و ثواب کے لئے دیا جائے جس پر نہ ستائش کی تمنا ہو اور نہ صلہ کی آرزو، ایسا بھی ہوا ہے کہ اساتذہ نے فاقوں پر فاقے کئے ہیں، لیکن طلبہ کی طرف سے ایک وقت کا کھانا بھی گوارہ نہیں کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے طویل ترین عہدِ حکومت میں مفت تعلیم کا نظم رہا، یہی کیفیت انگریزوں کے عہد میں تھی، جن کے ظلم و جبر کی داستانیں بیان کرتے ہماری زبانیں نہیں تھکتی ہیں، آج بھی مغربی ممالک میں ضروری حد تک تعلیم کا مفت اور موثر نظام موجود ہے اور بہت سے ممالک میں تو اعلیٰ ترین تعلیم کے اخراجات بھی حکومت ادا کرتی ہے، لیکن یہ بد قسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں گورنمنٹ تو ٹیکس اتنے ہی حاصل کرتی ہے، جتنے ان ممالک میں حاصل کئے جاتے ہیں، لیکن نہ حکومت کی طرف سے تعلیم کا معقول انتظام ہے، نہ مریضوں کا کوئی پرسان حال، نہ بے روزگاروں کے لئے کوئی وظیفہ، نہ بے سہارا لوگوں کے لئے کوئی تنخواہ، خیر حکومت کی اہلیت و نااہلی کے بارے میں تو وہ جوابدہ ہے؛ لیکن ہم مسلمانوں کے لئے یہ بات سوچنے کی ہے کہ کیا ہم محض ایک معاشی حیوان ہیں، کیا ہم صرف اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور امت کا ہم پر کوئی حق نہیں، ہماری تعلیم گاہیں قوم کے تعمیری مراکز ہیں، یا بنیوں کی دکانیں؟

تجارت میں بھی نفع کا ایک تناسب ہوتا ہے، ایک دو فیصد سے بیس پچیس فیصد تک نفع پر مختلف تجارتیں کی جاتی ہیں، لیکن علم کی یہ تجارت گاہیں ایسی ہیں کہ جن میں ڈیڑھ سو دو سو فیصد نفع کمانے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ اتنا بڑا قومی المیہ ہے کہ اس پر جس قدر رویا جائے کم ہے، ان تعلیم گاہوں کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ دینی مدارس کے نظام کو دیکھیں، جو مسلمانوں کے بہت ہی معمولی تعاون سے چلتے ہیں، جو ان لوگوں تک علم کی روشنی پہونچاتے ہیں جہاں چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لَو بھی موجود نہیں، جہاں اساتذہ جذبۂ دین سے سرشار ہو کر بہت ہی معمولی تنخواہوں پر علم کی خدمت کر رہے ہیں، مدرسہ کی جانب سے جو اوقاتِ تعلیم مقرر ہوتے ہیں وہ خود اپنی طرف سے اس سے زیادہ وقت تعلیم و تربیت میں خرچ کرتے ہیں، اور جو کام ان کے ذمہ نہیں ہوتا کسی کے کہے بغیر خالصۃ لوجہ اللہ بوقت ضرورت اسے انجام دیتے ہیں، اور فی طالب علم اتنے کم اخراجات میں ان کے قیام و طعام اور ضروریات کا مناسب انتظام کرتے ہیں، جو ان کی خوش انتظامی اور خوش سلیقگی کا بہترین نمونہ ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مدارس کے خطوط پر اقامتی عصری درسگاہیں قائم کی جائیں اور کوشش کی جائے کہ ان کے نقش

قدم پر چلتے ہوئے کفایتی فیس مقرر کی جائے جو متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے قابل برداشت ہو، اور تعلیم کو تجارت بنانے کا مزاج ہم اپنی قوم میں نہ بنائیں، اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو نئی نسل کا بہت بڑا طبقہ تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے اور جہالت و ناخواندگی کا جو داغ اس امت کے دامن پر آج لگا ہوا ہے، اور جس کی شہرت اوراپنوں اور بے گانوں کی زبان سے جس کا تذکرہ ہر غیرت مند مسلمان کو بے چین کر کے رکھ دیتا ہے، اس شرم ساری سے پوری قوم کو نجات ملے، ہم تجارت ضرور کریں لیکن تعلیم و اخلاق کی نہیں، کیوں کہ یہ انسانیت اور اسلامی اخوت کے مغائر ہے!

(۶ر جولائی ۲۰۰۱ء)

☆☆☆

مخلوط تعلیم —— ایک جائزہ

آج کل تعلیم نے بھی چونکہ بزنس اور تجارت کی صورت اختیار کر لی ہے، اس لئے جب اسکولوں میں داخلہ کا وقت آتا ہے تو خالص تاجرانہ انداز پر داخلہ کے لئے تشہیر کی جاتی ہے، بڑے بلند بانگ دعوے کئے جاتے ہیں، اور سرپرستوں کو لبھانے کے لئے طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، انگریزی زبان اور بول چال کی صلاحیت، عصری وسائل کی فراہمی، باصلاحیت اساتذہ، کمپیوٹر اور نہ جانے کن کن باتوں کے حوالے دئے جاتے ہیں، ان ہی ترغیبات میں ایک Co-Education (مخلوط تعلیم) کا تذکرہ گویا مخلوط تعلیم بھی ایک قابلِ تعریف اور باعثِ ترجیح امر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی اور سماجی نقطۂ نظر سے بھی یہ بیمار ذہنیت اور کھوٹی فکر کا نمونہ ہے، بُرائی کے غلبہ کی انتہاء یہ ہے کہ بُرائی ندامت وشرمندگی کا سبب اور معذرت خواہی کا باعث بننے کے بجائے وجہ افتخار اور باعثِ اعزاز بن جائے۔

یہ بات بہت سنجیدگی سے سوچنے کی ہے، کہ تعلیم کا مخلوط نظام کس حد تک قابلِ قبول ہے؟ مخلوط تعلیم کے مسئلہ میں دو پہلو قابلِ توجہ ہیں، اوّل یہ کہ کیا لڑکوں اور لڑکیوں کا نصابِ تعلیم ایک ہی ہونا چاہئے یا جُداگانہ؟ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک ساتھ ہونی چاہئے، یا الگ الگ؟۔ جہاں تک نصاب تعلیم کی بات ہے تو کچھ اُمور ضرور ایسے ہیں جو دونوں کے درمیان مشترک ہیں، اور ان کا نصاب لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں ہوسکتا ہے، جیسے زبان وادب، تاریخ، جنرل نالج، جغرافیہ، ریاضی، جنرل سائنس، اور سوشل سائنس وغیرہ، لیکن کچھ

مضامین اور تعلیمی میدان ایسے ضرور ہیں جن میں لڑکے اور لڑکیوں میں فرق کرنا ہوگا، مثلاً انجینئرنگ کے بہت سے شعبے، عسکری تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم کی یقیناً لڑکیوں کو ضرورت نہیں، میڈیکل تعلیم میں ایک اچھا خاصا حصہ خاص خواتین سے متعلق ہے، اوراس لئے زمانۂ قدیم ہی سے ''امراض نسواں'' طبّ کا مستقل موضوع رہا ہے، یہ لڑکیوں کے لئے نہایت اہم ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم میں اُمورِ خانہ داری کی تربیت ضرور شامل ہونی چاہئے، سلائی، کڑھائی، پکوان، بچوں کی پرورش کے اصول اوراس طرح کے مضامین ضرور شریک ہونے چاہئیں، اس سے نہ صرف گھریلو زندگی میں لڑکیاں زیادہ بہتر رول ادا کرسکتی ہیں، بلکہ ازدواجی زندگی کی خوشگواری، خاندان میں ہردلعزیزی، اور مشکل اور غیر متوقع حالات میں آپ اپنی کفالت کے لئے یہ آج بھی بہترین وسائل ہیں، اس کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے لئے ان کے حسبِ حال آداب معاشرت کی تعلیم نہایت اہم ہے، کیوں کہ ایک لڑکی اگر بہتر بیوی اور بہتر ماں نہ بن سکے تو سماج کو اس سے کوئی فائدہ نہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے مردوں سے علاحدہ خواتین کی تعلیم وتذکیر کے لئے ہفتہ میں ایک دن مستقل طور پر متعین فرمادیا تھا، جس میں خواتین جمع ہوتیں، اور آپ ﷺ ان کو ان کے حسبِ حال نصیحتیں فرماتے، اور ہدایات دیتے (بخاری: کتاب العلم، حدیث نمبر ۱۰۱) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خواتین کی دل بہلائی کے لئے بہترین مشغلہ دھاگے کاتنا ہے (کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۰۶۱۱، باب اللھو واللعب والغنی) کیوں کہ اس زمانہ میں دھاگے کاتنا ایک گھریلو صنعت تھی، اور آج سے پچاس سال پہلے تک بھی بہت سے گھرانوں کا اسی پر گذران تھا۔

غور کیجئے کہ جب قدرت نے مردوں اور عورتوں میں تخلیقی اعتبار سے فرق رکھا ہے، اعضاء کی ساخت میں فرق، رنگ و روپ میں فرق، جسمانی قُویٰ میں فرق، مزاج و مذاق میں فرق اور پسند و ناپسند میں فرق، پھر قدرتی طور پر افزائش نسل اور اولاد کی تربیت میں دونوں کے کردار مختلف، تو کیوں کر ممکن ہے کہ سماج میں دونوں کے فرائض اور ذمہ داریاں الگ الگ نہ ہوں، اور جب ذمہ داریاں علاحدہ ہیں، تو ضرور ہے کہ اسی نسبت سے دونوں کے تعلیمی اور تربیتی نصاب اور مضامین میں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں، اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا

جائے تو یہ کسی بھی معاشرہ کے لئے نہایت ہی مہلک اور مضرت رساں ہے، علامہ اقبال نے خوب کہا ہے :

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے عِلم و ہنر موت

خواتین کو بھی چاہئے کہ وہ تعلیم کے لئے وہ میدان تلاش کریں جو سماج میں ان کے کردار سے مطابقت رکھتا ہے، اور تعلیم کے وہ شعبے جوان کے لئے موزوں نہیں، ان میں ان کا داخل ہونا بے سود ہے اور آئندہ اس شعبہ میں ملازمت سماج کے لئے اور خود ان کے لئے مہلک اور نقصان دہ، اس لئے قرآن مجید نے ایک اصول بتا دیا ہے کہ مرد اور عورت اپنے اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے جدوجہد کریں، اپنے دائرہ سے ہٹ کر دوسرے کے دائرہ عمل میں قدم رکھنے کی کوشش نہ کریں، ارشاد ہے :

﴿ وَلَاتَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ، لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ وَ اسْئَلُوْا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَئٍي عَلِيْمًا ﴾ (النساء : ۳۲)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر جو فضیلت عطا کی ہے، اس کے بارے میں رشک میں مبتلا نہ ہو، مردوں کے لئے ان کے اعمال میں حصہ ہے، اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال میں، اور اللہ تعالیٰ سے اسی کا فضل وکرم مانگتے رہو، بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہیں۔

یہ آیت دراصل معاشرتی زندگی کے آداب کے سلسلے میں آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے، کہ قدرت نے سماج کو اختلاف اور رنگارنگی پر پیدا کیا ہے، کسی بات میں مردوں کو

فوقیت حاصل ہے تو کسی معاملہ میں وہ عورتوں کا محتاج اور دست نگر ہے، قدرت نے جس کو جو کام سپرد کیا ہے، اس کے لئے وہی موزوں ہے، کیوں کہ خالق سے بڑھ کر کوئی مخلوق کی فطرت وصلاحیت اور ضرورت سے واقف نہیں ہوسکتا، یہ مغرب کی خود غرضی اور بے رحمی ہے کہ اس نے عورتوں سے ''حق مادری'' بھی وصول کیا، اور ''فرائض پدری'' میں بھی اس کو شریک ہونے پر مجبور کیا۔ اور چونکہ مرد اپنی ذمہ داری کا بوجھ بھی اس کے کاندھوں پر رکھنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے ایسا نظامِ تعلیم وضع کیا، جس میں عورتوں کو مرد بنانے کی صلاحیت ہو پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا، کہ تین افراد وہ ہیں جو جنت میں کبھی داخل نہ ہوں گے، ان تین میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اَلرَّجِلَۃُ مِنَ النِّسَاءِ (مجمع الزوائد: ۴/۳۲۷) یعنی ''عورتوں میں سے مرد'' دریافت کیا گیا، عورتوں میں مرد سے کون لوگ مراد ہیں؟ فرمایا: وہ عورتیں جو مردوں کی مماثلت اختیار کریں، والمتشبھات من النساء بالرجال (بخاری، حدیث نمبر: ۵۸۸۵) غالباً جو عورتیں تعلیم وتربیت اور پھر اس کے بعد عملی زندگی میں مردوں کی صف میں کھڑا ہونا چاہتی ہیں وہ اسی حدیث کا مصداق ہیں۔

مخلوط تعلیم کا دوسرا پہلو لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترک درس گاہ اور مشترک تعلیم ہے، ابتدائی عمر جس میں صنفی جذبات سے بچے عاری ہوتے ہیں، اور ان میں ایسے احساسات نہیں پیدا ہوتے، مخلوط تعلیم کی گنجائش ہے، آٹھ، نو سال کی عمر اور پرائمری کی سطح تک مشترک تعلیمی نظام رکھا جاسکتا ہے، اسی لئے اسلام نے بے شعور بچوں کو غیر محرم عورتوں کے پاس آنے جانے کی اجازت دی ہے، اور قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے (النور: ۵۸) لیکن جب بچوں میں جنسی شعور بیدار ہونے لگے اور ایک حد تک صنفی جذبات کی پہچان پیدا ہو جائے، تو ایک ساتھ ان کی تعلیم آگ اور بارود کو ایک جگہ جمع کرنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح اور بے غبار ہے کہ ایک مرد کا غیر محرم عورت پر نظر ڈالنا کسی طرح روا نہیں، حج کے ایام ہیں، **فضل بن عباس** رضی اللہ عنہ **رسول اللہ** ﷺ **کے ساتھ اونٹنی پر سوار ہیں، قبیلۂ بنو خثعم کی ایک لڑکی ایک شرعی مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حضرت کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور فضل بن عباس کی نظر ایک لمحہ اس لڑکی پر جم جاتی ہے، آپ** ﷺ **نے**

فوراً حضرت فضل بن عباس ﷺ کا چہرہ موڑ دیا، جب حج کے پاکیزہ ماحول اور رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہؓ وصحابیات کے بارے میں بھی آپ ﷺ نے یہ احتیاط برتی تو اوروں کا کیا ذکر؟ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نگاہ شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے، کیوں کہ اصل میں ساری بُرائیوں کی جڑ یہی بدنگاہی ہے، نگاہ ہی سے سارے فتنے جاگتے ہیں، جب بار بار نگاہیں چار ہوتی ہیں، تو جرأت بڑھتی ہے، زبان کو گفتگو کا حوصلہ ہوتا ہے، پھر دست ہوس آگے بڑھتا ہے، ملاقاتیں ہوتی ہیں، اور آخر شرم وحیا کے سارے ہی حجابات اُٹھ جاتے ہیں، اس لئے نظر کی فتنہ سامانی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، بالخصوص ایسی صورت میں کہ چست اور دیدہ زیب یونیفارم ہوں اور نہ صرف چہرہ ورخسار بلکہ بے لباس ٹانگیں بھی نگاہ ہوس کو دعوت نظارہ دیتی ہوں۔

مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے تو شاید ہی کوئی سلیم الفطرت انسان اس بات سے انکار کر سکے کہ یہ اختلاط اخلاق کے لئے تباہ کن ہیں، لیکن علاوہ اس کے تعلیمی اور انتظامی لحاظ سے بھی اس کی مضرت دن ورات سامنے آتی ہیں، چھیڑ چھاڑ اور فقرہ بازی اب ایسی درس گاہوں کی معمولات میں ہیں، اس سے درس گاہ کا ماحول بے وقار اور غیر مامون ہوجاتا ہے، ستم ظریفی یہ ہے کہ "طلبۂ عزیز" کے ساتھ ساتھ بعض اوقات "اساتذۂ گرامی قدر" بھی اس حمام میں اُتر جاتے ہیں، اور پھر پولیس کیس بھی بنتا ہے، اغواء کے واقعات بھی پیش آتے ہیں، وقتی محبت میں فرار اور بعد میں ندامت کی خبریں اخبارات کی زینت بنتی ہیں، اور کتنی ہی ناگفتنی پیش آتی ہے۔

یہ مخلوط تعلیم کا انتظامی پہلو ہے، اب خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھئے، تعلیم دراصل دو باتوں کا نام ہے، جس مضمون کا درس ہورہا ہے، اسے پوری طرح سمجھنا اور ذہن کی گرفت میں لانا، دوسرے اس مضمون کو اپنے حافظہ اور یادداشت میں محفوظ رکھنا، ان دونوں باتوں کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم پوری طرح اپنے مقصد میں منہمک اور یکسو ہو، اور یکسوئی کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ جو پڑھ رہا ہے یا سُن رہا ہے اس کی طرف پوری توجہ، دوسرے ہر طرح کے خوف وخطر اور اندیشوں سے اس کے ذہن ودماغ کا محفوظ اور مامون

ہونا، اب اوّل تو بہ تقاضۂ سن و سال یہ مخلوط بیٹھک لڑکوں اور لڑکیوں کی توجہ کو منتشر کرتی رہتی ہے، دوسرے شریف لڑکیاں اوباش لڑکوں کی طرف سے ایک طرح کے اندیشہ سے دوچار رہتی ہیں، اور سہمی سہمی درس گاہ میں اپنا وقت گذارتی ہیں، ایسے ماحول میں تعلیم و تعلم کا کام پوری یکسوئی، توجہ اور انہماک کے ساتھ کیوں کر انجام پاسکتا ہے؟؟ کیوں کہ :

رُسوا کیا اس دَور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے ہوس آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہوجاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

میرا خیال ہے کہ اگر کوئی ادارہ یا شخص ان طلبہ و طالبات کا سروے کرے جو جداگانہ نظام میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، اور ان کا جو مخلوط درس گاہوں میں زیرِ تعلیم رہے ہیں، تو غالباً تعلیمی اعتبار سے وہ لڑکے اور لڑکیاں زیادہ کامیاب ہوں گے جنھوں نے پہلی قسم کی درس گاہوں میں تعلیم پائی ہے۔ اگر ہم نے موجودہ حالات میں جب کہ ٹی، وی نے معاشرہ کو بگاڑنے کے لئے صور قیامت پھونک رکھا ہے، اور بیرونی کمپنیوں کی آمد نے رہی سہی کسر پوری کردی ہے، اور ایک زبردست یلغار ہے جو مشرقی تہذیب و ثقافت پر پوری قوت سے جاری و ساری ہے، جداگانہ نظامِ تعلیم نہ اختیار کریں، لڑکیوں کے لئے علاحدہ اسکول کا صحیح اور اعلیٰ فنی تعلیم کے ادارے قائم نہ کریں اور ان کے حسبِ حال نصاب نہ مقرر کریں، تو ہمارے لئے اپنی سماجی اور مذہبی قدروں کا تحفظ ممکن نہ ہوگا۔ اور مغرب کی غیر سنجیدہ نقالی ہمیں کہیں کا نہ رکھے گی۔

(۱۴ر جولائی ۲۰۰۰ء)

☆☆☆

ریگنگ
مذہب اور اخلاق کی میزان میں

جون کا مہینہ آیا، گرمی نے رخت سفر باندھا اور دہکتی ہوئی فضاء پر ہر سو اَبر رحمت چھا گیا، نئے موسم کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں میں بھی نئی بہار آئی، پوسٹروں، ورقیوں اور اخبارات کے ذریعہ ہر طرف تعلیم گاہوں کے تعارف اور اس میں داخلہ کی ترغیب کا سلسلہ جاری ہے، بازار میں طلبہ اور طالبات کے نئے نئے خوبصورت اور دیدہ زیب یونیفارم اور بھاری بھرکم کتابوں کے بستوں کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے، جن کتب خانوں پر کوئی بھول کر پھٹکتا بھی نہیں تھا، وہیں اب نصابی کتابیں خریدنے والوں کی قطار در قطار لگی ہوئی ہے، ماں باپ اُمیدوں اور آرزوؤں کے حسین خواب سجا کر اپنے بچوں کو داخل کر رہے ہیں اور معصوم بچے نئی کتابوں، کاپیوں، دوستوں اور سہیلیوں کو پاکر شاداں وفرحاں ہیں۔

اس خوش منظر اور دلفریب موسم میں ایک ہی چیز ہے جو حساس دلوں میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے اور وہ ہے اعلیٰ تعلیم کے مراکز، یونیورسیٹیوں اور کالجوں میں ریگنگ (Ragging) کا رواج، نئے طلبہ کے ساتھ قدیم طلبہ کا یہ وہ رویہ ہے جو بہت سے لڑکوں کو کالج چھوڑنے بلکہ تعلیم سے محروم ہونے پر مجبور کر دیتا ہے، اخبارات میں ایسے واقعات بھی آچکے ہیں کہ بعض طلبہ وطالبات کو بے لباس تک کر دیا گیا اور ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے اپنی تذلیل وتحقیر کے صدمہ سے دوچار ہو کر خودکشی کر لی، ایک تو یہ بجائے خود انتہائی غیر اخلاقی وغیر انسانی سلوک ہے، اور خاص طور پر تعلیم گاہوں اور دانش گاہوں میں ایسے واقعات کا پیش آنا مزید قابل افسوس ہے کہ جہاں سے پوری قوم اور پورے ملک کو اخلاق ومروت کی روشنی ملنی

چاہیے، خود وہیں ایسی تہہ در تہہ تاریکی ہو۔ ﴿ظلمات بعضها فوق بعض﴾

اسلام اس طرح کے عمل کو نہایت مذموم سمجھتا ہے، آپ ﷺ نے ہر آنے والے کا گرم جوشی اور محبت آمیز استقبال کرنے اور ان کے ساتھ احترام وتوقیر کا معاملہ کرنے کا حکم دیا، اسی لیے آپ ﷺ نے ملاقات کرتے ہوئے ایک دوسرے کو سلام کرنے اور سلام کا جواب دینے کا حکم دیا، ''سلام'' نہایت جامع اور بامعنی دعاء ہے، جس میں انسان مخاطب کو ہر طرح کی تکلیف سے سلامت و عافیت اور رحمت و برکت کی دعاء دیتا ہے، سلام کا منشأ ہی یہ ہے کہ مخاطب انسان سے مانوس ہو اور وہ سمجھے کہ وہ اپنے خیر خواہوں اور مخلصوں کے درمیان ہے، اس کو ماحول سے وحشت اور گھبراہٹ نہ ہو، اسے اپنائیت کا احساس ہو نہ کہ بیگانگی کا۔

آپ ﷺ آنے والوں کا بہت ہی پرتپاک خیر مقدم فرماتے تھے، ایک وفد خدمت اقدس میں حاضر ہوا، تو آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے استقبال فرمایا: ''مرحبا غير خزايا و لا ندامى '' (بخاری: ۱/۱۹) یعنی: ''تمہارا آنا مبارک، تمہارے لیے خوش آمدید، نہ تمہارے لیے ذلت ورسوائی ہے اور نہ ندامت وپشیمانی'' عربی زبان میں ''مرحب'' کے اصل معنی کشادہ جگہ کے ہیں، عربی زبان کے اس لفظ کے ذریعہ مہمانوں سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری آمد بارِ خاطر نہیں، تمہارے لیے دل میں بھی اور مکان میں بھی خوب وسعت ہے، حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے موقعہ سے اسلام قبول کیا، جب آپ ﷺ کے پاس آئے، تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا، اور ''مرحبا'' کے لفظ سے ان کو خوش آمدید کہا، حالاں کہ عکرمہ رضی اللہ عنہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بدترین دشمن رہ چکے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ بن حصن آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے، اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس تھے اور تینوں یوں ہی زمین پر بیٹھے تھے، آپ ﷺ نے حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ کے لیے قالین منگوائی اور اس پر ان کو بٹھایا۔ (مجمع الزوائد: ۸/۱۶) حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے حجرۂ مبارکہ میں بہت ازدحام تھا، جریر رضی اللہ عنہ دروازہ ہی پر بیٹھ گئے، آپ ﷺ نے دائیں بائیں دیکھا، جب کوئی جگہ نظر نہیں آئی تو اپنی رداءِ مبارک لپیٹ کر حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی طرف پھینکی اور

فرمایا کہ اسی پر بیٹھ جاؤ، جریر ﷺ نے چادر لی، اپنے سینہ سے لگایا، بوسہ دیا، پھر حضور ﷺ کو واپس کردی، احتراما اس پر بیٹھنا گوارا نہیں کیا اور عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! جیسے آپ ﷺ نے میری عزت کی ہے، اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو بھی عزت عطا فرمائے ''أکرمك الله کما أکرمتنی'' (مجمع الزوائد: ۸/۱۵)

آپ ﷺ کا یہ سلوک اچھے اور نیک لوگوں ہی کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ بدخلق لوگوں کے ساتھ بھی آپ ﷺ خوش اخلاقی ہی کا رویہ اختیار کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ایک صاحب نے حضور ﷺ سے حاضری کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص اچھا آدمی نہیں ہے، پھر ملاقات کی اجازت مرحمت فرمائی، جب وہ آئے تو آپ ﷺ نے ان سے بہت ہی نرم خوئی کے ساتھ گفتگو فرمائی، جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ آپ ﷺ نے ان کے بارے میں ایسی بات کہی، لیکن گفتگو بہت نرمی کے ساتھ کی، تو ارشاد فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے جس کو لوگ اس کی بدکلامی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔ (ترمذی: ۲/۲۰) ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگوں کے قافلے بھی آئیں گے جن کو تم ناپسند کرتے ہوگے، لیکن پھر بھی جب وہ آئیں تو ان کو خوش آمدید کہنا۔ (مجمع الزوائد: ۸/۱۷)

اسی لیے اسلام میں مہمان نوازی کی بڑی اہمیت ہے، مسلمان ہو یا غیر مسلم، جانا پہچانا ہو یا اَن پہچان، معروف آدمی ہو یا غیر معروف، بحیثیت مہمان ہر آنے والے کا احترام مسلمان کا فریضہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ اپنے مہمان کے ساتھ اکرام سے پیش آئے۔ (بخاری: ۲/۹۰۶) نئے طلبہ کی حیثیت دراصل قدیم طلبہ کے لیے مہمان کی ہے، درس گاہ کی نئی فضا ان کے لیئے نامانوس اور نئے چہرے ان کے لیے اجنبی ہیں، اس لیے ہونا یہ چاہئے کہ ان کے ساتھ نسبتاً زیادہ حسن سلوک اور خوش اخلاقی کو روا رکھا جائے، ان کا تعاون کیا جائے اور ان کی دلداری کا خیال رکھا جائے، تا کہ وہ اس ماحول سے متوحش نہ ہوں اور گھبرا نہ جائیں، نہ یہ کہ خاص طور پر ایسے سروسامان کئے جائیں جو نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں ان کے لیے رکاوٹ و دشواری کا باعث بن جائے۔

کسی بھی ماحول میں جو لوگ پہلے سے ہوں اور ''سینئر'' کہلاتے ہوں، ان کے لیے نئے واردین ''جونیئر'' کی نسبت سے شفقت ومحبت اور نصح وہمدردی کا رویہ رکھنا ضروری ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو بڑے کا احترام نہ کرے، اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ نہ رکھے اور علماء کا مرتبہ شناس نہ ہو، وہ میری اُمت میں سے نہیں ہے۔ (مجمع الزوائد: ۱۴/۸) جب بڑے چھوٹوں کے ساتھ محبت، خیر خواہی اور شفقت کا معاملہ کریں گے، تب ہی وہ چھوٹوں کے دل میں اپنا گھر بنا سکیں گے اور احترام کیے جائیں گے۔

مزاح کی ایک حد تک ضرور اسلام میں گنجائش ہے، بعض مواقع پر آپ ﷺ نے لطیف مزاح فرمایا اور اسی لیے حدیث وسیرت کی کتابوں میں آپ ﷺ کے مزاح پر مستقل باب موجود ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک بوڑھی خاتون خدمت اقدس میں آئیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی، وہ خاتون رونے لگیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ جنت میں جائیں گے تو وہ جوان کردئے جائیں گے، بوڑھوں کے جنت میں نہ جانے کا یہ مطلب ہے۔ (احیاء علوم الدین: ۳/۱۳۸) حضرت امّ ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا خدمت میں حاضر ہوئیں اور درخواست کی کہ میرے شوہر آپ ﷺ کو مدعو کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہی جس کے آنکھ میں سفیدی ہے؟ انہوں نے کہا کہ بخدا! میرے شوہر کی آنکھ میں سفیدی نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ہاں، ضرور سفیدی ہے، وہ انکار کرتی رہیں، آپ ﷺ فرماتے رہے کہ سفیدی ہے، آپ ﷺ کی مراد پتلی کی سفیدی نہیں بلکہ حلقۂ چشم کی سفیدی تھی، جو ہر انسان کی آنکھ میں رہتی ہے۔ (حوالہ سابق) اس طرح کے سنجیدہ اور پاکیزہ مذاق اپنے بے تکلف احباب اور اقارب سے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

ایسا مذاق جو تکلیف دہ ہو، جس سے دوسروں کی تحقیر ہوتی ہو اور ان کا تمسخر مقصود ہو، قطعاً جائز نہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے تمسخر نہ کیا کرے، ممکن ہے کہ تم جن سے تمسخر کرتے ہو، وہی بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ جن عورتوں کا تمسخر کیا جاتا ہو وہی بہتر ہو، (الحجرات: ۱۱) تکلیف دہ مذاق کو آپ ﷺ نے بہت ہی ناپسند فرمایا ہے، ایک دفعہ کچھ لوگ آپ ﷺ کے ساتھ شریک سفر تھے، ایک صاحب

سو گئے، بعض حضرات نے دل لگی کے طور پر سونے والے شخص کی ایک رسی لے لی، وہ بیدار ہوئے اور رسی نہ پا کر گھبرا گئے، آپ ﷺ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ارشاد فرمایا: کہ کسی مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کو خوفزدہ اور گھبراہٹ میں مبتلا کرنا حلال نہیں۔ ''لا یحل لمسلم أن یروع مسلما'' (ابوداؤد:۲/۸۳)

''رینگنگ'' کے معنی درگت بنانے اور عملی مذاق کرنے کے ہیں، گویا درسگاہوں کے قدیم طلبہ نئے طلبہ کی درگت بناتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ نئے طلبہ کو قابو میں اور سرخمیدہ رکھنے کا ایک طریقہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اولاً یہ جذبہ ہی غیر انسانی اور غیر اخلاقی ہے کہ دوسروں کو اپنے سامنے جھکا کر رکھا جائے اور ان کے ساتھ مساویانہ اور برادرانہ سلوک کرنے کے بجائے دوسرے اور تیسرے درجے کا سلوک کیا جائے، پھر اس کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ محبت اور احترام کے بجائے بغض اور نفرت کو جنم دینے والا ہے، اس سے گروپ بندیاں اور پارٹی بازیاں جنم لیتی ہیں اور نئے طلبہ گو وقتی طور پر اپنی تحقیر و تذلیل کو برداشت کرلیں، لیکن وہ ایسے بدطینت اور بدقماش لڑکوں کو اپنے ذہن سے فراموش نہیں کرسکتے اور انتقام کے لیے موقعہ کی تاک میں رہتے ہیں، پھر اس سے ماحول میں عمومی بداخلاقی، بے احترامی، تحقیر و تذلیل اور بے ادبی کی فضا قائم ہوتی ہے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، پھر یہ کتنی بڑی محرومی ہے کہ بعض طلبہ اس ''بے ہودہ استقبال'' کی تاب نہ لا کر تعلیم ترک کردیں یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں!

یہ کردار نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے نہایت نامناسب ہے بلکہ کوئی بھی مذہب اور اخلاقی نظام اس کی اجازت نہیں دے سکتا، ہونا یہ چاہئے کہ قدیم طلبہ نئے طلبہ کو داخلہ کی کاروائی میں مدد دیں، دفتری کاموں کی تفصیل سے واقف کرائیں، ان کو اپنے پاس ٹھہرائیں، ان کی تعلیم اور مطالعہ میں ان کی مدد کریں، ان کو بہتر اساتذہ اور ذی صلاحیت طلبہ کی رہنمائی کریں اور جب تک کوئی مناسب انتظام نہ ہو، انکو اپنا مہمان بنائیں، اگر نئے ماحول کی وجہ سے وہ وحشت و گھبراہٹ محسوس کریں تو انہیں مانوس کرنے کی سعی کریں، بحمد اللہ اب بھی دینی مدارس میں یہ فضا موجود ہے اور بڑی اسلامی جامعات میں قدیم طلبہ، جدید طلبہ سے نہایت شفقت و

ہمدردی کا معاملہ کرتے ہیں اور دفتری اُمور کی انجام دہی میں حد درجہ معاون ہوتے ہیں۔

مقامِ فکر ہے کہ یہ درسگاہیں اور دانش گاہیں جہاں سے ملک وقوم کو چھوٹے بڑے افسر، کارکن اور خدمت گار ملنے والے ہیں، جو ملک کی تقدیر ہیں اور ملک کا مستقبل جن کے ہاتھوں میں ہے، ان میں اخلاقی پسماندگی اور تہذیبی انحطاط کا یہ حال ہو، وہ لوگوں کی ایذاءرسانی کو کھیل کود کی معمولی بات خیال کرتے ہوں، تکلیف پہنچانے میں انہیں لطف آتا ہو، کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل میں قوم کے سچے بہی خواہ اور حقیقی خیر خواہ ثابت ہوسکیں گے؟ وہ دکھی انسانیت کے زخموں کا مرہم بن سکیں گے، اور پریشان حال انسانوں کی مدد کے لیے آگے بڑھیں گے، لوگوں کو اخلاق کا درس دیں گے اور اخلاق وانسانیت سکھائیں گے؟ اس لیے ضروری ہے کہ عصری درسگاہوں میں اخلاقی اور مذہبی تعلیم کا کچھ حصہ رکھا جائے، ناشائستہ اور غیر مہذب روایات کو ختم کیا جائے اور ان کی اخلاقی تربیت پر بھرپور توجہ دی جائے کہ ڈاکٹر، انجینئر، قانون داں، صحافی اور ادیب بننا آسان ہے اور ''انسان'' بننا مشکل ہے، مولانا حالی کے بقول:

فرشتوں سے مشکل ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

(۳/ جولائی ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

مسلمانوں کے زیر انتظام عصری درسگاہیں

کچھ مخلصانہ مشورے

اللہ کا شکر ہے کہ گذشتہ ایک دہے میں مسلمانوں نے درسگاہوں کے قیام پر خصوصی توجہ دی ہے، اور ملک کے اکثر علاقوں میں مسلمانوں نے اپنی درسگاہیں قائم کی، پرائمری اور میڈل اسکول سے لے کر کالجز اور اعلیٰ فنی تعلیم کے بہت سے ادارے ہیں، جو اس وقت مسلم انتظامیہ کے تحت کام کر رہے ہیں، ہندوستان کے جن شہروں میں اس اہم کام کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، ان میں ایک ہمارا شہر ''حیدر آباد'' بھی ہے، یہ نہایت ہی مبارک اور مسعود قدم ہے، اور انشاء اللہ مستقبل میں اس کے بڑے مفید نتائج ظاہر ہونگے، عام طور پر لوگ اعلیٰ فنی تعلیم کے اداروں ہی کو اہم سمجھتے ہیں اور اہمیت دیتے ہیں، لیکن شاید ایسا سمجھنا درست نہ ہو، اگر ہم اپنے بچوں کو پرائمری سطح سے ہائی اسکول کی سطح تک بہتر تعلیم نہ دلا سکیں، اور معیاری تعلیم کا اہتمام نہ کر پائیں، تو میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کا قیام چنداں مفید نہ ہوگا، کیوں کہ ہمارے بچے مقابلاتی امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ محنت آپ کریں گے، پیسے آپ لگائیں گے، لیکن خود آپ کے بچے ان درسگاہوں میں پڑھنے سے محروم رہیں گے، اس لئے یہ اولین ضرورت ہے کہ ہائی اسکول سطح تک تعلیم پر ہم بھرپور توجہ دیں، یہی زمانہ ہے جس میں ذہن و فکر کی تعمیر ہوتی ہے، اور تعلیم کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں، اگر اس مرحلہ پر توجہ نہ دی گئی، تو وہ طالب علم ہمیشہ کمزور اور پست ہمتی کا شکار ہی رہے گا کہ :

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان انتظامیہ کے تحت مستقل درسگاہوں کے قیام کا مقصد سرکاری یا غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والا نجی درسگاہوں کی طرح مجرد تعلیم ہے یا کوئی اور بڑا مقصد بھی ہے، اس مقصد کے لئے تو پہلے ہی بڑی تعداد میں اسکولس اور کالجز موجود ہیں، اصل مقصود مسلمانوں کے زیرِ انتظام درسگاہوں کا یہ ہے کہ ان کو جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسکولی ماحول میسر ہو، ان کے دِلوں میں اسکولی اقدار کی عظمت بیٹھے، وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں، وہ سب کچھ ہوں، لیکن پہلے مسلمان ہوں، بہ قول اکبرالہ آبادی :

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں پر اڑو چرخ پر جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اس کے لئے چند باتیں نہایت ہی ضروری ہیں، اور مسلمان انتظامیہ کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ ان پر توجہ دے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اسکول کے ماحول میں اسلامی معاشرہ کو فروغ دیا جائے، اور بچوں کا رہن سہن اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر کا نمائندہ ہو، مسلمانوں کے زیرِ انتظام یعنی اسکولوں میں طلبہ اور طالبات کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ ملاقات کے وقت "گڈ مورننگ" Good Morning گڈ آفٹرنون Good Afternoon گڈ ایوینگ Good evening، کہا کریں، ظاہر ہے کہ یہ ملاقات کا غیر اسلامی طور وطریق ہے، اسلام سے پہلے عربوں میں سلام وملاقات کے لئے اس قسم کے الفاظ وحروف تھے کہ "انعم اللہ بك عینا" (اللہ تمہاری آنکھ کو ٹھنڈی رکھے، اور "انعم صباحا" (تمہاری صبح بخیر ہو) لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کلمات کو پسند نہیں فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اس کے بجائے ملاقات کے وقت کہا جائے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" یعنی، تم کو اللہ تعالیٰ دین ودنیا کے تمام نقصانات سے محفوظ رکھے، اور تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں" یہ نہایت جامع دعاء ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس

سے بہتر اور کوئی دعا نہیں دے سکتا ہے، ہماری درسگاہوں میں بچوں کو اس طرز ملاقات کا عادی بنایا جائے، کہ اس سے ہماری شناخت اور پہچان بھی متعلق ہے۔

اسی طرح یونیفارم کا مسئلہ ہے، یونیفارم ایسا ہونا چاہئے، جو شریعت کے دائرہ میں ہو، آج کل بہت سے مسلمان اسکولوں میں بھی لڑکیوں کو ''اسکارف'' کے استعمال سے منع کیا جاتا ہے، ایسی قمیص پہننے کو کہا جاتا ہے جس میں بازو کھلے ہوئے ہوں، بعض اسکولوں میں پائجامہ کے بجائے لڑکیاں ''اسکرٹ'' پہنتی ہیں، قریب البلوغ اور بالغ لڑکیاں ہیں لیکن ان کے بال کھلے ہوئے، بازو کھلے ہوئے، ٹانگیں کھلی ہوئیں، کپڑا چست، ظاہر ہے کہ یہ نہ صرف اسلام بلکہ شرافتِ انسانیت کے بھی مغائر ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورت سراپا پردہ ہے، المرأة عورة ایسے کپڑے جس سے جسم کی رنگت چھلکتی ہو، جن سے اعضا کا نشیب وفراز محسوس کیا جاسکتا ہو اور جسم کی ساخت نمایاں ہوتی ہو، قطعاً جائز نہیں، اور نفسیاتی اعتبار سے بھی ایسے یونیفارم مقرر کرنا نقصان دہ ہی ہے، جس ماحول میں اس طرح بے حجاب لڑکیاں چلتی اور رہتی ہوں، آنکھوں سے آنکھیں ٹکراتی ہوں، کھلے ہوئے بازو اور ٹانگوں پر نگاہ پڑتی ہو، تو ضرور ہے کہ یہ چیز لڑکوں کی ذہنی یکسوئی میں خلل انداز ہوگی، دل میں وساوس پیدا ہونگے، اور ذہن میں ہیجان کی لہریں اٹھینگی، ایسا طالب علم کیونکر اپنے سبق اور استاذ کی لکچر کی طرف متوجہ رہ سکتا ہے؟ اور جب توجہ اور یکسوئی باقی نہ رہے، تو کیسے وہ کتاب کے مضامین کو حل کر سکے گا، لڑکیوں کو اس کی وجہ سے دو چیزوں میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ایک تو یہی نفسیاتی الجھن لڑکیوں کے ساتھ بھی پیدا ہونگی دوسرے ایسے لباس کی وجہ سے ان کو اوباش اور آوارہ لڑکوں کی مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، فقرہ بازی، چھیڑ چھاڑ، مسلسل نظر بازی کے نتیجہ میں لڑکیاں ذہنی تناؤ سے دوچار رہتی ہیں، اور درسگاہ میں آتے جاتے اور اٹھتے بیٹھتے یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ کچھ اوباش نگاہیں، اس کا تعاقب کررہی ہیں، ظاہر ہے ایسے خوف اور ذہنی تناؤ کے ماحول میں کیسے ان کو ذہنی یکسوئی حاصل ہوسکتی ہے؟

اس لئے یونیفارم میں اسلامی اور اخلاقی قدروں کا لحاظ ہونا چاہئے، شرٹ، پتلون اسکارف اور بالغ لڑکیوں کے لئے نقاب تاکہ جسم ڈھکا چھپا رہے، لڑکوں کے لئے بھی دیدہ

زیب لیکن اسلامی وضع قطع کا نمائندہ لباس ہو، بعض پڑوسی ممالک میں دیکھا گیا ہے کہ پٹھانی سوٹ اسکول کا یونیفارم متعین کیا گیا ہے، یہ خوبصورت بھی ہے، ڈھیلا ڈھالا ہونے کی وجہ سے طبی نقطۂ نظر سے صحت کے لئے مفید بھی اور پوری طرح ساتر بھی، اگر مسلمان انتظامیہ اسکولوں میں ایسے یونیفارم مقرر کرے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ کیا جسم کی نمائش اور غیر ساتر لباس سے طالبعلم کے ذہنی وفکری قوت میں اضافہ ہوجاتا ہے، کیا انسان کی قوت حفظ اور ذکاوت میں بھی اسکو کچھ دخل ہے، اور علم وفن کی تاریخ میں جو ممتاز شخصیتیں گذری ہیں، وہ اس قسم کے یونیفارم پہن کر ہی علمی اور قلمی کام کیا کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ مغربی تہذیب سے مرعوبیت، اور اپنی تہذیب وتمدن کے بارے میں احساس کمتری اور فکری ہزیمت کا آئینہ دار ہے!

اسی سے متعلق دوسری اہم چیز لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے جداگانہ تعلیمی نظام کا ہے، بدقسمتی سے اس وقت مخلوط تعلیم ''کوایجوکیشن'' کا فیشن سا ہوگیا ہے، فخریہ تشہیر کی جاتی ہے کہ ہمارے یہاں ''کوایجوکیشن'' (Co Education) ہے، یہ سراسر نادانی ہے اور نہ صرف اسلام سے دوری تعلیمی نفسیات سے ناواقفیت اور ناآگہی بھی ہے، تعلیم وتعلم کے وقت استاد اور طالب علم کا ذہن پوری طرح ان مضامین پر مرتکز ہونا چاہئے، جو اس وقت ان کے سمجھنے اور سمجھانے کا موضوع ہے، درس گاہ کے ماحول میں کوئی ایسی چیز نہ ہونی چاہئے جو توجہ کو بانٹنے والی ہو کہ یہ تعلیم کے لئے سم قاتل ہے، سبق کی حیثیت ایک زنجیر مسلسل کی ہے، اگر بیچ سے ایک کڑی بھی غائب ہوتی، تو پورا سبق ضائع ہوجائے گا۔

اور یہ فطری بات ہے کہ ایک ہی ماحول میں لڑکوں اور لڑکیوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے کشش کا باعث ہے، ایک ہی جگہ ان دونوں کا موجود رہنا نگاہوں کا ٹکرانا یقیناً ذہن کو متاثر کرے گا، توجہ کو بانٹے گا، اور مدرس کی طرف پوری توجہ تسلسل کے ساتھ برقرار رکھنا دشوار ہو جائے گا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے نمازیوں کے سامنے سے گزرنے کو منع فرمایا اور اس کو ''قاطع صلاۃ'' قرار دیا، یعنی نمازیوں کی توجہ کو بانٹنے والی چیز ہے، سماج میں بڑھتے ہوئے موجودہ اخلاقی بحران بلکہ اخلاقی انارکی کے پس منظر میں جداگانہ نظام تعلیم ایک بہت

بڑی ضرورت ہے، اور اگر مسلمان بھی اس جانب توجہ نہ کریں، جو شرم وحیا اور عفت وعصمت کا علم بردار ہے، تو کن سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے؟

مسلمانوں کے زیرِ انتظام عصری مدارس کی ایک بڑی ضرورت نصاب تعلیم میں ایسے مضامین کو شامل کرنا ہے جو مسلمان طلبہ اور طالبات کو اسلام کے بارے میں واقفیت بھی فراہم کرے اور ان کو احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے بچائے، محض چند دعاؤں کا یاد دِلا دینا کافی نہیں، بلکہ توحید، شرک، رسالت، عبادات، معاشرتی زندگی اور معاملات کے بارے میں ان کو معلومات فراہم کی جائے، سیرت نبوی ﷺ اور اسلامی تاریخ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، ان کے متعلق وہ حقائق سے آگاہوں، ہندوستان کی حقیقی تاریخ کہ مسلمانوں نے اس ملک کو کیا کچھ دیا؟ پڑھائی جائے، بابر، غزنوی وغوری اور حضرت اورنگ زیب عالم گیرؒ وغیرہ مسلم حکمرانوں کے بارے میں جو پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں، ان کی حقیقت سمجھائی جائے، تاکہ آج ازسرنو تاریخ لکھنے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اس کے زہر سے مسلم نوجوانوں کے ذہن کو محفوظ رکھا جاسکے، ان موضوعات پر بہت سی تحریریں موجود ہیں اور اگر ضرورت پڑے، تو اس نقطۂ نظر سے کچھ کتابیں مدون کی جائیں، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے جن جماعتوں میں بورڈ کا امتحان دینا ہوتا ہے، ان جماعتوں کو چھوڑ کر اگر دوسری کلاس میں ایسی کتابیں رکھی جائیں، تو شاید اس میں کوئی دقت نہ ہو۔

ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ تعلیم جو خدمتِ خلق کا ذریعہ تھی، آج وہ سب سے بڑی تجارت ہے، عیسائی مشنریز تو اس تجارت سے لوگوں کا مذہب خرید کرتی ہے، اور اپنے دین کی تبلیغ کرتی ہے، لیکن مسلمان انتظامیہ اس تجارت کو زیادہ تر اپنے شخصی مفاد اور زیادہ سے زیادہ حصولِ دولت کے لئے استعمال کرتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو غریب مسلمانوں کو اس حوصلہ افزا مشورہ سے بھی سرفراز فرماتے ہیں کہ ''پڑھانا ہی کیا ضروری ہے، رکشہ چلوالو'' اگر ہماری درس گاہوں'' کا مقصد صرف مرفہ الحال مسلمانوں سے پیسے وصول کرنا اور ان کے بچوں کو پڑھانا ہے، تو یقیناً یہ ادارے بے فیض ہیں، اور یہ مقصد تو غیر مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والی درس گاہوں سے بھی حاصل ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ معقول داخلہ فیس اور تعلیمی فیس لینے کے باوجود ان '' اسکولوں میں عام طور پر اساتذہ کی تنخواہیں بہت قلیل ہوتی ہیں، اور قلیل تنخواہ ہی کی نسبت سے ان اساتذہ کی صلاحیت اور استعداد بھی ہوتی ہے، تنخواہ کی کمی اساتذہ کے لئے بے اطمینانی کا باعث ہوتی ہے، اس لئے وہ بھی دوسری جگہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ شاید یہ ان کی تنخواہ میں کسی قدر اضافہ کا باعث ہو سکے، اس بے اطمینانی کی وجہ سے بار بار اساتذہ تبدیل ہوتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ بار بار اساتذہ کی تبدیلی تعلیم کے لئے نہایت ہی نقصان دہ ہے، کیوں کہ تعلیم کے لئے طالب علم اور مدرس کے درمیان ذہنی مناسبت اور مناسبت سے بڑھ کر موانست ضروری ہے، ہر شخص کی تفہیم کا انداز الگ الگ ہوتا ہے، زبان اور لب ولہجہ میں بھی فرق ہوتا ہے، ہفتہ عشرہ تو طالب علم کو اساتذہ سے مناسبت پیدا ہونے میں لگ جاتا ہے، اور اساتذہ کے لئے طلبہ کی انفرادی صلاحیت اور مزاج کو پہچاننے میں تو اس سے بھی زیادہ وقت درکار ہوتا ہے، اس کے بعد ہی حقیقی طور پر استاذ اور طالب علم کا تعلیمی رشتہ استوار ہوتا ہے، اگر مدرس بار بار تبدیل ہو، یا خود مضامین ایک مدرس سے دوسرے مدرس کی طرف منتقل ہوتے رہیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اچھا خاصا وقت ایک دوسرے سے ارتباط ہی میں چلا جائے گا۔

مسلمان انتظامیہ کا انسانی، اسلامی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ تعلیمی اخراجات کو ایسا مناسب اور متوازن رکھیں کہ غریب مسلمان خاندان بھی تعلیم حاصل کر سکیں، اور '' نہ نفع نہ نقصان '' یا '' اقل ترین نفع '' کی بنیاد پر ادارے چلائے جائیں، جبھی ہم غریب اور پس ماندہ مسلمانوں کو بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ کر سکیں گے، یا کم سے کم اتنا کیا جائے کہ ہر طالب علم کی فیس میں کچھ حصہ (Poorfound) مان کر چلیں، مثلاً اگر ہم ایک ہزار داخلہ فیس لیتے ہیں، تو نو سو داخلہ فیس اور ایک سو '' غرباء کا فنڈ '' تصور کریں، اور ہر دس طالب علم پر ایک غریب طالب علم کا مفت داخلہ لیں، اس طرح کم سے کم دس فیصد داخلے غریب بچوں کے بھی ہو سکیں گے۔

موجودہ حالات میں ایک اہم مسئلہ اردو زبان کی تعلیم کا بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ

اردو واحد زبان ہے جس کو مسلمانوں نے وجود بخشا ہے، اس زبان میں تقریباً 75 فیصد الفاظ عربی اور فارسی ہیں، خود قرآن مجید کے الفاظ بہ کثرت اس زبان میں داخل ہیں، اسلامی اصطلاحات اور محاورات جس قدر اردو زبان میں پائے جاتے ہیں، عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں، جو اسلامی تعبیرات سے اس قدر مالا مال ہو، ایک غیر مسلم بھی جب اردو زبان میں لکھتا اور بولتا ہے، تو "ماشاء الله ، الحمد لله ، اور سبحان الله" وغیرہ الفاظ اسے بھی بولنے اور لکھنے پڑتے ہیں۔

پھر اردو زبان میں اسلامی علوم کا سرمایہ اتنی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے کہ سوائے عربی زبان کے کوئی زبان نہیں جو اتنی مال دار اور صاحبِ ثروت ہو، تفسیر، قرآن وحدیث کے ترجمے، مسنون حدیث کی شرحیں، فقہ اور فقہی کتابوں کے ترجمے، سیرت، اسلامی تاریخ، غرض تمام ہی اسلامی علوم پر اردو زبان میں ایک عظیم الشان کتب خانہ تیار ہو چکا ہے، ایک زمانہ میں عربی کے بعد سب سے زیادہ اسلامی لٹریچر فارسی زبان میں تھا، لیکن اب اردو نے فارسی پر سبقت حاصل کر لی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے، جو آج ایشیاء سے لے کر امریکہ تک اپنا مقام بنا چکی ہے، برصغیر آبادی کے اعتبار سے دنیا کا نہایت ہی گنجان علاقہ ہے، برصغیر کے اکثر علاقوں میں اردو زبان سمجھی جاتی ہے، ایک محتاط اندازہ کے مطابق ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں ساٹھ کروڑ مسلمان بستے ہیں، ان میں پچاس کروڑ لوگ وہ ہیں جو اردو سمجھتے ہیں، اور کم سے کم چالیس کروڑ وہ ہیں جو اردو بولتے اور پڑھتے ہیں، یہ ایک بہت وسیع حلقہ ہے، اگر پوری دنیا میں اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد پچاس کروڑ ہی مان لی جائے، تو اردو بولنے والے کا تناسب بین الاقوامی زبانوں میں نہایت نمایاں ہے۔

اگر ہمارے بچے (جو عربی اور فارسی زبان سے بھی واقف نہیں) اردو زبان سے بھی نابلد رہ جائیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت ہی عظیم اسلامی سرمایہ سے محروم ہو جائیں گے، اسلامی لٹریچر سے ان کا رابطہ کٹ کر رہ جائے گا، اور اپنے سلفِ صالحین اور بزرگوں سے

ان کا رشتہ منقطع ہو جائے گا، اسلام کے بارے میں یا تو ان کو کوئی واقفیت اور آگہی نہیں رہے گی، یا وہ اپنی معلومات کے لئے ان لوگوں کی تحریروں اور کتابوں پر انحصار کریں گے جو حقیقت میں اسلام کے معاند ہیں، اور جن سے اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی، اس لئے مسلم انتظامیہ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں اردو زبان کی تعلیم وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، اور اس سے چشم پوشی برتنا آنے والی نسلوں سے محرومی کو گوارا کرنے کے مترادف ہے، یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ جو لوگ اردو زبان کے تحفظ کی تحریک چلاتے ہیں، دین دار ہیں، دینی علوم سے وابستہ ہیں، اردو زبان کی روٹی کھاتے ہیں، اردو میں وعظ وتقریر اور شعر وسخن ان کا امتیاز ہے، خود ان کے بچے اردو کو ''اچھوت'' سمجھتے ہیں، اس لئے ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ معیاری اسکول قائم کئے جائیں، لیکن اگر اپنے اندر اتنی جرأت نہ پاتے ہوں، تو خواہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہو، ثانوی زبان ہی کی حیثیت سے کم سے کم اردو کو داخل نصاب کریں، اس کے لئے اچھے تربیت یافتہ اساتذہ رکھیں، اور اس کو پوری اہمیت دیتے ہوئے پڑھائیں، یہ موجودہ حالات میں آئندہ نسلوں کو اسلام پر باقی رکھنے اور مسلمان بچوں کا اسلام سے رشتہ استوار رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

عصری درس گاہوں کے طلبہ کی اسلامی تربیت اور ذہن سازی میں دینی مدارس بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، اگر دینی مدارس ابتدائی مرحلہ میں پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک سرکاری نصاب کے ساتھ اسلامیات اور قرآن مجید پڑھ لیں، دو پارے حفظ کر لیں، سیرت اور دینیات کی کچھ کتابیں پڑھ لیں، نیز اسلامی عقائد اور تاریخ پر بھی کوئی کتاب ان کی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھا دی جائے، اور تربیت کا اسلامی ماحول ان کو دیا جائے، تو یہ نہایت ہی مبارک اور نافع قدم ہوگا، اس طرح بہت سے وہ ماں باپ جو اپنے بچوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں، اور اس ذہنی ارتداد سے نالاں ہیں، جو اس وقت مشنری اسکولوں کی عام بیماری ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے، بچوں کا اگر ابتدائی مرحلہ میں اسلامی ذہن بنا دیا جائے اور ان کی صحیح تربیت ہو جائے، تو پھر جو بھی پڑھیں اور بنیں، ایک مسلمان کی

حیثیت سے بنیں گے، اور انشاء اللہ ان کو کوئی طاقت ''سلمان رشدی'' اور ''تسلیمہ نسرین'' بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی، اور خود ان دینی مدارس کے لئے بھی یہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز قدم ہوگا، ان مدارس کے فضلاء کے بارے میں جو شکایت ہے کہ یہ عصری معلومات سے بے خبر ہیں، اور اپنے ماحول کے بارے میں بھی کوئی آگہی نہیں رکھتے، یہ شکایت بھی انشاء اللہ دور ہو جائے گی، اور مدرسہ کی چہار دیواری سے نکلنے کے بعد اپنے آپ کو ماحول میں اجنبی اور نو وارد محسوس نہیں کریں گے۔

(۲۵/جون ۱۹۹۹ء)

☆☆☆

دینی تعلیم وتربیت کے لئے گرمائی کلاسس

کچھ مشورے

تعلیم وتربیت کے کچھ شعبے وہ ہیں جن کی ضرورت ایک طبقہ کو پڑتی ہے، دوسرے طبقہ کونہیں پڑتی ہے، جیسے میڈیسن اور میڈیکل کہ اس کی ضرورت معالجین کو ہے، یا بہت سی اشیاء وہ ہیں، جن کی بنیادی معلومات ہر شخص کے لئے لازم ہے، جیسے راستہ پر چلنے کے قواعد، جرائم کے سلسلہ میں اس بات کا علم کہ کون سے کام قانون کی نظر میں جرم قرار پاتے ہیں، کھانے پینے کا طریقہ اور رہن سہن کا سلیقہ، یہ ایسی باتیں ہیں کہ انسانی سماج میں نشو ونما پانے والے کسی شخص کے لئے ان سے نابلد رہنے کی گنجائش نہیں، ایسی ہی ضروری چیزوں میں دین کی بنیادی باتوں کا علم بھی ہے، جیسے غذا ہر شخص کی ضرورت ہے، سانس کے لئے ہوا ہر انسان کے لئے ضروری ہے، اور جیسے کوئی زندہ آدمی پانی سے مستغنی نہیں ہوسکتا، اسی طرح دین ہر شخص کی ضرورت ہے مرد ہو کہ عورت، جوان ہو یا بوڑھا، امیر ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا جاہل، شہر کا رہنے والا ہو یا دیہات کا، اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی ہو اور اچھا سے اچھا ماہر فن ہو؛ لیکن علم دین سے وہ بے نیاز نہیں ہوسکتا؛ بلکہ ایسے لوگوں کو علم کی اور زیادہ ضرورت ہے؛ کیوں کہ اگر ایسے باصلاحیت افراد کے اندر دین اور دین کا شعور نہ آئے، تو وہ محض سکے ڈھالنے والی مشین بن جائیں گے، اور انسانی خدمت کے اس حقیقی جذبہ سے محروم رہیں گے، جو ان کی تعلیم کا اصل مقصود ہے۔

جیسے شارعِ عام پر چلنے والے ہر شخص کے لئے ٹریفک قواعد کا علم ضروری ہے، اسی طرح یہ کائنات بھی ایک راستہ ہے، اور جتنے لوگ اس کائنات میں زندگی گزار رہے ہیں، وہ اس کے راہ رو ہیں، اس دنیا میں ہر شخص اس طرح زندگی گزارے، کہ وہ دوسروں کے لئے ایذاء اور نقصان کا باعث نہ بنے، اور وہ اپنے آپ کو انسانی شرافت کی حدود میں باقی رکھے، اسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعہ زندگی گزارنے کا طریقہ یعنی دین بھیجا ہے، یہ انسان کے لئے روحانی غذا ہے، یہ زندگی کے اندھیروں میں خدا کی روشنی، (نورِ مبین) ہے، یہ آخرت کے ساتھ ہماری دنیا کی فلاح کا بھی ضامن اور محافظ ہے؛ اس لئے دین کی کم سے کم بنیادی تعلیم سے کسی کو مفر نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد علماء نے خالص قومی تعاون سے چلنے والے ایسے دینی مدارس کی بنیاد رکھی، جن میں مفت تعلیم اور مفت قیام وطعام کا نظم کیا گیا، اور اللہ نے کچھ بے نوا فقیروں سے وہ خدمت لی، جو بادشاہوں کے نصیب میں بھی نہ آسکی، ان مدارس نے ایسے طبقہ کو علم سے آراستہ کیا ہے، جن کے لئے تعلیم کے دوسرے تمام راستے بند ہیں، اور آج اس خطہ میں اسلامی تشخصات کا باقی رہنا بڑی حد تک ان ہی مدارس کی دین ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان مدارس میں جو طلبہ آتے یا لائے جاتے ہیں، ان کا تناسب شاید ایک فی ہزار بھی نہ ہو، تو ہمارے قوم کے یہ ہزاروں طلبہ وطالبات جو سرکاری اور سرکاری طرز کی درس گاہوں میں زیرِ تعلیم ہیں، کیا ان کی دینی تعلیم کے بارے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟ ہمارے یہ بچے اور بچیاں اگر دین سے نابلد رہ جائیں، ان میں خدا اور اس کے رسول ﷺ کی معرفت اور محبت نہ پیدا ہو، تو یہ کس قدر محرومی کی بات ہوگی؟

مئی اور اپریل اور جون کا کچھ حصہ ان درس گاہوں میں تعطیلات کا ہوتا ہے، ان تعطیلات میں اسلامیات کے گرمائی کلاس قائم کر کے ہم اس ضرورت کی تکمیل کر سکتے ہیں، اور یہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی ایک سنت کی تکمیل ہوگی، آپ ﷺ کے پاس جو صحابہؓ آتے ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی جو ماہ دو ماہ کے لئے خدمتِ اقدس میں رہتے، صفہ میں قیام کرتے، اور آپ ﷺ سے اور آپ ﷺ کے قدیم صحبت یافتہ رفقاء سے دین کی ضروری باتیں

سیکھ کر واپس جاتے، یہ ایسا مختصر مدّتی نظامِ تعلیم تھا جس سے اسلام کی روشنی دور دور تک پہونچی، اور مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا جو دین کی بنیادی تعلیمات سے نا آشنا ہو، دوسری طرف وہ صحابہ ؓ تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اس علم کے حاصل کرنے میں وقف کررکھی تھی، اور وہ استنباط واجتہاد کے مقام پر فائز تھے۔ پس آج بھی یہ بات ضروری ہے کہ امت کے مختلف طبقات بالخصوص طلبہ برادری کے لئے ایسا مختصر مدّتی نظامِ تعلیم وضع کیا جائے، جو ان کو ضروریاتِ دین سے آشنا کردے، اس کے علاوہ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں جیسے: ڈاکٹروں، انجینیروں، قانون دانوں وغیرہ کے لئے بھی ایسے تربیتی کیمپ منعقد ہونے چاہئیں کہ وہ زندگی کے عام مسائل کے علاوہ اپنے پیشہ سے منسلک مسائل میں بھی اسلامی تعلیمات سے باخبر ہوسکیں، اس سے ہمارے ڈاکٹر واقعی مسلمان ڈاکٹر بن سکیں گے، ہمارے انجینرس میں اپنے فن کو انسانی خدمت کے لئے استعمال کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا اور ہمارے قانون داں ظالم اور مظلوم کی تفریق کرنا سیکھیں گے۔

طلبہ اور طالبات کے گرمائی تعلیمی نصاب میں کئی مضامین کو شامل ہونا چاہئے، یہ بھی بہت اہم ہے، ان میں بعض مضامین تو بنیادی ہیں، اوّل: قرآن مجید کی تعلیم، اور اسی تعلیم کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، ایک تو تجوید کی رعایت کے ساتھ قرآن مجید کا ناظرہ، دوسرے: طلبہ کے سن وسال اور استعداد کے لحاظ سے قرآن مجید کی سورتوں کا حفظ، مثلاً: بالکل مبتدی بچوں کے لئے سورہ فاتحہ تا سورہ اخلاص، اس سے اونچے معیار کے طلبہ کے لئے سورہ فیل تک اور اس سے اونچے معیار کے طلبہ وطالبات کے لئے سورہ ضحیٰ تک، جن طلبہ کو یہ سورتیں یاد ہوں، ان کے لئے مخصوص سورتوں، سورہ ملک، سورہ واقعہ، سورۃ بقرہ کا ابتدائی وانتہائی رکوع وغیرہ کا حفظ، قرآن کی تعلیم کا تیسرا پہلو قرآن کا ترجمہ اور معانی قرآن سے واقفیت ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق آیات قرآنی کا ایک انتخاب ہو، ان آیات کو مع ترجمہ زبانی یاد کرایا جائے، اس میں عقیدہ واخلاق سے متعلق آیتیں بھی ضرور ہونی چاہئیں۔

دوسرا موضوع سیرت ہے، رسول اللہ ﷺ کی معرفت اور آپ ﷺ کی محبت اس دین کی

اساس و بنیاد ہے، اور مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا سب سے مؤثر ذریعہ بھی ہے؛ اسی لئے یہودی اور عیسائی مصنفین نے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو مجروح کرنے کی اپنی دانست میں خوب کوششیں کی ہیں، جو پہلے بھی ناکام ہوئیں، اور انشاء اللہ آئندہ بھی ناکام و مراد ہی ہوں گی؛ اس لئے ضروری ہے کہ لازمی طور پر آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو پڑھانی چاہئے، سیرت پر متعدد مختصر رسائل جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوئے ہیں، اور طلبہ کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں، نہیں پڑھایا جاسکتا ہے، اور جو ان سے اونچے معیار کے طلبہ ہوں ان کے لئے محترمہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ (ہمشیرہ سید مولانا ابوالحسن علی ندویؒ) کی تالیف ''ہمارے حضور ﷺ '' نہایت ہی مفید کتاب ثابت ہوسکتی ہے، اس کی زبان بہت سہل اور عام فہم ہے، اور مختصر الفاظ میں سیرت کی تمام بنیادی باتیں آ گئی ہیں، یہ کتاب واقعہ ہے کہ بچوں کے ادب کا بہترین نمونہ ہے، اس کے علاوہ موصوفہ ہی کی ایک اور کتاب ''بچوں کی قصص الانبیا'' ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے حالات چار حصوں میں نہایت ہی آسان اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں، نیز انبیاء کے تمام قصص قرآن سے ماخوذ ہیں، اس میں دیوتاؤں کی کہانیوں، اسرائیلی اور موضوع روایتوں کا کہیں کوئی دخل نہیں ہے، اس طرح یہ مجموعہ نہ صرف بچوں کو انبیاء کی مبارک زندگی سے روشناس کرتا ہے، بلکہ قرآنی قصص سے بھی انہیں بڑی حد تک مانوس کر دیتا ہے۔

تیسرا ضروری موضوع احادیث اور دینی تربیت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے چالیس احادیث کے یاد کرنے کی خصوصی فضیلت بیان فرمائی ہے، اور اسی ارشاد نبوی کے پس منظر میں مختلف بزرگوں نے ''اربعین'' کے نام سے چالیس حدیثوں کے مجموعے مرتب فرمائے ہیں، طلبہ و طالبات کو ایسی مختصر چالیس حدیثیں اردو یا انگریزی ترجمہ کے ساتھ یاد دلانی چاہئے، جو عقائد و اعمال، عبادات کی اہمیت و فضیلت اور اخلاق و آداب کے بارے میں اسلام کے مزاج و مذاق کی رہنمائی کرتی ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اپنے لفظی حسن، معنوی گہرائی اور زندگی میں نافعیت کے اعتبار سے جواہر پاروں سے کم نہیں، ان اقوال زریں کو یاد کرنے سے رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور آپ ﷺ کی محبت میں بھی اضافہ ہوگا۔

دینی تربیت میں ضروری اذکار واوراد اور شب وروز کی مختلف مواقع سے متعلق دعائیں بھی شامل ہیں، ان دعاؤں کو اردو اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ یاد دلانا مناسب ہوگا، اس میں شبہ نہیں کہ دعائیں عقیدہ وایمان کی بھی اصلاح کرتی ہیں، اللہ کا یقین بڑھاتی ہیں اور اسلامی ثقافتی تشخصات کو بھی ظاہر کرتی ہیں، ان دعاؤں کے ذریعہ رسولِ اقدس ﷺ نے مؤمن کی پوری زندگی کو اللہ کی حمد وثنا اور جذبہ سپاس سے مربوط کردیا ہے اور یہی تعلق مع اللہ انسانیت کا اصل جوہر ہے، دینی تربیت میں روزمرہ پیش آنے والی ضروریات یعنی کھانا، پینا، سونا، جاگنا، لوگوں سے ملاقات، پردہ، صفائی ستھرائی، استنجاء وغیرہ کے اسلامی آداب شامل ہیں، جن کی عملی مشق بھی ضروری ہے، اس سلسلے میں صحابۂ کرام اور سلف صالحین کے مستند واقعات بھی بچوں کو پڑھانے چاہئے اور جو خود نہیں پڑھ سکتے ان کو کہانی کے طور پر سنانا چاہئے، اس سلسلہ میں جناب افضل حسین صاحب کی ''''اخلاقی کہانیاں'' اور ''سچی کہانیاں'' اور ذرا بڑی طالبات کے لئے مولانا عبدالسلام ندوی کی ''اسوۂ صحابیات'' بہتر کتابیں ہیں۔

عقائد اور اعمال، آداب واخلاق اور سیرت نبوی ﷺ کے سلسلے میں مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دینی تعلیم کے رسائل بھی بڑے نفیس اور مفید ہیں، گو اس مختصر مدت میں ان تمام رسائل کو پڑھانا ممکن نہیں؛ لیکن ایک دو منتخب رسالہ پڑھایا جاسکتا ہے، اسی طرح عقائد وعبادات کے لئے مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی کتاب ''تعلیم الاسلام'' سوال وجواب کے انداز پر مفید کتاب ہے، یہ تو شاید ممکن نہ ہو کہ ایک ماہ میں یہ پورا رسالہ پڑھادیا جائے؛ لیکن کم سے کم عقیدہ کا حصہ ضرور پڑھایا جاسکتا ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں یہ بات بہت ضروری ہوگئی ہے کہ ہمارے بچے عقیدۂ توحید کے بارے میں پختہ ذہن کے حامل ہوں اور شرک کی نفرت پوری طرح ان کے دلوں میں راسخ ہو، تاکہ ہندوتو اتحریکوں کی جانب سے مسلمانوں کی نئی نسل کو اعتقادی اور تہذیبی اعتبار سے جذب کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس خطرہ سے ان کو بچایا جاسکے۔

اس وقت ہندوستان میں اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ تاریخ کو مسخ کرکے مسلمانوں کو ڈاکو، لٹیرا اور دہشت گرد ثابت کیا جائے اور مسلمان فرمان رواؤں کی ظلم وجور کی

مفروضہ کہانیاں اس کثرت سے بیان کی جائیں اور لکھی جائیں کہ نہ صرف ہندوؤں میں فرقہ پرستی کا ذہن پروان چڑھے، بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل اپنے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے اور اپنے اسلاف کی تاریخ پر شرمانے لگے، اس پس منظر میں یہ بات ضروری ہوگئی کہ ہماری نئی نسل ہندوستان کی حقیقی تاریخ سے آشنا ہو اور وہ پروپیگنڈوں اور مغالطوں کا شکار نہ ہوں، اس سلسلہ میں جناب افضل حسین صاحب کی کتاب ''آئینہ تاریخ'' ایک مفید اور جامع کتاب ہے، جس میں سنگھ پریوار کی جانب سے اٹھائے جانے والے بے جا اعتراضات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اتنے کم عرصے میں یہ پوری کتاب تو شاید نہ پڑھائی جا سکے، لیکن کم سے کم اس کے مغلیہ عہد کا حصہ پڑھا دیا جائے تو بہتر ہوتا کہ بابر اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں ان کا ازالہ ہو سکے۔

غرض کہ موجودہ حالات میں یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ ہم اپنے ان بچوں کو جو اسکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں شعوری طور پر مسلمان بنائیں، اور ان میں فکری پختگی پیدا کریں کہ وہ اسلام کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈوں کا جواب دینے کے لائق بن سکیں، بلکہ اسلامی افکار واحکام کو انہیں اپنے معقول طریقے پر پڑھایا جائے، اللہ کی اس بھیجی ہوئی ابدی اور آفاقی سچائی کی طرف بلا سکیں، اس کے لئے گرمائی تعطیلات کے ایام اور مختلف سن وسال کے طلبہ وطالبات کے نفسیات اور ان کی شعوری صلاحیت کو سامنے رکھ کر مستقل نصاب مدون کرنے کی ضرورت ہے، کاش ہمارے تعلیمی مراکز اس جانب توجہ دیں۔

(۲۷/اپریل ۲۰۰۱ء)

☆☆☆

مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

ملک کو آزاد ہوئے نصف صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، قوموں کی زندگی میں پچاس سال کی مدت کچھ کم مدت نہیں ہوتی، اس نصف صدی نے جہاں ہمیں محرومی کی داستانیں دی ہیں، وہیں ہم نے بہت کچھ پایا بھی ہے۔ ہم نے جو کچھ پایا ہے ان میں سب سے اہم چیز تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس ہے۔ کسی صالح انقلاب کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہی ہوتی ہے کہ انسان اپنی کوتاہی کا احساس کرے، اور اس کے اندر اس خیر کی طلب بلکہ تڑپ پیدا ہو جائے جو زندگی کو سنوارنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کا ذریعہ ہو، اس لئے بچوں کو تعلیم دلانے کا یہ عمومی رجحان بھی ایک بہت بڑی کامیابی ہے!

ایک زمانہ تھا کہ علم کو مخصوص خاندان کی جاگیر سمجھا جاتا تھا، کچھ زمیندار اور وڈیرے اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے تھے، لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھا دی گئی تھی کہ صرف یہی لوگ پڑھنے پڑھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، عام لوگ اپنے بچوں کے بارے میں تعلیم دلانے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، اور نچلے درجے کے کاموں پر قانع تھے، متوسط درجہ کے لوگ اگر اپنے بچوں کو پڑھاتے بھی تو چھوٹے اور معمولی اسکولوں میں ہی پڑھا سکتے تھے، معیاری درس گاہیں نوابان، رؤساء اور جاگیرداروں کے لئے مخصوص تھیں، عام لوگوں کے بچے ان درس گاہوں میں تعلیم نہیں پا سکتے تھے، اور ظاہر ہے کہ یہ اس ہندوانہ فکر وتہذیب کا اثر تھا، ذات پات کی تفریق جن کے عقیدہ کا جزء ہے اور جن کے لئے اس فکر سے آزاد ہو کر سوچنا ممکن نہیں ہے۔

یہ اللہ کا شکر ہے کہ جمہوری نظام نے ان بند دروازوں کو کھولا، تعلیم کے مواقع سے فائدہ اٹھانے کا سبھوں کو موقع میسّر آیا۔ اور یہ سوچ عام ہوئی کہ تکلیف اٹھا کر اور پیٹ کاٹ کر بچوں کو تعلیم دلانی چاہئے، لیکن ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے تانے بانے ان بدیشی آقاؤں کے بنے ہوئے ہیں، جن کا اصل مقصد تعلیم کو وسیلہ بنا کر رعایا کو اپنی فکر اور اپنی تہذیب وثقافت کا اسیر بنانا تھا، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اپنے تمدن میں مغرب کا عکس ہو جائے، ان کا منصوبہ تھا کہ ان کے دماغ مغربی فکر کے سانچے میں ڈھل جائیں، ان کی کوشش تھی کہ وہ اپنی زبان بھول جائیں، اور ان کا اصل ہدف یہ تھا کہ رعایا اپنے مذہب وعقیدہ کے بارے میں بھی حکمراں کی متبع ہو جائے، اور اگر اتنا نہ ہو تو کم سے کم ان کے دلوں میں اپنے مذہب کی بابت شکوک وشبہات کے کانٹے چبھ جائیں۔

انگریزی رہنما اس پالیسی پر کتنی منصوبہ بندی کے ساتھ عمل پیرا تھے؟ اس کا اندازہ اس خط کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے جو میکاؤلے نے ۱۸۳۶ء میں اپنے والد کو لکھا تھا کہ:

> ”ہمارے انگریز اسکول دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں، اور اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ طلبہ کے لئے گنجائش نکلنی مشکل ہے...... اس تعلیم کا بہت زیادہ اثر ہندوؤں پر ہو رہا ہے، کوئی ہندو انگریزی پڑھنے کے بعد اپنے مذہب پر فی الواقع ایمان نہیں رکھ سکتا، مجھے پورا اعتماد ہے کہ اگر ہماری تعلیمی پالیسی کامیاب ہوئی تو بنگال میں کوئی بت پرست باقی نہ رہے گا، یہ سب فطری طور پر ہوگا، بغیر کسی مذہبی وعظ اور مداخلت کے“

> B.C.Rai History of Indian)
> Education p.135 بحوالہ: طرز تعلیم: ۷)

اسی لئے اردو زبان کے دو مشہور شعراء جو مشرق اور مغرب دونوں کے بادہ خواروں میں تھے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے، انہوں نے مسلمانوں کو للکارا اور اس

جدید نظام تعلیم کے فتنہ سے ان کو باخبر کرنے کی کوشش کی، میری مراد اکبر آلہ آبادی اور ڈاکٹر اقبال سے ہے، یہ کوئی مولوی اور دینی مدارس کے فیض یافتگان میں نہ تھے، بلکہ ان کی پوری تعلیم اسی درس گاہ میں ہوئی جو اس زمانہ میں مغرب کی نمائندہ تھی، بلکہ اقبال نے تو یورپ کے قلب میں پہنچ کر علم حاصل کیا اور اس نظام تعلیم کو سر کی آنکھوں سے دیکھا اور کہا اٹھے :

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

ایک موقعہ پر اقبال نے کیا تیکھی تنقید کی ہے!

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدنظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

غالباً اقبال زندہ ہوتے تو وہ اعتراف کرتے کہ پردہ اٹھ چکا ہے، اور جس الحاد کا انتظار تھا وہ اب نگاہوں کے سامنے پوری طرح بے لباس ہے۔

جن لوگوں نے اس نظام تعلیم پر تنقید کی ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ تحقیق وسائنس کے خلاف ہوں، سائنس تو کائنات میں چھپی ہوئی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہے، اگر اس سے لوگوں کو نفع پہونچے تو کوئی سمجھدار شخص کیسے اس کی مخالفت کرسکتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہر قوم کا نظام تعلیم اس کے افکار اور سماجی ماحول سے ہم آہنگ ہونا چاہئے، وہ علم کے ساتھ ساتھ اسے اپنے عقیدہ پر پختگی دے، اپنی تہذیب وثقافت سے اس کی وابستگی کو برقرار رکھے، وہ اپنے بارے میں احساس کمتری کا شکار نہ ہو، ہندوستان کو جو نظام تعلیم اپنے مغربی آقاؤں سے ملا، وہ اس خصوصیت سے محروم ہے، وہ ہندوستانیوں کو اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنے ادب اور اپنی سماجی قدروں کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا کرتا ہے، اور اس کی اہم وجوہ میں ایک یہ

ہے کہ ہم نے انگریزی زبان کوایک زبان کی حیثیت سے پڑھنے کے بجائے اسی کو ''ذریعہ تعلیم'' بنالیا، کہ ہمارے بچے اپنی الف، ب سے ہی انگریزی میں بولنا، انگریزی میں لکھنااور انگریزی میں سوچنا شروع کردیں۔

انگریزی کی عظمت کچھ اس طرح ہمارے دل ودماغ پر مسلط ہوئی کہ ہم نے اس کوعلم کی معراج سمجھ لیا، اور اس چیز نے ہمارے بچوں کو ذہنی اعتبار سے بھی اور صحت جسمانی کے اعتبار سے بہت نقصان پہونچایا ہے، غور کیجئے کہ ابتداء ہی سے انگریزی ذریعہ تعلیم قرار پائی، ہندوستان میں قومی زبان کی حیثیت سے اسے ہندی بھی پڑھنی ہے، اور چوں کہ یہ ایک ''مختلف لسانی'' خطہ ہے اس لئے ہر علاقہ کی اپنی اپنی زبانیں اس کے سواء ہیں، طالب علم اسے بھی پڑھے گا، اگر ہندی ریاستوں میں کوئی اور مقامی زبان نہیں تو اب قوم پر سنسکرت مسلط کی جارہی ہے، ان کے علاوہ مسلمانوں کو اپنے سماجی رابطہ اور مذہبی ورثہ سے وابستگی کے لئے اردو بھی پڑھنی ہے، اس طرح ہمارے مسلمان بچوں کو ابتدائی عمر سے ہی چار چار زبانوں کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

طبّی اعتبار سے نوعمر بچوں کے لئے یہ ایک بارگراں ہے، بالخصوص ان حالات میں کہ فی زمانہ چارسال کی عمر سے ہی بچوں کی تعلیم شروع کرادی جاتی ہے، اور ابھی زبان کا تلفظ بھی درست نہیں ہوتا کہ کتابوں کا ضخیم بستہ پشت پر رکھ دیا جاتا ہے، دوسرے کسی بھی انسان کے اندر اپنی زبان کو بے تکلف سمجھنے اور ادا کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے، اجنبی زبان کو اس طریقہ پر پڑھنا پڑھانا دشوار ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اصل مضمون کو سمجھنے اور اس میں فکری ترقی حاصل کرنے کے بجائے اس کا ذہن چند انگریزی فقروں کے گرد گھومتا رہتا ہے، اصل فن پر اس کی توجہ کم ہوتی ہے، اسی لئے دنیا کی جتنی ترقی یافتہ قومیں ہیں، انہوں نے علوم وفنون کو اپنی مادری زبان کا جامہ پہنایا ہے، اور وہ اپنے بچوں کو اسی زبان میں تعلیم دیتے ہیں، فرانسی اور جرمن جغرافیائی اعتبار سے برطانیہ سے کتنے قریب ہیں؟ لیکن ان کے یہاں ذریعہ تعلیم فرانسیسی اور جرمنی ہے، چین اور جاپان دنیا کے ترقی یافتہ اور معاشی اور صنعتی اعتبار سے طاقت ورترین ممالک میں ہیں، لیکن ان کے یہاں ذریعہ تعلیم چینی اور جاپانی ہے، روس میں جب کمیونسٹ

انقلاب آیا اور اس نے ترقی کی نئی کروٹ لی، تو سب سے پہلے مغربی علوم کو روسی زبان میں منتقل کیا، لیکن ہمارے ذہنوں پر انگریزی کا ایسا سحر چھایا ہوا ہے کہ ہم اپنی قومی زبانوں میں عصری تحقیقات کو منتقل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے، اور بجائے اس کے کہ ہم دوسرے علوم کو اپنی زبان کا جامہ پہناتے ہم نے خود اپنی زبان سے منہ پھیر لیا۔

مسلمان جب فاتحانہ یورپ تک پہونچے اور یورپ میں ان کو حکمت و دانش کا ورثہ ملا تو نہایت بے تعصبی کے ساتھ اسے گلے لگایا اور سر آنکھوں پر رکھا، لیکن جلد سے جلد اس علمی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کر لیا، عباسی دور میں اس سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے گئے وہ کسی صاحبِ علم کے لئے محتاج اظہار نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے مادری زبان سے محرومی کا ایک اور بڑا نقصان یہ ہے کہ ہمارے دینی علوم و معارف کا بہت بڑا حصہ اردو زبان میں ہے، انگریزی یا دوسری مقامی زبانوں میں اسلام پر جو کچھ کام ہوا ہے، وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں، ان حالات میں اگر ہماری نسلیں اردو زبان سے ناواقف رہیں تو یہ براہِ راست دین وایمان سے ان کا رشتہ کاٹ دینے کے مترادف ہوگا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو ذریعہ تعلیم کے معیاری مدارس قائم کریں، بچوں کو مادری زبان میں کم سے کم میٹرک تک تعلیم دیں، اور انگریزی کو بھی ایک زبان کی حیثیت سے پڑھائیں، تاکہ وہ اصل فن میں آگے بڑھ سکیں، اور جو صلاحیت محض سمجھنے اور سمجھانے میں صرف ہوتی ہے، وہی صلاحیت اصل مضمون میں استعمال ہو، یہ انشاء اللہ ان کی تعلیمی ترقی کا ضامن ہوگا، ہر سال اگر رینک لانے والے طلبہ وطالبات کا جائزہ لیا جائے تو یہ وہ ہیں جنہوں نے مادری زبان میں تعلیم حاصل کی ہے، پڑوسی ریاست مہاراشٹر میں بحمد اللہ کئی سال سے مسلم طلبہ اور طالبات اردو سے تعلیم پا کر امتیازی رینک لاتے ہیں۔

انگلش میڈیم کا جو طوفان اس وقت آیا ہوا ہے، اور غالباً مسلمان اس کے زیادہ شکار ہیں، وہ جہاں معاشی اعتبار سے متوسط خاندان کے لوگوں کی کمر توڑ رہا ہے، وہیں یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ بہت سے بچوں کے لئے یہ تعلیم ایسا بوجھ ثابت ہوتی ہے کہ وہ چند قدم چل کر تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنا تعلیمی سفر مکمل نہیں کر پاتے، اس کے علاوہ اردو زبان

سے ناواقفیت انہیں سماج سے بھی کاٹ دیتی ہے، وہ اپنے خاندان کے بزرگوں سے کسی اہم موضوع پر مؤثر گفتگو نہیں کر سکتے، اگر وہ باہر سے خط لکھیں تو ان کا خط پڑھا نہیں جاتا، اور دین و مذہب سے جوان کا رشتہ کمزور ہوتا ہے وہ نقصان تو سب سے سواء ہے۔ اس لئے اردو ذریعہ تعلیم کی درس گاہیں قائم کرنا، اپنے تعاونِ عمل سے انہیں مستحکم کرنا اور ان کو تقویت پہونچانا وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، اور اسی میں ہمارے مذہب اور تہذیب وثقافت کی حفاظت ہے۔

(۳۰ر جولائی ۲۰۰۰ء)

راہِ عمل ۵

دینی و عصری درسگاہوں کے مشترک مسائل

اساتذہ کے ساتھ سلوک

چند دنوں میں ۵ رستمبر کی تاریخ آنے والی ہے، یہ بعض اعتبار سے نہایت اہم تاریخ ہے، کیوں کہ اس دن کو ''یوم اساتذہ'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، اساتذہ ہی سماج وقوم کے اصل معمار ہیں، کیونکہ تعلیم گاہوں کی حیثیت سپلائی ہاؤس کی ہے، جہاں سے ہر شعبہ زندگی کو افراد فراہم کئے جاتے ہیں۔ حکومت کو اچھے منتظم، عدالتوں کو منصف اور جج، دواخانوں کو طبیب اور معالج، کارخانوں کو انجینئر اور کارکن، مارکٹ کو مارکٹنگ کرنے والے کارکن اور اچھی منصوبہ بندی کرنے والے افراد واشخاص، مالیاتی اداروں کو اچھے محاسب، یہاں تک کہ ملک کی سرحدوں کو باشعور فوجی اور ان سب سے بڑھ کر سماج کو سچا خادم اور مصلح، غرض زندگی کا کوئی شعبہ نہیں، جو تعلیم گاہوں سے مستغنی ہو اور ان تعلیم گاہوں کے ارتقاء واستحکام اور نافعیت وافادیت کا پورا انحصار ان ہی ساتذہ پر ہے۔

استاذ کی ذمہ داری معمولی نہیں، وہ اپنی آنکھیں جلاتا ہے، دل ودماغ کو سلگاتا ہے، اور اپنے مطالعہ کا حاصل ان لوگوں کو سمجھاتا ہے جو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اور جو اپنی بے شعوری کی وجہ سے اس راہ کی آبالہ پائی کو سب سے زیادہ گراں خاطر تصور کرتے ہیں۔ تعلیم کا کام آسان نہیں، بالخصوص متوسطات تک کی تعلیم، کیوں کہ یہ ان لوگوں کو دکھانا ہے جو دیکھنا نہیں چاہتے، یہ ان لوگوں کو سنانا ہے جو سننے کو تیار نہیں، یہ ان لوگوں کو سمجھانا ہے جو سمجھنے پر آمادہ نہیں، اور یہ ایسے فقیر کی کشکول بھرنا ہے جس کو اپنی فقر واحتیاج اور ضرورت کا شعور تک نہیں، اس لئے اساتذۂ ومعلمین کی ذمہ داریاں بہت ہیں، علم اور طالب علم کی محبت اور افادۂ ونفع رسانی کے جذبۂ صادق کے بغیر کوئی شخص کامیاب استاذ ومعلم نہیں ہوسکتا، استاذ کے دل کو اپنے طلبہ کی محبت سے اسی طرح لبریز ہونا چاہئے، جیسے مشک خوشبو سے ہوتا ہے، جب ہی اس کے علم کی خوشبو پھیلے گی

اور اس کا فیضِ علم عام و تام ہوگا۔

استاذ کی ذمہ داریاں جتنی زیادہ ہیں، اسی نسبت سے اس کے حقوق اور اس کے تئیں طلبہ اور اولیاء طلبہ اور سماج کی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں، استاذ کی اہمیت اور اس کے مقام کی رفعت کے لئے یہی بات کافی ہے کہ قرآن مجید نے امت سے رسول اللہ ﷺ کی جس نسبت کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے، اور اس کا بار بار ذکر کیا ہے، وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ اس امت کے معلم ہیں، **یعلمھم الکتاب والحکمۃ** رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ مسجد نبوی تشریف لائے تو مسجد میں مختلف حلقے قائم تھے، لیکن آپ ﷺ نے اس حلقے کا انتخاب فرمایا جو علمی مذاکرے کا تھا، اور ارشاد فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں **انی کنت بعثت معلما**۔

اساتذہ کا بنیادی حق ان کے ساتھ تکریم واحترام کا رویہ اختیار کرنا ہے، طلبہ ہوں یا اولیاء طلبہ اور حکومت ہو یا سماج، اساتذہ کا احترام سب کی ذمہ داری ہے، قرآن مجید نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا نقل کیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام قانونِ شریعت کے سب سے بڑے عالم اور اپنے وقت کے جلیل القدر پیغمبر ہیں، اور حضرت خضر علیہ السلام تکوینی علوم کے عالم ہیں، ظاہر ہے اس اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علمی مقام بڑھا ہوا ہے، چنانچہ ایک خاص پس منظر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام سے علمی استفادہ کریں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ایک رفیق کے ساتھ ایک جاں گسل اور بھٹکا دینے والا سفر کر کے حضرت خضر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت خضر علیہ السلام کے مزاج اور گفتگو کا جو نقشہ قرآن نے کھینچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت صاف گو بلکہ ایک حد تک تیز مزاج آدمی تھے، خود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بہ مقابلہ جمال کے جلال کا رنگ غالب تھا، حضرت خضر علیہ السلام نے غیر مشروط طور پر تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول نہیں فرمائی بلکہ یہ شرط بھی لگائی کہ چاہے کتنی بھی خلاف طبیعت بات نظر آئے، مہر بہ لب رہیں۔

اب ایک طالب علم اور استاذ کا سفر شروع ہوا، گویا ایک موبائل درس گاہ ہے، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے داخلہ لیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام سے بار بار خلاف طبع اور بعض اوقات بہ ظاہر خلاف شرع باتیں صادر ہوتی ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے، اور بے ساختہ سوال کر بیٹھتے ہیں، پھر حضرت خضر علیہ السلام کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے، اس تنبیہ کے جواب میں نہ احتجاج ہے، نہ معذرت، نہ تنقید ہے نہ اعتراض، بلکہ کمال تواضع کے ساتھ اپنی بے صبری کا اعتراف اور آئندہ دامن صبر نہ چھوڑنے کا وعدہ، آخر یہ نوبت ایک بار نہیں بلکہ تین تین بار پیش آتی ہے، اور حضرت خضر علیہ السلام کی طرف سے پروانۂ فراق دے دیا جاتا ہے، قرآن نے اس واقعہ کو عبرت و موعظت کے لئے بیان کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر کو بھی اپنے استاذ کے ساتھ کس درجہ تکریم اور تواضع کا سلوک کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

یہی مزاج رسول اللہ ﷺ نے اس امت کا بنایا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: علم حاصل کرو، علم کے لئے سکینت و وقار سیکھو، اور جس سے علم حاصل کرتے ہو، اس سے تواضع اختیار کرو، **تو اضعوا لمن تعلموا منه**، (مجمع الزوائد: ۱/۱۲۹) چنانچہ مسلمانوں کے یہاں استاذ کے ساتھ تواضع کی ایک روایت سی رہی ہے، امام شعبیؒ سے مروی ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھی، میں نے خچر قریب کیا کہ وہ سوار ہوں، تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے، اور خچر کی رکاب تھام لی، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: اے برادر زادہ رسول! اسے چھوڑ دو، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ہمیں علماء اور اکابر کے ساتھ اسی سلوک یعنی تواضع و خدمت کا حکم دیا گیا ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا، اور فرمایا کہ ہمیں بھی رسول اللہ ﷺ کے اہلِ بیت کے ساتھ اس سلوک کا حکم ہے (احیاء العلوم: ۱/۵۰) امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے استاذ حمادؒ کے مکان کی طرف بھی اپنا پاؤں نہیں کرتے تھے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی باندی حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب حضرت ثابت رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس آتے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنی باندی سے فرماتے

خوشبولاؤ کہ میں اپنے ہاتھ میں لگاؤں، کیوں کہ ثابت رضی اللہ عنہ میرے ہاتھوں کو بوسہ دئے بغیر راضی نہیں ہوتے، **لا یرضی حتی یقبل یدی**، (مجمع الزوائد:۱؍۱۳۰)

مشہور محدث امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں آداب علم سے متعلق ایک باب کتاب العلم کا قائم کیا ہے، اور بڑے نفیس انداز پر علم سے متعلق اساتذہ اور طلبہ کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً یہ کہ جب استاذ درس دینے میں مشغول ہو، اور بیچ میں طالب علم سوال کرلے تو اس استاذ کو کیا کرنا چاہئے، اونچی آواز خلاف ادب سمجھی گئی ہے، لیکن استاذ اپنے شاگرد سے اونچی آواز میں بات کرسکتا ہے، مجلس درس کا ادب یہ ہے کہ طالب علم کو جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے، کیا استاذ تعلیم اور نصیحت وموعظت میں اپنے غصہ کا اظہار کرسکتا ہے؟ اس طرح کے بہت سے آداب طلبہ سے متعلق ذکر کئے گئے ہیں، استاذ کا کردار و اخلاق کیسا ہو؟ اور طلبہ کے ساتھ وہ کیا رویہ اختیار کرے؟ اس پر بھی امام بخاری نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے، امام بخاری نے تعلیم وتعلم کے آداب میں اس بات پر بھی متنبہ فرمایا ہے کہ محض ذہانت اور محنت کسی طالب علم کے کامیاب ہونے کے لئے کافی نہیں، بلکہ استاذ کی دعاء بھی نہایت ضروری چیز ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کم سن صحابی تھے، اور حضور ﷺ سے زیادہ شرف رفاقت حاصل نہیں تھا، اس کے باوجود قرآن وحدیث اور فقہ و اجتہاد میں بہت بلند پایہ شمار کئے گئے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ ﷺ کے لئے تفقہ کی دعاء فرمائی تھی۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۷۵، باب قوله: اللهم علمه الكتاب) اور ظاہر ہے کہ دل سے دعاء اس وقت نکلتی ہے جب طلبہ اور اولیاء طلبہ سے استاذ خوش ہو اور دل گرفتہ نہ ہو۔

آج کل صورتِ حال یہ ہے کہ استاذ اور شاگرد کا تعلق محض ایک قانونی اور تجارتی تعلق بن کر رہ گیا ہے، نہ احترام ہے اور نہ محبت، نہ شفقت ہے اور نہ دردمندی، نہ اساتذہ میں اپنے طلبہ کو پروان چڑھانے کی تڑپ ہے، اور نہ طلبہ میں اپنے استاذ سے سچی محبت اور عظمت، اولیاء طلبہ کا حال یہ ہے کہ کسی سرکاری آفس میں پہونچیں گے، یا سیاست داں کی بارگاہ میں حاضری دیں گے تو خوشامد اور چاپلوسی کریں گے۔ اور وہ اساتذہ جو اپنا خون جگر پلا کر ان کے بچوں کی علمی نشو ونما کرتے ہیں، ان سے نہ صرف ناشائستہ گفتگو کریں گے،

بلکہ موقع ہوتو ہاتھا پائی سے بھی دریغ نہ کریں گے، یہ انتہائی شرمناک اور افسوس ناک بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تملق وخوشامد مؤمن کے اخلاق میں سے نہیں، سوائے طلب علم کے، کہ علم حاصل کرنے کے لئے خوشامد بھی کرنی چاہئے، (احیاء العلوم: ۱/ ۵۰) ایسی حرکتوں سے اصل نقصان خود طلبہ کا ہے، کیوں کہ جب استاذ طالب علم کی نظر میں بے وقار ہو جائے، تو علم کی عظمت بھی اس کے دل سے جاتی رہے گی، کیوں کہ تواضع اور جھکاؤ کے بغیر علم سے فائدہ نہیں پہونچتا، اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ دعوت حق ان ہی لوگوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے، جن کے پاس قبول کرنے والا دل اور ہمہ تن متوجہ رہنے والے کان بھی موجود ہوں، لمن كان له قلب او ألقى السمع و هو شهيد ۔

امام غزالیؒ نے جو فلسفۂ اخلاق کے بڑے ماہر اور انسانی نفسیات کے کامل درجہ رمز آشنا تھے، انہوں نے حصولِ علم کے لئے دس ضروری شرطیں لکھیں ہیں: ان میں سے تیسری شرط کو ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے:

> علم پر تکبر نہ کرے، اور استاذ کے مقابلہ سرکشی کا ثبوت نہ دے، بلکہ پورے طریقہ پر اپنے معاملات کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دے، اور جیسے ایک جاھل مریض شفقت کرنے والے ماہر طبیب پر یقین رکھتا ہے، اسی طرح اپنے استاذ پر بھروسہ کرے۔ اور جیسے ایک جاہل مریض شفقت کرنے والے ماہر طبیب پر یقین رکھتا ہے، اسی طرح اپنے استاذ پر بھروسہ کرے، استاذ کے لئے تواضع اختیار کرے، اور استاذ کی خدمت کر کے ثواب اور شرف کا خواستگار رہے۔
>
> (احیاء العلوم: ۱/ ۵۰)

جہاں اساتذہ کے ساتھ احترام ومحبت ضروری ہے، وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ معاشی اعتبار سے بھی ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھا جائے، جس استاذ کا ذہن نان و نمک کی فکر سے آزاد نہ ہوگا وہ کیسے تعلیم کی طرف یکسو ہو سکے گا؟ حضرت عمرؓ نے جب

اپنے دورِ خلافت میں وظائف متعین کئے تو فریضۂ تعلیم انجام دینے والوں کا وظیفہ بہت ہی نمایاں رکھا، کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے صاحبزادے حماد کو جب انکے استاذ نے سورۂ فاتحہ پڑھائی تو آپ نے پانچ سو دینار انہیں پیش کیا، اور فرمایا کہ یہ بھی کم ہیں، گر اس وقت میرے پاس اس سے زیادہ ہوتا، تو اور پیش کرتا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی نظر میں تعلیم کی کیا قدر و قیمت تھی، دینی مدارس کے ذمہ داران اور نجی درسگاہوں کے منتظمین کے لئے خاص طور پر یہ پہلو قابل توجہ ہے!

(۱ر ستمبر ۲۰۰ء)

اساتذہ —— مقام اور ذمہ داریاں

ابھی پانچ ستمبر کی تاریخ گزری ہے، یہ دن ''یوم اساتذہ'' (Teachers Day) کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، کسی خاص سلسلہ میں ''دن منانا'' ایک رسم سا ہو گیا ہے؛ اس لیے سوائے اخبارات میں اکادکا رسمی بیان کے، ایسے مواقع پر کچھ نہیں ہوتا، حالاں کہ ایسے دنوں کو متعلقہ موضوعات پر سنجیدہ غور وفکر، تبادلۂ خیال اور ان کی روشنی میں انقلابی تبدیلیوں کی کوششوں کا محرک بنانا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس نہایت ہی مقدس اور معزز پیشہ ہے، ہر مذہب اور ہر سماج میں اساتذہ کو بڑا احترام حاصل رہا ہے، کیوں کہ سماج میں جو کچھ بھلائیاں اور نیکیاں پائی جاتی ہیں اور خدمت خلق کا جو سروسامان موجود ہے، وہ سب دراصل تعلیم ہی کا کرشمہ ہے اور درسگاہیں ان کا اصل سرچشمہ، اسلام کی نگاہ میں انسانیت کا سب سے مقدس طبقہ پیغمبروں کا ہے، پیغمبر کی حیثیت اپنے اُمتی کی نسبت سے کیا ہوتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ اس کا ذکر فرمایا ہے اور وہ یہی کہ نبی انسانیت کا مربی اور معلم ہوتا ہے، وہ تعلیم بھی دیتا ہے اور انسانیت کو اس علم کے سانچہ میں ڈھالنے کی بھی کوشش کرتا ہے: ﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ﴾ (آل عمران:۱۶۴)

اسی لیے اساتذہ کا احترام اسی قدر ضروری ہے جتنا اپنے والدین کا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فقہاءِ صحابہ میں ہیں، حدیث کی نقل و روایت اور فہم و درایت میں بھی بڑے اعلیٰ درجے کے مالک ہیں، اور تفسیر وفہم قرآن کا کیا پوچھنا؟ کہ اُمت میں سب سے بڑے مفسر مانے گئے ہیں، لیکن اس مقام و مرتبہ کے باوجود صورتِ حال یہ تھی کہ حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی سواری کی رکاب تھام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں اہل علم کے ساتھ اسی سلوک

کا حکم دیا گیا ہے، (مستدرک حاکم: ۳/۴۲۳) خلف احمر مشہور امام لغت گزرے ہیں، امام احمدؒ ان کے تلامذہ میں ہیں، لیکن علومِ اسلامی میں مہارت اور زہد وتقوی کی وجہ سے امام صاحب کو اپنے استاذ سے بھی زیادہ عزت ملی، اس کے باوجود امام احمدؒ کبھی ان کے برابر بیٹھنے کو تیار نہیں ہوتے اور کہتے کہ آپ کے سامنے بیٹھوں گا، کیوں کہ ہمیں اپنے اساتذہ کے ساتھ تواضع اختیار کرنے کا حکم ہے۔ (تذکرۃ السامع والمتکلم: ص: ۸۷) امام شافعیؒ امام مالکؒ کے شاگردوں میں ہیں، کہتے ہیں کہ جب میں امام مالکؒ کے سامنے ورق پلٹتا تو بہت نرمی سے، کہ کہیں آپؒ کو بارِ خاطر نہ ہو، (حوالہ سابق: ص: ۸۸) خود قرآن مجید نے حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، باوجودیکہ حضرت موسی علیہ السلام مقامِ نبوت پر فائز تھے؛ لیکن انہوں نے نہایت صبر اور تحمل کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام کی باتوں کو برداشت کیا اور بار بار معذرت خواہی فرمائی، امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں منقول ہے کہ اپنے استاذ حمادؒ کے مکان کی طرف پاؤں کرنے میں بھی لحاظ ہوتا تھا، امام صاحبؒ خود اپنے صاحب زادہ کا نام اپنے استاذ کے نام پر رکھا، قاضی ابویوسفؒ کو اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ سے ایسا تعلق تھا کہ جس روز بیٹے کا انتقال ہوا اس روز بھی اپنے استاذ کی مجلس مین حاضری سے محرومی کو گوارا نہیں فرمایا۔

بدقسمتی سے اب اساتذہ اور طلبہ کے درمیان محبت واحترام کا یہ جذبہ مفقود ہے، طلبہ اپنے اساتذہ کو ایسی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ ان کے حریف اور فریق ہیں، نقل وحرکت اور نشست وبرخاست میں ادب واحترام تو بہت دور کی چیز ہے، رودررو فقرے چست کرنے اور جملے کسنے میں بھی کوئی حجاب نہیں، ظاہر ہے اس بے احترامی اور بے اکرامی کے ساتھ کیوں کر کسی شخص سے فیض یاب ہوا جا سکتا ہے؟

جو شخص جتنے بلند مقام ومرتبہ کا حامل ہو، اسی نسبت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں، استاذ باپ کا درجہ رکھتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو وہی محبت اور پیار بھی دے، جو ایک باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اپنے طلبہ کی نسبت سے فرماتے تھے کہ اگر ان پر ایک مکھی بھی بیٹھ جاتی ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے، (تذکرۃ السامع: ص: ۴۹) سلف صالحین کو اپنے شاگردوں سے ایسی محبت ہوتی کہ ان کی نجی

دشواریوں کو بھی حل کرتے ، امام شافعیؒ بڑے اعلیٰ درجے کے فقیہ ومحدث ہیں ، یہ حصولِ علم کے لیے مدینہ پہنچے، غریب آدمی تھے ، امام مالکؒ نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو خود اپنا مہمان بنایا اور جب تک مدینہ میں رہے ، ان کی کفالت کرتے رہے ، پھر جب امام شافعیؒ نے مزید کسب علم کے لیے کوفہ کا سفر کرنا چاہا تو سواری کا نظم بھی کیا اور اخراجات سفر کا بھی ، اور شہر سے باہر آ کر نہایت محبت سے آپؒ کو رخصت کیا، امام شافعیؒ کوفہ آئے اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید امام محمدؒ کی درس گاہ میں بحیثیت طالب علم شریک ہوگئے ، یہاں بھی امام محمدؒ نے ذاتی طور پر امام شافعیؒ کی کفالت فرمائی ؛ بلکہ بھرپور تعاون فرمایا، امام شافعیؒ اس حال میں کوفہ پہنچے کہ نہایت ہی معمولی کپڑا آپ کے جسم پر تھا ، امام محمدؒ نے اسی وقت ایک قیمتی جوڑے کا انتظام فرمایا جو ایک ہزار درہم قیمت کا تھا ، پھر جب امام شافعیؒ کو رخصت کیا تو اپنی پوری نقدی جمع کر کے تین ہزار درہم انہیں حوالہ کیا ، (جامع بیان العلم لابن عبد البر: ص:۲۶۸) امام ابو یوسفؒ کے والد دھوبی کا کام کرتے تھے اور بڑی عسرت کے ساتھ گزر اوقات ہوتی تھی ، بلکہ اس افلاس و مجبوری کی وجہ سے ان کے والدین کو امام ابو یوسفؒ کا پڑھنا پسند نہیں تھا ، وہ چاہتے تھے کہ آپؒ کسب معاش میں مصروف ہوں اور گھر کے اخراجات میں ہاتھ بٹائیں ، امام ابوحنیفہؒ ان کی ذہانت اور طلب علم کے شوق سے بہت متاثر تھے ، اس لیے آپؒ نے بنفس نفیس ان کے اخراجات برداشت کئے۔

آج کل صورتِ حال یہ ہے کہ تدریس محض درس گاہ کی ملازمت نہیں کہ آدمی تکمیلِ ضرورت کے لیے کچھ تنخواہ لے لے اور بے غرضی کے ساتھ اپنے شاگردوں کو پڑھائے ، بلکہ تدریس ایک ایسی تجارت بن گئی ہے کہ جس کے لیے کسی سرمایہ اور دوکان کی ضرورت نہیں ، اساتذہ تاجر ہیں اور طلبہ گاہک ، اساتذہ اسکولوں اور کالجوں میں قصداً غیر معیاری اسباق دیتے ہیں اور اسباق کو تشنہ رکھتے ہیں ، تاکہ طلبہ ان سے ٹیوشن پڑھیں اور کم وقت کی زیادہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہوں، ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دانش گاہوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کیلیے بھی ''شایانِ شان نذرانہ'' پیش کرنا ہوتا ہے!

یہ ایسی شرمناک بات ہے کہ شریف النفس لوگوں کے لیے اس کا تذکرہ بھی گراں خاطر ہے ، ایک ایسا مقدس رشتہ جو مکمل طور پر بے غرضی پر مبنی ہے ، جو ایک دوسرے سے بے

لوث محبت اور بے پناہ شفقت کا متقاضی ہے اور جو تعلیم گاہیں انسانیت، محبت اور فرض شناسی کا احساس پیدا کرنے کے لیے ہیں، وہیں سے ایسی بداخلاقی اور حرص وطمع کا سبق ملے تو پھر کون سی جگہ ہوگی جہاں انسان کو انسانیت کا سبق مل سکے گا؟ حماد بن سلمہ ایک مشہور محدث گزرے ہیں، ان کے ایک شاگرد نے چین کا تجارتی سفر کیا اور کچھ قیمتی تحائف اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیا، استاذ نے فرمایا کہ اگر یہ تحفے قبول کروں گا تو آئندہ پڑھاؤں گا نہیں اور پڑھاؤں گا تو یہ تحفے قبول نہیں کرسکتا۔ (الکفایۃ للخطیب :ص:۱۵۳) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانیٔ دار العلوم دیوبند) کا حال یہ تھا کہ صرف تیس روپے ماہانہ پر خدمت فرماتے تھے، اس درمیان بعض رئیسوں کی طرف سے تین سو اور پانچ سو روپے ماہانہ پر کام کرنے کی درخواست کی گئی تو آپ نے معذرت کردی اور فرمایا کہ اللہ کے یہاں ان ہی پیسوں کا حساب دینا مشکل ہے، اگر اور زیادہ پیسے لئے جائیں تو ان کا حساب تو اور بھی دشوار ہوگا۔

مسئلہ صرف پیسوں ہی کے لین دین کا نہیں؛ بلکہ ہر طرح کی نصح وہمدردی کا ہے، ابن جماعہ نے خوب لکھا ہے کہ استاذ کا فرض ہے کہ وہ اپنے لیے جو پسند کرتا ہے وہی اپنے شاگردوں کے لیے پسند کرے اور جو چیز اپنے لیے ناپسند ہے اسے اپنے شاگردوں کے لیے بھی ناپسند۔ (تذکرۃ السامع:ص:۴۹) استاذ کو اپنے شاگرد سے بے حد محبت ہونی چاہئے اور اسے ہر وقت اس کا خیر خواہ ہونا چاہئے، جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کی ترقی پر خوش ہوتا ہے اور اس کی ناکامی پر کبیدہ خاطر، یہی تعلق ایک استاذ کو اپنے شاگردوں کے ساتھ ہونا چاہئے، یہ تعلق بے غرض اور بے لوث ہو اور پاکیزگی پر مبنی ہو، اگر اساتذہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ طلبہ میں ان کے تئیں وہی احترام نہ پیدا ہو جن کا ذکر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ تدریس کے لیے کسی شخص کا انتخاب اہلیت اور لیاقت کی بناء پر ہونا چاہئے نہ کہ تعلقات اور دوسری بنیادوں پر؛ اس لیے کہ تدریس نہایت ہی اہم اور نازک کام ہے، مشہور بزرگ ابوبکر شبلی سے منقول ہے کہ جو شخص قبل از وقت کسی منصب پر فائز ہو جائے وہ دراصل اپنی رسوائی کے درپے ہے، ''من تصدر قبل أوانہ فقد تصدر لھوانہ'' (تذکرۃ السامع و المتکلم:۴۵) اہلیت کا مطلب یہ ہے کہ جس مضمون کی تدریس اس کے

حوالہ کی جارہی ہے، وہ واقعی اس مضمون میں عبور رکھتا ہو اور اپنے اخلاق و عادات کے اعتبار سے بھی انگشت نمائی سے محفوظ ہو۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مضمون پر مناسب محنت کرتا ہو اور اس کے مطالعہ و تحقیق میں ارتقاء اور تسلسل ہو کہ اس کے بغیر وہ اپنے طلبہ کو کما حقہ فیضیاب نہیں کر سکتا، وہ اوقاتِ درس کا پابند ہو اور اپنے وقت کو طلبہ کی امانت تصور کرتا ہو، قرآن مجید نے کم ناپنے تولنے کی بڑی مذمت فرمائی ہے اور اہل علم نے لکھا ہے کہ ناپ تول کی کمی میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ وہ ملازمت کے اوقات میں سے کوئی حصہ اپنی ضرورت میں اور مفوضہ کام کے علاوہ کسی اور کام میں خرچ کرے، یہ بھی ایک طرح کی چوری ہے اور ان اوقات کی اجرت اس کے لیے حلال نہیں۔

اساتذہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی نفسیات کا شعور رکھتے ہوں اور عملی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، طالب علم کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کرنا اور اس کی تذلیل کے درپے ہونا نہایت اوچھی بات ہے اور کسی بھی طرح استاذ کے شایان شان نہیں، رسول اللہ ﷺ کا معمولِ مبارک تھا کہ اگر کسی کی غلطی پر ٹوکنا ہوتا تو تنہائی میں توجہ دلاتے اور اگر متعدد افراد کو اس غلطی میں مبتلا دیکھتے تو مجمعِ عام میں کسی کا نام لئے بغیر مبہم انداز میں توجہ دلاتے، چوں کہ مقصود اصلاح ہے نہ کہ انتقام، ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ کے بعض نو آموز رفقاء نے مسجد میں پیشاب کردیا، آپ ﷺ نے اس پر پانی بہادیا اور کسی ناگواری کا اظہار کئے بغیر محبت کے ساتھ سمجھانے پر اکتفا فرمایا، بعض طلبہ بظاہر شر پسند ہوتے ہیں، لیکن اگر تنہائی میں بلا کر ان کی تفہیم کی جائے اور ان کی ذہانت کو تخریبی کاموں کے بجائے تعمیری کاموں کی طرف موڑ دیا جائے تو بآسانی ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور وہ قوم کے لیے ایک مخلص عنصر ثابت ہوسکتے ہیں۔

اساتذہ کے لیے علمی لیاقت کے ساتھ اخلاقی اقدار بھی نہایت ضروری وصف ہے، استاذ کو اتنا باوقار ہونا چاہئے کہ اس کی ایک نگاہِ درشت سے طلبہ سہم جائیں، اگر اساتذہ خود اخلاقی پستی میں مبتلا ہوں، طلبہ سے سطحی گفتگو کرتے ہوں، ان کے سامنے فحش ہنسی مذاق کیا

کرتے ہوں، ان کے کردار کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور ان کی زبان وبیان سے وقتاً فوقتاً سوقیانہ پن اور پھوہڑ پن کا اظہار ہوتا ہو، تو بجا طور پر طلبہ ان کو اپنا بے تکلف دوست سمجھتے ہیں اور استاذ کا درجہ نہیں دیتے، کیوں کہ یہ ایک فطری بات ہے کہ انسان خود کتنا بھی برا ہو، وہ اپنے بزرگوں کو اس سے ماوراء دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سماج اور قوم کی تعمیر میں اساتذہ کا بڑا رول ہے، وہ نہ صرف طلبہ بلکہ سماج کے لیے بھی قابلِ احترام ہیں، لیکن اسی قدر ضروری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور جیسے وہ اپنے حقوق کے لیے احتجاج کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتتے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اپنے فرائض وواجبات پر بھی نگاہ رکھیں اور خود احتسابی سے بھی غافل نہ ہوں۔

(۱۱/ستمبر ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

طلبہ کی تادیب اور فہمائش کے شرعی اُصول ☆

انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے اور شر کی طرف رجحان اس کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے کریم بن کریم بن کریم بن کریم حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کی زبان حق ترجمان سے کہلایا ہے: ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ﴾ (یوسف: ۵۳) —— پھر بہت سی غلطیاں ہیں جن پر تقاضۂ عمر بھی انسان کو اُکساتا ہے، اس لئے بچوں سے غلطیوں کا سرزد ہوجانا کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے، تاہم ان کی اصلاح اور ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے۔

اصلاح کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ استاذ اور مربی طالب علم کو خود سے مانوس کرلے اور اپنے استاذ سے طالب علم کو ایک روحانی محبت اور پاکیزہ وارفتگی پیدا ہوجائے، ایک مخصوص مدت میں جب تک طلبہ کو خود سے مانوس نہ کرلیا جائے، ان پر سختی کرنا قبل از وقت ہوگا، پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہم کو یہ حکمت واضح طور پر ملتی ہے، مثلاً ایک طرف رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کی سخت مذمت فرمائی جو مسجد میں تھوکیں یا کسی گمشدہ چیز کا اعلان کریں، دوسری طرف ہمیں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک دیہاتی نے جب مسجدِ نبوی میں پیشاب کرنا شروع کردیا اور صحابہ نے اس کو مسجد سے نکالنا چاہا تو آپ ﷺ نے منع فرمادیا اور جب وہ پیشاب کر چکے تو آپ نے اسے پانی سے دُھلوا دیا اور نہایت نرمی سے ان کی فہمائش کی کہ مسجد صرف عبادت کی جگہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کا یہ فرق اسی

☆ غالباً ۱۴۱۰ھ میں دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد میں دینی تعلیم اور دینی مدارس کے موضوع پر ایک ریاستی مذاکرہ رکھا گیا تھا جس کا ایک موضوع طلبہ کی تادیب میں بے اعتدالی بھی تھا، اسی سلسلہ میں یہ تحریر مرتب کی گئی تھی۔

پر مبنی تھا، یہ نومسلم تھے اور ابھی اسلام اور پیغمبر اسلام سے کما حقہ مانوس نہیں تھے اور وہ تہدیدان صحابہ کے لئے تھی جو بعض مفسد ذہن طلبہ کو چھوڑ کر عام بچوں کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ استاذ کی تھوڑی سی شفقت اور محبت بہت جلد ان کو گرویدہ بنادیتی ہے؛ تاہم اس کے لئے ضروری ہے کہ استاذ شفقت اور وقار کا ایک بہترین آمیزہ ہو، اس کی شفقت ومحبت طلبہ کو اس سے مانوس رکھتی ہے اور اس کا وقار طلبہ سے کم سے کم اختلاط، کثیف اور ناشائستہ ہنسی مذاق سے پرہیز، خصوصیت سے زبان اور لب ولہجہ میں احتیاط اور تعلیم کے معاملہ میں پختگی اور عدم کوتاہی اس کو باوقار بنائے رکھے، اس کے مزاج میں ایسا غلبۂ غضب بھی نہ ہو کہ طلبہ کو اس سے توحش ہو اور مزاج میں اتنا غیر سنجیدہ بھی نہ ہو کہ طلبہ کو ان سے تکلف اور حجاب باقی نہ رہے۔

نیز وہ طلبہ کے ذاتی معاملات و واقعات پر بھی نظر رکھے مثلاً کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کرلی جائے، کسی کے ہاں کوئی حادثہ پیش آیا تو اس سے کلمات تعزیت کہے، بیماری کے بعد مدرسہ آئے تو اس کی مزاج پرسی کرلی جائے —— یہ وہ باتیں ہیں جو بہ ظاہر صرف چند الفاظ ہیں لیکن درحقیقت انسان کے ذہن پر گہرے نقوش واثرات چھوڑتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک حد تک بچوں کی غلطیوں کو نظر انداز بھی کرنا چاہئے اور ایسی صورت اختیار کرنی چاہئے کہ گویا استاذ ان کی اس غلطی سے ناواقف اور انجان ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو بالکل قید وبند میں محسوس نہ کریں اور رفتہ رفتہ مدرسہ کی تربیت کے ماحول میں خود کو ڈھال لیں، —— حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''ایک شخص نشہ کی حالت میں پکڑا گیا، لوگوں نے اس کو پکڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لانے لگے، جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکان کے پاس لوگ پہنچے تو ان کا نشہ اُتر گیا اور مارے شرم کے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے چمٹ گئے اور کسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے تیار نہ ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی سزا نہیں دی اور نہ خود اپنے سامنے بلایا'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۴۷۶، باب الحد فی الخمر، عن ابن عباس رضی اللہ عنہ) یہ غلطی کو نظر انداز کرنے کی ایک مثال ہے۔

مزاج کے رُخ کی تبدیلی

اصلاح کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انسان کے فطری مزاج و مذاق کو بدلا نہیں جا سکتا؛ البتہ اس کا ''رُخ'' تبدیل کیا جا سکتا ہے، مثلاً کسی طالب علم کو دیکھا جائے، کہ وہ ہر کام میں دوسرے ساتھی کو اپنا حریف سمجھتا ہو اور اس کو زیر کرنے کا خواہاں رہتا ہو، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر جذبۂ مسابقت ہے استاذ کا فرض ہے کہ وہ اس کے اس جذبۂ مسابقت کو دوسری چیزوں سے پھیر کر کتاب اور اس کی یادداشت کی طرف یکسو کردے۔

مدارس میں جو طلبہ فتنہ وفساد کا سبب بنتے ہیں اور لیڈری کرتے ہیں، اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کے اندر جذبۂ خودنمائی ہوتا ہے، اب اگر تقریر وتحریر میں اس کے وقت کو زیادہ سے زیادہ مصروف کردیا جائے اور وقتاً فوقتاً اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کی بعض محنتوں کو شائع کردیا جائے تو اس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے اور اب خود کو نمایاں کرنے کا جذبہ ایک صحیح رُخ اختیار کر لیتا ہے، ایسے طلبہ کو اگر مصروف نہ رکھا جائے تو وہ پورے ماحول کے لئے سخت مضر ثابت ہوتے ہیں، اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: ''خيار كم فى الجاهلية خيار كم فى الإسلام'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۶۸۹، باب کتاب تفسیر سورۂ یوسف) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج کی درشتی اسلام کے بعد بھی باقی رہی، مگر پہلے اس کا استعمال اظہار شجاعت و مردانگی کے لئے تھا اور اب وہ فاروقیت کا نشان بن گئی ''رضی اللہ عنہ''۔

موعظت

طلبہ جب کوئی غلطی کریں تو سب سے پہلے موعظت اور تذکیر سے کام لینا چاہئے اور انفرادی طور پر تنہائی میں محبت کے ساتھ ان کو سمجھانا چاہئے، انفرادی نصیحت اکثر اوقات انسان پر بہت اثر انداز ہوتی ہے؛ اسی لئے اسلام کی دعوت واشاعت میں انفرادی دعوت ہی کو زیادہ دخل رہا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ استاذ پہلے طالب علم کے مزاج اور اس کی بنیادی کمزوریوں کو سمجھے اور اس کی دو تین بنیادی غلطیوں کو اپنے ذہن میں رکھے،

پھر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ان سب کے بارے میں یکے بعد دیگرے سمجھائے اور عہد لے کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا، مثلاً ایک بچہ چوری کرتا ہے، لوگوں سے قرض لیتا رہتا ہے، اپنے سامان بیچ لیتا ہے، گھر سے لائے ہوئے پیسوں کو جلد ختم کر دیتا ہے، تو یہ اس کی بنیادی کمزوری فضول خرچی کا رجحان ہے، اب مربی کا کام ہے کہ وہ چند دن پیسے کی ایک مخصوص مقدار پر کفایت کرائے، رفتہ رفتہ اس میں کمی کرتا جائے، یہاں تک کہ بتدریج اس کی یہ عادت ختم ہو جائے۔

یا مثلاً کوئی طالب علم بہ ظاہر فہیم ہے، لیکن کتاب یاد نہیں کرتا ہے، مفوضہ کام انجام نہیں دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام چور ہے، اس کی اصلاح کے لئے سب سے بنیادی ضرورت ''انضباطِ وقت'' کی ہے، استاذ کا کام ہے کہ وہ اس سے اس کا پورا نظام العمل بنوائے اور روزانہ اس کی خانہ پری کرائے، تاکہ بتدریج وہ وقت کے صحیح استعمال کا خوگر ہو جائے۔

تہدید

نصح وموعظت بھی جب مفید ثابت نہ ہو تو اب ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیا جائے، اسی لئے انبیاء کو بشیر کے ساتھ نذیر بھی بنایا گیا ہے، اور آپ نے اول درجہ میں بشارت سے کام لینے کا حکم دیا ہے اور دوسرے درجہ میں ڈرانے کا، ہمیشہ نرم گفتگو بدطینت لوگوں کو اور شوخ بنا دیتی ہے اور ان کے حوصلے بڑھاتی ہے — تاہم ڈانٹ ڈپٹ میں بھی دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے ایک یہ کہ بدعاء وغیرہ کے الفاظ نہ ہوں جس کی وجہ سے طالب علم استاذ کو اپنا دشمن اور بدخواہ تصور کرنے لگے، حدیث میں ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو بہت ہنسایا کرتے تھے، لوگ غالباً مزاحاً ان کو ''حمار'' کہا کرتے تھے، ان سے کئی دفعہ شراب نوشی کی غلطی سرزد ہوگئی، لوگ ان کو شرم وعار دلانے لگے، اسی دوران ایک صاحب نے کہہ دیا کہ تم پر اللہ کی لعنت ہو اور کسی نے کہہ دیا خدا تم کو رسوا کرے، حضور ﷺ نے اس فقرہ کو پسند نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ایسی بات کہہ کر تم شیطان کی مدد نہ کرو اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ خدا اور اس کے رسول سے محبت رکھتا

ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۷۸۰، ۶۷۸۱، کتاب الحدود، عن عمرو ابن ابی ہریرۃ)

دوسرے ڈانٹ ڈپٹ میں بھی طالب علم کے لئے دردمندی اور نصح کا جذبہ ہو؛ اسی لئے انبیاء کو قرآن مجید نے ''مخوف'' نہیں کہا؛ بلکہ ''نذیر'' کہا نذیر ایسے ڈرانے والے کو کہتے ہیں جو دوسرے کو بے عزت اور خوفزدہ کرنے کے لئے نہیں ڈرائے: بلکہ ترس اور درد کے ساتھ ڈرائے۔

بے توجہی

اصلاح کا ایک طریقہ تھوڑے وقفہ کے لئے بے توجہی بھی ہے، اگر طالب علم ایک غلطی کا بار بار اعادہ کرتا ہو اور استاذ چند دن اس کی طرف توجہ کرنا چھوڑ دے اور اس کے ہم جماعت طلبہ کو بھی دو تین دنوں کے لئے بے تعلق کر دے تو اس طرح وہ اپنے ماحول میں بالکل اجنبی بن کر رہ جائے گا اور یہ قدم اس کی اصلاح کے لئے بڑا مؤثر ثابت ہوگا۔

حدیث میں ہم کو اس کی اصل یہ ملتی ہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ وحضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہ جن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے، خود بھی ان سے بہ ظاہر بے توجہی کرتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی چند دنوں ان سے قطع تعلق کا حکم دیا، یہ چیز نہ صرف یہ کہ ان کے لئے ایک عبرت خیز واقعہ بن گئی بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی یہ ایک زبردست تازیانہ ثابت ہوا — دراصل مقاطعہ اور کسی انسان کو اس کے ماحول سے کاٹ دینا اصلاح کے لئے ایک نہایت مؤثر ذریعہ ہے، تاہم اس کے لئے بہت احتیاط اور طالب علم کی نفسیات کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کے اندر دینی تعلیم کی طرف توجہ اور اپنے استاذ سے محبت پیدا ہوگئی ہو، قبل از وقت اس قسم کا اقدام اس کے لئے تعلیم سے نفرت اور مدرسہ کے ماحول وفضاء سے بُعد کا سبب بن جائے گا۔

جسمانی تادیب

تنبیہ وتادیب کا ایک اہم ذریعہ ''جسمانی سرزنش'' بھی ہے، اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مار پیٹ کے علاوہ دوسرے طریقوں سے جسمانی سرزنش کی جائے، مثلاً کسی مخصوص انداز سے کھڑا کر دینا یا بیٹھا دینا، ایسی تدبیروں کے بجائے ایسا بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس سے

کچھ نمازیں پڑھائی جائیں یا ایک دو وقت کا کھانا بند کر دیا جائے، شریعت میں تادیب کے اس طریقہ کے لئے ثبوت موجود ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد غلطیوں کا کفارہ ''روزہ'' کو قرار دیا گیا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ جسمانی سرزنش کی یہ ایک مؤثر اور انقلاب انگیز تدبیر ہے جب ہی تو اسلام نے کفارات کے لئے اس کا انتخاب کیا ہے۔

مار پیٹ

سرزنش کا ایک آخری درجہ ''ضرب'' اور مناسب حدود میں ہی مار پیٹ کرنا ہے، مار پیٹ ایک نامناسب چیز ہے، لیکن کبھی کبھی اصلاح و تربیت کی خاطر اس قدر ناگزیر ہو جاتی ہے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے؛ اس سلسلہ میں نہ یہ نظریہ صحیح ہے کہ طالب علم کو بالکل مارا ہی نہ جائے اور نہ یہ طریقہ صحیح ہے کہ طلبہ کو سزا دیتے ہوئے دیکھنے والے کو ایسا گمان ہو کہ جانور پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں، حدیث میں ہے کہ دس سال کی عمر ہونے کے باوجود بچے نماز نہ پڑھیں تو ان کو مارو (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۹۴، باب متی یؤمر الغلام بالصلاۃ) اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جو اپنے گھر میں ڈنڈا لٹکا کر رکھے تاکہ اس کے ذریعہ بچوں کی تربیت کی جاسکے، (مسند دیلمی، بحوالہ کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۴۹۹۸، باب تربیۃ أهل البیت) اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو ان کی غلطی پر ''مار پیٹ'' کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

دوسری طرف مار ایسی بھی نہ ہو کہ ''ضرب مبرح'' ہو جائے، اس سلسلہ میں احادیث اور کتب فقہ کی صراحتوں سے جو ہدایات ملتی ہیں وہ یہ ہے کہ:

۱- رسول اللہ ﷺ نے جانور کو بھی چہرہ پر مارنے سے منع فرمایا۔ (کنز العمال، حدیث نمبر: ۲۵۶۲۳، ۲۵۶۳۵، حقوق الراکب والمرکوب) اسی طرح غلام کو بھی چہرہ پر مارنے کی ممانعت فرمائی ہے، (کنز العمال، حدیث نمبر: ۲۵۶۶۰، حقوق المملوک)

اور سرزنش کے سلسلہ میں صراحتاً حکم فرمایا کہ چہرہ سے بچا جائے: **''إذا ضرب أحدکم فلیتق الوجہ''** (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۴۴۹۳، باب فی ضرب الوجہ فی الحد، کتاب الدیات)

۲- جسم کے نازک حصہ جیسے پیٹ، سینہ وغیرہ پر بھی نہ مارا جائے۔

۳-　مسلسل ایک ہی مقام پر نہ مارا جائے بلکہ جسم کے مختلف حصوں پر مارا جائے۔

۴-　اس طرح نہ مارے کہ جسم پھٹ جائے، ہڈی ٹوٹ جائے یا مار کا نشان جسم پر نمایاں ہو جائے کہ فقہاء نے ان ساری صورتوں کو ''ضرب مبرح'' میں داخل قرار دیا ہے۔

ان اُمور کی رعایت کے بغیر سخت ترین اور تکلیف دہ سزا دینا نامناسب تو ہے ہی شرعاً بھی ناجائز ہے اور علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ خود ایسے مدرس کی تعزیر کی جائے گی۔

۵-　ایک دفعہ دس چھڑی سے زیادہ نہ مارا جائے، حدیث میں ہے کہ حد کے علاوہ کسی اور غلطی پر دس کوڑے سے زیادہ نہیں مارنا چاہئے: **''لایجلد فوق عشر جلدات إلا فی حد حدود اللہ''** (بخاری، حدیث نمبر: ۶۸۴۸، ومسلم، حدیث نمبر: ۱۷۰۸، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

لیکن یہ طریقہ کہ استاذ انتظامیہ کے پاس شکایت کرے پھر وہ اس کی تحقیق کریں اور بعد تحقیق وتفتیش مقدار متعین فرمائیں اس کے بعد کسی طالب علم کی سرزنش کی جائے، تجرباتی لحاظ سے سخت مضر ہے اور میرے خیال میں اس کے لئے کوئی شرعی اصل بھی موجود نہیں ہے، فقہاء نے جہاں والد یا استاذ یا شوہر کے لئے تعزیر کی اجازت دی ہے، وہاں کہیں ایسی کوئی قید نہیں لگائی گئی ہے، البتہ استاذ کے لئے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ سرزنش کے پیچھے انتقام اور اشتعال کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔

اخراج

لیکن نصح وموعظت، تہدید، جسمانی تادیب اور مار پیٹ کے باوجود اگر طالب علم کی اصلاح نہ ہو پائے یا طالب علم کوئی حد سے گذری ہوئی بات کر جائے تو ایسے طالب علم سے مدرسہ کے ماحول کو خالی کر دینا دراصل نہ صرف دوسرے طلبہ بلکہ خود اس کے ساتھ بھی انصاف ہے — اس معاملہ میں مدرسہ کی انتظامیہ عام طور پر افراط وتفریط میں مبتلا ہوتی ہے کچھ لوگ ذرا سی بات پر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ مدرسہ کو اس طالب علم سے خالی کر دیا جائے گویا مدرسہ طلبہ کی اقامت گاہ بلکہ خدارسیدہ بزرگوں کی خانقاہ ہو، جن سے غلطی کا ارتکاب قابلِ تصور نہ ہو اور ہو جائے تو قابل برداشت نہ ہو۔

اس کے مقابلہ میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب مدرسہ نے ایک طالب علم کا

داخلہ لے لیا تو گویا اس بات کا ٹھیکہ لے لیا ہے کہ چاہے وہ کسی درجہ میں بھی مفسد ہو مگر اس کو سند فراغت پر ہی رخصت کرے گا؛ اس لئے کہ مدرسہ اسپتال ہے اور یہ جگہ تو ہے ہی بیماروں کے لئے — یہ بات بعض اوقات پہلی رائے سے بھی زیادہ مضرت رساں ہو جاتی ہے؛ اس لئے کہ ایک مفسد اور کمینہ طینت طالب علم کی موجودگی اکثر اوقات پورے ماحول کو خراب کر کے رکھ دیتی ہے، اس طرح ایسے طالب علم کو مدرسہ میں رکھنا دوسرے طلبہ کے ساتھ سخت ناانصافی اور ظلم ہے اور یہ خود اس طالب علم کے حق میں بھی مضر ہے مثلاً ایک طالب علم استاذ کے ساتھ گستاخ ہو، آپ اس کی تنبیہ بھی کر دیں تو اس ماحول میں جہاں وہ پہلے شوخیاں کرتا رہا ہے، اس کو اپنے لئے وقار کا مسئلہ سمجھ لیتا ہے اور اپنی فروتنی سے اس کو ذلت محسوس ہونے لگتی ہے، پھر چوں کہ بعض اساتذہ کے لئے اس کے دل میں نفرت کے جذبات رہتے ہیں؛ اس لئے ان سے استفادہ دشوار ہو جاتا ہے، استاذ میں بھی اس کی طرف سے ایک حد تک اِبا کا جذبہ کارفرما رہتا ہے، جسے بہر حال انتظامیہ اپنے آمرانہ مزاج سے ختم نہیں کرسکتی؛ اس لئے اگر وہ اس مدرسہ سے نکل کر کسی نئے ماحول میں چلا جائے تو فروتنی میں عار محسوس نہیں ہوتی، کسی استاذ کے بارے میں اس کے دل میں کوئی نفرت نہیں ہوتی نہ کسی استاذ کو اس سے حجاب رہتا ہے، اس طرح وہ خود بھی اپنی تعلیم کو صحیح طور پر جاری رکھ سکتا ہے اور اپنی اصلاح کرسکتا ہے۔

اسلام میں اس کی واضح نظیر ''تغریب'' یعنی جلاوطنی ہے، فقہاء نے از راہِ تعزیر جلاوطن کئے جانے کی اجازت دی ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں بارہا اس طریق کو استعمال فرمایا ہے، قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے درمیان فراق کا جو واقعہ لکھا ہے وہ ایک طالب علم کے اخراج کی بہترین نظیر ہے۔

تمت